فروری 2014

بہنوں کا اپنا ماہنامہ

شعاع

انٹرویو

ناول

مکمل ناول

ناولٹ

افسانے

نظمیں، غزلیں

زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹری

پاکستان (سالانہ)----- 600 روپے
ایشیا، افریقہ، یورپ---- 5000 روپے
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا--- 6000 روپے

مستقل سلسلے

فروری 2014
جلد 28 شمارہ 6
قیمت 50 روپے

خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ شعاع، 37 - اردو بازار، کراچی۔

رضیہ جمیل نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا - مقام: 2/ 1 بی 6 پی ای سی ایچ ایس سوسائٹی کراچی

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 0092-21-32766872
Email: shuaa@khawateendigest.com website: www.khawateendigest.com

دوشیزہ جیلانی

پہلی شعاع

شعاع کا فروری کا شمارہ لیے حاضر ہیں۔

رواں سال کے دوسرے مہینے کا آغاز ہو رہا ہے۔ حالات میں تبدیلی تو کیا، اب تو اس کے امکانات بھی معدوم ہوتے جا رہے ہیں۔ خیر کی خبر تو کہیں بھی نہیں ہے۔ اگر کوئی دن بدخبری کے بغیر گزر جائے تو سکون کی سانس لیتے ہیں۔

جن کی خاطر ہم نے اپنا قبلہ بدلا۔ اپنوں سے بیگانہ بن گئے۔ آج ان کا سب سے بڑا ہدف ہم ہیں۔ ہر طرف دھماکے ہیں، لہو ہے، آگ ہے۔

غلط فیصلے، غلط راستے کبھی منزل کی نشان دہی نہیں کرتے۔ جن راستوں کا انتخاب ہم نے کیا تھا۔ شاید اس کا نتیجہ یہی نکلنا تھا۔

زندگی جس کے ایک پل کا یقین نہیں۔ اس تعاقب میں ہم ایک عمر لگا دیتے ہیں، اپنے اقتدار و اختیار کی خاطر لاکھوں کروڑوں انسانوں کی زندگیوں سے کھیل جاتے ہیں اور جب وقت کی گرفت میں آتے ہیں تب بھی عرق ندامت سے پیشانی نم نہیں۔ رعونت، غرور و تکبر سر نہیں جھکانے دیتا۔ اپنی غلطیوں کا اعتراف کرنے کے بجائے مزید فتنوں کی راہ ہموار کی جاتی ہے۔

کیا اب بھی وقت نہیں آیا کہ اپنے غلط فیصلوں سے قوم کو تباہی کی اس اسٹیج پر پہنچانے والے اپنی غلطیوں کا اعتراف کریں اور اپنے اندر سزا بھگتنے کا حوصلہ بھی پیدا کریں۔ مگر اس کے لیے بہت بہادری کی ضرورت ہے۔

امکانات کی ایک وسیع دنیا ہمارے سامنے ہے۔ بہت حد تک مجبور ہیں تو بہت کچھ اختیار میں بھی ہے لیکن اس سے پہلے کامل یکسوئی سے راستوں کا تعین کرنا ہوگا۔ فیصلہ کرنا ہوگا کہ سر اٹھا کر جینا ہے یا اسی بدحالی میں رہنا ہے۔

یہ پیش نظر رہے کہ جو آگے نہیں بڑھتے۔ انہیں پیچھے ہٹنا پڑتا ہے۔ یہاں تک کہ دیوار سے لگ جائیں کیونکہ وقت کے کارخانے میں ہر پل تبدیلی کا پیغام لے کر آتا ہے۔

اس شمارے میں،

- نایاب جیلانی کا طویل مکمل ناول۔ کوئی چاند رکھ میری شام پر،
- امایہ خان، ام ایمان، عنیقہ محمد بیگ اور صدف آصف کے ناولٹ،
- ام مریم، مصباح علی، رضیہ مہدی اور سعدیہ عزیز سعدی کے افسانے،
- رخسانہ نگار عدنان اور نبیلہ عزیز کے ناول،
- یاسر نواز اور ندا یاسر کا بندھن،
- معروف شخصیات سے گفتگو کا سلسلہ۔ دستک،
- شعاع کے ساتھ ساتھ۔ قارئین سے سروے،
- پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری باتیں۔ احادیث کا سلسلہ،
- خط آپ کے، شاعری سچ بولتی ہے اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں۔

شعاع ترتیب دیتے ہوئے ہماری ہر ممکن کوشش یہی ہوتی ہے کہ یہ آپ کی پسند کے معیار پر پورا اترے۔ یہ شمارہ کیسا لگا، اپنی رائے ضرور دیجیے گا۔ آپ کے خطوط کے منتظر ہیں۔

حمد باری تعالیٰ

بکھرے ہیں کائنات میں ہر سُو ہُنر تیرے
آتے ہیں اہلِ شوق کو جلوے نظر تیرے

ممنون کس قدر ہیں یہ شمس و قمر تیرے
ڈوبے ہیں تیرے عشق میں یہ بحر و بر تیرے

ہر طائرِ چمن کی زباں پر ہے تیرا نام
چرچے ہیں اس جہاں میں شام و سحر تیرے

خالق ہے فرش و عرش کی ایک ایک چیز کا
تخلیقِ کائنات کا سہرا ہے سر تیرے

تیرا قلم ہی لکھتا ہے اُن کے لیے یہ فیض
وہ خوش نصیب لوگ جو جاتے ہیں گھر تیرے

ہر رہ گزر ہے تیرے تعلق کا سنگ میل
تجھ تک پہنچ ہی جاتے ہیں اہلِ نظر تیرے

عالم پناہ! تیرا ہے محتاج ہر نفس
یہ شاہ بھی غلام ہیں اے تاجور تیرے

شمیم فاطمہ

نعت رسول مقبول ﷺ

وہ شمع اُجالا جس نے کیا چالیس برس تک غاروں میں
اک روز چمکنے والی تھی سب دُنیا کے درباروں میں

گر ارض و سما کی محفل میں لولاک کا شور نہ ہو
یہ رنگ نہ ہو گلزاروں میں، یہ نور نہ ہو سیاروں میں

جو فلسفیوں سے کھُل نہ سکا جو نکتہ وروں سے حل نہ ہوا
وہ راز اک کملی والے نے بتلا دیا چند اشاروں میں

بوبکرؓ و عمرؓ، عثمانؓ و علیؓ کرنیں ہیں ایک ہی مشعل کی
ہم مرتبہ ہیں یارانِ نبیؐ کچھ فرق نہیں ان چاروں میں

وہ جنس نہیں ایماں جسے لے آئیں دُکانِ فلسفہ سے
ڈھونڈنے سے ملے گی عاقل کو یہ قرآں کے سیپاروں میں

ظفر علی خان

ادارہ

پیارے نبی کی پیاری باتیں

بدعات اور (دین میں) نئے نئے کاموں کے پیدا کرنے کی ممانعت کا بیان

اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔
"پس نہیں ہے حق کے بعد مگر گمراہی۔"
اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔
"ہم نے کتاب میں کسی چیز (کے بیان کرنے) میں کوتاہی سے کام نہیں لیا۔"
اور فرمایا۔
"اگر تم کسی چیز کی بابت آپس میں اختلاف و نزاع کرو تو اسے اللہ اور رسول کی طرف لوٹا دو۔"
اور فرمایا۔
"اور بے شک یہ ہے میرا راستہ سیدھا' پس تم اسی کی پیروی کرو اور دوسرے راستوں کی پیروی مت کرو ورنہ وہ تمہیں اس سیدھے راستے سے جدا کر دیں گے۔"
اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔
"(اے پیغمبر!) کہہ دیجیے اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری پیروی کرو' اللہ تعالیٰ تمہیں اپنا محبوب بنا لے گا اور تمہارے گناہ معاف فرما دے گا۔"
اور اس باب میں اور بہت سی آیات ہیں جو کہ معلوم ہیں۔ اور احادیث بھی بہت زیادہ ہیں چند احادیث پیش ہیں۔

دین میں نئی بات پیدا کرنا

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"جس نے ہمارے اس دین (اسلام) میں (اپنی طرف سے) کوئی نئی بات ایجاد کی جو اس میں سے نہیں تو وہ مردود ہے۔" (بخاری و مسلم)
اور مسلم کی ایک روایت میں ہے۔
"جس نے کوئی ایسا کام کیا جس کے متعلق ہمارا حکم نہیں ہے تو وہ مردود ہے۔"

فوائد و مسائل :

1۔ اس میں ایک نہایت اہم ضابطہ اور قاعدہ بیان کیا گیا ہے۔ بدقسمتی سے مسلمانوں نے اس حدیث کو اور اس میں بیان کردہ اصول اور ضابطے کو کوئی اہمیت نہیں دی' جس کا نتیجہ ہے کہ بدعات عام ہیں' بلکہ اصل دین ہی بدعات و رسومات کو سمجھ لیا گیا ہے اور نہایت شدومد سے ان پر عمل کیا اور کرایا جاتا ہے۔ اس کی ایک وجہ تو جہالت اور دین سے بے خبری ہے۔ دوسری وجہ اس ضابطے کا عدم فہم ہے حالانکہ یہ ضابطہ نہایت واضح ہے جو اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے اور وہ یہ کہ وہ ہر کام جسے نیکی اور ذریعہ تقرب سمجھ کر کیا جائے اور اس پر کتاب و سنت کی کوئی دلیل نہ ہو یا وہ مختلف ہو جو صحابہ و تابعین رضی اللہ عنہ نے کی جو اسلام کا بہترین دور ہے یعنی صحابہ کرام نے وہ کام نہ کیے ہوں اور خیرالقرون کے تعامل کی تائید سے بھی وہ محروم ہو' ایسے تمام کام بدعت ہوں گے۔
2۔ کسی کام کو نیکی یا گناہ قرار دینے کا اختیار صرف اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے۔ نیکی اور بدی کے خود ساختہ پیمانے مقرر کر لینا مسلمانوں کی نہیں بلکہ یہودیوں کی روش ہے۔

بہترین اور بدترین

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب خطبہ ارشاد فرماتے تھے تو آپؐ کی آنکھیں سرخ اور آواز بلند ہو جاتی اور آپؐ کا غضب شدید ہو جاتا' حتیٰ کہ ایسے ہو جاتے گویا آپ (دشمن کے) کسی لشکر سے ڈرانے والے ہیں کہ وہ لشکر تم پر صبح یا شام کو حملہ کرنے والا ہے اور فرماتے۔
"میں اور قیامت ایسے معبوث کیے گئے ہیں جیسے یہ دو انگلیاں ہیں۔" اور آپؐ اپنی انگشت شہادت اور درمیانی انگلی دونوں کو ملا لیتے (یعنی جس طرح ان دونوں انگلیوں کے درمیان میں کوئی فاصلہ نہیں' اسی طرح میرے اور قیامت کے درمیان کسی نبی کا فاصلہ نہیں) اور فرماتے۔
"امابعد! یقیناً" بہترین بات اللہ کی کتاب ہے اور بہترین راستہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا راستہ ہے اور بدترین کام (دین میں) نئے پیدا کردہ کام ہیں اور (ایسا) ہر نیا کام (دین میں) نئے پیدا کردہ کام ہیں اور (ایسا) ہر نیا کام (بدعت) گمراہی ہے۔"
پھر فرماتے۔
"میں ہر مومن پر اس کی جان سے بھی زیادہ حق رکھتا ہوں (یعنی اس کے معاملات میں اس سے بھی زیادہ خیرخواہ ہوں) جو شخص مال چھوڑ جائے تو وہ اس کے ورثاء کے لیے ہے اور جو قرض یا محتاج اہل و عیال چھوڑ کر مر جائے تو (قرض کی ادائیگی) میری ذمہ داری اور (بچوں کی نگرانی کا فریضہ) مجھ پر ہے۔" (مسلم)

فوائد و مسائل :

1۔ اس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے انداز خطابت کا ذکر ہے اور آپؐ کے وجود گرامی کو قرب قیامت کی علامت بتلایا گیا ہے۔ علاوہ ازیں کتاب و سنت کی اہمیت اور بدعات کی ہلاکت خیزی کے ساتھ یتیموں اور ضرورت مندوں کی کفالت کو حکومت وقت (بیت المال) کی ذمہ داری بتلایا گیا ہے کیونکہ خلفاء ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جانشین ہیں اور جو کام آپؐ اپنی زندگی میں کرتے تھے' اب وہی کام ان کے ذمے ہیں۔
2۔ نیز لوگوں کے چھوڑے ہوئے مال کے حق دار' میت کے ورثا ہی ہیں نہ کہ کوئی اور۔

اس شخص کا بیان جو کوئی اچھا یا برا طریقہ جاری کرے

حضرت ابو عمرو جریر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ ہم دن کے شروع میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تھے کہ آپؐ کے پاس کچھ ایسے لوگ آئے جو ننگے بدن تھے' اون کی دھاری دار چادریں یا کمبل ڈالے ہوئے تھے اور گردنوں میں تلواریں لٹکائے ہوئے تھے۔ ان کی اکثریت مضر قبیلے سے' بلکہ سارے ہی مضر سے تھے۔
جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی فاقہ زدگی کا مشاہدہ فرمایا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ متغیر ہو گیا' آپؐ (گھر کے) اندر تشریف لے گئے اور پھر باہر آ گئے۔ بلال رضی اللہ عنہ کو حکم دیا تو انہوں نے اذان دی' پھر (جب لوگ نماز کے لیے جمع ہو گئے تو) تکبیر کہی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز پڑھائی' پھر لوگوں سے خطاب فرمایا۔ اس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"لوگو! اپنے اس رب سے ڈرو جس نے تمہیں ایک جان سے پیدا کیا۔۔۔" آخر آیت تک آپؐ نے یہ آیت تلاوت فرمائی۔ اس کے بعد سورۃ حشر کی آیت پڑھی۔ ترجمہ : "اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو! اور (ہر) نفس کو چاہیے کہ اس نے کل (قیامت) کے لیے جو آگے بھیجا ہے' اسے دیکھے۔"
(اس کے بعد آپؐ نے صدقہ و خیرات کی ترغیب دی' فرمایا)
"ہر آدمی کو چاہیے کہ صدقہ کرے اپنے دینار و درہم کا' اپنے کپڑے کا' گندم کے صاع کا' کھجور کے صاع کا۔" (صاع ایک پیمانہ تھا' ڈھائی کلو کا) حتیٰ کہ فرمایا "گو کھجور کا ایک ٹکڑا ہی ہو (یعنی تھوڑا یا زیادہ جس کو جتنی توفیق ہو' صدقہ کرے)۔"
چنانچہ انصار میں سے ایک آدمی ایک تھیلی لے کر آیا (جو اتنی بھاری تھی کہ) اس کی ہتھیلی اسے اٹھانے

سے عاجز آ رہی تھی بلکہ عاجز ہو چکی تھی۔ پھر لوگ (لے لے کر) پے در پے آتے رہے' یہاں تک کہ میں نے دو ڈھیر دیکھے۔ ایک سامان خوراک کا اور دوسرا کپڑوں کا اور میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا تو آپؐ کا چہرہ انور اس طرح چمک رہا تھا گویا کہ وہ سونے کا ٹکڑا ہے۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"جس نے اسلام میں کوئی اچھا طریقہ جاری کیا تو اس کے لیے اس کا اپنا اجر اور ان تمام لوگوں کا اجر ہوگا جو اس کے بعد اس پر عمل کریں گے' بغیر اس کے کہ ان کے اجروں میں کوئی کمی کی جائے۔ اور جس نے اسلام میں کوئی برا طریقہ جاری کیا تو اس پر اس کے اپنے گناہ کا بوجھ اور ان تمام لوگوں کے گناہوں کا بوجھ ہوگا جو اس پر اس کے بعد عمل کریں گے' بغیر اس کے کہ ان کے گناہوں کے بوجھ میں کوئی کمی کی جائے۔" (مسلم)

فوائد و مسائل :

1۔ بعض لوگ بدعت کی دو قسمیں بیان کرتے ہیں حسنہ اور سیئہ لیکن یہ صحیح نہیں ہے۔ بدعت کوئی بھی ہو' وہ حسنہ نہیں ہو سکتی۔ بدعت ہمیشہ بری ہی ہوگی' اس لیے کہ بدعت سازی دراصل شریعت سازی ہے۔ جس کا حق کسی انسان کو نہیں ہے۔ شریعت سازی کا تمام تر اختیار صرف اللہ تعالیٰ ہی کو حاصل ہے۔ وہی اصل شارع ہے اور اسی کے حکم اور اجازت سے پیغمبر لوگوں کو احکام شریعت بتلاتا ہے۔

2۔ اس حدیث کا مطلب صرف یہ ہے کہ جو چیز اسلام میں مشروع اور جائز ہے' اس پر عمل کرنے اور اسے فروغ دینے کے لیے جو شخص کوئی نیا طریقہ اختیار کرے گا' جسے بعد میں دوسرے لوگ بھی اختیار کر لیں تو اسے اپنے عمل حسن کا ثواب تو ملے گا ہی' ان لوگوں کا ثواب بھی ملے گا جو اس طریقے کو اختیار کر کے وہ عمل صالح کریں گے۔ لیکن جس چیز کا سرے سے کوئی ثبوت ہی شریعت میں نہ ہو' اس کا کوئی بھی طریقہ اختیار کیا جائے' وہ ہر صورت میں سیئہ ہے' وہ حسنہ نہیں ہو سکتا۔ حدیث کے جو دیگر فوائد ہیں' وہ واضح ہیں۔

برے کام ایجاد کرنا

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"جو جان بھی ظلم سے قتل کی جاتی ہے تو آدم علیہ السلام کے پہلے بیٹے (قابیل) پر اس کے خون ناحق کا ایک حصہ ہوگا' اس لیے کہ وہی وہ پہلا شخص ہے جس نے قتل ناحق کا طریقہ جاری کیا۔" (بخاری و مسلم)

فائدہ : اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ خلاف شریعت اور برے کاموں کو پہلے پہل کرنا' جس کی بعد میں لوگ تقلید کریں' کتنا بڑا جرم ہے کہ قیامت تک اس کام کے کرنے کا گناہ اسے بھی ملتا رہے گا' اس لیے امن و سلامتی اس میں ہے کہ انسان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کرے بدعات ایجاد نہ کرے۔

خیر کی طرف رہنمائی کرنے اور ہدایت یا گمراہی کی طرف بلانے کا بیان

اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

"اپنے رب کی طرف بلاؤ۔" اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

"اپنے رب کے راستے کی طرف حکمت اور اچھے وعظ کے ساتھ دعوت دیجیے۔" اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

"اور نیکی اور تقویٰ (کے کاموں) میں ایک دوسرے سے تعاون کرو۔" اور فرمایا۔

"تم میں سے ایک گروہ ایسا ہونا چاہیے جو لوگوں کو خیر کی طرف بلائے۔"

بھلائی کی طرف رہنمائی

حضرت ابو مسعود عقبہ بن عمرو انصاری بدری رضی

اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"جس نے کسی بھلائی پر رہنمائی کی تو اس کے لیے اس کے کرنے والے کے برابر اجر ہے۔" (مسلم)

فائدہ : نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس وقت یہ ارشاد فرمایا جب ایک شخص نے آپؐ سے سفر کے لیے سواری مانگی۔ آپؐ نے فرمایا : میرے پاس تو سواری نہیں ہے۔" ایک شخص نے کہا : میں اسے ایسا آدمی بتلاتا ہوں جو اسے سواری مہیا کر دے گا۔ چنانچہ آپؐ نے بھلائی کی طرف رہنمائی کرنے کا مذکورہ اجر بیان فرمایا جس سے دلالت علی الخیر کی ترغیب ملتی ہے' یعنی خیر کی طرف رہنمائی کرنا بھی باعث اجر ہے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"جس نے کسی کو ہدایت کی طرف بلایا تو اسے ان تمام لوگوں کے برابر اجر ملے گا جو اس کی پیروی کرنے والوں کو ملے گا۔ یہ ان کے اجروں سے کچھ کمی نہیں کرے گا۔

اور جو کسی کو کسی گمراہی کی طرف بلائے گا تو اس پر ان تمام لوگوں کے گناہوں کا اتنا وبال بھی ہوگا جو اس کی پیروی کرنے والوں کو گناہ کرنے کا ہوگا۔ یہ ان کے گناہوں میں کچھ کمی نہیں کرے گا۔" (مسلم)

سرخ اونٹوں سے بہتر

حضرت ابو عباس سہل بن سعد ساعدی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر والے دن ارشاد فرمایا۔

"میں یہ جھنڈا کل ایسے آدمی کو دوں گا جس کے ہاتھوں پر اللہ تعالیٰ فتح عطا فرمائے گا۔ وہ اللہ اور اس کے رسول سے اور اللہ اور اس کا رسول صلی اللہ علیہ وسلم اس سے محبت کرتے ہیں۔"

چنانچہ لوگوں نے رات یہ بحث کرتے ہوئے گزاری کہ کون وہ خوش نصیب ہوگا جسے ان میں سے جھنڈا دیا جائے گا۔ جب لوگوں نے صبح کی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے' سب کے سب امید رکھتے تھے کہ انہیں جھنڈا دیا جائے گا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا۔

"علی بن ابی طالب کہاں ہیں؟"

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو بتلایا گیا کہ ان کی آنکھیں دکھتی ہیں۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "ان کی طرف پیغام بھیجو۔"

چنانچہ وہ لائے گئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی آنکھوں میں لعاب مبارک لگایا اور ان کے حق میں دعا فرمائی۔ تو وہ اس طرح ٹھیک ہوئے جیسے انہیں کوئی درد تھا ہی نہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں جھنڈا عطا فرمایا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا۔

"اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! میں ان سے لڑوں یہاں تک کہ وہ ہم جیسے (مسلمان) ہو جائیں؟"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"(نہیں بلکہ) آرام و سکون کے ساتھ چلو' یہاں تک کہ تم ان کے میدان میں پڑاؤ ڈالو! پھر ان کو اسلام کی دعوت دو اور انہیں بتلاؤ کہ تم پر اللہ کے یہ یہ حق واجب ہیں۔ اللہ کی قسم! تمہارے ذریعے سے کسی ایک آدمی کا ہدایت یافتہ ہو جانا' تمہارے لیے (بیش قیمت) سرخ اونٹوں سے بہتر ہے۔" (بخاری و مسلم)

فوائد و مسائل :

1۔ اس میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی فضیلت اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزے کے علاوہ' جہاد کے طریقے کا بیان ہے کہ پہلے کافروں کو اسلام کی دعوت دی جائے' اگر وہ اسے رد کر دیں تو پھر جہاد کیا جائے۔

2۔ جہاد بھی ایسا عمل ہے کہ اگر اس کے ذریعے سے یا اس کے آغاز میں دعوت دینے سے کچھ لوگوں کو

ہدایت نصیب ہو جائے تو جہاد میں شریک لوگوں کو نو مسلموں کے اعمال خیر کا اجر بھی ملے گا۔

سامان جہاد

حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ اسلم قبیلے کے ایک نوجوان نے کہا۔

"اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! میں جہاد کرنا چاہتا ہوں لیکن میرے پاس وہ سامان نہیں جس کے ساتھ میں جہاد کی تیاری کروں۔" آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"فلاں شخص کے پاس جاؤ' اس نے جہاد کی تیاری کی تھی لیکن وہ بیمار ہو گیا۔"

(یعنی اس سے سامان جہاد لے لو)۔

چنانچہ وہ (نوجوان) اس کے پاس گیا اور جا کر کہا۔

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تجھے سلام کہتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ تم مجھے وہ سامان دے دو جس کے ساتھ تم نے جہاد کی تیاری کی ہے۔"

اس شخص نے (اپنی بیوی سے) کہا۔

"اے فلانی! اس کو وہ سامان دے دے جس کے ساتھ میں نے جہاد کی تیاری کی تھی اور اس میں سے کوئی چیز مت روکنا' اللہ کی قسم! تو اس میں سے کوئی چیز روک کر نہیں رکھے گی کہ پھر تمہارے لیے اس میں برکت ہو (یعنی سامان کا روکنا بے برکتی کا باعث ہو گا)۔ (مسلم)

فوائد و مسائل :

1۔ اس سے معلوم ہوا کہ کسی نیکی کے کام کے لیے انسان نے تیاری کی ہو لیکن بیماری اور عذر کی وجہ سے اس پر عمل کرنے سے وہ قاصر رہے تو وہی ساز و سامان اگر وہ کسی اور کو دے دے گا تو وہ بھی اس کے ساتھ عمل خیر یا اجر جہاد میں برابر کا شریک رہے گا۔

2۔ اللہ کے راستے میں خرچ کرنے کے بجائے مال کو اپنے پاس روکے رکھنا بے برکتی اور اللہ کی ناراضی کا باعث ہے۔

3۔ جس مال کو اللہ کے راستے میں خرچ کرنے کی نیت ہو اُسے اپنے پاس روکنا بے برکتی کا باعث ہے۔

جہاد

ابو عبدالرحمٰن زید بن خالد جہنی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"جس نے اللہ کے راستے میں کسی جہاد کرنے والے کو جہاد کا سامان تیار کر کے دیا' بلاشبہ اس نے خود جہاد کیا اور جو کسی جہاد کرنے والے کا' اس کے گھر میں بھلائی کے ساتھ جانشین (نگرانی اور خبر گیری کرنے والا) بنا' یقیناً" اس نے (بھی) جہاد کیا۔" (بخاری و مسلم)

فوائد و مسائل :

1۔ اس حدیث میں ایسا طریق کار بتلایا گیا ہے' جس پر عمل کر کے جہاد کو زیادہ سے زیادہ موثر بنایا جا سکتا ہے اور جہاد کے اجر و ثواب میں سب لوگ برابر کے شریک ہو سکتے ہیں۔ معاشرے میں بہت سے تنومند' قوی اور جوان ہوتے ہیں لیکن ان کے پاس وسائل نہیں ہوتے' اس لیے وہ جہاد میں حصہ لینے سے محروم رہ سکتے ہیں اور یوں ایک نہایت کار آمد عنصر عضو معطل بنا رہ سکتا ہے۔ دوسری طرف ایسے لوگ ہوتے ہیں جن کے پاس وسائل کی فراوانی ہے لیکن ان کے پاس صحت' قوت اور جوانی نہیں ہے جو جہاد کے لیے ضروری ہے۔ اس حدیث میں بیان کردہ طریق کار پر عمل کرنے سے رجال کار اور وسائل دونوں باہم جمع بھی ہو جاتے ہیں اور جہاد کے اجر میں بھی سب برابر کے شریک۔

2۔ خیال رہے کہ قرون اولیٰ میں جہاد میں حصہ لینے والے مجاہدین' مستقل باقاعدہ تنخواہ دار نہیں ہوتے تھے' جیسے آج کل فوج کا ایک نہایت وسیع ادارہ ہے۔ بلکہ لوگ رضاکارانہ طور پر حصہ لیتے تھے' جیسے آج کل بھی بعض تنظیموں کے تحت لوگ جہاد میں رضاکارانہ حصہ لے رہے ہیں' یہ حدیث ایسے ہی رضاکار مجاہدین کے بارے میں ہے

ندا یاسر ہمراہ یاسر نواز

شاہین رشید

یاسر نواز تو اب اتنی معروف شخصیت ہو گئے ہیں کہ ان کا نام ہی اب تعارف ہے۔ فنکار گھرانے سے تو ان کا تعلق تھا ہی کہ ان کے والد فرید نواز بلوچ بہت اچھے فنکار تھے۔ مگر فنکار فیملی سے تعلق جوڑنے کے بعد ان کی شہرت میں مزید اضافہ ہوا ہے۔

"بندھن" کے لیے یاسر نواز اور ان کی بیگم ندا یاسر کے انٹرویو کی بہت فرمائشیں تھیں' سو آج یہ فرمائش پوری کر رہے ہیں۔

یاسر نواز نے فن اداکاری سے اس فیلڈ میں قدم رکھا۔ مگر پھر جلد ہی ڈائریکشن کی فیلڈ میں آ گئے اور بہترین سیریلز اور ٹیلی پلے ڈائریکٹ کیے اور گزشتہ سال فلم "انجمن" کا ری مکس پیش کر کے انہوں نے یہ ثابت کیا کہ یہ نہ صرف اچھے ڈرامہ ڈائریکٹر ہیں' بلکہ فلم ڈائریکٹر بھی ہیں اور یاسر کے لیے یہ بڑے اعزاز کی بات ہے کہ ان کی فلم "انجمن" کو 7 ایوارڈز ملے ہیں اور یہی نہیں جب 2001ء میں پی ٹی وی نے ڈراموں کا مقابلہ کیا تو یاسر نواز نے نور الہدیٰ شاہ کا ڈرامہ ڈائریکٹ کیا' 26 ڈراموں کے اس مقابلے میں ان کا ڈرامہ نمبرون قرار پایا ــــــ یاسر نواز نے کریڈٹ پہ بہت کامیاب ڈرامے ہیں۔ جو ناظرین کو یقیناً" یاد ہوں گے۔

"جی یاسر! کیسے ہیں اور لندن میں خوب مزے ہو رہے ہیں؟"

"جی اللہ کا شکر ہے اور واقعی بہت مزے ہو رہے ہیں۔ چھٹیاں گزارنے آئے ہیں اور بس اب چند دنوں میں واپسی ہے۔"

"کیا بات ہے کہ اپنا پاکستان چھوڑ کر آپ چھٹیاں گزارنے ملک سے باہر جاتے ہیں؟"

"بات یہ ہے کہ پاکستان میں سب ہمیں بہت اچھی طرح جانتے ہیں۔ ہم کھلے عام لوگوں میں چل پھر نہیں سکتے۔ لہٰذا گھومنا پھرنا ہمارے لیے ممکن نہیں رہتا' اس لیے ہم چھٹیاں گزارنے ملک سے باہر جاتے ہیں۔ کیونکہ ہماری خواہش ہوتی ہے کہ ہم اپنے بچوں کو پورا ٹائم دیں اور ان کے ساتھ انجوائے کریں۔ پاکستان میں رہ کر یہ ممکن نہیں ہے۔ بس اور کوئی وجہ نہیں ہے ملک سے باہر جانے کی۔"

یاسر نواز کے آباؤ اجداد کا تعلق حیدر آباد سندھ سے ہے۔ 26 جولائی کو جنم لینے والے یاسر نواز اپنے بہن' بھائیوں میں پہلے نمبر پر ہیں۔ ان کی ایک ہی بہن ہیں جو فہد مصطفیٰ کی بھابھی ہیں۔

"کتنے سال ہو گئے ہیں شادی کو اور ندا سے پہلی ملاقات کا تو نہیں پوچھیں گے' کیونکہ وہ تو ہوتی ہی رہتی تھی۔ شریک سفر کے حوالے سے کب ندا کو دیکھا؟"

"ہاہاہا۔۔۔ بہت گھما پھرا کر سوال کیا آپ نے اور جناب 2 جون 2002ء کو ہماری شادی ہوئی' سالوں کا حساب آپ خود لگا لیں اور جہاں تک شریک سفر کی نظر سے دیکھنے کا تعلق ہے تو جب ایک ڈرامہ سیریل کر رہا تھا "دوزخ" اس کی کاسٹ میں "ندا" بھی تھی تو ہیلو ہائے ہو جاتی تھی۔ پھر ایک ٹیلی فلم میں ہم دونوں کام کر رہے تھے تو بس اس دوران ہم دونوں میں تھوڑی بہت ذہنی ہم آہنگی ہو گئی اور مجھے ندا اچھی لگنے لگی اور میں نے اپنے دل میں فیصلہ کیا کہ مجھے اسے اپنا شریک سفر بنا لینا چاہیے اور میں نے اپنی اس خواہش کا اظہار ندا سے بھی کر دیا۔ ندا نے اپنی والدہ سے ذکر کیا اور میں نے اپنے والد سے اور یوں بڑوں کی رضامندی سے ہمارا رشتہ طے پا گیا اور چونکہ میں اپنے گھر کا بڑا بیٹا

تھا اور ندا اپنے گھر میں بڑی بیٹی تھی۔ لہٰذا ہماری منگنی کافی دھوم دھام سے ہوئی ۔ پھر کچھ ہی عرصے کے بعد والد صاحب کا انتقال ہو گیا۔ انہیں میری شادی کی بہت خواہش تھی، مگر قدرت نے مہلت نہیں دی۔ والد کے انتقال کے تقریباً" آٹھ ماہ کے بعد 2 جون 2002ء میں ہماری شادی ہو گئی۔"

"منگنی کے بعد ملنا جلنا رہتا تھا۔ کوئی مسئلہ مسائل در پیش ہوئے؟"

"بالکل رہتا تھا۔ کیونکہ ایک ہی فیلڈ سے تعلق تھا اور ہے اور منگنی کے بعد ہم دونوں نے ایک ساتھ کافی کام کیا۔ اس طرح ملاقات تو روز ہی ہو جاتی تھی اور اللہ کا شکر ہے کوئی مسئلہ مسائل نہیں ہوئے۔"

"بچے دو ہی اچھے؟ کیا بنانا چاہیں گے انہیں؟"

"جی بچے دو ہی اچھے۔ مزید بچوں کی خواہش تھی۔ مگر شاید قسمت میں دو ہی تھے۔ ایک بیٹا اور ایک بیٹی، بیٹے کا نام اپنے والد کے نام پر "فرید" یا سرنواز رکھا ہے اور بیٹی کا نام "فصلہ" یا سرنواز ہے اور میں بچوں کو کیا بنانا چاہوں گا، تو میں نئی نسل کا باپ ہوں۔ اس لیے بچے جو چاہیں بن جائیں۔ میں اور ندا ان کے آگے رکاوٹ نہیں بنیں گے۔ اگر فرید شوبز میں آئے گا تو مجھے خوشی ہو گی۔"

"تو کیا بچوں میں اداکاری کے یا اس فیلڈ میں آنے کے جراثیم ہیں، کیونکہ آپ دونوں اس فیلڈ سے ہیں؟"

"بچوں میں اداکاری کے جراثیم ابھی تک تو نظر نہیں آر ہے۔ مگر امید ہے کہ مزید بڑے ہوں گے تو جراثیم آجائیں گے۔ میں بھی جب ان کی عمر کا تھا تو بہت شرمیلا تھا اور کسی کے سامنے نہیں جاتا تھا۔ مگر وقت کے ساتھ ساتھ شرمیلا پن ختم ہو گیا۔"

"آپ نے کہا کہ اگر "فرید" اس فیلڈ میں آئے گا تو مجھے خوشی ہو گی تو کیا آپ "فصلہ" کے حق میں نہیں ہیں کہ وہ بھی اس فیلڈ میں آئے؟"

"فرید کو تو میں شاید خود بھی تھوڑا بہت فورس کر کے اس فیلڈ میں لے آؤں گا، مگر فصلہ کو شاید اس کی اجازت نہیں دوں گا۔ کیونکہ شادی کے بعد کی زندگی ڈسٹرب ہو سکتی ہے۔ مگر پھر بھی فیصلہ اللہ پر چھوڑا ہے کہ دیکھیں ان کی قسمت انہیں کہاں لے جاتی ہے۔"

"آپ دونوں اس فیلڈ سے ہیں۔ بچوں کی لائف متاثر تو ہوتی ہو گی؟"

"نہیں، ایسا نہیں ہے۔ کیونکہ ہم بچوں کو کافی ٹائم دیتے ہیں۔ ندا کے بارے میں تو آپ کو پتا ہی ہے، وہ صرف مارننگ شو کرتی ہے اور دوپہر تک گھر آجاتی ہے اور بچے بھی دوپہر کو ہی گھر آتے ہیں۔ شوبز کی تقریبات میں بھی ہم دونوں نہیں جاتے۔ گھر سے باہر جب کھانا کھانے جاتے ہیں تو بچوں کے ساتھ ہی جاتے ہیں۔"

"غصہ ہر نارمل انسان کو آتا ہے۔ ندا کو جب غصہ آتا ہے تو کیا کیفیت ہوتی ہے اس کی؟"

قہقہہ..... "غصے میں تو ندا شفقت چیمہ بن جاتی ہے۔ اب آپ خود بتائیں کہ کس کو شفقت چیمہ اچھا لگے گا۔"

"جھگڑے میں پہل کون کرتا ہے اور پھر صلح میں پہل کون کرتا ہے؟"

"دونوں طرف سے ہی پہل ہو جاتی ہے اور صلح میں پہل وہی کرتا ہے، جس کی غلطی ہوتی ہے اور ایسا ہی ہونا چاہیے، کیونکہ بڑائی اسی میں ہے کہ اپنی غلطی کو تسلیم کر لیا جائے۔"

"ندا کام کی وجہ سے بیشتر وقت میک اپ میں رہتی ہو گی۔ ندا کا اصلی روپ دیکھے ہوئے کتنا عرصہ ہو گیا ہے؟"

ہنستے ہوئے "ندا پورے وقت میک اپ میں نہیں ہوتی۔ ایک بج کر پینتالیس منٹ پر وہ گھر آجاتی ہے۔ پھر پورا وقت اس کا میک اپ نہیں ہوتا، تو اس وقت جب دیکھتا ہوں تو ڈر جاتا ہوں۔" ہاہاہا.....

"اچھا..... برا مان جائیں گی بیگم صاحبہ..... خیر ندا کس روپ میں اچھی لگتی ہے؟"

"نہیں، میری بیگم برا نہیں مانے گی، کیونکہ مجھے میری بیگم ہر روپ میں اچھی لگتی ہے۔"

"سسرال سے آپ کے تعلقات کیسے ہیں؟"

"سسرال سے تعلقات اچھے ہیں۔ خاص طور پر ندا کی امی سے بہت اچھے تعلقات ہیں۔"

"گھر کو آپ کتنا وقت دیتے ہیں اور ندا کتنا وقت دیتی ہیں؟"

"ندا کے بارے میں تو جیسا کہ میں نے بتایا، وہ دوپہر کو فارغ ہو کر گھر آجاتی ہے۔ پھر وہ تقریباً" پورا وقت ہی گھر پر ہوتی ہے اور میری جب شوٹ ہوتی ہے تو میں مصروف ہوتا ہوں اور جب شوٹ نہیں ہوتی تو پھر زیادہ وقت گھر پر ہی اپنے بچوں کے ساتھ گزارتا ہوں۔ مجھے بچوں کے ساتھ وقت گزارنا اچھا لگتا ہے۔"

"گھر کا بجٹ کون بناتا ہے؟"

"برابر بجٹ تو نہیں بنتا کہ بس اتنا ہی خرچ کرنا ہوتا ہے جو ضروری ہوتا ہے، اس پہ خرچ ضرور کرتے ہیں۔ کبھی کنجوسی نہیں کی۔ بندہ کماتا کس لیے ہے۔"

"خرچ ففٹی ففٹی ہوتا ہے کیا؟ کیونکہ ندا بھی تو کماتی ہیں؟"

"ارے نہیں..... گھر کا سارا خرچ میں ہی کرتا ہوں۔ ندا جو کماتی ہے اپنے شوق کی خاطر اور مصروفیت کی وجہ سے کہ وہ مصروف رہے۔ وہ اگر کچھ خرچ کرتی ہے تو اپنی مرضی سے کرتی ہے، میں فورس نہیں کرتا۔ گھر میں بجلی پانی سے لے کر ہر طرح کا خرچ میری ذمہ داری ہے۔ کیونکہ بیوی، بچوں کا خیال رکھنا بھی میری ذمہ داری ہے۔"

"آپ پوچھتے تو ہوں گے کہ کتنا جمع کر لیا؟"

"ہاہاہا..... ارے نہیں..... نہ میں نے کبھی پوچھا، نہ اس نے کبھی مجھے بتایا۔ ہاں میں اپنی ہر بات اس سے شیئر کرتا ہوں۔ اسے آپ میری بے وقوفی کہہ لیں یا میرا اعتماد۔"

"منہ دکھائی میں کیا دیا تھا آپ نے؟ سالگرہ مناتے ہیں؟"

"سونے کے کنگن دیے تھے اور یہ سالگرہ منانا نہ تو مجھے بہت پسند ہے اور نہ ہی مجھے یاد رہتی ہے۔ بس ندا کو اچھا لگتا ہے سالگرہ منانا اور پھر اہتمام بھی وہی کرتی ہے۔"

"اچھی زندگی گزارنے کے لیے پیسہ کتنا ضروری ہے اور محبت کتنی ضروری ہے؟"

"میرے خیال سے اچھی زندگی گزارنے کے لیے پیسہ اور محبت دونوں ہی بہت ضروری ہیں۔ پیسہ تو خیر بہت ہی ضروری ہے۔ کیونکہ اگر پیسہ نہ ہو تو محبت بھی ماند پڑ جاتی ہے۔ محبت سے پیٹ نہیں بھرا جا سکتا۔ یہی حقیقت ہے دنیا کی۔"

"کبھی دوسری شادی کا خیال آیا؟ کیونکہ اسلام بھی

اس کی اجازت دیتا ہے اور پھر آپ شوبز سے بھی تعلق رکھتے ہیں؟"

"دوسری شادی؟ نہیں، نہیں..... کبھی خیال نہیں آیا۔ اسلام اجازت دیتا ہے مگر کن کنڈیشن کے تحت، یہ بھی آپ سب کو پتا ہے اور شوبز سے تعلق ہے، مگر یہ ضروری نہیں کہ جو شوبز میں ہو، وہ شادیاں بھی دو کرے۔ پھر ہماری فیملی میں بھی کسی نے دوسری شادی نہیں کی۔ میرے والد نے بھی ایک شادی کی، میرے کزن نے بھی اور میرے تایا نے بھی ایک ہی شادی کی۔ میں تو کبھی سوچ بھی نہیں سکتا دوسری شادی کے بارے میں۔"

"بچوں پر بھی اچھا اثر نہیں پڑتا اور وہ ڈسٹرب بھی بہت ہوتے ہیں۔"

"جی بالکل..... ہماری زندگی ماشاء اللہ بہت اچھی گزر رہی ہے۔ ایسی لائف میں تو کوئی بے وقوف ہی ہو گا جو دوسری شادی کے بارے میں سوچے گا۔"

"اللہ تعالیٰ آپ کی فیملی کو ہمیشہ اسی طرح خوش و خرم رکھے۔ آمین۔"

"ندا یاسر"

"جی ندا! کیا حال ہیں..... کیا کہتی ہیں آپ اپنی ازدواجی لائف کے بارے میں؟"

"جی حال ٹھیک ٹھاک ہے اور ماشاء اللہ بہت اچھی زندگی گزر رہی ہے۔ آپ تو دیکھ ہی رہی ہیں کہ اللہ کا کتنا کرم ہے ہم پر۔"

مارننگ شو پہ تو ایک علیحدہ سے ہی آپ کا انٹرویو کروں گی۔ آج تو آپ کا بندھن دیکھنا ہے کہ یاسر کے ساتھ کتنا مضبوط ہے۔

"یہ بتائیے شادی کے بعد زندگی کو کیسا پایا۔ کون کس کا خیال زیادہ رکھتا ہے؟"

"شادی کے بعد الحمد للہ زندگی کو بہت خوب صورت پایا ہے اور ہم دونوں ہی ایک دوسرے کا خیال رکھتے ہیں اور یہ ہم دونوں کی ذمہ داری ہے کہ نہ صرف ایک دوسرے کا خیال رکھیں بلکہ اپنے بچوں کی ذمہ داری کو بھی احسن طریقے سے نبھائیں۔"

"گھر میں کس کا رعب ہے؟"

"یاسر کا رعب ہے۔ کچھ کچھ میرا بھی ہے، یاسر پر میرا رعب نہیں ہے لیکن بچوں پر میرا رعب ہے۔ یاسر میں یہ خوبی ہے کہ ہر کام میں مجھ سے مشورہ ضرور لیتے ہیں، اور بات ہے کہ فیصلہ اپنی مرضی سے کرتے ہیں۔"

"یاسر کی کوئی خوبی..... جھگڑا کرتے ہیں۔"

"بہت سی خوبیاں ہیں، سب سے بڑی بات تو یہ کہ یاسر میں کسی بات کا نخرا نہیں ہے کہ یہ کھانا ہے یا وہ کھانا ہے۔ بہت اچھا مزاج ہے ان کا اور جھگڑا کس میاں بیوی میں نہیں ہوتا..... یہ تو مانی ہوئی بات ہے کہ جہاں پیار ہو گا وہاں لڑائی بھی ہو گی۔ مگر اللہ کا شکر ہے کہ سنگین قسم کی لڑائی نہیں ہوتی۔"

"یاسر نے ڈائریکٹ رشتہ بھیجا تھا یا اظہار محبت بھی کیا تھا؟"

"پہلے اظہار محبت کیا تھا پھر اپنے والدین کو بھیجا تھا ..... یاسر نے کہا تھا کہ "تم مجھے اچھی لگتی ہو اور میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔"

"کیا کیفیت تھی؟..... غصہ آیا یا خوشی ہوئی؟"

"یاسر سے ملاقات تو اکثر ہوتی تھی لیکن کبھی ایسا سوچا نہیں تھا۔ اچانک اس جملے نے مجھے بوکھلا دیا۔ میں نے کوئی جواب نہیں دیا اور پھر گھر آ کر امی کو بتایا۔ میری امی ہمارے لیے دوستوں کی طرح ہیں۔ امی کو یاسر ہمیشہ سے ہی بہت اچھے لگتے ہیں اور ابو کو بھی..... پھر یاسر کے والد رشتہ لے کر آئے جو کہ تھوڑی سی رسمی کارروائیوں کے بعد قبول کر لیا گیا۔"

"اور پھر منگنی ہوئی باقاعدہ طور پر؟"

"جی بالکل..... کافی دھوم دھام سے ہماری منگنی ہوئی اور نہ صرف شوبز کے لوگوں نے بلکہ دیگر لوگوں نے بھی بھرپور طریقے سے شرکت کی۔ بہت یادگار منگنی تھی ہماری۔ بہت اچھا لگا تھا۔"

"یہ سوال میں سب سے کرتی ہوں کہ اسلام میں چار شادیوں کی اجازت ہے۔ اگر کبھی یاسر کا دل دوسری شادی کو چاہا تو؟"

ہنستے ہوئے "سچ بتاؤں یاسر ایسا کبھی کر ہی نہیں سکتے کیونکہ یاسر کو مجھ سے اور اپنے بچوں سے بہت محبت ہے اور دوسری شادی کے بارے میں وہ ہی لوگ سوچتے ہیں جنہیں گھر میں سکون نہیں ملتا..... ہماری گھریلو لائف بہت پر سکون ہے۔"

"آپ اردو اسپیکنگ اور یاسر سندھی..... کوئی مسئلہ تو نہیں ہوا؟"

"ارے نہیں۔ ایسا کوئی مسئلہ نہیں ہے یہ تو آپس میں لڑوانے والے لوگوں کی سوچ ہے ورنہ ہم تو سب زبان والے بہت پیار محبت سے رہتے ہیں۔"

"میرا مطلب تھا کہ سندھی بولنے میں کوئی دشواری ہوئی۔"

"نہیں بالکل نہیں۔ کیونکہ مجھے سندھی بولنے کی ضرورت ہی پیش نہیں آتی..... گھر میں سب ہی اردو بولتے ہیں۔ ویسے سندھی سمجھ لیتی ہوں اور تھوڑی بہت بول بھی لیتی ہوں۔"

"سسرال میں کون سا رشتہ بہت اچھا لگا؟"

"سسرال کے سارے رشتے بہت اچھے لگے۔ سسرال والوں نے مجھے بہت عزت دی ہے۔ میں اپنے آپ کو بہت خوش قسمت سمجھتی ہوں کہ میں اس گھرانے کی بہو ہوں۔"

"مصروفیات کی وجہ سے گھر متاثر ہوتا ہے کیا؟ گھریلو ذمہ داریاں کون پوری کرتا ہے؟"

"نہیں، ایسا نہیں ہے۔ جب سے مارننگ شو شروع کیا ہے اور اداکاری چھوڑی ہے گھر کو زیادہ وقت دیتی ہوں۔ گھریلو ذمہ داریوں کو ہم دونوں ہی پورا کرتے ہیں۔ ویسے گھر کے کام کاج اور کھانا پکانے کے لیے کک اور ماسیاں ہیں۔ کبھی کبھی خود بھی کوکنگ کر لیتی ہوں۔"

"اور یاسر! آپ کچھ کہنا چاہیں گے؟"

"میرے والدین نے ایک بات کہی تھی کہ شوبز کی دنیا چمکتی دمکتی دنیا ہے۔ انسان بھٹک بھی سکتا ہے۔ مزہ تو تب ہے کہ گندگی میں رہ کر خود کو بچا کر چلیں۔ شوبز میں گندگی تو نہیں ہے مگر بھٹکنے کے لیے بہت کچھ ہے، اللہ سب کو بچائے رکھے۔ (آمین)"

دستک دستک دستک

شاہین رشید

حوریہ فہیم

"کیسی ہیں حوریہ صاحبہ؟"

"جی الحمد اللہ ٹھیک ٹھاک۔"

"کیا ہو رہا ہے آج کل؟"

"آپ کو پتا ہی ہے ربیع الاول کا مہینہ ہے تو اس میں مصروفیات بہت زیادہ ہو جاتی ہیں۔"

"بچپن سے خواب تھا آپ کا کہ نعت خواں بننا ہے جبکہ آج کل کی لڑکیاں تو اس کو ایکسٹرا کوالٹی سمجھ کر کسی اور فیلڈ میں جاتی ہیں؟"

"بالکل ٹھیک کہا۔۔۔ مگر چونکہ میں بچپن سے ہی نعتیں پڑھ رہی ہوں تو پھر کسی اور فیلڈ میں جانے کا میں نے سوچا ہی نہیں۔ اسلامک اسٹیڈیز میں گریجویشن کیا اور پھر اپنی ساری توجہ نعت خوانی پر لگا دی۔"

"پروفیشن ہے یا شوق؟"

"یہ میرا شوق ہے۔ پروفیشن تو وہ ہوتا ہے کہ جس کی آپ قیمت وصول کرتے ہیں، مگر میں ایسی کوئی ڈیمانڈ نہیں کرتی۔ جو خوشی سے ہدیہ دے دے، وہ قبول کر لیتی ہوں۔ اللہ کے کلام کی خدانخواستہ کیا قیمت لگانی۔"

"جو ایسا کرتے ہیں، کیا وہ برا کرتے ہیں؟"

"میرا تو یہی خیال ہے۔۔۔ مگر سب کی اپنی اپنی سوچ ہوتی ہے۔ لوگ کیا کرتے ہیں مجھے اس سے کوئی غرض نہیں ہے۔"

"نعتیں پڑھنے کی طرف رجحان کیسے ہوا؟"

"اصل میں ہمارا گھرانہ بہت مذہبی ہے۔ جب میں چھوٹی تھی تو اکثر امی کے اور نانی کے ساتھ میلاد کی محفلوں میں چلی جایا کرتی تھی۔ پھر میری نانی کے گھر ہر ماہ محفل نعت، محفل میلاد کا اہتمام ہوتا تھا تو مجھے یہ سب دیکھ کر بہت اچھا لگتا تھا اور میرا دل چاہتا تھا کہ میں بھی پڑھوں۔ حوصلہ افزائی ملتی گئی اور میں آگے بڑھتی گئی۔"
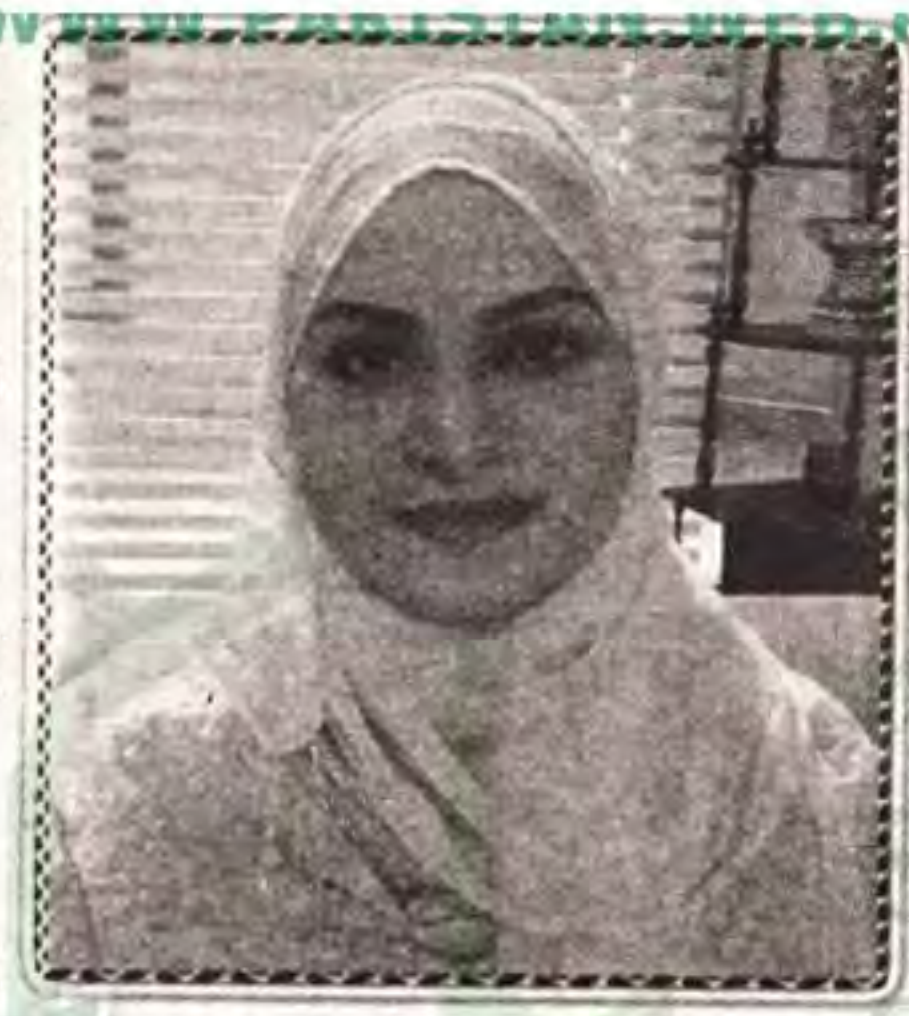
"گھر میں سب سے زیادہ حوصلہ افزائی کس نے کی؟"

"ماں باپ تو حوصلہ افزائی کرتے ہی ہیں لیکن ان کے تعلق سے اگر کوئی دوسرا بھی حوصلہ افزائی کرے تو بہت خوشی ہوتی ہے۔ میرے نانا نانی اور میرے ماموں نے میری بہت حوصلہ افزائی کی اور مجھے ریڈیو ٹی وی تک لانے میں میرے ماموں نے ہی اہم کردار ادا کیا۔"

"ریڈیو ٹی وی کی بات چلی ہے تو بتائیں کہ ریڈیو پہ نعتیں پڑھنا زیادہ اچھا لگتا ہے یا پھر ٹی وی پر۔ اور کیوں؟"

"ریڈیو پہ میں نے بہت کم پڑھا ہے۔ البتہ ٹی وی میڈیا کے لیے زیادہ پڑھا ہے اور اس کی کوئی خاص وجہ نہیں۔ کیونکہ ٹی وی پہ محفل میلاد کا انعقاد اکثر ہوتا ہے پھر الگ سے نعتیں ریکارڈ کروانے کی آفرز بھی ہوتی ہیں تو اس طرح ٹی وی کے لیے زیادہ موقع مل گیا۔ ورنہ اور تو کوئی بات نہیں ہے۔"

"گھر ڈسٹرب ہوتا ہے؟"

"نہیں اللہ کا شکر ہے ایسا کچھ نہیں۔ میرے شوہر بہت کوآپریٹو ہیں۔ میری بہت حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ مجھے دیر سویر ہو جائے تو کچھ نہیں کہتے۔ ان کی وجہ سے مجھے اپنی صلاحیتیں کھل کر دکھانے کا موقع ملا ہے۔ ہماری ایک بیٹی بھی ہے۔"

"بیٹی کو بھی اس طرف لائیں گی؟"

"دیکھیں، وقت سے پہلے کیا کہہ سکتی ہوں۔ جس طرف اس کا رجحان ہوگا وہ ادھر ہی جائے گی۔"

"اور اگر میوزک کی طرف رجحان ہو گیا تو۔"

"تو پھر دیکھیں گے کہ کیا کرنا ہے۔ ویسے میرا نہیں خیال کہ ایسا کچھ ہوگا، کیونکہ گھر کے ماحول کا بہت اثر ہوتا ہے بچوں پر۔ جیسے مجھ پر میرے گھر کے ماحول کا اتنا اثر ہوا کہ میں بھی صرف نعت خوانی کی طرف ہی آئی۔"

"آواز اچھی ہے۔ کبھی میوزک میں کچھ کرنے کو دل چاہا؟"

"نہیں بالکل نہیں۔ آپ یقین کریں کہ مجھے بہت آفرز آئیں گلوکاری کے لیے مگر میں نے انکار کر دیا۔

کیونکہ میرا اس طرف رجحان ہی نہیں ہے۔ جب چھوٹی تھی تو پھر بھی گانے وغیرہ سن لیا کرتی تھی مگر بڑے ہونے کے بعد اب تو بالکل بھی دل نہیں چاہتا میرا گانے وغیرہ سننے کو۔"

"کسی چینل سے بھی وابستہ ہیں آپ؟"

"جی جی بالکل۔ میں "Q" ٹی وی کے لیے پروگرام کرتی ہوں۔ اور رمضان المبارک میں ہوسٹنگ بھی کر چکی ہوں۔ زیادہ تر پروگرام لائیو ہوتے ہیں۔ لائیو پروگرام کرنے کا اپنا ہی مزا ہے۔"

"اور کیا مشاغل ہیں گھرداری وغیرہ؟"

"کچھ خاص نہیں۔ چونکہ جوائنٹ فیملی ہے تو گھر داری کی ابھی اتنی ذمہ داریاں نہیں ہیں۔ ویسے مجھے کھانا پکانا اچھا لگتا ہے اور جب مجھے ٹائم ملتا ہے پکا بھی لیتی ہوں۔ اللہ کا شکر ہے کہ ماں نے مجھے ہر ہنر سے آراستہ کیا ہوا ہے۔"

☼ ☼ ☼

عینی جعفری

"کیسی ہو؟"

"جی اللہ کا شکر ہے۔"

"کیا ہو رہا ہے آج کل؟"

"جو ہو رہا ہے آپ اسکرین پر دیکھ ہی رہی ہیں۔"

"بالکل دیکھ رہی ہوں۔ اسیر زادی اور مجازی خدا۔"

"جی جی۔ آپ بتائیں آپ کو دونوں سیریلز کیسے لگ رہے ہیں؟"

"بہت اچھے ہیں۔ کہانی کے لحاظ سے بھی اور تمہاری پرفارمنس کے حساب سے بھی، تمہیں کیا رسپانس مل رہا ہے؟"

"جی بہت اچھا۔ سب تعریف کررہے ہیں میری پرفارمنس کی اور مجھے خود بھی بہت مزا آیا ان دونوں سیریلز کو کرکے۔ مجھے انتظار تھا اس بات کا کہ لوگوں کا کیا رسپانس آتا ہے اور مجھے خوشی ہے کہ سب نے پسند کیا۔"

"کیا بات ہے کہ تمہارے سیریلز آتے ہیں تو ایک ساتھ آتے ہیں اور غائب ہوتی ہو تو ایک دم سے ہوجاتی ہو؟"

"بس جی اتفاق ہے کہ کبھی کبھی سیریلز ایک ساتھ آن ایر ہوجاتے ہیں اور کبھی لمبا گیپ آجاتا ہے۔ "اسیر زادی" اور "مجازی خدا" دونوں الگ الگ پروڈکشن ہاؤس کے ہیں۔ سب کی اپنی مرضی ہوتی ہے ورنہ میرا دل چاہتا ہے کہ ایک وقت میں میرا ایک ہی سیریل آن ایر ہو۔ اور میں کوئی سیریل سائن کرتے وقت اس بات کا بہت خیال رکھتی ہوں کہ ایک وقت میں ایک ہی سیریل سائن کروں۔"

"کیوں؟"

"اس لیے کہ میں ہر وقت اسکرین پہ رہ کر اپنی ویلیو کم کرنا نہیں چاہتی لوگ یہ نہ کہیں کہ اسے اور کوئی کام ہی نہیں ہے۔ میری خواہش ہے کہ لوگ کہیں اس سیریل میں عینی جعفری ہے تو یقیناً کوئی اچھا سیریل ہی ہوگا۔"

"ہوں۔ اور کیا چل رہا ہے آج کل؟"

"بس کمرشل ماڈلنگ چل رہی ہے، کبھی کبھار فیشن میگزین کے لیے ماڈلنگ کرلیتی ہوں۔ کمرشلز کا کافی کام ہوتا ہے میرا۔"

"اس فیلڈ میں کہاں تک جانا ہے؟"

"میں پلاننگ سے نہیں چلتی۔ کیونکہ سب سے بڑا پلانر تو اللہ تعالیٰ ہے۔ جو میری قسمت میں ہوگا، میں کرتی جاؤں گی۔"

"تم بچپن سے اس فیلڈ میں ہوں۔ تھیٹر سے تم نے آغاز کیا۔ پھر ٹی وی ڈراموں میں دیر سے کیوں آئیں؟"

"جی میں بچپن سے اس فیلڈ میں ہوں اور چونکہ بچپن سے ہی شوق تھا اس فیلڈ میں آنے کا تو سب سے پہلے تھیٹر جوائن کیا۔ کیونکہ تھیٹر میں وقت ضائع نہیں ہوتا۔ مطلب زیادہ وقت نہیں لگتا ڈراموں کی ریکارڈنگ میں کافی ٹائم لگ جاتا ہے۔ اور پھر اس سے پہلے اجازت بھی نہیں تھی۔"

"کیوں؟"

"کیونکہ میرے والدین کا کہنا تھا کہ پہلے اپنی تعلیم مکمل کرو پھر اس فیلڈ میں آنے کا نام لینا۔ سو میں نے ایسا ہی کیا۔"

"اور پھر جب اجازت ملی تو کون سا کردار کرنے کی خواہش ہوئی؟"

"اس وقت تو ایسی کوئی خواہش نہیں تھی۔ اس وقت تو بس فیلڈ میں آنے کی خوشی تھی۔ میرا پہلا ڈراما "ڈریمر" تھا۔ لوگوں نے بہت پسند کیا تھا۔ اب چونکہ کافی کام کرچکی ہوں تو اب دل چاہتا ہے کہ "فیری ٹیل" کروں اور ہارر رول کرنے کی بھی خواہش ہے۔ اب تو بہت کچھ کرنا چاہتی ہوں۔"

"مارننگ شو کیسے لگتے ہیں؟"

"کچھ خاص نہیں اور اسی لیے میں آپ کو مارننگ شو میں نظر بھی نہیں آتی۔ ہاں کبھی کسی نئی سیریل کا تعارف ہو جس میں میں بھی کام کررہی ہوں تو پھر میں آجاتی ہوں، ورنہ نہیں۔"

"اپنی اداکاری کیسی لگتی ہے؟"

"اچھی لگتی ہے۔ بہت غور سے اپنی اداکاری دیکھتی ہوں اور جہاں محسوس کرتی ہوں کہ یہ سین اچھا نہیں ہوا تو پھر کوشش کرتی ہوں کہ آئندہ ایسی غلطی نہ ہو۔"

"فارغ اوقات میں کیا کرتی ہو؟"

"اب تو فارغ وقت ملتا ہی نہیں ہے۔ پھر بھی اگر ٹائم مل جائے تو فلمیں دیکھتی ہوں۔ مجھے اردو انگریزی

اور انڈین فلمیں دیکھنے کا شوق ہے۔"

"کام کرنے کا بھی شوق ہے؟"

"بالکل ہے مگر صرف اور صرف پاکستانی فلموں میں، جو اچھے ڈائریکٹر بنائیں۔ انڈین اور ہالی ووڈ میں تو کام کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کیونکہ ان کے سین، ان کے ڈریسز وغیرہ سے میں دور بھاگتی ہوں۔ بھئی شرم و حیا بھی تو کوئی چیز ہوتی ہے۔"

سنبل اقبال

"کیسی ہو؟"

"جی اللہ کا شکر ہے۔"

"رخسار" تو اچھا جارہا ہے۔ کیا رسپانس مل رہا ہے؟"

"اچھا رسپانس مل رہے، لوگ پسند کررہے ہیں۔"

"اسٹوری کچھ پرانی نہیں ہے؟"

"کہانیاں تو پرانی ہی ہوتی ہیں مگر پیش کرنے والے کا کمال ہے کہ اس کو نئے انداز میں پیش کرے۔ اس سیریل کے ڈائریکٹر نے اس پرانی کہانی کو بڑا نئے اور اچھوتے انداز میں پیش کیا ہے۔"

"تمہارا سیریل "تیری بے رخی" بھی بہت اچھا گیا۔ کچھ زیادہ ہی تم کو رحم دل اور صلح پسند دکھایا گیا تھا۔ کیا حقیقت میں ایسا ہوتا ہے؟"

"بالکل ہوتا ہے۔ جو لڑکیاں غریب گھرانے میں اور خصوصاً "سوتیلی ماں کے سائے میں پروان چڑھتی ہیں۔ انہیں اپنے شوہر کے گھر کی بڑی قدر ہوتی ہے اور وہ سوچ کر جاتی ہیں کہ بس ہمیں تو اپنا گھر بنانا ہے اور رشتوں کو مضبوط کرنا ہے۔"

"مگر زیادہ پیسہ دیکھ کر لڑکیاں آپے سے باہر بھی تو ہوجاتی ہیں؟"

"ہاں۔ ایسا بھی ہوتا ہے لیکن میں سسرال (ڈرامے میں) جاتی ہوں تو مجھے وہاں شوہر کی ہمدردی اور میری پھوپھو کا پیار ملتا ہے جو سمجھاتی ہیں کہ تمہیں یہاں پر چیلنج کا مقابلہ کرنا ہے اور ہر حالت میں اپنا گھر بنانا ہے۔

سو میں نے ایسا ہی کیا۔"

"دیکھتے ہیں کہ اب رخسار میں "احمر" کا دل کس طرح جیتتی ہو۔"

"بالکل آپ دیکھیے گا۔ آپ کو سیریل بہت پسند آئے گا۔ ابھی تو اس کی چند ہی اقساط ہوئی ہیں۔"

"کتنے بہن بھائی ہیں آپ۔ اور گھر میں کسی اور کو بھی شوق ہے اس فیلڈ میں آنے کا؟"

"ہم دو ہی بہنیں ہیں اور صرف میں ہی ہوں اس فیلڈ میں۔ میری چھوٹی بہن کو نہیں ہے شوق۔ جبکہ وہ پیاری بھی ہے اور باصلاحیت بھی ہے۔"

"تم نے کہا نہیں کہ آجاؤ میرے ساتھ، دونوں مل کر کام کریں گے۔ ویسے بھی آج کل دو بہنوں پر خوب ڈرامے بن رہے ہیں؟"

قہقہہ۔ "ڈراموں میں جیسی دو بہنیں دکھائی جاتی ہیں ہم ویسی بہنیں نہیں ہیں۔ ہمارا آپس میں بہت پیار ہے۔ ڈراموں میں دکھائی جانے والی بہنوں کی تعداد ویسے بھی میرے خیال میں بہت کم ہیں اس معاشرے میں۔ کیا خیال ہے آپ کا۔"

"ہاں تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ بھائی بھائی کو لڑتے دیکھا ہے مگر بہنوں کو نہیں؟ تم نے ایک بار کہا تھا کہ میں گیٹ اپ والے رول کرنا چاہتی ہوں۔ کیوں؟"

"جی کہا تھا اور وہ اس لیے کہ لوگ مجھے پہچان نہ پائیں اور جب لوگ ایک دوسرے سے پوچھیں کہ اتنا اچھا رول کس نے کیا اور جواباً "جب میرا نام لیا جائے تو لوگ بے ساختہ کہیں کہ اچھا! اتنا اچھا رول سنبل نے کیا ہے۔ ہم تو پہچان ہی نہیں سکے۔"

"کبھی اس روٹین ورک سے دل گھبرایا؟"

"نہیں دل تو نہیں گھبرایا۔ بس کبھی کبھی آرام کرنے کو بہت دل چاہتا ہے۔"

"اچھا چلو تو پھر تم آرام کرو۔"

شادیٔ مبارک ہو

عروبہ ہمراہ فرحان احمد

سعدیہ رئیس

اللہ کے فضل سے اب تک بہت سی کہانیاں اور افسانے بہت آسانی سے لکھتی آئی ہوں مگر آج جب اپنی بیٹی کی شادی کا احوال لکھنے کے لیے قلم اٹھایا تو قلم تھم سا گیا۔ جیسے اس کی رخصتی پر میرا دل تھم سا رہا تھا۔

خوشی اور غم کے اس حسین امتزاج کو لفظوں کا روپ دینے سے خود کو قاصر پا رہی ہوں۔ ہاں اتنا کہوں گی کہ اللہ کے شکر سے میری ننھی پری اپنے گھر کو چلی۔

کل کی سی بات لگتی ہے کہ جب میں اسے نت نئی فراکیں پہنا کر خوش ہوتی تھی اور وہ میری انگلی پکڑ کر چلا کرتی تھی۔ انگلش اردو کی بے شمار پوئمز کبھی دو پونیاں بنائے اور کبھی بالوں میں ہیئر بینڈ سجائے جھوم جھوم کے پڑھا کرتی تھی اور آج وہ اتنی بڑی ہوگئی کہ دلہن بن کر پیا دیس سدھار گئی۔

14 دسمبر 2013 کو میری پیاری بیٹی عروبہ رئیس کی رخصتی فرحان احمد کے ساتھ انجام پائی، مجھے تو اس وقت بھی یہ محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے عروبہ بہت چھوٹی سی ہے۔ میری آغوش میں ابھی تک اس کا بچپن کلبلا رہا ہے۔ جب وہ دلہن بن کر آئی تو اس قدر پیاری لگ رہی تھی جیسے بچپن میں تیار ہو کر گڑیا سی لگا کرتی تھی۔ سرخ زرتار جوڑے میں اس پر بے حد روپ آیا تھا۔ اس موقع پر مجھے اپنی والدہ کی کمی بے حد محسوس ہوئی، جو عروبہ سے بے حد پیار کرتی تھیں۔ ان کے حصے کا پیار بھی عروبہ کو اس کے نانا نے دے دیا۔

بہت سے پیار کرنے والے مخلص لوگ اس کی شادی میں شریک ہوئے اور دعاؤں کے ساتھ اسے رخصت کیا۔ خصوصی طور پر امتل کی شرکت نے بے پناہ خوشی دی۔ میرے مان کو بڑھایا۔

شادی کا ہنگامہ بہت دن سے جاری تھا۔ تیاری بھی جوش و خروش سے ہو رہی تھی۔ اس کے ساتھ ہی عروبہ کے تینوں بھائی محمد سفیر، محمد طحہ اور محمد مصعب بھی اپنی اپنی تیاریوں میں مصروف تھے۔ جی ہاں، آپ لوگ صحیح سمجھے، میری عروبہ اکلوتی ہے۔ اس کی کوئی بہن نہیں ہے تو ہر موقع پر میں ہی اس کی بہن، سہیلی اور ماں کا کردار ادا کرتی ہوں۔ اس کے بھائیوں نے عروبہ کو تنگ کرنے کا کوئی موقعہ نہیں چھوڑا بقول محمد سفیر کہ "جتنا تنگ کرنا ہے ابھی کر لو پھر تو یہ ہمارے ہاتھ نہیں لگے گی۔" ہنسی مذاق اور شرارتوں کے ساتھ گزرنے والے اس وقت کے پیچھے جدائی کا وہ عکس تھا، جو کچھ دنوں میں حقیقت بننے والا تھا۔

عروبہ کی مایوں ہم نے سادگی سے کی۔ زرد رنگ کے بنارسی جارجٹ کے سوٹ میں وہ بہت معصوم اور سادہ لگ رہی تھی۔ قریبی عزیزوں کی شرکت نے محفل کی خوب رونق بڑھائی۔ عروبہ کی سہیلیوں اور کزنز نے گانے گا کر صحیح معنوں میں محفل کو چار چاند لگا دیے۔ مزید مزا چکن تکہ، پوری ترکاری اور گلاب جامن کھا کر آگیا۔

یہاں ایک مزے کی بات آپ سب کے ساتھ شیئر کروں گی کہ میری بیٹی نے پانچویں کلاس تک جس اسکول میں پڑھا تھا، گھر شفٹ کیا تو وہ اسکول اور اس کی ساری فرینڈز بھی چھوٹ گئیں۔ آپس میں کسی قسم کا رابطہ بھی نہ رہا جس کا اسے از حد افسوس تھا۔ وہ اکثر ہی اپنی فرینڈز کو یاد کرتی تھی۔ اتفاق سے ایک روز نیٹ پر اسے اپنی ایک سہیلی مل گئی اور یوں بچھڑی سہیلیوں کی پوری ڈار ایک بار پھر عروبہ کی شادی پر جمع ہوگئی۔ ان سب نے برسوں بعد عروبہ کی شادی پر اس سے ملاقات کی۔ ہے نا دلچسپ بات!

اس کے علاوہ اس کی قریبی دوست شہرین، فرحین، ثانیہ، حنا اور مائدہ اسریٰ وغیرہ نے بھی شادی میں شرکت کی۔

شکر ہے کہ شادی میں اتنی زیادہ سردی نہ تھی۔ لہٰذا شادی کا فنکشن بہت سہولت سے خوش گوار انداز میں انجام پایا۔ تقریب بہت پر رونق رہی۔ سب نے عروبہ کی تعریف کی۔ زیادہ تر لوگوں کا یہ کہنا تھا کہ۔

"عروبہ تو دوسری سعدیہ لگ رہی ہے۔"

کچھ لوگ تو ویسے ہی اسے "لٹل سعدیہ" کہا کرتے تھے۔

اس روز دلہن کے ساتھ دلہن کی امی بھی تعریفیں وصول کر رہی تھیں۔ حالانکہ گزرتے دنوں کے ساتھ اب ایسا لگنے لگا تھا جیسے عمر کی شام ڈھلتی جا رہی ہے مگر یہ ان سب کا پیار اور محبت ہے کہ میں اب بھی انہیں ویسی ہی دکھائی دیتی ہوں جیسی پہلے تھی۔ میں سب کی محبتوں کی بے حد مشکور ہوں۔ 14 دسمبر کی رات میری لختِ جگر میری پیاری بیٹی فرحان احمد کے ساتھ وداع ہوگئی۔

ولیمہ والے روز بھی وہ سی گرین اور مرجنڈا کلر کے لہنگے میں بے حد پیاری لگ رہی تھی اور اسٹیج پر دلہن بنی بیٹھی مزے سے اپنی فرینڈز سے باتیں کر رہی تھی۔ اب نہ اس کے چہرے پر اداسی تھی اور نہ میرا دل اداس تھا بلکہ اسے خوش دیکھ کر میرا اپنا دل شاد ہو رہا تھا۔

میری دعا ہے کہ عروبہ اور فرحان کی جوڑی سلامت رہے اور نظرِ بد سے محفوظ رہے۔ (آمین)

آپ بھی دعاؤں میں یاد رکھیے گا اور آخر میں مزید ایک دعا ہے کہ "خدا ہر لڑکی کا نصیب سنوارے اور اسے اپنے گھر میں خوش اور آباد رکھے۔" (آمین)

خط بھجوانے کے لیے پتا
ماہنامہ شعاع - 37 - اردو بازار، کراچی۔

Email: info@khawateendigest.com
shuaamonthly@yahoo.com

آپ کے خط اور ان کے جوابات کے ساتھ حاضر ہیں۔

آپ کی عافیت، سلامتی اور خوشیوں کے لیے دعائیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو، ہم کو اور ہمارے پیارے وطن کو اپنے حفظ و امان میں رکھے۔ آمین۔

پہلا خط بلال کالونی ملتان سے حرا قریشی کا ہے، لکھتی ہیں

پہلی شعاع پڑھی۔ "خوشیوں کا طلوع سحر، روشن خواب اور تعبیریں، نیک ارادے اور ان کی تکمیل" "پیارے نبی کی پیاری باتیں" "رب تعالیٰ کے نزدیک کرتی ہیں۔ "نیت کا ثواب، صدقے سے متعلق حقائق اور شرعی احکامات، شہید کون ہے؟ ہر بات سوچ کے نئے پہلو وا کرتی ہے۔ "پھر آگیا نیا سال" فرحین اظفر اور مسکان قریشی کے اسکول، کالج کی سدا بہار یادیں پڑھ کر ہمیں بھی طالب علمی کے سنہرے دن یاد آگئے۔ (کبھی ہم اساتذہ کو گلاب دیا کرتے تھے اور آج ہمارے طالب علم ہیں۔) قرۃ العین خرم کا انتخاب بھی مزہ دے گیا۔ اقصیٰ مریم نے "راحت جبیں" کی یادیں تازہ کردیں۔ بندھن میں بھی ملاقات خوب رہی۔ "لہو رنگ فلسطین" پر آمنہ زریں کا تبصرہ کمال تھا۔ ایک گھر کا حسن، ایک سجا ہوا دسترخوان سلمٰی اعوان کی یہ تحریر درحقیقت فلسطینیوں کے عکس کو نمایاں کرتی تیرگی میں سناٹوں کو چیر دینے والی روشنی محسوس ہوئی۔ راشدہ رفعت کی "بے جوڑ" کا جوڑ نہیں کوئی، پہلوئے حور میں ملیحہ صدیقی جی نے کیا خوب حور کا تصور دیا۔ ہدایت اللہ پر جی بھر کر ترس آیا۔ چائنیز دلہن! حق ہا!! حقیقت کو آشکار کرتی "طوبیٰ حسن" کی تحریر "تصوروار کون" نماز فجر کے لیے اٹھنا مسئلہ کشمیر نئی نسل کو لگتا ہے، اس مسئلے کو منکشف کرتی تحریر قانتہ رابعہ کی "رکاوٹ" "تہجد کا وقت رب سے رازداری میں ملاقات کا بہترین مصرف ہے۔ جیو قانتہ جی۔ صباحت یاسمین کی تحریر "عادی" پڑھ کر ثانی (دوست) کو بہت یاد کیا۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے کہ "کوئی تکیہ اتنا ملائم نہیں ہوتا، جتنا صاف ضمیر" امید کی جھلک دکھاتی عظمیٰ افتخار کی تحریر "محبت راز ہے ایسا!" جبران کے فٹ جوک نے شگفتہ قہقہہ بکھیرنے پر مجبور کردیا۔ اسماعیل میرٹھی کے شعر ڈائریکٹ دل پر لگے۔ "تم کہنے میں اپنائیت ہے۔ مگر زندگی میں کچھ لوگ آپ کو ایسے ملتے ہیں جن سے آپ اپنائیت سے زیادہ عزت کا رشتہ نبھاتے ہیں۔" عارفہ

رباب کی "زندگی سے یوں کھیلے" بھی اچھی لگی۔ غرور تو ویسے بھی متکبر کو پٹخ پٹخ کے مارتا ہے۔ مسکان قریشی کی چوائس پر حیرت ہوئی۔ (معذرت کے ساتھ.... شعر پرانا پرانا لگا) دستک دینے اور آئینہ خانے میں جانے کی زحمت محسوس نہیں کی۔ تاریخ کے جھروکوں میں "طولون" کو پڑھ کر حیرت انگیز انکشاف ہوا۔ آخر میں ایک بات "کیا ہم بھی کسی کتاب پر تفصیلی تبصرہ کرکے بھیج سکتے ہیں؟"

ج۔ جی حرا! آپ بھی کتاب پر تبصرہ بھیج سکتی ہیں، لیکن تبصرہ بھجوانے سے پہلے ہم سے کتاب کے بارے میں بات ضرور کرلیں اس سلسلے میں ہم صرف معیاری کتابوں پر تبصرہ کرتے ہیں۔ شعاع پر تفصیلی تبصرے کے لیے شکریہ۔

حرا! آپ اتنے خوب صورت الفاظ میں تبصرہ کرتی ہیں ہمیں لگتا ہے کہ آپ کہانیاں بھی لکھ سکتی ہیں۔ آپ کہانیوں کی طرف بھی توجہ دیں۔

صبا طارق نے تربیلہ غازی سے لکھا ہے

ٹائٹل کچھ خاص نہیں لگا نئے سال کے حوالے سے اور ہاں پلیز پلیز مجھے بتا دیجئے کہ سروے کے سوالات کہاں لکھے ہوتے ہیں۔ کیوں کہ ماہ دولت بھی سروے میں شرکت کرنا چاہتے ہیں۔ دسمبر کے شمارے میں مجھے سوالات نظر ہی نہیں آئے۔ "رقص بسمل" میں تو تجسس ہی پھیلا ہوا ہے۔ ایک تھی مثال کے اینڈ میں تو میں بھی عاصمہ کے ساتھ ساتھ دھک سے ہی رہ گئی۔ "زندگی سے یوں کھیلے" اچھا تھا۔ مگر شروع میں ہی معلوم ہوگیا تھا کہ آخر میں ابرار پر محبت کا اثر ہو جائے گا۔ اور ہاں اب جو دو باتیں اس شمارے کے متعلق نوٹ کی ہیں سب سے پہلے تو "محبت راز ہے ایسا" اسی قسم کی ایک کہانی شعاع ہی کے نومبر 2006ء کے شمارے میں شائع ہوئی تھی۔ اس کا نام "میری عید ہو تم" تھا اور اس کی رائٹر صائمہ اکرم چوہدری تھیں۔ اور پھر جیسے ہی میں نے "بے جوڑ" کو پڑھنا شروع کیا میرے دماغ میں کچھ کلک ہونے لگا۔ مجھے لگا میں نے اسی قسم کی کوئی کہانی پڑھ رکھی ہے۔ وہ کہانی شاید 2000ء کے کسی شمارے شاید جنوری میں شائع ہوئی تھی۔ مجھے اس کا نام بالکل بھی یاد نہیں آرہا۔ میں نے انٹرنیٹ پر بہت ڈھونڈنے کی کوشش کی مگر مجھے نہیں ملی۔ اس کو عمیرہ احمد نے لکھا تھا۔ وہ بھی ایسی ہی تھی۔

ہیروئن کا نام کومل تھا اور وہ اس جملے سے شروع ہوئی تھی۔ "اتنا سب کچھ ہونے کے بعد وہ آرام سے بیٹھی ہے۔ ہاتھ میں آئس کریم کا باؤل ہے اور وہ نہایت اطمینان سے آئس کریم کھا رہی ہے۔"

"بت شکن" پہ تبصرہ تب ہی کروں گی جب وہ مکمل ہوگا۔ "عشق دعا ہے" فنٹاسٹک۔ اس کو پڑھتے ہوئے دل کئی بار اوپر نیچے ہوا۔ پھیلا اور سکڑا پھر پھیلا اور سکڑا۔ مگر آخر میں ہیپی ہیپی اینڈنگ ہو ہی گئی۔ پلیز فواد خان کا انٹرویو شائع کردیجئے اور میری فرینڈ کی فرمائش ہے کہ عمران عباس کا انٹرویو شائع کیا جائے۔

ج۔ پیاری صبا! کہانیوں میں اس طرح کی مماثلت محض اتفاقی ہوتی ہے اگر آپ غور کریں تو تقریباً" ساری ہی کہانیوں میں کچھ نہ کچھ تو مشترک ہوتا ہی ہے "محبت راز ہے ایسا" کی کہانی جس موضوع پر لکھی گئی، وہ زندگی سے جڑا عام [illegible] گئی ہوں گی، لیکن کسی بھی تحریر کو منفرد اور مختلف رنگ مصنف کا انداز بیاں، اس کا مشاہدہ، مطالعہ دیتا ہے۔ ایک ہی موضوع پر اگر فرحت اشتیاق اور عنیزہ سید کہانیاں لکھیں تو باوجود مشترک موضوع کے وہ کہانیاں یکسر مختلف ہوں گی کیونکہ دونوں مصنفین کا اسٹائل انداز مختلف ہے۔

آپ کی فرمائش نوٹ کرلی گئی ہے، جلد پوری کرنے کی کوشش کریں گے۔ "لہو رنگ فلسطین" سنڈے میگزین میں شائع ہوچکا ہے۔ سمیرا حمید تک ہم نے آپ کی رائے پہنچادی ہے۔

مقدس اور صدف۔ لکھنوال کلاں ضلع گجرات سے شریک محفل ہیں، لکھا ہے

شعاع کو سب سے پہلے میں نے اپنے گھر ہی پایا۔ پہلے ہماری امی پڑھتی تھیں پھر میری بڑی بہن جو کہ اس وقت دارالرحم اسکول کے سویٹ بچوں کی کیوٹ سی ٹیچر ہے اور اب میں بھی پڑھتی ہوں۔

ٹائٹل بہت زبردست تھا۔ حمد و نعت تو ہوتی ہی زبردست ہے۔ پیارے نبی کی پیاری باتیں پڑھ کر دل کو سرور حاصل ہوا۔ دسمبر کے شمارے پر تبصرہ لیٹ رسالہ ملنے پر نہیں کرسکی، لیکن اب صائمہ اکرم جی کا شکریہ ادا کرتی ہوں کہ اتنا زبردست ناول لکھا۔ نبیلہ عزیز آپ ہر ماہ اتنا تھوڑا کیوں لکھتی ہیں کہ شعاع ہاتھ میں پکڑ کر پڑھنا شروع کیا اور باقی آئندہ۔ رخسانہ نگار جی آپ نے بشریٰ کے ساتھ تو برا کیا، لیکن پلیز مثال کے ساتھ ایسا نہ کیجئے گا۔ افسانوں میں "بے جوڑ" اچھا لگا۔ ملیحہ صدیقی "پہلوئے حور" کے یہ الفاظ دل و دماغ میں سرایت کرگئے ہیں "سب خاکی چیزیں ہیں۔ قبر کی مٹی رنگ روپ نہیں دیکھتی سب کھا جاتی ہے سب فانی ہے۔ بس اعمال رہ جاتے ہیں۔" لبنیٰ جدون نے کافی اچھا اینڈ کیا ہے۔

سمیع خان کا انٹرویو کریں۔

ج۔ مقدس اور صدف! شاہین رشید تک آپ کی فرمائش پہنچا رہے ہیں۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے تہہ دل سے شکریہ۔

آبرو ملک نے وعولہ سے لکھا ہے

ٹائٹل اچھا لگا پھر اڑ کر عشق دعا ہے پر پہنچے۔ لبنیٰ آپ

بہت زیادہ اچھا لکھتی ہیں۔ اللہ آپ کی لمبی عمر کرے اور آپ ایسے ہی پیاری پیاری کہانیاں لکھتی رہیں۔ مجھے لالئی کا کردار بہت زیادہ پسند آیا اور جب زیاد خان اور فاطمہ شاہ نے بھی لالئی پر شک کیا تو میں سچ میں رونے لگ پڑی تھی۔ محبت ہو تو ایسی جیسی فاطمہ بیگم کو عمر خان سے تھی۔ اور ہاں! شبیر کا مزاحیہ پن بہت مزے کا تھا۔ اس کے بعد ایک تھی مثال کی طرف گئے۔ رخسانہ جی! یہ اب عاصمہ کے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ رقص بسمل میں عزت کی دیوانگی بہت عروج پر جارہی ہے۔ پلیز! آفاق کی شادی کو طول نہ دیجیے گا۔ زندگی سے یوں کھیلے میں پھر وہی کھیل کھیلا گیا۔ لڑکی کو کھلونا کیوں سمجھتے ہیں۔ یہ مرد حضرات۔ "محبت راز ہے ایسا" بہت زیادہ اچھا تھا۔ مجھے تو ویسے بھی ایسے لوگ ہی پسند ہیں۔ اپنے ہر غم کو اپنے اندر چھپا کر۔ دوسروں کی خوشیاں ان کو دینا۔ بت شکن ابھی پڑھی نہیں۔ اگلے ماہ تبصرہ کروں گی۔ افسانہ رکاوٹ بہت زیادہ پسند آیا۔

ج۔ آبرو! شعاع کی بزم میں خوش آمدید۔ معذرت خواہ ہیں پچھلے ماہ آپ کا تبصرہ شامل نہ کرسکے۔ بہت اچھا تبصرہ کیا ہے آپ نے۔

شعاع آپ کو پسند آیا، تہہ دل سے شکریہ۔ امید ہے آئندہ بھی خط لکھ کر اپنی رائے کا اظہار کرتی رہیں گی۔

رضوانہ شکیل راؤ لودھراں سے لکھتی ہیں

یہ کیا؟ لیکن نئے سال کے سروے میں اپنا نام نہ دیکھ کر بہت مایوسی ہوئی۔ آخر مستقل قاری ہونے کے ناتے میرا اتنا حق تو بنتا ہے نا؟۔ خیر ٹائٹل اچھا تھا۔ بندھن میں کرن خان اور علی ناصر اچھے لگے۔ رقص بسمل نبیلہ عزیز کی اچھی کاوش ہے۔ "ایک تھی مثال" ست روی کا شکار ہے کہانی بہت تھوڑے صفحات پر مشتمل ہوتی ہے کہانی پڑھ کر کچھ تشنگی سی رہتی ہے۔ صباحت یاسمین کی "عادی" خوب صورت تحریر تھی اس میں الفاظ کی خوب صورتی، فقروں کی برجستگی اپنے عروج پر تھی۔ طبیعت کی ناسازی کی وجہ سے تفصیلی تبصرہ لکھنے سے قاصر ہوں۔

ج۔ پیاری رضوانہ! ہمیں احساس ہے کہ آپ ہماری نہ صرف مستقل قاری ہیں بلکہ ہمیں باقاعدگی سے خط بھی لکھتی ہیں۔ آپ کا سروے نہ شائع ہوسکا، اس کا ہمیں بھی افسوس ہے، لیکن اسے آپ ہماری مجبوری سمجھیں۔

شعاع کی قارئین کا ایک بہت بڑا حلقہ ہے اور ہمیں بڑی تعداد میں سروے کے جوابات موصول ہوئے تھے۔ محدود صفحات میں ان سب کو شائع کرنا ہمارے لیے ممکن نہیں تھا۔ اسی لیے آپ کا سروے شامل نہ کرسکے۔

شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ اللہ تعالیٰ آپ کو صحت و تندرستی عطا فرمائے۔ ہماری دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔

اقصیٰ بتول نے نیا لاہور سے شرکت کی ہے، لکھتی ہیں

سرورق بے حد خوب صورت لگا۔ حمد کے ساتھ ساتھ نعت نے بھی دل موہ لیا۔ قارئین کرام کا سروے پڑھا۔ سب نے بہت اچھا لکھا، مگر ثمینہ اکرام سب سے خوب صورت رہیں۔ نبیلہ عزیز سے بہت سارے قارئین کو شکوہ ہے کہ وہ ناول پہ دھیان نہیں دے پارہیں۔ ہمیں بھی یہی شکوہ ہے۔ "عشق دعا ہے" واہ لبنیٰ جی تجسس ہی تجسس، دھماکے ہی دھماکے، اتفاقات ہی اتفاقات مگر اچھا اینڈ کیا۔ سارے ناول کا حاصل دلچسپ فقرہ۔ عشق دعا ہے رد بلا ہے۔ امایہ خان بھی ٹاپ کلاس رائٹرز میں شامل ہونے جارہی ہیں۔ بے حد خوب صورت آغاز۔ خاص طور پر بارش کے منظر کی تصویر کشی نے تو روح ہی کھینچ لی۔ اپنا آپ بھی اسی بھیگی رات کا حصہ محسوس ہونے لگا، لیکن ہر کردار کسی نہ کسی دکھ میں مبتلا ہے۔ ایسا کیوں ہے بے چینی، سکون قلب کی کمی، ہر کوئی رنج والم میں مبتلا۔ اجتماعیت سے ہٹ کر انفرادیت سے دیکھو تو شاید آج ہر گھر کی یہی کہانی ہے۔ عظمیٰ افتخار نے بھی زبردست لکھا ظاہریت پر ہی مرتے ہیں سب۔ اس دفعہ کی سوپر ہٹ کہانی "زندگی سے یوں کھیلے آہ....یوں بھی ہوتا ہے واقعی یوں بھی ہوتا ہے۔ کسی کا دامن بھرتے بھرتے انسان بعض اوقات خود خالی ہوجاتا ہے۔ "ایک تھی مثال" مثال کی شخصیت آگے جاکر کن کرچیوں میں تقسیم ہونے والی ہے، یہ نظر آرہا ہے۔ افسانوں میں بے جوڑ بازی لے گیا۔

ج۔ پیاری اقصیٰ! آپ کا تفصیلی تبصرہ بہت خوب صورت ہے، آپ کے پچھلے خط کیوں شائع نہ ہوسکے۔ اس کا جواب وہی ہے جو پہلے بھی کئی بار دے چکے ہیں۔ آپ خط لکھتی ہیں۔ ہم آپ کے خط پڑھتے ہیں، آپ کی رائے سے آگاہ ہوتے ہیں۔ ہمارے لیے اس سے بڑی بات کیا ہوسکتی ہے۔

عائشہ نورین اور آمنہ نورین کنگن پور سے شریک محفل ہیں لکھا ہے

ہمارا تعلق پنجاب کے چھوٹے، مگر اپنے نام ہی کی طرح خوب صورت قصبے کنگن پور سے ہے۔ جی ہاں آپ بالکل ٹھیک سمجھیں، بشریٰ سعید کے رقص جنوں والے کنگن پور سے ہی۔ شعاع اور خواتین سے تعلق کافی پرانا ہے سو پکا بھی ہے۔ وہ کہتے ہیں نا اولڈ از گولڈ تو ایسا ہی کچھ سلسلہ یہاں بھی ہے۔ ایک عرصہ تک بڑی بہنوں اور کزنز کو رسالوں کے لیے صحیح معنوں میں "باؤلی" (یعنی جنونی ہاہاہا) ہوتے دیکھا تو ہم بھی پیچھے نہ رہے سو اسکول لائف کے آخر سال میں ہی فزکس اور میتھس تک کے پیریڈز میں نئے پرانے سب ہی رسالے پڑھ ڈالے، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم میٹرک میں صرف رسالوں پر توجہ دینے کی بدولت بری طرح سے فیل ہوئے ہوں گے۔ دونوں جڑواں کزنز کی میٹرک میں پرسنٹیج بھی 84% کے ساتھ جڑواں ہی رہی۔ شعاع جب آتا ہے تو ہماری بھی تقریباً" وہی حالت ہوتی ہے کہ کبھی ہم ان کو دیکھتے ہیں کبھی اپنے گھر کو۔

سچ پوچھیں تو شعاع کے سب ہی سلسلے ہمیں کرن کرن سورج اور قطرہ قطرہ قلزم ہی لگتے ہیں۔ سب سے پہلے حمد و نعت اور پیارے نبی کی پیاری باتیں پڑھ کر دل و دماغ میں لگے دنیا کی مکڑی کے جالے خود بخود صاف ہونے لگتے ہیں۔ "خط آپ کے" یقین جانیے پڑھ کر یوں لگتا ہے گویا دیس دیس کی بہنوں سے بذات خود ملاقات کررہے ہوں.... ہے نا مزے کی بات! کوئی خط نہیں چھوڑتے ہم۔ سلسلہ وار ناولز میں رائٹرز قلم کی نوک سے جس طرح واقعات اور کرداروں کو آپس میں جوڑتی ہیں، پڑھ کر مزہ آجاتا ہے۔ صائمہ اکرم! سو فناٹ عائشہ رحیم کے رنگوں سے سجے کینوس جیسی ایک اور خوب صورت سی تحریر لکھ ہی ڈالیں۔

باتوں سے خوشبو آئے، اس ماہ کی مسکراہٹیں ہمارے پسندیدہ سلسلے ہیں۔ "آئینہ خانے میں" لوگوں کو آئینہ دکھاتے ہوئے ہاتھ ہولا رکھا کریں۔ شاعری کے سب سلسلے ہماری مضبوط قسم کی کمزوری ہیں۔ تاریخ کے جھروکوں سے جب جھانکنے کا موقع ملتا ہے تو ہمارے "علمی بینک" میں خاطر خواہ اضافہ ہونے کے ساتھ ساتھ گھر بیٹھے ماضی کی سیر بھی ہوجاتی ہے۔

ج۔ عائشہ اور آمنہ! آپ کا خط پڑھ کر کچھ تشنگی سی محسوس ہوئی آپ نے صرف سلسلوں پر تبصرہ کیا۔ آئندہ خط لکھیں تو کہانیوں کے بارے میں بھی اپنی رائے لکھیں۔

میٹرک میں اچھے نمبر لے کر آپ نے ثابت کردیا کہ رسالے پڑھنے سے پڑھائی پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ ہماری طرف سے مبارک باد۔

آمنہ عبدالرحمان نے کھاریاں سے لکھا ہے

سب سے پہلے دینی باتیں پڑھ کر روحانی مسرت حاصل کی۔ اس کے بعد سال نو کے حوالے سے سروے پڑھا۔ سروے میں فرحین اظفر (کراچی) کی باتیں بہت پسند آئیں۔ انہوں نے اپنی یادوں کی ایسی منظر کشی کی کہ میں پہروں اس میں کھوئی رہی۔ نبیلہ عزیز کا ناول "رقص بسمل" ہے تو ٹھیک، لیکن کافی سلو جارہا ہے۔ راشدہ رفعت کے بے جوڑ میں نور العین کا کردار بہت پسند آیا جو بات میر مکرم ساری زندگی نہ سمجھ سکا وہ نور العین پل میں سمجھا گئی۔ ملیحہ صدیقہ کا پہلوئے حور پسند نہ آیا۔ قانتہ رابعہ کا ناول رکاوٹ اچھا لگا۔ زندگی سے یوں کھیلے تو پورے ڈائجسٹ کی جان تھا، لیکن اس میں ایک بات مجھے کنفیوز کررہی ہے کہ آخر میں یہ کیوں دکھایا گیا کہ ابرار کو اس کے غرور کی سزا ملی۔ مجھے تو ابرار مغرور نہ لگا، وہ تو حاشر اور ثمن کو ملانا چاہ رہا تھا۔ اس ناول کا یہ فقرہ "محبتیں اعزاز سے حاصل کی جاتی ہیں خیرات سے نہیں" بہت پسند آیا۔ "ایک تھی مثال" اچھا جارہا ہے، لیکن مجھے کوئی کردار اٹریکٹ نہیں کررہا۔ مجھے اس طرح کے ناول بہت پسند ہوتے ہیں جس میں کوئی غیر مسلم مسلمان ہوتا ہے۔

ج۔ پیاری آمنہ! ابرار کو یہ زعم تھا کہ وہ لوگوں کے جذبات و احساسات ان کے اظہار کے بغیر جان سکتا ہے۔ اس نے خود ہی یہ فرض کرلیا کہ ثمن حاشر سے محبت کرتی ہے۔ ثمن سے اس کی منگنی ہوگئی تھی پھر بھی وہ ثمن کے احساسات نہ سمجھ سکا اور اس نے ثمن اور حاشر کو ملا کر ہی دم لیا جبکہ ثمن اسے چاہتی تھی۔ اس کے دل میں بھی ثمن گھر کرچکی تھی۔ وہ خود اپنے دل کی بات بھی نہ سمجھ سکا۔

اس کا یہ زعم ہی اسے لے ڈوبا۔

رخسانہ نگار بڑی مہارت اور چابک دستی سے بھرپور کردار تخلیق کرتی ہیں اور چھوٹی چھوٹی جزیات کا بھی خیال رکھتی ہیں۔ ان کے اس ناول میں ہر کردار اپنی جگہ مکمل ہے۔ ویسے بھی ہر ناول میں کرداروں کو مسلمان کرتے رہے تو آپ خود یکسانیت کی شکایت کریں گی۔

غزل ثانی نے لکھا ہے

میں نے جب بھی شعاع کو پڑھا' پہلے سے بڑھ کے پایا اس کی تعریف کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں۔ میں نے تقریباً" سات آٹھ سال پہلے ایک ناول پڑھا تھا' لیکن بدقسمتی سے نہ اس کا نام مجھے یاد ہے اور نہ ہی یہ پتا ہے کہ وہ کب اور کس ڈائجسٹ میں چھپا تھا۔ براہ مہربانی اگر کسی کو پتا ہو پلیز بتا دیجیے ہیرو اور ہیروئن کے نام یہ تھے معظم ارباز رسول اور عائشہ اعتزاز رسول۔

ج۔ پیاری غزل! شعاع کی بزم میں خوش آمدید اور دعائیں۔ صرف ناموں سے کہانی کے بارے میں بتانا مشکل ہے۔ آپ کا خط شائع کر رہے ہیں' اگر کسی قاری بہن کو یہ کہانی یاد ہوئی اور انہوں نے خط لکھا تو ہم شائع کردیں گے۔

آپ کی شاعری کے لیے معذرت۔

مریم' طوبیٰ' ایشاع اور سائرہ چک NP,44 کنجراں سے تشریف لائی ہیں' لکھا ہے

سب سے پہلے خط پڑھے۔ سب سے اچھا خط شمع مسکان کا تھا پھر "لبنیٰ جدون" کی کہانی پڑھی' زبردست تحریر تھی' لیکن اتنے اتفاق ہضم نہیں ہوئے۔ ربیط اور لالئی کا کردار اچھا لگا۔ مرجانہ اور شمیلا نام اچھے نہیں تھے۔ اینڈ اچھا تھا۔ "رقص بسمل" نبیلہ عزیز کی تحریر بالکل دردل جیسی ہی ہے۔ پلیز اس میں تین سال بعد نہ ہسٹری کھولیے گا۔ پہلے ہی کھول دیجیے گا۔ "رخسانہ نگار عدنان" کی تحریر اچھی ہے۔ مگر انہوں نے بس برا ہی برا کیے جانا ہے۔ پلیز اب عاصمہ کے ساتھ کچھ اچھا کردیں۔ "امایہ خان" کی تحریر بت شکن اچھی لگی۔ باقی اس کا تبصرہ اگلے ماہ ہی کریں گے۔ "راشدہ رفعت" کا افسانہ "بے جوڑ" اچھا لگا۔ باقی افسانے اور مستقل سلسلے اچھے تھے۔ پلیز رائٹرز کا انٹرویو لیا کریں۔

ج۔ مریم' طوبیٰ' ایشاع اور سائرہ! آپ کی تعریف اور تنقید متعلقہ مصنفین تک پہنچا رہے ہیں۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

بینا شاہ (ٹوپی) صوابی

ٹائٹل بہت ہی ڈیسنٹ تھا۔ حمد و نعت سے فیض حاصل کرنے کے بعد آئے "ہمارے نام کی طرف" یہ کیا کرن چیمہ کو آپ نے پہلے ہی سے بتا دیا کہ ربیط اپنی غلطی کی وجہ سے پیشمان ہوا۔ سارا سسپنس ختم کرکے رکھ دیا۔ عائشہ اختر بٹ اللہ تعالیٰ آپ کی فیملی کے درمیان پیار محبت کو اسی طرح قائم رکھے۔ آج کل بہت ساری قارئین پٹھانوں کے بارے میں لکھ رہی ہیں تو دیکھیں چاہے پٹھان ہو چاہے سندھی یا پنجابی سب میں اچھے برے لوگ ہوتے ہیں۔ میں خود ایک پٹھان (سید) فیملی سے تعلق رکھتی ہوں۔ بعض پٹھان انا کے نام پر اپنی ہی ماں اور بہنوں کی زندگی تباہ کردیتے ہیں تو دوسری طرف پیار و محبت میں وہ اپنی جان کی بھی پرواہ نہیں کرتے۔ "عشق دعا ہے" لبنیٰ جدون کی بہت ہی اعلیٰ کاوش ہے۔ ملالئی کے وارنے ربیط خان کو اس کی اوقات یاد دلادی۔ بہت ہی مزا آیا۔ سب رشتوں کا اس طرح اکٹھا کرنا بہت ہی اچھا لگا۔

ج۔ پیاری بینا! آپ نے بالکل صحیح لکھا۔ اچھے برے ہر قوم' ہر مذہب میں ہوتے ہیں بلکہ کبھی کبھی ایک گھر کے افراد میں بھی سب اچھے یا سب برے نہیں ہوتے۔ لبنیٰ جدون تک آپ کی تعریف ان سطور کے ذریعے پہنچائی جارہی ہے۔

آپ کا سسپنس ختم ہوگیا۔ اس کے لیے معذرت' لیکن خطوط تو آخری صفحات میں شامل تھے۔ آپ پہلے کہانی پڑھتیں پھر خطوط پڑھتیں تو آپ کا سسپنس قائم رہتا۔

شعاع کے ساتھ

اِدارہ

فوزیہ ثمریٹ..... گجرات

شعاع سے میرا رشتہ اتنا پرانا نہیں۔ یہی کوئی زندگی کے دو' تین سال پیچھے چلے جائیں' اتنے کم عرصے میں ہی شعاع میری زندگی کی ضرورت بن گیا ہے۔ شعاع کی ہر تحریر' ہر رائٹر مجھے بہت پسند ہے۔ ڈائجسٹ پڑھنا ہمارے گھر میں کبھی مسئلہ نہیں رہا۔ کیونکہ میرے والد محترم ریٹائرڈ فوجی ہیں اور مطالعہ کی عادت ہمیں وراثت میں ملی ہے۔

خواتین' کرن اور شعاع تینوں مجھے بہت پسند ہیں۔ ان کی تحریروں میں ایک سبق ہوتا ہے۔ شعاع مجھے ہمیشہ ایک استاد کی طرح لگا۔ جو باتیں روزمرہ زندگی میں ہمیں محسوس نہیں ہوتیں یا ہم لاپروائی میں جن باتوں کی قدر نہیں کرتے انہیں شعاع میں پڑھ کر سمجھنا اور پھر ان پر عمل کرنا بہت آسان ہو جاتا ہے۔

میری صبح' دوبار ہوتی ہے۔ ایک تو جب صبح کی اذان ہوتی ہے' میں اور امی اٹھ جاتے ہیں۔ صبح کی نماز پڑھ کر سو جاتی ہوں۔ پھر آٹھ ساڑھے آٹھ بجے ہانیہ کی آواز سے اٹھتی ہوں۔ ہانیہ ہمارے گھر کی مینا ہے۔ "پھوپھو جی! اٹھ جاؤ۔" طیبہ بھابھی نے بھائی کا ناشتا بنا دیا ہوتا ہے۔

پھر ہم سب امی' میں' بھابھی ہانیہ سب مل کر ناشتا کرتے ہیں' ساتھ ساتھ مارننگ شو۔

ناشتا سے فارغ ہوکر بھابھی گھر کی صفائی ستھرائی شروع کردیتی ہیں اور میں کچن میں ناشتا کے برتن دھو کر وضو کرکے قرآن پاک پڑھتی ہوں۔ اسی طرح گھر کے چھوٹے بڑے کام کے ساتھ بارہ بجے ہنڈیا پکاتی ہوں۔ دو بجے تک کچن کے کام سے فارغ ہوکر نماز پڑھ کر دوپہر کا کھانا کھا کر تھوڑی دیر آرام کرتے ہیں۔

دو سے چار بجے تک قیلولہ فرمایا جاتا ہے۔ ہاں اس ساری روٹین میں ردوبدل اس ٹائم ہوتا ہے جب شازی' آمنہ آجاتی ہیں پھر تو نہ ہی پوچھیے گھر میں کیا ہنگامہ آرائی ہوتی ہے۔ کچن میں جاؤں تو فوزی کی پکار' کمرے میں آؤں خالہ مجھے اٹھاؤ۔ ہانیہ کی آواز میری پیاری پھوپھو کدھر ہیں۔ ہمارے آنگن کی یہ دونوں معصوم چڑیاں جو ہماری خوشی ہیں۔

چار بجے عصر کی نماز پڑھ کر سب صحن میں بیٹھ جاتے ہیں۔ عصر سے مغرب کی نماز تک ایسے ہی باتوں میں ٹائم گزرتا ہے مغرب کی نماز پڑھ کر ٹی وی دیکھا جاتا ہے۔ آج کل تو بہت اچھے ڈرامے بن رہے۔ خاص کر خواتین' شعاع کے ناولوں پر مبنی ڈرامے بہت اچھے لگتے ہیں۔

تحریروں کے کردار زندہ جاوید دیکھ کر خوشی ہوتی ہے۔ ہاں کبھی کبھی افسوس ہوتا ہے جیسی ہم نے کہانی' ناول کی ہیروئن یا ہیرو کی ذہن میں شکل بنا رکھی ہوتی ہے۔ وہ ڈرامے میں فٹ نہیں آتی تو مایوسی ہوتی ہے۔

رات نو بجے تک کھانے سے فارغ ہو جاتے ہیں۔ رات کو صرف روٹیاں پکانی ہوتی ہیں اور برتن چائے وغیرہ کے اور کام ختم۔ پھر سب اپنے اپنے روم میں۔ اور میں اپنے رسالوں کے ساتھ خط لکھنے بیٹھ جاتی ہوں چاہے میرا خط ہر ماہ شامل ہو نہ ہو مجھے لکھنا اچھا لگتا ہے۔ مایوسی بھی ہوتی ہے جب خط شامل نہیں ہوتا۔ ہر مہینے کی چھ' سات تاریخ اور سترہ' اٹھارہ' انیس تاریخ یہ ہر ماہ میرے لیے انتظار کا باعث ہوتی ہے کیونکہ ان تاریخوں میں شعاع اور کرن ملتا ہے۔ باقی کے دن رات ٹی وی یا پھر موبائل پہ ایس ایم ایس کرتے۔

3۔ شعاع کی بے شمار تحریریں جنہیں بھولنا ناممکن

ہے، مگر صاحب کیا کیجیے اس یادداشت کا' جواب خود کو بھی بھولنے لگی ہوں۔ پھر بھی اکثر تحریروں کے کردار یاد رہ جاتے ہیں اور کبھی کسی کہانی کا ایک جملہ اداسی کا باعث بن جاتا ہے اور کبھی یہ مسکراہٹ بکھیر دیتا ہے۔ غرض کہ شعاع کی تحریروں کے ساتھ اپنا رونا دھونا ہنسنا بولنا وابستہ ہے۔ "پھلاں دے رنگ کالے" کی ہیروئن کا انتظار بہت پسند آیا تھا۔ منزل کو پانا ہو تو ثابت قدمی لازم ہے۔

4۔ خامیاں اور خوبیاں دونوں کا حسین امتزاج ہوں۔ انسان ہوں فرشتہ تو ہوں نہیں اس لیے سب سے بڑی خامی میرے خیال میں غصہ ہے جو کہ کافی خطرناک ہوتا ہے۔ کوئی بات دل میں نہیں رکھتی، جلد باز ہوں بہت، کام کرکے اکثر پچھتاتی ہوں۔ شاعر نے شاید میرے لیے ہی لکھا ہے۔

عدم خلوص کے بندوں میں ایک خامی ہے
ستم ظریف بڑے جلد باز ہوتے ہیں

خوبی.... دل میں بغض نہیں رکھتی ہوں۔ ہمیشہ دوسروں کی بھلائی کی کوشش کرتی ہوں۔ نرم دل ہوں۔ حساس ہوں اپنی غلطی کو تسلیم کرتی ہوں اور دوسروں کی معاف کردیتی ہوں۔ مجھے اپنا دوستانہ موڈ اچھا لگتا ہے۔

مجھے نعت شریف سننا اچھا لگتا ہے۔ اپنے متعلق تعریفی جملے مجھے شرمندہ کردیتے ہیں۔ میری امی کہتی ہیں۔ "یہ گھر اور اس گھر کی رونقیں تمہاری وجہ سے ہیں۔ اس گھر کو تم نے سنبھالا ہوا ہے۔" مجھے اپنی ماں کی خدمت کرکے دلی سکون ملتا ہے۔ مجھے اپنے رب سے باتیں کرنا اچھا لگتا ہے۔

5۔ سردیاں اچھی لگتی ہیں، ساون بھی اچھا لگتا ہے۔ میں اور ہانیہ صحن کے درمیان پیڑھی پہ بیٹھ کر بارش انجوائے کرتے ہیں۔ پھر نہ تو چائے یاد رہتی ہے اور نہ پکوڑے۔

6۔ پسندیدہ اقتباس.... "بادباں نہیں کھلتے۔" سے نسیم آمنہ کا۔

"بداعتمادی چور دروازوں کو جنم دیتی ہے۔ جبر، فرار کا راستہ ڈھونڈ نکالتا ہے۔ کمزور نفس تسکین چاہتا ہے۔ پھر جائز راستہ نہ ملے تو جائز کی تمیز بھی کھو بیٹھتا ہے۔"

✻

نبیلہ عزیز

رقص بسمل

ماورا مرتضیٰ' عافیہ بیگم کی اکلوتی بیٹی ہے۔ فارہ کے ساتھ یونیورسٹی میں پڑھتی ہے۔ عافیہ بیگم اس کا اپنی سہیلیوں سے زیادہ ملنا جلنا پسند نہیں کرتیں۔ اس کے علاوہ بھی اس پر بہت ساری پابندیاں لگاتی ہیں جبکہ ماورا خود اعتماد اور اچھی لڑکی ہے۔ عافیہ بیگم اکثر اس سے ناراض رہتی ہیں۔ البتہ بی گل اس کی حمایتی ہیں۔

فارہ اپنی ثمینہ خالہ کے بیٹے آفاق یزدانی سے منسوب ہے۔ دو سال پہلے یہ نسبت آفاق کی پسند سے ٹھہرائی گئی تھی مگر اب وہ فارہ سے قطعی لاتعلق ہے۔ فارہ کی والدہ منزہ رحیم اپنی بہن ثمینہ یزدانی سے ملنے کراچی جاتی ہیں۔ آفاق انہیں ایئر پورٹ لینے نہیں جاتا۔ مجبوراً "ساشا کو جانا پڑتا ہے۔ وہ آفاق کی بدتہذیبی پر خفا ہو کر واپس چلی جاتی ہیں۔

منزہ' ثمینہ اور نیرہ کے بھائی رضا حیدر کے دو بچے ہیں۔ تیمور حیدر اور عزت حیدر۔ تیمور حیدر بزنس مین ہے اور بے حد شان دار پرسنالٹی کا مالک ہے۔ ولید رحمٰن اس کا بیسٹ فرینڈ ہے۔ اس سے حیثیت میں کم ہے مگر دونوں کے درمیان اسٹیٹس حائل نہیں ہے۔ نیرہ کے بیٹے سے فارہ کی بہن حمنہ بیاہی ہوئی ہے۔

عزت اپنی آنکھوں سے یونیورسٹی میں بم دھماکا ہوتے دیکھ کر اپنے حواس کھو دیتی ہے۔ ولید اسے دیکھ کر اس کی جانب لپکتا ہے اور اُسے سنبھال کر تیمور کو فون کرتا ہے۔ تیمور اسے اسپتال لے جاتا ہے۔ عزت کے ساتھ یہ حادثاتی ملاقات ولید کو ایک خوشگوار حصار میں باندھ لیتی ہے۔ عزت بھی ولید کے بارے میں سوچنے لگتی ہے اور ڈھکے چھپے لفظوں میں ولید سے اپنی کیفیت کا اظہار بھی کر دیتی ہے مگر ولید انجان بن جاتا ہے۔

آفاق فون کر کے فارہ سے شادی کرنے سے انکار کر دیتا ہے۔ فارہ بہت روتی ہے۔ ثمینہ اور اشتیاق یزدانی کو علم ہوتا ہے تو انہیں سخت صدمہ ہوتا ہے۔ ثمینہ کی طبیعت بگڑنے لگتی ہے۔

اشتیاق یزدانی' آفاق سے حد درجے خفا ہو کر اس سے بات چیت بند کر دیتے ہیں۔ آفاق مجبور ہو کر شادی پر راضی

ہوجاتا ہے۔ فارہ دل سے خوش نہیں ہو پاتی۔ عزت، تیمور کے موبائل سے ولید کا نمبر لے کر اسے فون کرتی ہے مگر ولید اس کی حوصلہ افزائی نہیں کرتا۔ رضا حیدر، تیمور کو فارہ کی شادی کے سلسلے میں فیصل آباد بھیجتے ہیں۔ فارہ اپنی تاریخ میں ماورا کو بصد اصرار مدعو کرتی ہے۔ ماورا، عافیہ بیگم کی ناراضی کے باوجود چلی جاتی ہے۔ وہاں تیمور اور ماورا کی ملاقات ہوجاتی ہے۔ عزت اپنے دل کی کیفیات ساشا سے بیان کردیتی ہے۔ ماورا بی گل کو بتاتی ہے کہ وہ رضا حیدر کے بیٹے تیمور حیدر سے ملی ہے۔ بی گل دم بخود رہ جاتی ہیں۔

فارہ اور آفاق کی شادی کی تیاریاں شروع ہوجاتی ہیں۔ رضا حیدر کے بہت پرانے دوست قیام مرزا بہت عرصے بعد ان سے رابطہ کرتے ہیں۔ پارلر میں ٹریٹمنٹ کے دوران ایک باتونی لڑکی باتوں باتوں میں آفاق کے بھائی اینق یزدانی سے شناسائی ظاہر کرتی ہے۔ فارہ کو چونکتے دیکھ کر وہ لڑکی پھر کترانے لگتی ہے۔

—۸—

آٹھویں قسط

"ہیلو! میں نے آپ سے کچھ پوچھا ہے۔" فارہ نے اس لڑکی کو دوبارہ متوجہ کیا۔

"جی، جی! کہیے کیا پوچھا ہے آپ نے؟" اس لڑکی نے فارہ کے سوال سے انجان بننا چاہا۔

"کچھ خاص نہیں، بس صرف آپ کا نام پوچھا ہے۔" اس نے "نام" پہ زور دیا۔

"اوہ اچھا! میرا نام زوبیہ شاہ نواز ہے۔" اس لڑکی کو اپنا نام بتانا ہی پڑا۔

"آپ کراچی میں کس جگہ......" اس سے پہلے کہ فارہ اپنا اگلا سوال مکمل کرتی اچانک اس کا سیل فون بج اٹھا اور مجبوراً اسے اس لڑکی سے دھیان ہٹا کر اپنے فون کی طرف متوجہ ہونا پڑا اسکرین پہ آفاق یزدانی کا نمبر دیکھ کر ایک بار تو سچ مچ وہ گنگ سی رہ گئی اور یہ تو اس کے ساتھ ہمیشہ ہی ہوتا تھا۔ اس کی کال جب بھی آتی وہ گم صم سی ہوجاتی تھی پھر اس کی اسی گم صم سی کیفیت میں وہ کال مس ہوجاتی تھی۔

جس کا اسے بعد میں افسوس ہوتا تھا۔

اور اب بھی ہوا تھا۔

"اوہ!" وہ آہستگی سے کہہ کے رہ گئی، مگر آفاق بھی شاید اس کی کیفیت کو اچھی طرح سمجھتا تھا اس لیے دوبارہ کال کرلیتا تھا۔ سو اب اس نے آرام سے اس کی کال ریسیو کرلی۔

"ہیلو!" اس کی آواز حد درجہ دھیمی تھی۔

"السلام علیکم!" ایرپیس سے آفاق کی انتہائی پرسکون اور گمبھیر سی آواز ابھری۔

"وعلیکم السلام! کیسے ہیں؟" فارہ نے دعا سلام کے دوران ہی اپنے آپ کو سنبھال لیا تھا۔

"بہت اچھا۔ لیکن تم سے ذرا کم۔" آفاق نے بات کو خوش گواری کا رنگ دینا چاہا۔

"آپ نے فون کس لیے کیا؟" وہ اس کے موڈ کی خوش گواری کو نظرانداز کرگئی۔

"تم سے بات کرنے کے لیے۔" وہ جانتا تھا کہ یہ سوال اس کی خفگی کا اظہار ہے۔

"کوئی خاص بات؟" اس وقت فارہ کے مزاج پہ ماورا کے مزاج کی چھاپ نظر آرہی تھی۔

"بات خاص ہو یا نہ ہو۔ ہمارا ایک دوسرے سے بات کرلینا ہی خاص ہے۔ اور یہ کیا کم خاص بات ہے؟"

آفاق ہلکے سے مسکرایا تھا لیکن فارہ کا موڈ پھر بھی نہیں بدل سکا، وہ ہنوز اس موڈ میں تھی، لاتعلق سی۔

"لیکن میرے پاس اس خاص بات کے لیے ذرا بھی ٹائم نہیں ہے، میں اس وقت پارلر میں ہوں، اس لیے فون بند کرتی ہوں، آپ بھی اپنا آفس سنبھالیے، بزنس میں کوئی نقصان نہ ہوجائے آپ کا۔"

اس نے بھرپور طنز کیا۔

"پارلر کس لیے آئی ہو؟" آفاق نے اس کا طنز نظرانداز کرکے دلچسپی سے پوچھا۔

"کیا آپ کو نہیں پتا کہ لڑکیاں پارلر کس لیے جاتی ہیں؟" فارہ نے ہنوز خفگی بھرا انداز اپنا رکھا تھا۔

"پتا ہے۔ اپنا آپ سجانے سنوارنے کے لیے جاتی ہیں۔" اس کا جواب لاپروا سا تھا۔

"تو پھر مجھ سے کیوں پوچھ رہے ہیں؟" فارہ کو حیرانی ہوئی تھی جبکہ آفاق اس کی ناسمجھی پہ ایک بار پھر مسکرایا تھا۔

"میں یہ جاننا چاہ رہا ہوں کہ آپ اپنا آپ کس کے لیے سجانے سنوارنے آئی ہیں؟"

آفاق کا لہجہ متبسم ہورہا تھا، فارہ ٹھٹک گئی اور اس کے سوال کا مفہوم بھی سمجھ گئی تھی۔

"انسان اپنا آپ کس لیے سجاتا سنوارتا ہے......؟ اپنے آپ کے لیے۔ اپنی خوشی کے لیے۔ میں بھی اسی لیے پارلر آئی ہوں، اپنی خوشی کے لیے اور اپنے لیے تاکہ میں خود کو اچھی لگوں۔"

فارہ نے اپنی طرف سے آفاق کو کرارا جواب دینے کی کوشش کی تھی۔

"میں تمہاری اس بات سے ہرگز اتفاق نہیں کرتا۔ انسان اپنا آپ اپنے لیے کبھی بھی نہیں سنوارتا۔ ہمیشہ دوسروں کے لیے سجاتا ہے، دوسروں کو خوش کرنے کے لیے، دوسروں کی نظروں میں جچنے کے لیے، دوسروں کو اچھا لگنے کے لیے تاکہ کوئی دوسرا اسے دیکھے اور دیکھتا ہی رہ جائے۔ اور یہ خواہش لڑکیوں میں زیادہ پائی جاتی ہے، اسی لیے تو وہ سجنے سنورنے کا اہتمام کچھ زیادہ ہی کرتی ہیں، تاکہ منگیتر یا ان کا ہزبینڈ انہیں دیکھے تو بس پھر انہیں ہی دیکھتا رہے، اس کی نظر ادھر سے ادھر نہ جائے، اور لڑکیوں کی اسی خواہش کی بدولت ہی تو بیوٹی پارلرز آباد ہیں اور کاسمیٹکس والوں کا کاروبار چل رہا ہے مگر میرا سوال اب بھی وہیں کا وہیں ہے کہ تم پارلر کس لیے آئی ہو؟ کس کی نظر میں جچنے کے لیے اپنا آپ سنوار رہی ہو؟" آفاق گھوم پھر کے بات کو پھر وہیں لے آیا تھا۔ جبکہ فارہ اس کی اتنی گہری اور لمبی چوڑی بات پہ چند ثانیے کے لیے خاموش ہوگئی تھی۔

"آفاق یزدانی کے لیے نا؟" وہ پوچھ رہا تھا لیکن فارہ کے پاس خاموشی کے سوا کچھ نہیں تھا۔

"اور اسی آفاق کے لیے تمہارے پاس اس وقت ٹائم نہیں ہے۔" اس کے لہجے میں ہلکی سی ناراضی جھلکی۔ لیکن وہ مسلسل چپ تھی جس پہ آفاق ایک گہری سانس کھینچ کے رہ گیا۔

"اوکے فارہ! اگر تمہارے پاس جواب دینے کا بھی ٹائم نہیں ہے تو ٹھیک ہے۔ میں کال بند کردیتا ہوں، تم ایزی ہوکر اپنا آپ سجا سنوار لو۔ اللہ حافظ۔" آفاق بڑے سکون اور مطمئن سے انداز میں کہتے ہوئے فون بند کرنا چاہتا تھا۔

"آفاق پلیز......!" اب اس سے چپ نہیں رہا گیا۔

"کہو۔" آفاق اس کی اجنبیت اور لاپروائی کا حل بخوبی جانتا تھا، کیونکہ اسے پتا تھا کہ وہ اس سے کتنی محبت کرتی ہے۔

"کس لیے فون کیا تھا آپ نے؟" فارہ نے شرمندگی سے پوچھا۔

"تلافی کرنے کے لیے۔"

"تلافی......؟ مگر کس چیز کی؟" وہ حیران ہوئی۔

"تمہارا دل دکھانے کی تلافی۔ تمہیں بے تحاشا رلانے کی تلافی۔ تمہاری محبت کو ستانے کی تلافی اور تمہیں انکار کرنے کی تلافی۔ مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا فارہ...... لیکن پھر بھی مجھ سے ایسا ہوگیا۔ میں اس روز بہت زیادہ ڈپریشن کا شکار تھا۔ اس لیے نجانے کیا کہہ گیا۔ لیکن بعد میں مجھے احساس ہوا کہ یہ میں کیا کر بیٹھا ہوں۔ اسی لیے سوچا کہ تم سے معافی مانگوں تم بتاؤ اپنی غلطی کی تلافی کیسے کروں...... کوئی ایسی بات۔ یا کوئی ایسا کام جس سے تمہاری محبت خوش ہوجائے، جس سے تمہارے ہونٹوں پہ مسکراہٹ بکھر جائے، جس سے تمہارے دکھے ہوئے دل کو سکون مل جائے......"

فارہ بس تکتی رہ گئی۔

"بولونا فارہ! کیا کروں۔ ایسا کہ تم سب کچھ بھلادو....."
آفاق اصرار کررہا تھا اور فارہ بے یقینی کی کیفیت میں مبتلا تھی۔ اسے اپنی سماعتوں پہ اعتبار نہیں رہا تھا۔

"غلطی خود کی تو تلافی بھی خود ہی کیجیے' مجھ سے کیا پوچھتے ہیں؟"
فارہ قدرے خفگی اور تلخی سے گویا ہوئی۔
"اوکے۔ پھر میں اپنے دل سے پوچھ لیتا ہوں کہ وہ اس معاملے میں کیا کہتا ہے۔"
آفاق کی گمبھیر آواز پہ فارہ کا دل بری طرح دھڑک اٹھا تھا اور اس نے بے اختیار اپنے آس پاس دیکھا تھا' لیکن فی الحال اس کے آس پاس کوئی بھی نہیں تھا۔ بیوٹیشن اس وقت اپنی کلائنٹس کو دیکھ رہی تھی۔
"ہوں! بتائیے کیا کہہ رہا ہے آپ کا دل؟" فارہ دل وجان سے سننا چاہتی تھی کہ اس کا دل آخر کیا کہتا ہے۔
"بتادوں؟" وہ جان بوجھ کر تجسس پھیلا رہا تھا۔
"ہوں!" وہ اب اور کیا کہتی۔
"آئی لو یو سو مچ فارہ... آئی ریئلی لو یو۔" آفاق نے اتنے دھیمے' اتنے بوجھل اور اتنے جذب سے کہا کہ فارہ کی ہتھیلیوں میں پسینہ اتر آیا اور کانوں کی لوئیں سرخ پڑ گئیں۔
"میرے پاس اس وقت اس سے اچھی تلافی اور کوئی نہیں ہو سکتی' البتہ جب تم پاس آجاؤ گی تو پھر میرا معافی تلافی کا طریقہ کار کچھ اور ہو گا۔"
آفاق کی بات پر وہ جھینپ گئی تھی۔
"آفاق پلیز! میں فون بند کررہی ہوں' آپ سے بعد میں بات ہو گی۔ بیوٹیشن میرا انتظار کررہی ہے۔" فارہ نے اپنے دل پہ ہاتھ رکھتے ہوئے اپنی دھڑکنوں کو ہموار کیا۔
"اوکے۔ اس کی آسانی کے لیے فون بند کردیا۔" آفاق نے مسکراتے ہوئے کہہ کر فون بند کردیا تھا۔
فارہ نے فون بند ہونے کے بعد کرسی پر پشت ٹکاتے ہوئے پلکیں موندلیں۔
"آر یو آل رائٹ مس فارہ؟" بیوٹیشن نے اندر آتے ہوئے بڑی نرمی سے پوچھا۔
"یس آئی ایم آل رائٹ۔" فارہ یکدم سیدھی ہو بیٹھی۔
"آئی تھنک! آپ کے فیانسی کی کال تھی۔" بیوٹیشن دلچسپی سے پوچھ رہی تھی۔
"جی ہاں۔ انہی کی کال تھی' لیکن آپ کو کیسے پتا چلا؟" فارہ بیوٹیشن کے سوال پہ چونک گئی۔
"وہ آپ کے ساتھ یہاں جو دوسری کسٹمر تھیں' وہ بتارہی تھیں۔" بیوٹیشن نے کندھے اچکائے اور فارہ کچھ یاد آنے پہ ایک بار پھر چونکی۔
"ارے۔ وہ کہاں گئیں کیا نام تھا ان کا۔ ہاں۔ مس زوبیہ شاہ نواز۔ پلیز۔ ان کو اندر بلائیں۔" فارہ کو بے چینی لاحق ہوئی۔
"سوری! وہ تو اسی وقت چلی گئی تھیں جب آپ کال سن رہی تھیں۔"
"اوہ نو۔" فارہ نے یک دم سر تھام لیا۔
"کیا ہوا مس فارہ! خیریت۔" وہ بھی پریشان ہو گئی۔
"ہوں۔ ہاں۔ ! نہیں کچھ نہیں۔" فارہ نے بے دھیانی سے جواب دیا تھا۔
"آپ کو کوئی کام تھا ان سے؟"
"جی۔ ! کیا آپ کو ان کا کوئی ایڈریس یا نمبر وغیرہ پتا ہے؟ میں ان سے کانٹیکٹ کرنا چاہتی ہوں۔" فارہ نے اس لڑکی سے دوبارہ ملنے کے لیے ہاتھ پیر مارنے چاہے تھے۔
"سوری مس فارہ! وہ ہماری ریگولر کسٹمر نہیں ہیں' وہ تو فرسٹ ٹائم یہاں آئی ہیں' بتارہی تھیں کہ کراچی کی

رہنے والی ہیں۔"
بیوٹیشن نے فارہ کو بالکل ہی مایوس کردیا تھا اور فارہ تاسف سے ہاتھ ملتی رہ گئی تھی۔!

☼ ☼ ☼

اور پھر جیسے ہی دن دس تاریخ سے کچھ آگے سرکے' ہر طرف ہی شادی کے ہنگامے جاگ اٹھے۔
لیکن جتنا انتظار تیمور حیدر کو تھا' اتنا تو شاید فارہ اور آفاق کو بھی نہیں تھا۔
وہ ایک ایک منٹ اور ایک ایک سیکنڈ بھی گن کے گزار رہا تھا۔
اس کی راتوں کی نیند بھی اڑی ہوئی تھی۔
اور اس کے ان ہی چکروں نے رضا حیدر کو مشکوک کرڈالا تھا۔
"کیوں برخوردار! نیند نہیں آرہی کیا؟" رضا حیدر نے اس کے قریب آتے ہوئے اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھا تھا۔
"جی!" تیمور نے سر کھجاتے ہوئے اعتراف کیا۔
"وجہ؟" رضا حیدر کھٹک تو گئے تھے لیکن انہوں نے اس کے منہ سے سننا چاہا۔
"آپ سمجھتے ہی ہوں گے۔" تیمور بتاتے ہوئے جھجک رہا تھا۔
"اوہ! یعنی یہ بات ہے؟" رضا حیدر کافی مبہم اور معنی خیز سے الفاظ میں بولے تھے۔
"وہی مطلب؟" تیمور خاک سمجھا تھا۔
"میرے ابا جان کہتے تھے کہ جب بیٹا راتوں کو جاگنے لگ جائے تو ماں باپ کو سمجھ جانا چاہیے کہ اس کی تنہائی اسے سونے نہیں دے رہی۔" رضا حیدر نے اسے تنگ کرنے کی حد کرڈالی تھی' اور تیمور بدک گیا تھا۔
"بابا! یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ۔ میرے ساتھ یہ مسئلہ ہرگز نہیں ہے' میں تو کسی اور ہی چوٹ کا گھائل ہوں۔" تیمور نے فوراً "انہیں کچھ ایسا ویسا سوچنے سے روکا۔
"اب یہ چوٹ اور گھائل کا کیا قصہ ہے۔ ذرا صاف الفاظ میں سمجھاؤ' رات پہلے ہی کافی ہو چکی ہے' ہمیں تو نیند آرہی ہے۔" انہوں نے اسے جلدی بولنے پہ اکسایا۔
"میرے پاس صاف الفاظ نہیں ہیں۔ اس لیے آپ پہلے اپنی نیند پوری کرلیں جاکر۔ یہ قصہ کل پہ اٹھا رکھتے ہیں۔" تیمور نے انہیں مطمئن کرنے کی کوشش کی۔
"ارے نہیں میری جان۔ نیند مجھے اپنے بیٹے سے زیادہ پیاری نہیں ہے۔ تم قصہ بیان کرو' میں سن رہا ہوں۔" رضا حیدر اس کے کندھے کو دوبارہ تھپکتے ہوئے اس کے ساتھ لان میں چہل قدمی کرنے لگے۔
"قصہ تو بہت ہی مختصر ہے۔ مگر میں اسے بڑھانا چاہتا ہوں۔" تیمور نے کچھ بولنے کے لیے تمہید باندھی۔
"ٹھیک ہے۔ پہلے عنوان تو بتاؤ؟" انہوں نے اثبات میں سر ہلایا۔
"عنوان ہے "محب اور محبوب۔" تیمور نے بڑے جذب سے کہا۔
"میں نے کہا نا بیٹا! ذرا صاف الفاظ میں سمجھاؤ۔" رضا حیدر اسے خوب ستارہے تھے۔
"صاف الفاظ میں سننا چاہتے ہیں تو پھر سنیں۔ ایک لڑکی میری زندگی میں آگئی ہے... اور اس کے سوا مجھے کچھ سوجھ ہی نہیں رہا ہے۔ اور... اور مجھے حیرت ہو رہی ہے خود پہ کہ میرے ساتھ یہ کیا ہو رہا ہے۔"
تیمور کہتے ہوئے واقعی حیران اور بے یقین سا لگ رہا تھا۔ رضا حیدر اس کے اتنے سیدھے سادھے اظہار پہ بے ساختہ ایک بلند قہقہہ لگا کر ہنسے تھے۔
"یہ وقتی جذبہ ہے یا اسے اپنی زندگی میں شامل کرنا چاہتے ہو۔"
"اگر اسے اپنانے کی نیت نہ ہوتی تو آپ سے کبھی بھی اس قصے کا ذکر نہ کرتا۔" تیمور کا لہجہ مضبوط ہوا۔

"ہوں! یعنی تم ایک ہی جست میں آخری اسٹیج پر جا پہنچے ہو۔"

"کیا مطلب؟" تیمور نے ان کے چہرے کو جانچا۔

"محبت پہلی اور شادی آخری اسٹیج ہوتی ہے۔ اور تم ایک ہی جھٹکے میں دونوں پھلانگ آئے ہو۔ ابھی کچھ دیکھو' کچھ سوچو' پھر کچھ سمجھنے کی کوشش کرو۔ اتنی جلدی کیا ہے بھلا۔" رضا حیدر نے بڑے نارمل سے طریقے سے اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی البتہ اس مشورے میں کوئی زور زبردستی یا انکار کی آمیزش نہیں تھی۔

"بابا! میرا تو ایک ایک پل صدیوں جیسا گزر رہا ہے اور آپ کہہ رہے ہیں کہ اتنی جلدی کیا ہے؟" تیمور نے جیسے اپنے آپ کا مذاق اڑایا تھا۔

"تو پھر کیا کرنا چاہیے ہمیں؟" وہ الٹا اس سے مشورہ لے رہے تھے۔

"یہ تو اب آپ کو سوچنا چاہیے نا کہ آپ کے بیٹے کو ایک لڑکی سے محبت ہوگئی ہے اور وہ اس سے شادی کرنا چاہتا ہے تو اس سلسلے میں آپ کو کیا کرنا چاہیے۔" تیمور نے ساری ذمہ داری ان پر ڈال دی۔

"کس فیملی سے ہے؟" اب رضا حیدر سنجیدہ ہوئے۔

"یہ تو مجھے بھی نہیں پتا ہے۔" تیمور واقعی اس بات سے لاعلم تھا۔

"رہتی کہاں ہے' یہ تو پتا ہوگا؟" وہ ذرا گھور کے بولے تھے اور تیمور مسکرا اٹھا۔

"جی! یہ پتا ہے۔ فیصل آباد میں رہتی ہے۔" اس نے کہتے ہوئے سر جھکا لیا تھا کیونکہ اسے اندازہ تھا کہ فیصل آباد کا نام سن کر ان کا ری ایکشن کیا ہوگا؟ اور واقعی وہ چونک گئے تھے۔

"فیصل آباد میں؟" انہیں جیسے کرنٹ لگا تھا۔

"جی... اسی فیصل آباد میں' جس سے میں کوسوں دور بھاگتا تھا' جہاں جاتے ہوئے میری جان جاتی تھی' جہاں جانا مجھے عذاب لگتا تھا' جہاں مجھے بوریت کے سوا اور کچھ محسوس ہی نہیں ہوتا تھا' آج اسی فیصل آباد میں مجھے یوں لگتا ہے کہ میری زندگی بس گئی ہے' میری سب سے بڑی خوشی کا مرکز ہی فیصل آباد ہے' اور اب اسی فیصل آباد جانے کے لیے میں دن گن رہا ہوں۔ اور انتظار کر رہا ہوں کہ فارہ اور آفاق کی شادی کب ہوگی۔"

تیمور نے تو اپنا دل کھول کر اپنے باپ کے سامنے رکھ دیا تھا اور رضا حیدر ششدر سے اس کی بات اور اس کے جذبات سنتے رہ گئے تھے۔

"بابا! میں چاہتا ہوں کہ جب آپ فیصل آباد جائیں تو اس سے ایک بار ضرور ملیں۔ میں آپ کو اس سے ملوانا چاہتا ہوں' پلیز بابا۔" اس نے بھرپور التجا کی تھی اور رضا حیدر نے اثبات میں سر ہلا دیا تھا۔

"ہوں۔ ضرور ملوں گا۔ تم بے فکر رہو۔ اب تو مجھے بھی اس لڑکی کو دیکھنے کا اور اس سے ملنے کا شوق ہو رہا ہے کہ آخر وہ ہے کون' جس کو دیکھ کر میرا بیٹا اتنا پاگل ہو رہا ہے اور ان شاءاللہ میرے بیٹے کی شادی بھی اسی سے ہوگی۔ آخر پہلی بار اس نے کسی چیز کے لیے اتنی شدت سے طلب ظاہر کی ہے۔"

رضا حیدر نے بڑے سکون سے کہتے ہوئے اس کا کندھا ایک بار تھپکا اور اس کا حوصلہ بڑھایا' جس پہ تیمور ایک پل میں ہی بہت مطمئن اور پرسکون ہوگیا۔

"اوہ تھینک یو بابا! تھینک یو سو مچ۔" تیمور نے شکر ادا کیا تھا کہ بابا نے کوئی نکتہ نہیں اٹھایا۔

"ہوں تو پھر کب ملوا رہے ہو اس سے۔" وہ معنی خیزی سے مسکرائے۔

"آفاق کی مہندی کی رسم میں ملواؤں گا۔ اگر وہ آئی تو۔ ورنہ شادی کے فنکشن میں تو ضرور ہی ملاقات ہوگی۔" تیمور کہتے ہوئے چہک رہا تھا اور رضا حیدر اس کی کیفیت سے محظوظ ہو کر آہستگی سے مسکرا دیے۔

☼ ☼ ☼

"امی! کہاں جا رہی ہیں آپ؟" ماورا' عافیہ بیگم کو تیار ہوتے دیکھ کر ان کے پیچھے ہی کمرے میں آگئی۔

"مارکیٹ جا رہی ہوں۔ سودا سلف سارا ختم ہو چکا ہے۔" وہ اپنا بیگ چیک کرتے ہوئے کافی مصروف سے انداز میں بولیں۔

"مجھے کچھ کہنا تھا آپ سے۔"

"کہو۔" انہوں نے بیگ کی زپ بند کر کے کھونٹی سے لٹکتی اپنی چادر اتاری۔

"میں چاہتی ہوں کہ فارہ مایوں کا جوڑا میری طرف سے پہنے۔" اس نے کہا۔

"کیا؟" اور عافیہ بیگم کے چادر اوڑھتے ہاتھ وہیں ساکت ہوگئے تھے۔

"جی پرسوں فارہ کی مایوں اور مہندی کی رسم ہے' اور اس نے ابھی تک مایوں کا جوڑا نہیں بنوایا۔ یہ جوڑا اکثر دلہن کی سہیلیاں بنواتی ہیں۔ جبکہ میرے سوا فارہ کی کوئی اور سہیلی نہیں ہے۔ بے شک فارہ مجھ سے یہ سب نہ کہے۔ لیکن مجھے خود تو احساس ہے نا۔ ہم دونوں نے آج تک ایک دوسرے کو کوئی گفٹ بھی نہیں دیا۔ اس لیے میں چاہتی ہوں کہ میں فارہ کو اپنی دوستی کا پہلا گفٹ اس کی مایوں کا پیلا جوڑا ہی دوں' جس پہ وہ بھی خوش ہو جائے اور میں بھی۔ اب آپ بتائیں آپ کا اس بارے میں کیا خیال ہے؟"

ماورا جب بھی ان کے سامنے یوں بات کرتی تھی عافیہ بیگم کو ہمیشہ اس کے سامنے بے بس ہونا پڑ جاتا تھا۔ وہ اختلاف کے باوجود تذبذب کا شکار ہو جاتی تھیں۔ اس وقت بھی ان کے ساتھ ایسا ہی ہوا تھا۔

ماورا ان کے جواب کی منتظر کھڑی تھی اور عافیہ بیگم چپ چاپ اس کی شکل دیکھ رہی تھیں۔

"اگر آپ کو اعتراض ہے تو آپ انکار بھی کر سکتی ہیں... کیونکہ میرے لیے اور فارہ کے لیے یہ بھی کافی ہے کہ میں اس کی شادی میں شریک ہو رہی ہوں' میں اس کے لیے مایوں کا جوڑا نہ بناؤں تو بھی کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ وہ خود ہی بنا لے گی۔" "یہ صرف میری خوشی ہے۔ آپ پریشان نہ ہوں۔"

ماورا نے انہیں اتنا سوچتے دیکھ کر اپنا پروگرام ہی بدل دیا۔ لیکن ابھی چند منٹ ہی گزرے تھے کہ عافیہ بیگم اس کے کمرے میں چلی آئی تھیں۔

"اگر فارہ کا جوڑا بنوانا ہے تو چلو میرے ساتھ....." گویا ان کی طرف سے ہاں ہو چکی تھی۔ ماورا ان کی رضامندی پہ بے ساختہ ان کے گلے لگ گئی تھی۔

"تھینک یو امی.....! تھینک یو ویری مچ....."

بی گل ہمیشہ کی طرح اس کی حرکتوں پہ مسکرا کے رہ گئیں۔

☼ ☼ ☼

تیمور کو ثمینہ یزدانی نے باقاعدہ کال کر کے اپنے گھر بلایا تھا' اس لیے وہ اس ٹائم سے ذرا پہلے ہی اٹھ آیا تھا لیکن ابھی راستے میں ہی تھا کہ ولید سے ٹکراؤ ہو گیا تھا' وہ ایک بس اسٹاپ پہ کھڑا تھا۔

تیمور نے گاڑی عین اس کے سامنے لاکر روکی تھی۔

"ہیلو..... شیطان کو جب بھی دیکھا..... سڑکوں پہ ہی دیکھا۔" تیمور نے گاڑی کا شیشہ نیچے کرتے ہوئے کہا اور ولید نے اس کے ارشاد پہ اسے مسکرا کے دیکھا۔

"ہمارے خیالات ایک دوسرے سے مختلف نہیں ہوتے۔" ولید قرض نہیں رکھتا تھا۔

"اب بیٹھو گے بھی یا بکواس ہی جاری رکھو گے.....؟" تیمور نے فرنٹ سیٹ کا دروازہ کھول رکھا تھا۔

"مجبوری ہے..... بیٹھنا تو پڑے گا ہی..... اور کیا کر سکتا ہوں بھلا.....؟"

وہ منہ بنا کر کہتا بیٹھ گیا تھا۔

"تو پھر میری طرف سے بھی یہی سمجھ لو کہ میری بھی مجبوری ہے۔ میں بھی اگنور کر کے نہیں گزر سکتا۔ کیا کروں" تیمور نے بھی جواباً" اسی کے سے انداز میں کہتے ہوئے کندھے اُچکائے اور گاڑی اسٹارٹ کر دی۔

"مہربانی ہے جناب.....! نوازش ہے آپ کی ورنہ سڑک کنارے کھڑے ہم جیسے حقیر لوگوں کو کون دیکھتا ہے؟ سب یوں زناٹے سے گزر جاتے ہیں جیسے پیچھے قیامت تعاقب میں ہو۔"

"بس بس..... اب زیادہ عاجزی دکھانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے' یہ بتاؤ یہاں کیا کر رہے تھے اور تمہاری بائیک کہاں ہے؟" تیمور نے اسے کچھ الٹا سیدھا بولنے سے روک دیا تھا۔

"ہونہہ! خوش فہمی ہے تمہاری کہ تمہارے سامنے عاجزی دکھا رہا ہوں..... میں..... ولید رحمان..... کبھی عاجز بنوں اور وہ بھی تمہارے سامنے ہو ہی نہیں سکتا۔"

اس نے کافی زور و شور سے نفی میں گردن ہلائی تھی اور تیمور ایک بلند قہقہہ لگا کر ہنسا۔

"تمہاری یہی کوالٹی تو مجھے بہت پسند ہے کہ تم کسی کے سامنے عاجز نہیں ہوتے' البتہ دوسروں کو عاجز ضرور کر ڈالتے ہو۔"

ولید نے سر ہلایا جیسے اس کی بات تسلیم کر لی ہو۔

"خیر.....! تم بتاؤ کہاں جا رہے ہو..... یہ تمہارا روٹ تو نہیں ہے۔" ولید اسے اس راستے پہ دیکھ کر پوچھے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔

"اپنی ثمینہ پھپھو کے گھر۔" تیمور لاپروائی سے بولا۔

"تو پھر مجھے کہاں لے جا رہے ہو.....؟" ولید ٹھٹکا۔

"اپنی ثمینہ پھپھو کے گھر۔" اس کا انداز لاپروائی ہنوز تھا۔

"کیوں؟ مجھے نہیں جانا..... مجھے یہیں ڈراپ کر دو۔"

ولید نے گردن موڑ کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے کافی تعجب سے کہا۔ مگر تیمور نے اس کی بات پر دھیان ہی نہیں دیا اور اسے سیدھا اپنے ساتھ لے آیا تھا۔

حالانکہ ولید نے بہت زیادہ شور بھی مچایا تھا۔

"یار.....! میرا یہاں کیا کام ہے؟" ولید گاڑی سے اترتے ہوئے جھنجلا گیا۔

"تمہیں میں لے کر نہیں آیا..... تمہاری قسمت لے کر آئی ہے..... اگر تمہاری قسمت میں نہ ہوتا تو شاید تم یوں راستے میں کھڑے ہی نہ ہوتے۔" تیمور نے اس کے قریب آتے ہوئے اس کا کندھا تھپکا۔

"ارے تیمور تم! بھئی یہاں کیوں کھڑے ہو۔ اندر آؤ ناں.....؟" اشتیاق یزدانی ڈرائیو وے پہ کھڑے تیمور کو دیکھ کر خاصے خوش ہوئے تھے۔

"السلام علیکم انکل! کیسے ہیں آپ؟" تیمور نے فوراً" آگے بڑھ کے ان کو سلام کیا۔

"وعلیکم السلام.....! میں ٹھیک ہوں اللہ کا شکر ہے..... تم بتاؤ اتنے لیٹ کیوں ہوئے ہو؟ تمہاری آنٹی کب سے تمہارا انتظار کر رہی ہیں؟"

"سوری انکل! وہ دراصل آفس میں کام کچھ زیادہ تھا' بس اسی میں ذرا ٹائم لگ گیا اینی وے! آپ اس سے ملیں یہ ہے میرا بہت ہی عزیز دوست ولید رحمان..... ایک ایسا دوست جس کی کمینگی کے باوجود مجھے اس سے دوستی پہ فخر ہے..... اور یہ ہے بھی فخر کرنے کے قابل....."

تیمور نے کہتے ہوئے ولید کے کندھے کے گرد اپنا بازو حمائل کرتے ہوئے اسے اپنے قریب کر لیا' جس پہ ولید بے ساختہ مسکرایا تھا۔

"السلام علیکم.....!" اس نے اشتیاق یزدانی سے مصافحہ کیا۔

"وعلیکم السلام! جیتے رہو بیٹا..... اللہ تم لوگوں کی یہ دوستی اور یہ فخر ہمیشہ سلامت رکھے۔"

اشتیاق یزدانی نے انہیں دعا دی۔

"آمین..... اللہ آپ کی زبان مبارک کرے۔"

اب کی بار ولید نے جواب دیا تھا اور تیمور مسکرا دیا تھا۔

"آؤ بیٹا! اندر آجاؤ....." وہ کہہ کر اندر کی طرف بڑھے۔

ان دونوں نے بھی ان کے پیچھے ہی قدم آگے بڑھا دیے۔

ڈرائنگ روم کے قریب آکر ان تینوں کے ہی قدم رک گئے تھے کیونکہ اندر سے ڈھولک کی تھاپ کے ساتھ لڑکیوں کے سریلے گانوں کی آوازیں بھی شروع ہو گئی تھی.....

اے دن ملیا دعاواں نال
آؤ سارے نچیے چاواں نال
آج دن خوشیاں والا چڑھیا
کہ ویرا شگناں دے نال بھریا
نی رب نے ملایا سب نوں
اوہدا شکر کراں لکھ واری کہ
ویرا اے دکھایا سب نوں

لڑکیوں اور عورتوں کے اس پنجابی گیت پہ اشتیاق یزدانی کے ساتھ ساتھ وہ دونوں بھی مسکرا اٹھے۔

"تم لوگ لاؤنج کی طرف آجاؤ' میں آفاق کو بلواتا ہوں وہ بھی نیچے آجائے گا۔" اشتیاق یزدانی ڈرائنگ روم کے ساتھ بنے ٹی وی لاؤنج کی طرف مڑ گئے۔

"لاؤنج میں تم بیٹھو' میں تو ڈرائنگ روم میں ہی ایزی فیل کروں گا۔" ولید نے آہستگی سے پھلجھڑی چھوڑی۔

تیمور نے اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھا۔

"تم جانتے ہو ناں کہ یہ میری پھپھو کا گھر ہے؟" تیمور نے اسے تنبیہہ کی۔

"یہ بھی جانتا ہوں کہ تمہاری پھپھو کی کوئی بیٹی نہیں ہے۔" تیمور اس کے سکون سے کہنے پہ دانت کچکچا کے

رہ گیا۔ کیونکہ آفاق قریب آچکا تھا۔

اس کے سلام کا تیمور نے بھی بڑی گرم جوشی سے جواب دیا تھا۔

پھر وہ ولید کی طرف متوجہ ہوا اور اس سے بھی ہاتھ ملایا۔

''مبارک ہو.....! سنا ہے آپ کی شادی ہو رہی ہے۔'' ولید نے آفاق کو چھیڑا۔ آفاق اس کی بات پہ قہقہہ لگا کے ہنس پڑا۔ وہ بھی اس کی شرارت سمجھ چکا تھا۔

در اصل میں یہاں اس خبر کی تصدیق کرنے کے لیے ہی آیا ہوں۔''

''ارے واہ تو پھر اندر آیئے..... آپ کو ذرا تفصیل سے خبر بھی دیتے ہیں اور فوٹو بھی بنواتے ہیں۔'' آفاق نے بھی ٹی وی لاؤنج کی طرف ہی اشارہ کیا۔ مجبوراً ولید کو وہیں قدم بڑھانے پڑے۔

''مسٹر آفاق یزدانی! میں نے ایک اور خبر بھی سنی ہے۔'' ولید نے تجسس پھیلانے والے انداز میں کہا۔

''وہ کیا.....؟'' وہ صوفے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے خود بھی اشتیاق یزدانی کے ساتھ والے صوفے پہ بیٹھ گیا تھا۔

''سنا ہے.....! آج کل پیار محبت اور شادی بیاہ کا سیزن چل رہا ہے؟ موڈ خاصے رومانٹک اور طبیعت کافی بے قراری پائی جا رہی ہے۔''

تیمور اس کے اس شگوفے پر اچھل پڑا۔

''شادی بیاہ تو چلو مان لیتا ہوں۔ لیکن یہ پیار محبت کا سلسلہ کچھ سمجھ نہیں آیا؟'' آفاق نے بھی کن اکھیوں سے تیمور کو ہی دیکھا تھا جو ولید کو گھور رہا تھا اور ولید اس کی طرف سے بالکل لاتعلق اور انجان بنا بیٹھا تھا۔

''آجائے گا سمجھ..... جلدی آجائے گا بس کچھ انتظار کریں۔'' اس نے آفاق کو اطمینان رکھنے کا اشارہ دیا تھا۔

''لیکن یار! کچھ اندازہ تو.....''

''ارے تیمور! تم کب آئے بیٹا! مجھے بتایا بھی نہیں؟'' اچانک ثمینہ یزدانی کے آجانے کی وجہ سے آفاق کا جملہ ادھورا ہی رہ گیا تھا اور تیمور مسکراتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

''السلام علیکم.....! میں ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی آیا ہوں' آپ سنائیں سب خیریت ہے نا؟'' وہ ان دونوں کی گفتگو چھوڑ کے ثمینہ یزدانی کی طرف متوجہ ہو گیا۔

''ہاں بیٹا.....! اللہ کا شکر ہے سب خیریت ہی ہے۔ تم سے پوچھنا تھا کہ تم نے فیصل آباد میں بکنگ کروائی ہے اس کی طرف سے سب تسلی بھی کی ہے یا نہیں.....؟''

ثمینہ یزدانی وہاں کے انتظامات کے لیے فکر مند ہو رہی تھیں۔

''ارے پھپھو.....! آپ کو کہا تو ہے کہ آپ نے جو کام مجھے سونپے ہیں ان کی طرف سے ذرا بھی پریشان نہ ہوں' میں نے آج صبح ہی اپنے منیجر کو فیصل آباد بھیج دیا تھا اور ایک چکر حماد بھی لگا آیا ہے' ساری سیٹنگ کمپلیٹ ہے' بس آپ کل بارات لے کر روانہ ہونے کی تیاری کریں..... میں نے جہاز کی ٹکٹیں بھی کنفرم کروالی ہیں۔'' تیمور نے انہیں ایک بھرپور تسلی دی تھی۔

''آپ کو کیا پتا کہ آپ نے اپنے کام ایک کاروباری بندے کو سونپے ہیں' جو ہر کام وقت سے پہلے کرنے کا عادی ہے اور جس نے ہر کام کی پلاننگ بھی پہلے سے ہی کر کے رکھی ہوتی ہے۔'' یہ لقمہ ولید نے دیا تھا۔ ثمینہ یزدانی ولید کی طرف متوجہ ہوئیں۔

''ارے.....! تم بھی ساتھ آئے ہو؟'' ثمینہ یزدانی نے کافی خوشی کا اظہار کیا۔

''السلام علیکم.....!'' ولید انہیں اپنی طرف متوجہ ہوتے دیکھ کر فوراً اپنی جگہ سے اٹھا۔

''وعلیکم السلام.....! جیتے رہو بیٹا! خوش رہو اللہ عمر دراز کرے۔'' انہوں نے ولید کے کندھے پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے دعا دی۔

''تھینک یو آنٹی.....! کوئی اور دعا بھی دے دیتیں تو کیا جاتا آپ کا.....؟'' ولید نے آہستگی سے کہتے ہوئے جیسے

شکوہ کیا تھا اور ثمینہ یزدانی اس کی بات سن کر پہلے ٹھٹکیں' پھر بے ساختہ ہنس پڑیں۔

''اچھا! کون سی دعا.....؟'' انہوں نے بڑی دلچسپی سے پوچھا۔

''وہی جو آپ نے اپنے بیٹے کو دی ہے اور آج اس کے بھاگ جاگے ہیں۔''

''اوہ!'' وہ سمجھ کر ہنس پڑیں۔

''اللہ جلدی سے تمہارے بھی نصیب جگا دے اور تمہارے سہرے کے بھی پھول کھلیں اور تمہاری امی بھی اپنے سارے ارمان پورے کریں۔''

انہوں نے ولید کے کندھے پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے اسے مزید دعائیں دیں۔ اور ان دعاؤں پہ ولید کے ساتھ ساتھ تیمور' آفاق اور اشتیاق یزدانی بھی ہنس پڑے تھے۔

''اسے کہتے ہیں دعا کروانا.....'' ولید فخریہ انداز میں مسکرایا۔ اتنے میں ملازمہ ان کے لیے کولڈ ڈرنک لے آئی۔

''بابا کو کس لیے کال کی تھی آپ نے.....؟'' تیمور جوس کا گلاس اٹھاتے ہوئے اشتیاق یزدانی اور ثمینہ یزدانی کی طرف متوجہ ہوا۔

''ارے ہاں.....! وہ دراصل کچھ کارڈز بھجوانے تھے ان کی طرف۔ ان کے کچھ دوستوں کو بھی انوائیٹ کیا ہے' مگر ایڈریس کا نہیں پتا اس لیے بھائی صاحب کو کہا کہ وہ یہ کارڈز خود ہی بھجوا دیں تم جاتے ہوئے یہ کارڈز بھی ساتھ لے جانا۔''

ثمینہ نے سائیڈ والی ٹیبل پر رکھے چار پانچ انویٹیشن کارڈز اٹھا کر تیمور کی طرف بڑھا دیئے۔

''اوکے! لے جاؤں گا لیکن یہ کیا بات ہوئی بھلا؟ آپ کو بابا کے دوستوں کو انوائیٹ کرنا یاد ہے اور میرے اکلوتے دوست کی خبر ہی نہیں ہے.....؟ یہ تو سراسر ناانصافی ہوئی نا..... بھاگ دوڑ میں کروں اور انوائیٹ بابا کے دوستوں کو کیا جائے؟''

تیمور نے فوراً شکوہ داغ دیا اور ولید اس کے شکوے پہ چونک گیا تھا کہ تیمور نے مجھے کہاں پھنسا دیا ہے؟

''یہ صرف تمہارا دوست نہیں ہے یہ ہمارا بھی دوست ہے اور دوستوں کو کوئی بھولتا نہیں ہے' اگر دیکھنا چاہتے ہو تو دیکھ لو..... ساجدہ' ساجدہ! ادھر اندر آؤ۔''

آفاق نے تیمور سے کہتے ہوئے اپنے گھر کی ملازمہ کو آواز دی۔

''جی صاحب؟''

''اوپر میرے بیڈ روم میں جاؤ اور بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پہ رکھا کارڈ اٹھا کر لاؤ..... جلدی شاباش۔'' آفاق نے اشارہ کیا۔ ساجدہ فوراً واپس پلٹ گئی اور ٹھیک تین منٹ بعد وہ سرخ رنگ کا ایک انویٹیشن کارڈ اٹھا کر نیچے لے آئی۔

ساجدہ سے کارڈ لے کر آفاق نے ولید کی طرف بڑھا دیا۔

ولید کارڈ پہ لکھا اپنا نام پڑھ کر ہی حیران رہ گیا کہ آفاق نے اپنی خوشی کے موقع پہ اسے بھی یاد رکھا۔

''جی ہاں! آپ کے لیے ہی ہے' مجھے بہت اچھی طرح یاد تھا کہ آپ کو بھی انوائیٹ کرنا ہے۔ اسی لیے یہ کارڈ اپنے بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پہ رکھا ہوا تھا اور سوچا تھا کہ صبح آپ کے گھر یا دفتر جا کر دوں گا لیکن اتفاق دیکھ لیں کہ آپ خود ہی یہاں آگئے ہیں۔''

آفاق نے مسکراتے ہوئے تیمور کی طرف دیکھا جو اس دلچسپ اتفاق پر مسکرا رہا تھا۔

''اب بولو.....! تمہارے دوست کا خیال ہے یا نہیں؟'' اس نے سوالیہ نظروں سے چھیڑا۔

''مان گئے یار..... مان گئے! تھینک یو سو مچ! یہ تم نے میرے دوست کو نہیں' بلکہ یوں سمجھو کہ مجھے یاد رکھا ہے۔'' تیمور نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے اس کی اپنائیت اور خلوص کا اعتراف بھی کیا اور اس کا شکریہ بھی ادا کیا۔

''ارے.....! تھینکس تو میں کہوں گا۔ اگر ولید صاحب میری شادی میں شرکت کریں گے اور میری بارات کے ساتھ فیصل آباد چلیں گے۔''

آفاق نے بارات کے ساتھ چلنے کا کہہ کر ولید کو بوکھلانے پہ مجبور کر دیا تھا۔

"بارات کے ساتھ.....؟"

"جی بارات کے ساتھ.....ورنہ یہاں فنکشن تو کوئی بھی اٹینڈ کر سکتا ہے۔"

"سوچ کر بتاؤں گا۔ اگر کام کی طرف سے کچھ اسپیس مل گئی تو ضرور چلوں گا۔" ایک دم سے انکار کر دینا اسے مناسب نہیں لگا تھا۔

"وعدہ.....؟" آفاق نے اسے پکا کرنا چاہا۔

"اوکے.....وعدہ....." اب ولید کے پاس کوئی راستہ نہیں بچا تھا۔

اتنے میں اس کے موبائل کی رنگ بجنے لگی۔ وہ اسکرین پہ نمبر دیکھ کر فوراً" وہاں سے اٹھ کھڑا ہوا۔

"ایکسکیوزمی....." وہ کہہ کر لاؤنج سے نکل آیا تھا۔

"ہیلو....." ولید فون کی دوسری طرف موجود کسی سے کہتا کاریڈور کی طرف آنکلا لیکن ڈرائنگ روم کے سامنے سے گزرتے ہوئے اس کے قدم ٹھٹک گئے اور نظریں بھی ٹھٹک گئی تھیں۔

بلے بلے او شاوا شاوا

عزت، ساشا اور اس کی چھوٹی بہن علیشہ تینوں اس پنجابی گیت پہ ہنسی، قہقہے لگاتی بھنگڑا ڈال رہی تھیں اور ولید ان تینوں میں سے صرف ایک کو دیکھتا رہ گیا اور اسی لمحے عزت نے بھی اسے دیکھ لیا۔ ولید پہ نظر پڑتے ہی وہ یکدم ٹھہر گئی جبکہ ولید نظروں کا تصادم ہوتے ہی شرمندہ ہو گیا تھا کہ وہ کیا سوچے گی کہ وہ یوں چوری چھپے اسے دیکھ رہا تھا۔

"عزت! رکو نا.....! کہاں جا رہی ہو.....؟" ساشا نے اسے ڈرائنگ روم کے داخلی دروازے کی سمت بڑھتے دیکھ کر روکا۔

"آ رہی ہوں.....!" وہ کہہ کر باہر نکل آئی تھی اور ولید چاہ کر بھی وہاں سے ہٹ نہیں سکا کیونکہ اسے اپنی طرف آتے دیکھ کر وہ سامنے سے ہٹ جاتا تو یہ بھی مناسب نہیں تھا۔

"ہیلو.....! عزت نے اسے سرتاپا دیکھتے ہوئے ذرا متبسم سے لہجے میں ہیلو کہا۔

"کیسی ہیں آپ؟" ولید کو بھی تو کچھ کہنا ہی تھا۔

"میں کیسی ہوں؟ یہ تو آپ دیکھ ہی چکے ہیں۔" وہ اس کے سوال پہ ہنسی اور ولید تھوڑا سا خجل ہو گیا۔

"ایم سوری! میں دراصل ایک فون کال سننے کے لیے لاؤنج سے باہر آیا تھا کہ یونہی گزرتے ہوئے....." ولید نے کہتے ہوئے بات ادھوری چھوڑ دی۔

"کہ یونہی گزرتے ہوئے مجھ پہ نظر پڑ گئی اور آپ رک گئے..... ہے نا؟" وہ جان بوجھ کر اسے ستانے والے اور اسے چھیڑنے والے سوال کر رہی تھی۔

"آپ کا یہ رکنا مجھے اچھا لگا۔"

وہ بڑے سرشار سے انداز میں بولی تھی اور ولید کچھ کہنے کے لیے الفاظ ہی تلاش کرتا رہ گیا۔ اتنے میں تیمور اور آفاق بھی اٹھ کر لاؤنج سے باہر آ گئے۔

"السلام علیکم.....!" عزت نے تیمور اور آفاق دونوں کو ہی سلام کیا۔

"وعلیکم السلام.....! تم کب آئی ہو؟" آفاق نے سلام کا جواب دیتے ہوئے پوچھا۔

"میں ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی آئی ہوں۔ بھائی! آپ کہاں جا رہے ہیں؟" عزت آفاق کو جواب دے کر تیمور کی طرف متوجہ ہوئی۔

"میں گھر ہی جا رہا ہوں راستے میں ولید کو ڈراپ کرنا ہے بس۔" تیمور نے کندھے اچکائے۔

"اوکے! جائیں آپ لوگ۔ ہم تو ذرا لیٹ ہی آئیں گے۔" عزت سرہلاتے ہوئے ذرا پیچھے ہٹی لیکن آفاق کی بات پہ اس کے قدم ٹھٹکے تھے۔

"ٹھیک ہے ولید صاحب! میں بارات میں آپ کا انتظار کروں گا۔" آفاق ولید سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہہ رہا تھا اور عزت اس کا بارات میں آنے کا سن کر سر سے پاؤں تک جھوم اٹھی تھی۔

☼ ☼ ☼

آج انیس تاریخ تھی۔ آج فارہ اور آفاق کی مشترکہ مایوں اور مہندی کی رسم تھی۔

ماورا نے اپنی تیاری سرِ شام ہی شروع کر دی تھی۔

ماورا تیار ہو کر اپنے بالوں میں ہیئر برش پھیر رہی تھی کہ فارہ کا میسج بھی آ گیا۔

"ماورا کہاں ہو..... کب پہنچ رہی ہو؟ وہ لوگ بھی فیصل آباد پہنچ چکے ہیں۔"

"بس پانچ منٹ اور..... میں گھر سے نکل ہی رہی ہوں۔" اس نے میسج لکھا اور بھیج دیا۔ اور ساتھ ہی جلدی جلدی اپنے بالوں کو سیٹ کر کے دوپٹا اوڑھتے ساری چیزیں سمیٹ کر کمرے سے باہر نکل آئی۔

"ماشاءاللہ..... ماشاءاللہ..... اللہ نظرِ بد سے بچائے..... بہت پیاری لگ رہی ہے میری بچی۔" بی گل اسے دیکھ کر کھل اٹھی تھیں اور عافیہ بیگم اسے دیکھ کر نظر چرا گئی تھیں۔

"تھینک یو گل! اوکے امی! میں چلتی ہوں۔ فارہ بار بار میسج کر رہی ہے۔ اس نے ابھی تیار بھی ہونا ہے اس لیے مجھے ذرا جلدی پہنچنا ہو گا۔ اس کا ڈرائیور انتظار کر رہا ہے۔"

ماورا بی گل کا شکریہ ادا کرتی عافیہ بیگم کی طرف بڑھی۔ وہ دل پہ پتھر رکھ کے سرہلا کے رہ گئیں۔

"ٹھیک ہے جاؤ تم.....! لیکن ذرا جلدی آنے کی کوشش کرنا، ہمیں پریشانی ہوتی رہے گی۔" وہ اپنے وہم اور خدشات کے ہاتھوں مجبوراً اسے تاکید کرنے سے رہ نہ سکیں۔

"ان شاءاللہ میں جلدی آ جاؤں گی۔ آپ پریشان نہ ہوں۔" اس نے ان کا ہاتھ پکڑ کر انہیں تسلی دی اور خدا حافظ کہہ کر دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

"دیکھو میرا بچہ.....! دھیان رکھنا، وہاں رضا حیدر بھی ہو گا، میرا دل ہول رہا ہے۔" بی گل اس کے پیچھے دروازے تک آئی تھیں۔

"میں بھی تو اسی لیے جا رہی ہوں بی گل! کہ وہاں رضا حیدر بھی ہو گا..... اب آپ کا دل ہولنا نہیں چاہیے۔ دل مضبوط رکھیں۔ جیسے پہلے رکھا تھا۔ ان شاءاللہ مجھے کچھ نہیں ہو گا۔"

وہ آہستگی سے بی گل سے کہتی دہلیز عبور کر گئی اور بی گل دروازے کے قریب کھڑی رہ گئیں۔

☼ ☼ ☼

"ماورا! یہ..... یہ تم ہو؟ یا میرا کوئی خواب.....؟"

جیسے ہی ماورا نے فارہ کے بیڈ روم میں قدم رکھا فارہ اسے دیکھ کر مبہوت رہ گئی تھی۔

"کیوں.....؟ کیا ہو گیا ہے تمہیں.....؟" ماورا کو حیرت ہوئی۔

"تمہیں کچھ نہیں ہوا مگر آج مجھے ضرور کچھ ہو جائے گا۔" فارہ غش کھانے کو تھی۔

"کیا ہو جائے گا؟" ماورا جان بوجھ کر پوچھ رہی تھی۔

"ہارٹ اٹیک....."

"بدشگونی کی باتیں مت کرو۔ اتنا مبارک موقع ہے۔" ماورا نے اسے ڈانٹا۔

"یار! حسن دل پر ہی تو وار کرتا ہے۔"

"افوہ! فضول باتیں نہ کرو، جلدی اٹھو۔" ماورا اس کی چیزیں نکالنے لگی اور بیوٹیشن نے فارہ کو تیار کرنا شروع کر دیا۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاءاللہ)

اُمِ مریم

سسکتی

"جانم کل پھر ٹائم پہ ہی تیار ہو جانا یاد سے۔"
سالار نے آئینے کے آگے کھڑے ہو کر بال بناتے ہوئے کہا تو رومیصہ، جو اسد کی نیپی چینج کر رہی تھی کسی قدر چونکی۔

"خیریت کہیں جانا ہے کیا؟"

"افوہ اک تو تم بھلکڑ بہت ہو۔ یار بتایا تو تھا کل اکبر کا ولیمہ ہے ود فیملی انوائیٹ کیا ہے۔" سالار نے زچ ہو کر جواب دیا اکبر اس کا دوست تھا۔

"تو آپ جائیں گے ود فیملی؟ اینڈ مائنڈ اٹ میں ہمیشہ سے بھلکڑ نہیں تھی' آپ کی آل اولاد نے مل کر میرے سارے حواس چھین لیے ہیں۔" وہ جل کر کہہ رہی تھی سالار نے ہمیشہ کی طرح ہنس کر ٹال دیا۔

"ظاہر ہے بھئی جائیں گے کیوں نہیں۔ ہمارے بچے خوش ہو جائیں گے۔"

"تو پھر آپ ہی اپنے بچوں کے ساتھ تشریف لے جائیے گا۔ میں نہیں جا رہی پلٹون کے ہمراہ۔"

وہ ناک چڑھا کر نخوت سے بولی تو سالار نے بے اختیار گہرا سانس بھرا تھا اب اسے قائل کرنے کو کم از کم بھی دو تین گھنٹے تو لازماً اس کی منت سماجت کرنا پڑتی۔ اکبر کی امی نے کتنے اصرار سے رومیصہ کو ساتھ لانے کا کہا تھا۔ اس کی بھولی صورت کچھ زیادہ ہی بھا گئی تھی شاید۔

"یار! بچے تمہیں کیا کہتے ہیں؟ میں انہیں خود دیکھ لوں گا ڈونٹ وری۔"

"اونہہ! دیکھ لیں گے۔ واش روم لے کر جائیں گے یا پھر جب یہ کپڑے گندے کر لیں گے وہ بدلوائیں گے؟... اوپر سے لوگوں کی ترحم بھری نظریں، مجھے رونا آنے لگتا ہے۔" وہ پہلے طنز سے پھر جھنجھلا کر کہنے لگی آخیر میں جیسے روہانسی ہوئی تو سالار نے ہونٹ بھینچ لیے تھے جبکہ اس کا غصہ ابھی کہاں اترا تھا۔

"پتا بھی ہے لوگ کتنا مذاق اڑاتے ہیں میرا؟ آفاق بھائی کی شادی پہ جب میں آپ کے پانچ بچوں کے ساتھ بارات میں گئی تو ان کی ریں ریں اور شرارتوں سے عاجز ہو کر ایک خاتون نے مجھے کیا کہا تھا؟ کہنے لگیں بیٹا انہیں ان کی ماں کے حوالے کر دو ماں کا بھی حق ہوتا ہے مگر تم تو خود دھان پان سی ہو پھر پانچ پانچ بچے کیسے سنبھالو گی؟" اور میں تو زمین میں گڑھ گئی تھی کیا جواب دیتی مگر وہ سمیعہ بھابھی ہیں نا گھنی میسنی برا مسکرا کر بولیں اماں جی! یہ سارے اسی کے تو بچے ہیں' لگتی نہیں ہے نا ان کی ماں؟ دراصل چھوٹی عمر میں شادی ہو گئی تھی اور بچے تو جیسے آسمانوں پر تھے ہی اس انتظار میں کہ اماں بیاہتا ہوں اور ہم پہنچیں ان کی گود میں "اف کیسی کمینی ہنسی تھی تب ان کے ہونٹوں پہ آپ دیکھتے تو پتا چلتا نا؟"

سالار نے اس کی موٹی موٹی سحر طراز آنکھوں میں آنسو دیکھے تو ساری جھنجھلاہٹ بھلا کر مسکرانے لگا۔

"یار بس بے وقوف ہو تم بھی۔ شرمندگی بھلا کس بات کی؟ بچے تو اللہ کی نعمت ہیں ان لوگوں کو دیکھو جو بے اولاد ہیں کیسے ترستے ہیں۔"

"مگر یہ بھی تو دیکھیں ہماری شادی کو صرف چار سال ہوئے ہیں چار سال میں پانچ بچے۔ مذاق کی بات تو ہے نا لوگ تو میرا مذاق اڑاتے ہیں نا۔ کبھی بچے بنانے والی مشین کہتے ہیں کبھی خاندانی منصوبہ بندی کی دشمن۔"

"تم ان کی باتیں کیسے سن لیتی ہو۔ منہ نہیں توڑا جاتا تم سے ایسے جاہلوں کا؟ لاحول ولا قوۃ الا باللہ! حد ہے یعنی جہالت کی۔"

وہ واقعی غصے میں آگیا تھا۔ "میں بھی آپ سے شادی کر کے پچھتا رہی ہوں۔ دیا کیا ہے آپ نے مجھے ان ڈھیر سارے بچوں کے سوا؟ جن کے گند صاف کرتے انہیں سنبھالتے میں سچ مچ پاگل ہو رہی ہوں۔"

وہ بھی چیخ پڑی تھی۔ اصل بات بیچ میں رہ گئی تھی۔ وہ اسد کو بیڈ پر پٹخ کر تن فن کرتی کمرے سے چلی گئی۔ سالار روتے ہوئے اسد کو دیکھتا سر تھامے بیٹھا تھا۔

☼ ☼ ☼

"بچے کدھر ہیں؟" سالار نے گھر میں آتے ہی غیر معمولی خاموشی کو محسوس کر لیا تھا۔

"امی کے گھر۔ صبح ذیشان کو فون کیا تھا آ کر لے جائے۔" وہ سرخ بنارسی ساڑھی پہنے آئینے کے آگے کھڑی میک اپ کرنے میں مصروف تھی۔

"مگر کیوں؟ تمہیں پتا ہے ممانی جان کو اس عمر میں گھٹنوں کی تکلیف شروع ہو گئی ہے کیسے سنبھالیں گی۔" وہ سخت زچ ہو گیا تھا۔

"آپ نے مجھے شادی پر لے کے جانا ہے یا نہیں۔" رومیصہ نے ایک جھٹکے سے لپ اسٹک بند کر کے ڈریسنگ ٹیبل پر پٹخ دی پھر اسے کسی قدر گھور کر طنز سے بولی تھی۔

"اطلاعاً" عرض ہے کہ انہیں ہر وقت سنبھالتے میرے بھی جانے کہاں کہاں درد شروع ہو گئے ہیں مجھے بھی سکون چاہیے اور مزید یہ کہ آپ کے پاس صرف ایک بائیک ہے جس پر پانچ بچوں کے ساتھ بہرحال ہم دونوں بھی سفر نہیں کر سکتے۔"

رومیصہ کے لہجے میں کسی قدر تلخی تھی سالار ہونٹ بھینچ کر رہ گیا۔ ولیمہ کی تقریب میں وہ جتنا

خاموش سا تھا وہ اسی قدر مطمئن اور سرشار صرف چھوٹی لینا ہی اس کے پاس تھی۔ سالار کو اس کا یہ خودستائشی کا انداز گراں گزر رہا تھا۔ مگر خاموشی کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔

"یہاں کدھر جا رہے ہیں؟" واپسی پہ جب سالار نے بائیک کو رومیصہ کی امی کے گھر کی طرف موڑا تو اس نے کسی قدر ناگواری سے پوچھا تھا۔

"بچوں کو لینے کا ارادہ ہے کہ نہیں؟" تمام تر ضبط کے باوجود سالار کو تپ چڑھ گئی تھی۔

"میں زیشان سے کہہ دوں گی فون پہ 'رات کو چھوڑ جائے گا۔ ابھی بہت تھکی ہوئی ہوں گھر جا کے آرام کروں گی جو آپ کے بچوں کی موجودگی کے باعث تو خواب و خیال ہی ہوتا ہے۔" اس کے بے زار کن انداز میں تلخی کا عنصر بھی نمایاں تھا۔ سالار کا ضبط جیسے اسی دم چھلک گیا۔

"اچھا کس بات پہ تھکن ہو گئی آپ کو میڈم؟ کیا کیا ہے آپ نے وہاں باتیں کرنے اور شیخیاں بگھارنے کے سوا۔"

"دیکھا نا جل گئے فوراً" مرد اتنے ہی تنگ نظر ہوتے ہیں جیسے ہی اپنی بیوی پہ ستائشی نگاہوں کا اٹھنا محسوس کیا جل بھن کر کباب ہو گئے ہیں۔" وہ حظ لیتے ہوئے بھی اس کے لتے لینے سے باز نہیں آئی۔

"بکواس مت کرو۔" سالار نے بے دریغ جھاڑ دیا۔ بائیک کالونی میں داخل ہو گئی تھی۔ ڈیفنس ویو کے نام سے یہ ایک خوب صورت رہائشی علاقہ تھا جس کے اطراف چہار دیواری کی گئی تھی اور انٹرنس پہ مین گیٹ تھا۔ گلابی پھولوں والی بیلوں سے ڈھکی دیواروں والے گھر کے آگے سالار نے بائیک روکی اور اتر کر اندر چلا گیا۔ ممانی جان اسد اور اسامہ کو پاس بٹھائے کھانا کھلا رہی تھیں جبکہ فاطمہ اور عشنا سو رہی تھیں۔

"السلام علیکم! کیسی ہیں ممانی جان! بچوں نے تنگ تو نہیں کیا۔" وہ ان کے پاس آ بیٹھا۔ انہوں نے تپاک سے سلام کا جواب دیا سر پہ ہاتھ پھیرا آخری سوال پہ شفقت سے مسکرائیں۔

"یہ ننھی جانیں کیا کہتی ہیں کسی کو بیٹا! بلکہ ان کے آنے سے تو گھر میں رونق ہو جاتی ہے۔ بہت تمیزدار بچے ہیں۔"

"اچھا! لیکن ان کی والدہ ماجدہ کا تو خیال ہے یہ دنیا کے سب سے بدتہذیب اور بدتمیز بچے ہیں۔"

سالار نے مسکرا کر کہتے گویا اندر آتی رومیصہ کا موڈ بحال کرنا چاہا مگر وہ تو جیسے پھٹ پڑی تھی۔

"ہاں ہاں کر لو میری غیبتیں میری ماں سے شرم تو آتی نہیں ہے نا؟"

"اف!" سالار کو ایک دم خفت نے سرخ کر ڈالا وہ اکثر یونہی بے لحاظ ہو جایا کرتی تھی' شرمندہ تو ممانی جان بھی ہوتی تھیں داماد کے ساتھ بیٹی کی بدزبانی پر' جبھی اسے بری طرح سے جھڑک کر رکھ دیا۔

"یہ کیا بدتمیزی ہے رومیصہ! شوہر ہے تمہارا اس طرح بات کرتے ہیں؟"

"اونہہ شوہر' سارے خیال بیوی کو ہی رکھنے ہوتے ہیں۔ شوہر جو مرضی کرتا پھرے۔"

لینا کو گود سے اتار کر بستر پہ پٹخا اور فاطمہ کو جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر جگانے لگی تو سالار سے رہا نہیں گیا۔

"افوہ رومیصہ کیا کر رہی ہو؟ اس طرح جگاتے ہیں بچوں کو؟"

"پھر کیا گیت گا کر جگاؤں؟" وہ بری طرح سے تڑخی اور سوئی ہوئی فاطمہ اور عشنا کو گھسیٹ کر بستر سے اتارا اور یونہی ساتھ کھینچتی باہر لے گئی۔

"بیٹا! یہ بہت بے وقوف ہے۔ ہم شرمندہ ہیں کہ۔"

"پلیز ممانی جان! ایسا مت کہیے۔ اس میں آپ کا تو کوئی بھی قصور نہیں ہے۔ یہ شادی سے پہلے ایسی تھوڑا ہی تھی۔ بچوں میں پڑ کے کچھ بدل گئی ہے۔ بس آپ بہتری کی دعا کیجیے گا۔" سالار سے ان کی خفت دیکھی نہ گئی تو نرمی و رسان سے کہتا اٹھ کھڑا ہوا۔

"بہت دعا کرتی ہوں بیٹا کہ یہ سدھر جائے۔ اس کا رویہ ہمارے لیے بھی تکلیف دہ ہے۔ پھر تم تو ہر وقت سہتے ہو۔" ممانی جان بے حد ملول تھیں۔ وہ ان کی رنجیدگی دیکھ کر دانستہ مسکرایا۔

"آپ پریشان نہ ہوں ہر وقت ایسا موڈ نہیں ہوتا۔ کبھی کبھار صحیح بھی ہوتی ہیں۔"

"کاش یہ کبھی کبھار والی خوشگواری ہمیشہ پہ غالب آجائے آمین!"

ممانی جان نے صدق دل سے دعا کی تھی اور انہیں رخصت کرنے کے خیال سے باہر آ گئیں۔

☼ ☼ ☼

"رومی! رومی کیا کر رہی ہو؟ لینا رو رو کر ہلکان ہو رہی ہے اسے تو پکڑو۔"

سالار ہاتھ لے کر واش روم سے باہر آیا تو بیڈ پر ہاتھ پیر مار کر روتی بلکتی ہوئی لینا کو اٹھا کر سینے سے لگاتے ہوئے زور سے پکارا۔

"فارغ نہیں بیٹھی ہوئی۔ بچوں کو اسکول کے لیے تیار کر رہی ہوں ان کی وین آنے والی ہے۔"

وہ وہیں سے جواباً چیخی۔ سالار بہ کچھ کہے بغیر لینا کو اٹھا کے پھرتا رہا اب ہچکیاں بھرتی اپنا انگوٹھا چوس رہی تھی یقیناً بھوکی تھی بچے تیار ہو کے اسکول گئے تب وہ لینا سمیت اس کے پاس آیا تھا۔

"اسے تو پکڑو مجھے بھی آفس جانا ہے۔" اس نے وال کلاک پہ نگاہ ڈال کر تحمل سے کہا پھر بھی وہ جھنجھلا اٹھی تھی۔

"یہ ابھی جاگ ہی رہی ہے؟ اگر آپ نے اسے جھولے میں ڈال کر جھولا دیا ہوتا تو سو جاتی نا۔"

"مجھے یہ ترکیب اگر تم نے پہلے بتائی ہوتی تو لازماً ایسا ہی کرتا۔" وہ کسی قدر خفگی سے کہتا لینا کو اسے پکڑا کر خود اپنی شرٹ اٹھا کر پہننے لگا۔

"ناشتہ تیار ہے میرا؟" مکمل تیاری کے بعد وہ اس سے مخاطب ہوا لینا کو جھلاتی خود بھی نیند کے جھونکوں میں ادھر ادھر ڈول رہی تھی اس کی بات سنی تو منہ بنا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

"بنائی ہوں۔ اتنا ٹائم ہی کہاں ملا۔ بچوں کو کچا پکا کھلا کر بھیجا لنچ بھی تیار نہ کر سکی۔ بریک میں کچھ کھانے کو پیسے دیے ہیں۔" اس کی داستان امیر حمزہ نے سالار کو جی بھر کے کوفت کا شکار کیا یہ روز کی ہی کہانی تھی مگر آج اسے غصہ آنے لگا تھا۔ ٹائم بھی تو نہیں تھا اب۔ جبھی بہت سرد سے انداز میں اسے ٹوک دیا تھا۔

"کوئی ضرورت نہیں ہے اس زحمت کی' جا رہا ہوں میں۔"

وہ اس کے تنکنے کی پروا کیے بغیر اپنا بیگ اٹھائے بائیک گھسیٹتا ہوا چلا گیا شام کو تھکا ہارا واپس آیا تو الٹا رومیصہ منہ پھلائے بیٹھی تھی۔ بچے اسے دیکھتے ہی اس کی سمت لپکے تھے۔

"پپا بھوک لگی ہے۔ مما نے کھانا نہیں دیا۔" اس اطلاع نے سالار کو متحیر کر ڈالا تھا وہ تنتنا[illegible]س کے پاس آیا تھا۔

"بچوں کو کھانا نہیں کھلا سکتی تھیں تم۔"

"جہاں باپ عیاشیاں کر سکتا ہے کھانے پینے کی وہاں یہ بھی کھالیں میں نوکرانی نہیں ہوں کہ کام بھی کروں اور نخرے بھی سہوں۔" جواباً وہ نروٹھے پن سے بولی۔

"چلو اٹھو میں کھانا نکال کر لاتا ہوں۔ اکٹھے کھائیں گے۔" وہ جان گیا تھا اس نے بھی نہیں کچھ کھایا جبھی موڈ اتنا خراب ہے۔ ہاتھ پکڑ کر اٹھاتے ہوئے کہا تو وہ کچھ اور تلخ ہو گئی۔

"میں نے کچھ نہیں پکایا ہے۔"

"کیا مطلب؟" وہ ٹھٹکا تھا۔

"آپ صبح جو نہیں کھا کے گئے تھے۔" وہ منہ پھلا کر بولی تو سالار زچ ہونے لگا تھا۔

"تم نے کچھ بنایا ہوتا تو کھاتا نا؟"

"میں بنانے جا رہی تھی مگر آپ۔۔۔ کس کے لیے کرتی ہوں یہ سب کچھ۔ آپ کے بچوں نے میری نیندیں ہی کیا سکون بھی حرام کر کے رکھ دیا ہے۔ رات کو بارہ بجے سوتی ہوں۔ صبح اذان کے ساتھ اٹھ کر بھی کام نہیں نبٹتے مشین بن کر رہ گئی ہوں۔ یا بچوں کو جنم دینا یا پھر گدھوں کی طرح سے کام کرنا۔ اس پر آپ کا

خراب موڈ بھی سہوں تو کیوں؟"

وہ روہانسی ہو کر کہتی باقاعدہ رونے کی تیاری میں تھی۔ شادی سے پہلے نازک سی لڑکی تھی، سالار جاب کے سلسلے میں ان کے شہر آیا تھا تب ماموں نے کہیں اور ٹھہرنے نہ دیا اور اپنے گھر لے آئے۔ وہیں نہ صرف رومیصہ اس کی وجیہہ چارمنگ پرسنالٹی سے متاثر ہوئی، وہیں سالار بھی اس کالج کی دوشیزہ کے لیے اپنا دل دھڑکتا محسوس کرنے لگا تھا پتا ہی نہ چلا کب دونوں محبت کے راستے پر گامزن ہو گئے۔ یہ فاصلے جب دونوں کو گراں گزرے تب سالار نے اس کی مکمل رضا مندی پہ اپنے والدین تک بات پہنچائی اور جائز طریقے سے اسے حاصل کر لیا۔ محض انیس سال کی تھی جب شادی ہوئی چوبیس سال کی عمر تک وہ پانچ بچوں کی ماں بن چکی تھی مگر تھی ویسی ہی نازک سلم اور خوب صورت، دیکھنے والا یہ تک نہ جان پاتا کہ اس کی منگنی بھی ہوئی ہے۔

شادی کے ایک ماہ بعد ہی پریگننٹ ہوئی تو اس کا منہ بن گیا تھا وہ اتنی جلدی پابند ہونا نہیں چاہتی تھی۔

مگر اب کچھ ہو بھی نہ سکتا تھا پہلی مرتبہ اس کے ہاں دو جڑواں بچوں نے جنم لیا تھا۔ اسد اور اسامہ ابھی صرف سوا سال کے تھے جب فاطمہ اور عشنا کی اکٹھی پیدائش ہوئی وہ تو کچھ ایسے بوکھلائی کہ باقاعدہ رو پڑی۔ اسامہ اور اسد کی مرتبہ تو پھپھو زندہ تھیں اسے پتا ہی نہ چلا تھا مگر اب چار چار بچوں کو سنبھالنا اسے پہاڑ سر کرنے کے مترادف لگ رہا تھا۔ پھر ڈھائی سالوں میں چار بچے اس کی فرینڈز جو ابھی زیر تعلیم تھیں اکثر اس سے ملنے آتیں تو اس ترقی پہ اس کا مذاق اڑاتیں جسے ہمیشہ رومیصہ نے دل پہ لیا۔ خاندان کے لوگ عزیز رشتہ دار سب ہی ہمدردی کی آڑ میں جب اس پہ ترس کھاتے تو اسے لگتا سب اس کا مضحکہ اڑا رہے ہیں۔ وہ بچوں سے بے زار رہنے لگی اور سالار سے مطالبہ کر دیا کہ اسامہ اور اسد کو امی کو دے دیں۔ پہلے پہل تو سالار نے ان سنی کر دی مگر جب اس نے ضد باندھ لی تو چڑ گیا۔

"بچے ہیں ہمارے کوئی نمک پارے بتاشے نہیں کہ اٹھا کر بانٹ دوں۔ پاگل ہو رہی ہو تم تو۔"

"ہاں ہو رہی ہوں پاگل کیسے سنبھالوں ان چار چار مصیبتوں کو اکیلی جان پھر ہمیشہ کے لیے تو نہیں دوں گی جب یہ ذرا بڑے ہو جائیں گے تو واپس لے لوں گی۔" وہ چیخ کر بولی تھی سالار نے ناگواریت سے اسے دیکھا۔

"وہ کیا سوچیں گے کہ ہمارے والدین کے پاس ہمیں کھلانے کو نہیں تھا یا پہنانے کو جو نانی کے پاس بھیج دیا؟ میں ایسا ہرگز نہیں کروں گا۔" اس کے دوٹوک انداز پہ رومیصہ رونے بیٹھ گئی تھی۔

"میں تمہارے لیے کل وقتی ملازمہ کا انتظام کر دیتا ہوں۔ تمہاری مدد کر دیا کرے گی اور بتاؤ کیا کروں؟"

سالار کے کہنے پہ اس نے احسان جتلانے والے انداز میں بات مانی تھی سالار نے ملازمہ کا انتظام کر دیا جو رومیصہ کی سخت مزاجی اور تند خوئی کے آگے ٹک نہیں پائی۔ ایک بار پھر وہی مسئلہ کھڑا ہو گیا۔ ساتھ ہی وہ ایک بار پھر پریگننٹ ہو گئی تو گویا ایک طوفان اٹھا دیا۔ وہ کسی صورت بھی اس بچے کو جنم دینے کو تیار نہیں تھی۔ سالار نے کیسے اسے سمجھایا کیسے قائل کیا یہ الگ داستان تھی۔ احادیث کا حوالہ مذہب کا ڈراوا تب جا کے وہ دھیمی پڑی مگر مزاج کی بے زاری ہنوز تھی لیتا کی پیدائش کے بیزاری، اکتاہٹ اور بڑھ گئی تھی کچھ ملنے جلنے والی خواتین نے رازداری اور خلوص سے مشورہ دیا تھا۔ مزید برتھ کنٹرول کرنے کا اور وہ اس پر عمل کا تہیہ کر بیٹھی تھی۔ ایک بار پھر سالار آڑے آیا۔

"پاگل ہو جو خدا کے کاموں میں دخل اندازی کی جرات کر رہی ہو؟"

"پھر کیا کروں! آپ نے کیا سمجھا ہے مجھے؟" وہ بے بسی کی انتہاؤں پر پہنچ کر رو پڑی۔

"بے وقوف! تم کیا سمجھتی ہو یہ سب کچھ میری وجہ سے ہے۔ جانتی ہو نا خدا کی مرضی کے بغیر ایک پتا بھی

نہیں ہل سکتا یہ تو پھر بچے کی پیدائش ہے۔" وہ بری طرح زچ ہونے کے باوجود سمجھا رہا تھا۔ "جب آپریشن کروالوں گی پھر کیسے ہوں گے مزید بچے؟"

سارے سمجھانے پر پانی پھیرے وہ کہہ رہی تھی۔ سالار کا جی چاہا اپنا سر پیٹ لے۔

"نری جہالت! یاد ہے ثانیہ آپا نے بھی کروایا تھا یہ آپریشن مگر دس سال بعد پھر ایک بچے نے جنم لیا تھا ان کے ہاں ان کے علاوہ خالہ رضیہ یاد ہیں۔ تین بچوں کے بعد یہ آپریشن ڈاکٹرز نے اس وجہ سے کیا تھا کہ تینوں بچوں کی پیدائش بڑے آپریشن سے ہوئی تھی اور ڈاکٹرز کا خیال تھا کہ مزید بچے کی پیدائش اگر ہوئی تو ان کی زندگی کو خطرہ لاحق ہو سکتا ہے۔ مگر ان کے ہاں اس وقت بچہ پیدا ہوا جب وہ اپنے بڑے بیٹے کی شادی کی تیاریوں میں مصروف تھیں۔ لوگ جہالت کی باتیں کرتے ہیں اور تم ان کے پیچھے لگ کر خود بھی گناہ گار ہو رہی ہو۔ کیوں نہیں سمجھ جاتیں کہ اللہ جب کسی کام کا ارادہ فرماتا ہے تو انسان کی کمزور تدبیریں اس کا راستہ نہیں روک سکتیں۔ تم اگر مزید اولاد نہیں چاہتیں تو اللہ سے دعا کرو وہ قبول فرمانے والا ہے اور بیشک اپنی ہر حاجت کے لیے اللہ کے آگے ہی ہاتھ پھیلانے چاہئیں کہ بندہ شرمندہ ہونے سے بچا رہتا ہے۔"

سالار نے رسان و نرمی سے سمجھایا جانتا تھا کہ تلخی و غصے سے بات اثر نہیں کرے گی اور واقعی رومیصہ کے دماغ میں دیر سے سہی مگر یہ بات سما گئی تھی۔ جس پہ سالار نے سکون کا سانس لیا تھا۔

"بولیں نا اب چپ کیوں ہو گئے ہیں؟ جھوٹے ہیں نا اس لیے۔" رومیصہ کی تلخ و تند آواز اسے ماضی کی یادوں سے کھینچ لائی تو اس نے گہرا سانس بھر کے اسے دیکھا۔

"اچھا تو آپ رات کو بارہ بجے سوتی ہیں؟"

"تو کیا جھوٹ ہے؟" وہ جھنجھلائی۔

"کون سا کام کرتی ہیں بھلا بارہ بجے تک میرا یا میرے بچوں کا؟ آٹھ بجے ہم کھانا کھا لیتے ہیں۔ ٹھیک بچوں کو سلانے اور ہوم ورک کرانے کی ذمہ داری میری، آپ بس ٹیبل سمیٹتی ہیں دھونے والے گندے برتن سنک میں پھینک آتی ہیں پھر ٹی وی ہوتا ہے اور آپ ہوتی ہیں۔ تب اٹھتی ہیں جب نیند آپ کی مت مار دیتی ہے۔ مجھ سے تو خیر آپ نے ایسے بچنا اور بدکنا شروع کیا ہوا ہے جیسے میں کوئی نامحرم ہوں۔ خیر یہ حفاظتی اقدام بھی درست! اس وقت میرا موضوع یہ نہیں، کہنے کا مقصد صرف یہ ہے اگر آپ رات کو برتن دھو کر بچوں کے اور میرے کپڑے پریس کر کے آٹا گوندھ کر سوئیں تو صبح کو ہرگز یہ افراتفری کا سماں نہ ہو۔ صرف ناشتہ بنانا رہ جائے اور آپ بہت سہولت سے دونوں بچوں کو تیار بھی کر لیں۔ مگر آپ کو چار سال گزر جانے کے باوجود گھر سنبھالنا نہیں آسکا۔"

ٹھنڈے ٹھنڈے انداز میں ہونے والی اس بے عزتی نے رومیصہ کو نہ صرف خفت زدہ کیا بلکہ چراغ پا بھی کر دیا تو آنسو آنکھوں میں سجا کر بولی۔

"ہاں میں تو ہوں ہی بد سلیقہ پھوہڑ آج تک میں نے کچھ نہیں کیا آپ کے لیے۔"

"میں نے یہ تو نہیں کہا۔"

وہ بوکھلایا اور اسے ساتھ لگا کر آنسو پونچھنے چاہے مگر وہ تو بدک اٹھی تھی۔

"خبردار جو مجھے ہاتھ لگایا۔ میری قربانیوں کا یہ صلہ دیا ہے مجھے۔"

آنسوؤں میں روانی آگئی تھی۔ سالار سر پہ ہاتھ پھیر کے رہ گیا۔ ایک بار پھر وہ اپنی غلطی تسلیم کرنے کے بجائے اسے موردالزام ٹھہرانے بیٹھ گئی تھی تو یہ کوئی نئی بات تھوڑا تھی۔

☆ ☆ ☆

وہ گھر میں آیا تو صاف ستھرے بچے سلیقے سے بیٹھے ہوم ورک میں مصروف تھے لیتا واکر میں بیٹھی بھاگتی پھر رہی تھی۔ عشنا اور فاطمہ کھلونوں میں مگن گھر صاف ستھرا خود رومیصہ بھی چاک و چوبند اسے دیکھا تو مسکرا

کرا ٹھی اور اس کا بیگ پکڑ کر رکھا کوٹ اتارا۔ سبزی کی ٹوکری میں چھری رکھ کر اس کام کو فی الحال موقوف کر دیا تھا۔ "آپ بیٹھیں میں پانی لاتی ہوں۔"

وہ حیران نہیں تھا یہ کایا پلٹ مہینوں سے پلٹی ہوئی تھی البتہ مطمئن اور سرشار ضرور تھا متعدد بار رومیصہ سے اس تبدیلی کی وجہ پوچھی تھی مگر وہ ہر بار مسکرا کے ٹال گئی تو سالار نے بھی اصرار نہیں کیا تھا۔ بچوں کو سلا کر کچن کے کام سمیٹ کر وہ اس کے پاس بستر پہ آئی تو سالار نے "شرارتاً" اسے دیکھ کر بازو پھیلا دیے۔ وہ جھینپی تھی اور مسکراتے ہوئے اس کے بازوؤں میں سما گئی جب سالار کروٹ بدل کر سو گیا تو اس نے بھی آنکھیں موند لیں۔

صرف سالار ہی نہیں اس کی اس تبدیلی پہ تقریباً سبھی ملنے جلنے والے حیران تھے سوائے ذیشان کے جو اس کا سگا بھائی تھا اور جو خدا کے بعد اس کے اس راز سے آگاہ بھی تھا۔ اسے یاد تھا وہ جون کی ایک تپتی ہوئی دوپہر تھی اس کا بی پی لو ہو رہا تھا اس نے دوا لی اور سونے کو لیٹ گئی عشنا اور فاطمہ جو پاؤں پاؤں چلتی تھیں، نے بستر سے اتر کر ایک اودھم مچا دیا برتنوں کی اٹھا پٹخ اس کا آرام حرام ہو گیا تھا۔ اس نے غصے میں اٹھ کر دونوں کو دو دو لگائے۔ ان کے رونے کی آواز پہ سوئی ہوئی لینا اٹھ کر بیٹھ گئی۔ شور مچانے لگی۔

رومیصہ کا دماغ اتنا خراب ہوا کہ عشنا اور فاطمہ کو تو ڈپٹ کر سلا دیا مگر لینا کا موڈ نہیں تھا وہ کئی دنوں سے اس سے عاجز تھی راتوں کو جاگنا اس کی عادت بنتی جا رہی تھی۔ ساتھ والی آنٹی نے مشورہ دیا تھا تھوڑی سی افیم دودھ میں ملا کر پلا دیا کرو سوتی رہے گی۔ اس نے اس بات پر عمل کا پختہ ارادہ کیا تھا اور انہی سے افیم منگوائی تھی مگر رات کے بجائے دوپہر میں ضرورت پڑ گئی۔ اللہ جانے انہوں نے کتنی کہی تھی اس نے کتنی ملا دی دودھ پیتے ہی بچی کی حالت بگڑنے لگی منہ سے جھاگ، رنگت خطرناک حد تک پیلی اسے تو اپنا سر درد اور وجود کی کسلمندی سب کچھ بھول گیا۔ لینا کو دیکھ کر لگتا تھا وہ ہرگز نہیں بچ سکتی۔

اس نے گھبراہٹ میں روتے ہوئے ذیشان کو فون کر کے صورتحال بتائی وہ بھاگا آیا اور بچی کو نزدیکی ہاسپٹل لے گیا۔ بس قدرت کو زندگی منظور تھی جو جان بچ گئی۔ اس کا رو رو کر برا حال تھا۔ جب ذیشان نے تاسف سے اسے دیکھا تھا پھر کسی قدر سخت لہجے میں بولا تھا۔

"یہ آنسو اگر ندامت کے ہیں تو اچھا ہے۔ شکر کریں آج آپ ایک قاتلہ ہونے سے بچ گئیں۔ مائی گاڈ! اتنی بے حسی مجھے تو شک ہو رہا ہے آپ ان کی ماں ہی ہیں۔ مجھے تو رشک آ رہا ہے سالار بھائی کے حوصلے پہ جو آپ کو نبھا رہے ہیں۔ ان کی جگہ میری بیوی ایسی ہوتی تو چوٹی سے پکڑ کر گھر سے باہر کرتا۔"

وہ سخت غصے میں تھا مگر اس کے چہرے پہ پچھتاوا دیکھ کر پھر خود کو کمپوز کر کے نرمی سے بولا تھا۔

"خدا جب اپنے کسی بندے کو ہدایت سے نوازنا چاہتا ہے، تو پھر اسے ٹھوکر لگاتا ہے خواب غفلت سے جگانے کو' کچھ لوگ ٹھوکر کھا کر سنبھل جاتے ہیں کچھ منہ کے بل مزید پستی میں جا گرتے ہیں۔ آپ کو بھی اللہ نے ٹھوکر لگا دی ہے۔ یہ آپ پہ ڈیپنڈ کرتا ہے آپ سنبھلنے والوں میں ہوتی ہیں یا پستی میں گرنے والوں میں۔ فیصلہ آپ کے ہاتھ میں ہی ہے۔"

وہ کچھ خاموش ہوا تھا پھر توقف سے بولا۔

"ویسے آپ کو پریشان نہیں ہونا چاہیے۔ میں کسی کو بھی آپ کی اس حماقت کے بارے میں نہیں بتاؤں گا۔"

اس نے اپنا کہا پورا کیا اور رومیصہ کی بند آنکھیں بھی کھل گئیں۔ وہ ناشکری کی مرتکب ہوتی رہی تھی ہر لحاظ سے صد شکر کہ وہ ٹھوکر کھا کر گرنے والوں میں نہیں سنبھلنے والوں میں شمار ہوتی تھی۔

WWW.PAKISTAN.WEB.PK

ناولٹ

صدف آصف

روپ کی دھوپ

"بس سسرال جاکر تمہیں ایک ہی کام کرنا ہوگا۔ روزانہ اچھے اچھے کپڑے پہن کر' سلیقے سے تیار ہونا اور نت نئے زیورات سجا کر شہیر بھائی کے آگے پیچھے پھرنا' تو سمجھو' میاں جی تمہارے پلو سے بندھ گئے۔ انہیں اپنے حسن کے جال میں یوں جکڑ لینا کہ ادھر ادھر دیکھنے کی فرصت ہی نہ ملے۔" ماہا نے شرارتی انداز میں چٹکی بجائی۔ زرد رنگوں سے سجی اپنی سہیلی پر پیار بھری نگاہ ڈالی اور تجربہ کار عورتوں کی طرح مشورے سے نوازا۔

"تم... سچ کہہ رہی ہو نا... اس طرح وہ ہمیشہ میرے بن کر رہیں گے نا؟" عائلہ نے معصومیت سے ہونٹ کاٹے اور ماہا کی طرف دیکھنے لگی۔ اس کی خوب صورت سبز آنکھیں رتجگوں کے باعث گلابی مائل ہو کر مزید غضب ڈھا رہی تھیں۔ ماہا نے ایک نگاہ اس کی حسین صورت پر ڈالی اور دل ہی دل میں اپنی ہر دلعزیز ہم جولی کی خوشیوں کے لیے دعائیں مانگیں۔

"پلیز... بتاؤ نا... شادی کے بعد مجھے کسی دشواری کا سامنا تو نہیں ہوگا نا' ایسے سجنے سنورنے سے شہیر ہمیشہ کے لیے میرے ہو جائیں گے؟" ماہا کو خاموش دیکھ کر عائلہ نے اس کا کاندھا ہلا کر اس کے خیالوں کی روانی پر بند باندھا۔

"ہونہہ... فلموں اور ڈراموں میں تو یہ ہی دیکھا ہے کہ ہیروئن سوتے ہوئے بھی سولہ سنگھار کیے رہتی ہے۔ باقی تجربہ تمہیں سسرال جا کے ہو جائے گا۔" ماہا نے پلیٹ میں چکن بریانی نکالتے ہوئے لاپروائی سے کہا۔ کھانے کی اشتہا انگیز خوشبو کے سامنے وہ مزید مزاحمت نہ کر پائی۔ آج اس کی بچپن کی سہیلی عائلہ کی رسم مہندی تھی۔ راحمہ نے بیٹی کو کھانا کھلانے کی ذمہ داری دوست ہونے کے ناطے اس پر لگائی تھی۔ اسی لیے عائلہ کے پاس اس کے کمرے میں آ بیٹھی تھی۔ عائلہ کو جب سے مایوں بٹھایا گیا تھا وہ زیادہ تر یہیں پائی جاتی تھی۔

ماہا راحمہ کے برابر والے فلیٹ میں رہتی تھی عیلی کی یہ پرخلوص سی سہیلی انہیں بہت عزیز تھی، جو ہردم عائلہ کا دھیان بہنوں کی طرح رکھتی تھی، مگر اس وقت تو اسے صرف اپنی پیٹ پوجا کی پڑی تھی۔

جب کہ عائلہ کی تو ان دنوں جیسے بھوک، پیاس، نیندیں سب اڑ سی گئی تھیں۔ اسی لیے ماہا کے اصرار کے باوجود اس نے ایک لقمہ بھی منہ میں نہ ڈالا۔ ملن کی گھڑیاں قریب آپہنچی تھیں۔ ان سہانے لمحوں کے خواب دیکھنے کے بجائے وہ جانے کون سی گتھیاں سلجھانے میں مصروف تھی، جو سلجھ کے نہیں دے رہی تھیں۔

"فلموں، ڈراموں کی نہیں، مجھے حقیقی زندگی کی مثال دو۔" ماہا کو بے فکری سے بریانی اڑاتا دیکھ کر وہ چڑ گئی۔ حالانکہ چند ماہ پہلے تک ایسی بے فکری اس کی ذات کا بھی خاصہ تھی۔ سترہ سال کی عمر ہی کیا ہوتی ہے۔ اس کے ساتھ کی لڑکیاں تو ابھی پڑھائی میں مگن تھیں۔ شادی اس کے لیے ایسی پہیلی تھی، جس کا جواب ابھی اسے ڈھونڈنا تھا۔

حقیقی رشتوں میں "مرد" نامی صنف کا اس کی زندگی میں پہلے کبھی ایسے گزر نہ ہو پایا تھا، جیسے اب ہونے جا رہا تھا۔ باپ بچپن میں چھوڑ گیا۔ کوئی بھائی نہ تھا۔ نوکری پیشہ ماں کو رشتے داروں سے ملنے کی فرصت ہی نصیب نہ ہو پاتی۔ جب سے عائلہ جوان ہوئی تھی، اس کے پاس پڑوس میں جانے پر بھی پابندی عائد کردی گئی۔ ایک ماہا کا گھرانہ ہی تھا۔ جہاں وہ بلا تکلف آجا سکتی تھی۔ کیونکہ اس کے دونوں بھائی امریکہ میں سیٹل ہو چکے تھے۔ اسی لیے اب زندگی میں جڑنے والے ایک نئے "مردانہ رشتے" نے اسے سوچوں کے سمندر میں دھکیل دیا تھا۔

"سچی مثالیں سننے کا شوق ہے نا... تو میری نانی کے گھر چلی جاؤ، نہ صرف تمہیں مفید مشوروں سے نوازیں گی، بلکہ اپنے زمانے کے وہ، وہ قصے سنائیں گی کہ تمہیں "شادی اور مرد ذات" کے نام سے خوف آنے لگے گا۔" ماہا نے بے زار ہو کر چمچہ پلیٹ میں پٹخا۔

عائلہ کی آنکھیں یکدم آنسوؤں سے بھر گئیں۔ ماہا کے ہاتھ پیر پھول گئے۔ وہ کھانا پینا چھوڑ چھاڑ اب پوری طرح سے عائلہ کی طرف متوجہ ہوگئی۔ جس نے ایک بات کو پکڑ کر اس کا سر کھا لیا تھا۔ حالانکہ باؤل میں رکھی ربڑی کھیر، جس کے اوپر ڈھیروں ڈھیر میوہ سجا تھا۔ اسے ابھی بھی اپنی طرف بلا رہی تھی۔

"یہ عائلہ بھی نا... اس کا شادی کے بعد بھی کچھ نہیں ہونے والا۔" ماہا نے کلس کر سوچا۔

"کیا... مطلب؟ شادی اتنی بری چیز ہے؟" عائلہ روتے ہوئے بولی۔ وہ زرد لباس میں خود بھی سرسوں کی طرح پیلی پڑ گئی تھی۔ ماہا کو اس کے کپکپاتے نرم و ملائم مہندی لگے ہاتھوں پر آخر ترس آ ہی گیا۔ اس نے دوست کے ہاتھ مضبوطی سے تھام لیے۔

"الو کی دم فاختہ! یہ جو تم دو گھنٹے سے مجھے "پکار" رہی ہو تو میں الٹے سیدھے جواب ہی دوں گی۔ نہ خود کھا رہی ہو نہ مجھے چین سے دعوت اڑانے دے رہی ہو۔ ایسے ٹیڑھے میڑھے سوال پوچھے جا رہی ہو، جیسے میں نے "شادیات" میں ماسٹرز کیا ہوا ہے یا میرے پاس شادی شدہ زندگی کا دس سالہ تجربہ ہو۔" ماہا نے چڑ کر عائلہ کی کلاس لی اور پانی کا گلاس اس کے لبوں سے لگایا۔

"ارے! شادی تو دور کی بات ہے۔ اپنی تو ابھی منگنی بھی نہیں ہوئی، بس اتنا ہی بتا سکتی ہوں کہ ہم نے اپنے گھر میں ہمیشہ یہ ہی دیکھا کہ نانی کی ہدایت پر کارنس پر رکھی ایک پیالی میں مہندی ہمیشہ گھلی رہتی۔ امی کے ہاتھ ہمیشہ مہندی سے رچے رہتے۔ وہ کلائیوں میں بھر بھر چوڑیاں پہنے، کیاری میں لگے بیلے کے پھولوں کو کانوں کی بالیوں میں پروئے ابو کے اردگرد گھوم رہی ہوتیں۔" ماہا نے اپنی جون میں واپس آتے ہوئے عائلہ کی تشفی کرانے کی کوشش کرنے لگی۔

ماہا اور عائلہ ایک ہی کالج میں پڑھتی تھیں۔ شہیر نے عائلہ کو کالج کے ہی فنکشن میں دیکھ کر پسند کیا تھا۔ وہ اپنے والد کی جگہ وہاں مہمان خصوصی کے طور

پر آیا تھا۔ جو شہر کے جانے مانے بزنس مین تھے۔

اسٹیج پر گلابی شیفون کی فراک اور سی گرین پاجامے میں ملبوس اداکاری کے جوہر دکھانے والی عائلہ دیکھنے والی ہر آنکھ کو لمحہ بھر ٹھٹکنے پر مجبور کر رہی تھی۔ سب سے زیادہ تالیاں اس کی پرفارمنس پر بجیں۔ اسٹیج کے سامنے وی آئی پی کرسی پر بیٹھا شہیر جیسا تجربہ کار کھلاڑی بھی اس کے معصوم حسن کی آنچ کے سامنے پگھل سا گیا یا پھر اسے عائلہ کی کوئی اور ادا بھا گئی۔ بہرحال اس نے اپنے سیکریٹری کے ذریعے عائلہ کے بارے میں ساری معلومات اور گھر کا ایڈریس نکلوالیا۔ والدین کو منا کر جلد ہی عائلہ کے گھر بھیج دیا۔ ان دونوں کو متوسط طبقے کی بہو لانے پر جو اعتراضات تھے۔ وہ عائلہ سے ملنے کے بعد دور ہوگئے۔ اتنا اچھا رشتہ آنے پر راحمہ کے تو ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ وہ تو شہیر کی امی کو دیکھ کر حق دق رہ گئیں۔ وہ یوں بنی سنوری، فریش چہرے کے ساتھ کھلکھلا رہی تھیں کہ راحمہ چھوٹی ہونے کے باوجود ان سے دس سال بڑی نظر آرہی تھیں۔ وہ کہیں سے بھی شہیر کی ماں نہیں لگتی تھیں۔ ان کا متناسب سراپا دیکھ کر کوئی بھی انہیں آسانی سے شہیر کی بڑی بہن سمجھ سکتا تھا۔

"پورے سرکل میں عائلہ جیسی حسین بہو کسی کی نہ ہوگی۔ مسز جاوید جو اپنی چھپکلی جیسی بہو کو مس ورلڈ سمجھ کر ہر جگہ تعریفیں بٹورنے لے کر پہنچتی ہیں۔ وہ تو عائلہ کی پاسنگ بھی نہیں۔ چلو! سب کو جلانے کا ایک اور موقع ہاتھ آیا۔" شیخی خور فطرت کی مالک منزہ کمال نے بیٹے کی شادی سے قبل ہی منصوبہ بندی کر ڈالی۔

جب کمال صاحب نے مسکرا کر خلوص نیت سے عائلہ کے سر پر اپنا پرشفقت ہاتھ رکھا اور منزہ کمال نے اسے گلے لگا کر اپنی سونے کی بھاری چین اس کے گلے میں پہناتے ہوئے جلدی شادی کرنے کا عندیہ دیا تو راحمہ کی آنکھیں دھندلا گئیں۔ آنکھوں سے یہ منظر اپنے دل میں اتارا، اس وقت یاسین کی یاد پوری شدت سے آئی۔

راحمہ کیونکہ اکلوتی بیٹی کے فرض سے جلد از جلد

سبکدوش ہونا چاہتی تھیں۔ اس لیے شادی کے لیے ایک ماہ کا وقت مانگا۔ وہ بحث میں پڑ کر اتنے اچھے رشتے کو کھونے کا رسک نہیں لے سکتی تھیں۔ شوہر کا ساتھ برسوں پہلے چھوٹ گیا تھا۔ سرکاری اسکول میں پڑھاتے پڑھاتے اب پرنسپل کے عہدے پر فائز ہو چکی تھیں۔ گھر میں دو ہی افراد تھے۔ زندگی بہت آسان نہیں تو مشکل بھی نہ تھی۔ سب سے اچھی بات یہ ہوئی کہ انہیں میکے کی جانب سے وراثت میں اتنی معقول رقم مل گئی کہ ان کا سر چھپانے کا آسرا ہو گیا۔ والدین کا انتقال ہو چکا تھا۔ ایک ہی چھوٹا بھائی تھا جس کو دبئی میں اچھی نوکری ملی تو وہ اپنی فیملی کے ساتھ ہمیشہ کے لیے شفٹ ہو گیا۔ تاہم جانے سے قبل اس نے ایک نیک کام ضرور کیا کہ والدین کا پرانا بڑا سا مکان بیچ کر بہن کو ایک اچھے علاقے میں کھلا ہوا دار لگژری فلیٹ دلا گیا۔ ورنہ یاسمین بیگ سے شادی کے بعد تو وہ طویل عرصہ کرائے کے مکان میں رہی تھیں۔

وقت اتنی تیزی سے گزرا کہ پتا ہی نہیں چلا۔ یوں بیٹی کی ودائی گھڑی آن پہنچی۔ انہیں عائلہ کی پیدائش کل کی بات لگتی تھی اور آج بیٹی دلہن بنی جانے کو تیار کھڑی تھی۔ ایک ماں کے لیے یہ کیسا عجیب لمحہ ہوتا ہے۔ وہ موت سے جنگ کے بعد ایک بیٹی کو جنم دیتی ہے۔ اپنی راج دلاری کو بڑے پیار سے پال پوس کر بڑا کرتے کرتے بڑھاپے کی سیڑھی چڑھ جاتی ہے اور جب جوان بیٹی، ماں کا سہارا بننے کے قابل ہوتی ہے تو پھر خوشی خوشی اسے کسی دوسرے کے حوالے کر دیتی ہے۔

"بیٹی! کبھی وہ غلطی نہ دہرانا جو میں نے کی تھی۔ تمہاری ترجیحات میں شہیر کا خیال رکھنا سب سے پہلے ہونا چاہیے۔" راحمہ نے سرخ اور سبز شاہانہ کامدار عروسی لباس زیب تن کیے اپنی پیاری بیٹی کے کان میں سرگوشی کی، جو اپنا بچپن، گڑیا، سہیلیاں، اپنی ضدیں، نخرے ماں کے آنگن میں چھوڑے جا رہی تھی، دل میں ماں کی محبت اور پلو سے بندھے بہت سے اندیشے ساتھ لیے جا رہی تھی۔ عائلہ روتی ہوئی ماں سے لپٹ گئی۔

☼ ☼ ☼

شہیر کے ساتھ زندگی کا سفر کیا شروع ہوا عائلہ کو لگا وہ سر تا پا تبدیل ہو گئی ہے۔ لاشعوری طور پر اس کے معمولات میں ایسی تبدیلیاں آئیں کہ اسے خود بھی خبر نہ ہو پائی کہ کب سسرال میں ایک نئی عائلہ نے جنم لے لیا۔ وہ رات کو جلد سونے کی عادی، مگر شہیر رتجگوں کا شیدائی، سو وہ بھی گلابی آنکھوں کے ساتھ میاں کی خوشنودی کے لیے اس کے برابر میں بستر پر دراز پلکیں جھپکا جھپکا کر ٹی وی دیکھتی رہتی۔ کبھی کبھی تو بے خبر سو بھی جاتی۔ پھر شہیر کی خواہش پر جاگنا پڑتا۔ وہ بہت موڈی تھا۔ کبھی خوب پیار لٹاتا، اسے سراہتا اور کبھی جب وہ بے حد سج دھج کے اس کے سامنے جاتی تو چڑ سا جاتا۔ وہ ابھی اس کی مزاج آشنا نہ تھی۔ اس لیے پیچھے بھاگتے بھاگتے تھک سی جاتی۔

ماں کی ویران زندگی عائلہ کے سامنے تھی۔ یہ ہی وجہ تھی کہ وہ اپنی ازدواجی زندگی کی کامیابی کے لیے سر توڑ کوشش کر رہی تھی۔ یہ اور بات ہے کہ اکثر اس کے ہونٹ مسکراتے مگر آنکھیں نم ہو جاتیں۔ وہ چٹ پٹے کھانوں کی شوقین اور سسرالی باورچی ایسے بدذائقہ پکوان پکاتا جیسے کسی اسپتال کے مریضوں کا کھانا ہو۔ وہ جو ایسے پھیکے سیٹھے کھانے بیماری کے دنوں میں بھی ماں کے ہاتھوں سے بہت شور مچا کر کھاتی تھی۔ یہاں سر جھکا کر خاموشی سے نوالے حلق سے اتارے جاتی۔

"بی بی! اپنی مڈل کلاسیوں کی عادت اس بار میکے جانا تو وہیں چھوڑ آنا۔" منزہ کمال نے اسے شادی کے شروع دنوں میں ہی جھاڑ کے رکھ دیا۔ جب عائلہ نے اپنی کوکنگ کلاسز کا ہنر آزمانے کے لیے ان سے کچن میں جانے کی اجازت مانگی تھی۔

☼ ☼ ☼

شہیر کا تعلق ایک مالدار گھرانے سے تھا۔ اپنا کاروبار تھا۔ اسی لیے وہ صبح دیر سے گھر سے نکلتا اور رات گئے تک اس کی واپسی ہوتی۔ ساس سسر کی اپنی زندگی تھی۔ ساس اپنے بوتیک اور فلاحی کاموں میں مصروف، تو سسر بزنس کے داؤ پیچ میں الجھے رہتے۔ وہ کسی سے باتیں کرنے کو ترس جاتی۔

یہ اور بات ہے کہ منزہ کو جب بھی کسی حریف بیگم سے مقابلے کا دورہ پڑتا تو وہ عائلہ کو سجا سنوار کر میدان میں اتارتیں، ہمیشہ جیت ان کا مقدر ہی ٹھہرتی۔ وہ ہر پارٹی یا فنکشن سے بہو کی تعریفیں یوں بٹورتیں جیسے یہ ان کا کوئی ذاتی کارنامہ ہو۔ ان کے نزدیک عائلہ کی اہمیت بس یہیں تک تھی کہ وہ سجی سنوری گڑیا بنی ان کی ستائش کا باعث بنے۔ اس سے زیادہ وہ بہو کو منہ لگانا پسند نہ کرتیں۔

گھر میں ایک دیور، دو نندیں بھی تھیں جو کالج اور یونیورسٹی جاتے تھے۔ مگر وہ بھی خاصے مغرور اور منہ پھٹ تھے۔ ان کی اپنی طرز زندگی تھی۔ جس میں وہ کسی کی مداخلت قطعی طور پر پسند نہیں کرتے تھے۔ عائلہ نے شروع میں یہ فاصلے کم کرنے کی بھرپور کوشش کی مگر جب منہ کی کھائی تو چپکی بیٹھ گئی۔ رفتہ رفتہ وہ سمجھ گئی کہ اس بڑے سے گھر میں کوئی کسی کے معاملات میں دخل اندازی پسند نہیں کرتا۔

سسرال کے مقابلے میں عائلہ کا گھرانہ تو بس دو افراد پر مشتمل تھا۔ مگر وہاں تو زندگی جیسے بھاگتی دوڑتی تھی۔ عائلہ نے کبھی اپنی امی کے بغیر ناشتا کھانا نہیں کھایا۔ وہ اپنی ہم جولیوں کے ساتھ مل کر پوری بلڈنگ میں دھما چوکڑی مچائے رکھتی۔ یہاں بیٹھ کر تو وہ بس ان رونقوں کو یاد ہی کر سکتی تھی۔ اسے سسرال میں کوئی غم نہ تھا۔ نہ ہی کسی قسم کے روایتی مسائل، وہ پھر بھی خوش نہ تھی۔ اس کی زندگی شور شرابے، ملنے گلنے سے عبارت تھی اور سسرال میں ایسی خاموشی کا راج کہ سوئی بھی گر جائے تو آواز سنائی دے۔ وہ جلد ہی ان سناٹوں سے گھبرا گئی۔

اسی لیے تو بڑے بوڑھوں نے کہا ہے کہ "نئے رشتوں کی بنیاد رکھتے ہوئے اس بات کا دھیان رکھنا ضروری ہے کہ فریقین کے ماحول اور رسم و رواج میں بہت زیادہ تضاد نہ ہو۔ کیونکہ ان باتوں سے مرد ذات پر تو کوئی خاص فرق نہیں پڑتا، مگر وہ لڑکی جو اپنا گھر بار چھوڑ کر آئی ہوتی ہے اس کے حصے میں بے شمار قربانیاں اور مصلحتیں آ جاتی ہیں۔" مگر فی زمانہ تو لوگوں کے دلوں پر "سب سے بڑا روپیہ" کا راج ہے۔

کبھی کبھی جینے کے لیے مسئلے مسائل بھی ضروری ہو جاتے ہیں۔ انسان ان میں الجھنے کی سعی کرتا ہے، تو لگتا ہے کہ زندگی ہے، یہ مصروفیت بھی جینے کی وجہ بنتی ہے۔ اپر کلاس کے اس گھر میں مڈل کلاس گھرانوں والی ایک بھی خصوصیت نہ تھی۔ نہ روایتی ساس، بہو کی چپقلش، نہ نندوں سے تو تو میں میں، کم آمدنی والا شوہر بھی نہ تھا، جس سے لڑ لڑ کر اپنی خواہشات مان سے پوری کروائی جاتیں۔ ایسی باتوں سے ماحول لمحوں میں کڑوا ہو جاتا، مگر تھوڑی دیر بعد ریشم کی کچی ڈور سے بندھے یہ رشتے سب کچھ بھلا کر شیر و شکر ہو جاتے۔ یہ سب باتیں وقتی طور پر کٹھن سہی مگر زندگی کی علامتیں ہیں، اس بڑے سارے گھر میں تو ایسا کچھ نہ تھا۔

جب کچھ نہ ہو تو کیا ہو؟ خاموشی، سناٹا۔

☼ ☼ ☼

"اف۔۔۔ سات بج گئے، دیر ہو رہی ہے۔ آخر یہ کب آئیں گے۔" پیازی اور عنابی امتزاج کی انار کلی اور بنارسی پاجامے میں، چوڑی پیشانی پر جڑاؤ ٹیکا لگائے وہ کسی دیس کی شہزادی لگ رہی تھی۔ ٹہل ٹہل کر شہیر کا انتظار کرتے ہوئے اس کے پیروں میں درد ہو گیا۔ آج اس کی سب سے پیاری سہیلی ماہا کی منگنی کی تقریب تھی۔ تقریب کا اہتمام انہی کے فلیٹ کے کمپاؤنڈ میں شامیانہ لگا کر کیا گیا تھا۔

"ہیلو۔۔۔ شہیر آپ کہاں ہیں۔ بھول گئے، ہمیں آج ماہا کی منگنی میں جانا ہے؟" اس نے نہ چاہتے ہوئے بھی ڈرتے ڈرتے شوہر کا نمبر ملایا۔

"کیا مصیبت ہے یار! میں اس وقت بہت اہم میٹنگ میں ہوں۔ تمہیں اپنی پڑی ہے، تم ایسا کرو، ڈرائیور کے ساتھ چلی جاؤ، میں واپسی پر تمہیں لے

لوں گا۔" شہیر جب غصے میں ہوتا تو بڑا بے مروت ہوجاتا۔ اس نے پہلے اسے جھاڑا، پھر کچھ سوچ کر ایک آسان حل پیش کردیا۔

عائلہ جانتی تھی کہ ڈرائیور ساتھ لے جانے کا مطلب اس کی اکیلے واپسی تھی۔ مگر شہیر اس وقت صرف کہنے کے موڈ میں تھا، سننے کے نہیں، اتنے دنوں میں وہ اسے اتنا تو سمجھ ہی گئی تھی۔ اس نے ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے — موبائل آف کیا۔ ڈرائیور کو آواز دے کر گاڑی نکالنے کو کہا اور جھلملل کرتا پرس اٹھا کر پورچ کی طرف بڑھ گئی۔

عائلہ گاڑی کی نرم و آرام دہ سیٹ سے سر ٹکا کر بیٹھ گئی۔ اس کی حسین آنکھوں سے آنسو چھلکنے کو بے قرار ہوگئے۔ مگر وہ ابھی ایک مشہور پارلر سے تیار ہو کر آئی تھی۔ سو نہیں چاہتی تھی کہ شہیر کے دیکھنے سے قبل اس کی تیاری ضائع جائے۔ اس لیے جلدی سے انہیں ٹشو پیپر میں جذب کرلیا۔

"آج کل شہیر بہت الجھے الجھے سے، دور دور رہنے لگے ہیں۔" اندیشوں نے اس کے دل میں ایسے سر اٹھایا، جیسے بارش کے بعد خودرو پودے اگ آتے ہیں۔

"کل ہی بیوٹیشن سے ٹائم لیتی ہوں، کافی دن ہوگئے فیشل لیے ہوئے، بالوں کا بھی نیا کٹ ضروری ہے۔"

اس نے پرس سے پاکٹ آئینہ نکالا اور اپنے چہرے کا جائزہ لینے میں مصروف ہوگئی۔ جو آج بھی پہلے دن کی طرح فریش تھا۔ یہ اور بات ہے کہ گہرے میک اپ نے اس کی معصومیت کو کہیں چھپا دیا تھا۔ وہ اب بھی اتنی ہی سلم اور اسمارٹ تھی جتنی شادی سے قبل ہوتی تھی۔ مگر اس کا بانکپن جڑاؤ زیورات کی چمک دمک کے آگے دب سا گیا تھا۔

ان کی شادی کو سال بھر ہونے کو آیا تھا۔ عائلہ گھر میں بھی خوب بنی سنوری رہتی تھی۔ اس کی اس ادا سے منزہ بہت خوش رہتیں اور اس معاملے میں وہ اپنی بہو کا خوب ساتھ دیتیں۔ وہ خود بھی بہت فیشن ایبل خاتون تھیں۔ مگر عائلہ تو اپنی ماں جیسی غلطی دہرانا نہیں چاہتی۔ جس کی وجہ سے اس کا باپ دوسری عورت کی طرف ملتفت ہوا اور بیٹی کا سوچے بغیر ان دونوں کو چھوڑ گیا۔

"کیا بات ہے؟ پریشان نظر آرہی ہو۔" چائے لاتی ہوئی راحمہ نے بیٹی کو مسلسل کمرے کا چکر کاٹتے دیکھا، تو پوچھ بیٹھیں۔ وہ ماہا کی منگنی سے واپسی پر گھڑی بھر کے لیے میکے آئی تھی۔

"بس امی! شہیر کی وجہ سے ٹینشن میں ہوں۔ آج کل بہت اکھڑے اکھڑے سے رہنے لگے ہیں۔" اس نے ماں کے آگے حال دل بیان کیا۔

"ارے — اتنا بڑا کاروبار چلا رہا ہے، باہر کے سو جھمیلے ہوتے ہیں۔ تم خود پر بلاوجہ کی فکریں نہ لادو۔" انہوں نے عائلہ کو کاندھے سے تھام کر صوفے پر بٹھایا اور چائے کا کپ تھماتے ہوئے اسے دلاسا دینا چاہا۔ شہیر جب بھی راحمہ سے ملتا، اس کے انداز میں ایک بیٹے جیسا احترام ہوتا۔ وہ خود بھی داماد کی شیدائی تھیں۔ اسی لیے بیٹی کے سامنے فوراً اس کی حمایت کی۔

"کیا چاہتی ہیں؟ آپ کی طرح ہوجاؤں اور میاں کو کھلی چھٹی دے دوں، تاکہ اسے دوسری شادی رچانے کا موقع مل جائے اور میں ساری عمر بیٹھ کر روؤں۔" عائلہ نے طیش میں آکر چائے کا کپ تپائی پر پٹخا اور بغیر کچھ کہے کھٹ کھٹ کرتی داخلی دروازے سے باہر نکل گئی۔ جہاں ڈرائیور گاڑی سے ٹیک لگائے اسے گھر لے جانے کے لیے اس کا منتظر تھا۔

راحمہ بیٹی کے طعنے پر دل تھام کر رہ گئیں۔ ماں نے تو ساری عمر انہیں خود اپنی بربادی کا ذمہ دار ٹھہرایا تھا، پر انہوں نے پروا نہ کی۔ لیکن بیٹی کی بات دل میں چبھ گئی۔ آنسو گالوں پر بہنے لگے۔ راحمہ کو اس حقیقت کا بھی ادراک تھا کہ عائلہ نے کہیں کا غصہ کہیں نکالا ہے۔ مگر ایسے میں بھی وہ ماں کو سچ کا آئینہ دکھانے سے باز نہیں آئی۔ بے آواز روتے ہوئے وہ ان لمحوں میں کھو گئیں۔ جو اب ان کے لیے سرمایہ حیات بنے ہوئے تھے۔

"بیگم صاحبہ — حسرت ہی رہی کہ کبھی آپ کو اچھے کپڑوں میں تیار شیار دیکھوں۔" یاسین بیگ نے موتیے کے سفید گجرے راحمہ کے قریب دھری کاپیوں کے انبار پر رکھے۔ مگر ان کے پاس اتنا وقت ہی کہاں تھا کہ وہ شوہر کی پرشوق نگاہوں پر شرماتیں۔ امتحانات سے قبل بچوں کی کاپیاں چیک کرکے واپس کرنا تھیں۔ اسی لیے ان کے تھکے ہوئے ہاتھ کھٹا کھٹ لال روشنائی سے غلطیوں پر دائرے کھینچنے میں مصروف رہے۔ یاسین بیگ منتظر نگاہوں سے مسلے ہوئے لباس میں دھلا چہرہ لیے بیٹھی بیوی کو تکتے رہے، جس نے کنگھی بھی شاید صبح کی تھی۔ کوئی جواب نہ پاکر وہ بے زاری سے اپنی خواب گاہ کی طرف بڑھ گئے۔

☆ ☆ ☆

یاسین بیگ، راحمہ کی امی کے بھتیجے تھے۔ آمنہ کے مرنے کے بعد جب ظفر بیگ نے دوسری شادی کرلی تو ناظمہ نے گھر میں قدم رکھتے ہی اس چھوٹے سے لڑکے سے بیر باندھ لیا جو اس رات بھی باپ سے لپٹ کر سونے کی فرمائش کررہا تھا اور ظفر اس کے خوشبوؤں میں بسے وجود کو نظر انداز کیے بیٹے کو کاندھے سے لگائے سلانے کی کوششوں میں مصروف تھے۔

ناظمہ کے کانوں میں خطرے کی گھنٹی بجنے لگی۔ اس نے زیادہ دن انتظار نہ کیا اور سوتیلے بیٹے کی وہ درگت بنائی کہ دنیا اس پر ترس کھانے لگی۔ نازوں پلے بچے سے وہ نہ صرف گھر کے کام کاج کروانے لگی۔ بلکہ ذرا سی غلطی ہونے پر ڈنڈا اٹھا کر اس پر پل پڑتی۔ ظفر بیگ ان حالات سے بہت پریشان تھے۔ باہر کے مسائل سے نپٹ کر جب وہ گھر آتے تو نیا فضیحتہ کھڑا ہوتا۔ وہ جانتے تھے کہ ناظمہ کی باتوں میں رتی برابر بھی صداقت نہیں۔ شروع شروع میں انہوں نے بیٹے کی ڈھال بننے کی کوشش کی تو ناظمہ ناراضی میں کمرے کا دروازہ بند کرکے سوجاتی۔ میاں ساری رات باہر کھڑا بیوی کی منتیں کرتا رہ جاتا، مگر وہ ہٹ دھرم عورت اپنی ہی کرتی۔

ایسے میں اگر یاسین باپ سے لپٹنے کی کوشش کرتا تو وہ چڑ کر اسے بھی دھتکار دیتے۔ اکثر وہ لڑ بھڑ کر میکے چلی جاتی۔ ظفر بیگ کے اندر اب دوسری بیوی کو کھونے کا حوصلہ نہیں تھا۔ اب تو یاسین کے علاوہ ناظمہ سے بھی ان کے چار بچے ہوچکے تھے، کتنا لڑتے؟ اسی لیے خانگی معاملات ناظمہ کے حوالے کرکے خاموشی اختیار کرلی۔ وقت گزرتا چلا گیا اور سب کچھ ویسا ہی ہوتا چلا گیا۔ جیسا ناظمہ چاہتی تھی۔ راحمہ اور ان کا چھوٹا بھائی شکیل ابو، امی کے ساتھ حیدر آباد ایک شادی کی تقریب میں شرکت کرنے گئے تو طویل عرصے بعد سلیمہ کو اپنے بھائی ظفر سے ملنے کا خیال آیا۔ وہ سب جب بنا اطلاع دیے ان کے گھر پہنچے تو ناظمہ اپنے بھاری وجود کے ساتھ چارپائی پر پسری ہوئی تھی اور یاسین پسینے میں شرابور باورچی خانے میں کھڑا مہارت سے سوتیلے بھائی، بہنوں کے لیے پراٹھے پکا رہا تھا۔ بھتیجے کی خستہ حالی دیکھ کر سلیمہ کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ انہوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ یاسین کو گھسیٹ کر کچن سے باہر نکالا اور ناظمہ کو خوب سنائیں۔ نند کو جلال میں دیکھ کر اس کے ہوش اڑ گئے۔ لگی طبیعت خرابی کے بہانے بنانے، مگر سلیمہ اس وقت کچھ سننے کو تیار نہ تھیں۔ یاسین کا حلیہ دیکھ کر آنکھیں بھر آئیں۔ اس سے بہتر کپڑے تو ان کے گھر میں کام کرنے والا نوکر پہنتا تھا۔ انہوں نے فوراً فون ملا کر بھائی کو گھر جلد پہنچنے کی تاکید کی۔ ناظمہ نند کے غصے کے آگے ڈری سہمی خاموش بیٹھی تھی۔ ناظمہ کی یہ درگت بنتے دیکھ کر مسکراہٹ آپ ہی آپ یاسین کے ہونٹوں پر رینگ گئی۔

"بھائی — مجھے آپ سے یہ امید نہ تھی۔ ناظمہ سوتیلی سہی، آپ تو سگے تھے۔ وہ اپنے آرام کے لیے اس بچے کو گھریلو عورت کے روپ میں ڈھال رہی ہے اور آپ خاموش تماشائی بنے ہوئے ہیں؟" بھائی کی آفس سے واپسی پر ان کی وہ کلاس لی کہ وہ بہن کا ہاتھ تھام کر رو دیے۔

"بس — بس مجھ پر آپ کے یہ آنسو اثر نہیں کریں گے۔ مجھے تو مری ہوئی کا خیال آتا ہے۔ جسے آپ بالکل ہی بھلا چکے ہیں۔ آخر ہیں نا مرد ذات۔" وہ گرجیں، منمنا کر اپنی صفائیاں پیش کرتا چھوٹا بھائی اس

وقت انہیں کہیں سے قابل رحم نہیں لگ رہا تھا۔

ناظمہ نے نند کے اعزاز میں ٹیبل پکوانوں سے بھر دی، مگر سلیمہ کے جلال میں کمی واقع نہ ہوئی۔ یاسین کے لیے شیرنی کا روپ دھارنے والی ناظمہ، سلیمہ کے آگے بھیگی بلی بنی ہوئی تھی۔

یاسین حیران و پریشان پھپھو کا منہ تکتا رہا۔ اس نے عورت کا یہ بے غرض روپ پہلی بار دیکھا۔ ماں تو یاد نہیں تھی مگر دل میں یہ احساس جاگا کہ "ماں ہوتی تو ایسی ہی ہوتی۔"

ایک دن وہاں رکنے کے بعد جب ان لوگوں نے کراچی جانے کا قصد کیا تو سلیمہ، یاسین کو بھی ساتھ لے آئیں۔ راحمہ دل ہی دل میں چڑ گئی اسے اپنے سے تین سال چھوٹا، گورا چٹا سبز آنکھوں والا گاؤدی کزن ایک آنکھ نہیں بھایا۔ جو بات بات پر سب کے آگے بچھا جا رہا تھا۔ جب باپ نے کوئی اعتراض نہیں کیا تو وہ ماں کے خلاف کیسے جا سکتی تھی۔ اسی لیے چپ ہو گئی۔

☼ ☼ ☼

کراچی آکر یاسین کی پڑھائی کا سلسلہ صحیح طریقے سے جڑ گیا۔ وقت کا کیا ہے وہ تو گزر ہی جاتا ہے۔ مگر اپنے باپ کی طرف سے، جو گرہ یاسین کے دل میں لگی، وہ کھل نہ سکی۔ اسی لیے سلیمہ کے اصرار کے باوجود وہ لوٹ کر حیدر آباد نہ گیا۔ برسوں میں کبھی اس کا باپ ملنے آجاتا تو وہ یوں ملتا جیسے کوئی اجنبی ہو۔ اس کی دنیا اپنی سلیمہ پھپھو سے شروع ہو کر ان ہی پر ختم ہوتی تھی۔ تعلیم مکمل ہوتے ہی اسے ایک درمیانے درجے کے دفتر میں نوکری مل گئی۔ برسر روزگار ہونے کے بعد اس نے جو پہلا کام کیا وہ باپ کی جانب سے ملنے والی ماہانہ رقم مزید لینے سے انکار تھا۔

وقت کا پہیہ اپنے حساب سے ہی گھومتا ہے۔ مگر ہم سمجھتے ہیں کہ وہ بھاگ رہا ہے۔ بچے بڑے ہو گئے اور جوان بوڑھے۔ یاسین کی مردانہ وجاہت نے اسے ایک دم خاندان بھر کی لڑکیوں کی آنکھ کا تارا بنا دیا۔ اسی لیے وہ ہواؤں میں اڑنے لگا۔ اسے یہ بھی خبر نہ ہو سکی کہ اس کی جان سے عزیز پھپھو اپنی معمولی صورت کی حامل بیٹی کے رشتے کے لیے کتنی پریشان ہیں۔ جو بھی ایک بار اسے دیکھ کر جاتا، واپس نہ آیا۔ راحمہ کی عمر ان کے بلڈ پریشر کی طرح ہائی ہو رہی تھی۔ بیٹا گھر میں سب سے چھوٹا تھا۔ اسے ابھی ان مسائل کی سمجھ نہ تھی۔ شوہر بھی اس سلسلے میں بیوی کا حوصلہ بڑھانے کے سوا کیا کر سکتے تھے۔ وہ سر پکڑ کر بیٹھ جاتیں۔

ایک تو راحمہ کی معمولی شکل و صورت۔ اس پر حلیہ بھی ایسا بنائے رکھتی تھی کہ دیکھنے والے کو ناگوار گزرے۔ چوڑے فریم کا چشمہ، بھولے بالوں کا جوڑا اور پھیکے رنگوں کے ڈھیلے ڈھالے کپڑوں نے اس کی شخصیت کی رہی سہی دلکشی بھی چھین لی تھی۔ حالانکہ اس کے نقوش بہت پرکشش تھے۔ جنہیں وہ سنجیدگی کی چادر میں چھپائے رکھتی تھی۔

"ارے۔ راحمہ! اسکول کی نوکری چھوڑ دے۔ دیکھ، پیدل اسکول جا جا کر تیرا رنگ کیسا کالا ہو گیا ہے۔ کیوں میرا امتحان لینے پر تلی ہے۔ آج کل کی لڑکیوں کو دیکھ، ہر دوسرے دن پارلر کے چکر لگا رہی ہوتی ہیں۔ ایک تو ہے، جسے رغبت ہے تو صرف کتابوں سے، اب نوکری کا یہ نیا شوق پال لیا ہے۔ پہلے ہی آنکھوں پر چشمہ چڑھایا ہوا ہے، اب کیا دوربین فٹ کروائے گی۔" سلیمہ نے کتاب میں غرق بیٹی کی کلاس لے لی۔ وہ سنی ان سنی کیے پڑھنے میں مگن رہی۔ چند دنوں قبل ہی اسے سرکاری اسکول میں اپنی دوست کے ابو کے توسط سے نوکری ملی تھی۔

"اے مالک! کیوں میری پھپھو کا امتحان لے رہا ہے؟ یہ راحمہ آپا بھی نا۔۔۔ دنیا کی دوسری لڑکیوں سے کتنی مختلف ہیں۔ ایک چچا تبریز کی سونیا ہے، اف! اتنی کم عمر ہے۔۔۔ پھر بھی حسن کے ترکش سے نشانے پہ تیر چلانا جانتی ہے۔ مگر میرے لیے تو ساری دنیا چھوڑ دینے کے دعوے کرتی ہے۔" یاسین دلچسپی سے یہ جنگ دیکھتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ، جس میں ایک فریق کے پاس موثر ہتھیار خاموشی تھا۔ جس سے وہ دوسری

طرف کی گولہ باری سرد کیے جا رہا تھا۔ آخر دوسرے فریق کو ہی پسپائی اختیار کرنا پڑی۔ سلیمہ رات کے کھانے کی تیاری کے لیے کچن میں چلی گئیں تو یاسین مسکراتے ہوئے چچا تبریز کے گھر جانے کے لیے باہر نکل گیا۔

☼ ☼ ☼

"یا اللہ! اگر میری کوئی نیکی تجھے بھائی ہو، تو اس کے بدلے میں میری بیٹی کو اپنے گھر کا کر دے، اے مالک! میری بیٹی کا دامن بھی پھولوں سے بھر دے۔" سلیمہ رات کے اس پہر سجدے میں گری رب کائنات سے فریاد کر رہی تھیں۔ ان کا وجود روتے ہوئے لرز رہا تھا۔ یاسین جو چائے کی طلب میں اس طرف آیا تھا۔ پھپھو کی آہ و زاری پر سن سا رہ گیا۔

"اے غفور و رحیم۔۔۔ میری آنکھیں بند ہونے سے قبل میری بچی کا نصیبہ کھول دے۔ بس میری یہ آرزو پوری کر دے کہ میں اپنی زندگی میں ہی اسے ہنستا بستا دیکھ لوں۔ وہ اپنے گھر کی ہو جائے۔ تیرے اختیار سے باہر تو کچھ نہیں۔ لمحوں میں تقدیر بدلنے والے میری راحمہ کی تقدیر بھی کھول دے۔" سلیمہ کا ہر آنسو جیسے یاسین کے دل پر گر رہا تھا۔ وہ تو انسان تھا، جو ایک ماں کے درد کو سمجھ رہا تھا۔ پھر قدرت ان لمحات میں سلیمہ پر کیوں نہ مہربان ہوتی۔

"پھپھو۔۔۔ پلیز پانی پی لیجیے۔۔۔ میں آج کے بعد آپ کی آنکھوں میں آنسو نہ دیکھوں۔" یاسین نے پھپھو کے کاندھوں پر ہاتھ دھر کر دلاسا دیتے ہوئے پانی پلایا۔

وہ یاسین کو وہاں پا کر شرمندہ ہو گئیں۔ انہوں نے اپنی بیٹی کی بے وقعتی کے خوف سے کبھی اس کے سامنے یہ ذکر نہیں نکالا تھا۔

"کیا کروں بچے۔۔۔ راحمہ کی شادی کی کوئی صورت نہیں نکل پا رہی۔ اس کی بڑھتی ہوئی عمر کی طرف دیکھتی ہوں تو نہ جی پاتی ہوں، نہ ہی مر پاتی ہوں۔" آخر ان کی انا ہار گئی اور وہ بھتیجے سے لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دیں۔ اس وقت انہیں دل کی بھڑاس نکالنے کے لیے ایک ہمدرد، ایک سہارے کی ضرورت تھی۔ یاسین سے بڑھ کر ان کا غمگسار اور کون ہو سکتا تھا۔

پھپھو کی حالت پر اس کا دل پانی پانی ہو گیا۔ اپنے آپ سے نظریں ملانا بھی مشکل ہو رہا تھا۔ ایک ہی گھر میں رہتے ہوئے وہ اپنی زندگی میں مست رہا۔ اپنی محسنہ، ماں جیسی پھپھو کے دکھوں کا اندازہ بھی نہ کر پایا۔

"پلیز۔۔۔ اب اور مت روئیے، ورنہ میں بھی رووں گا۔" اس نے پیار سے ان کے آنسو پونچھتے ہوئے دلار سے کہا۔

"کیا کروں بیٹا! سوچ سوچ کر دل پھٹا جاتا ہے کہ میرے بعد اس جھلی کا کیا ہو گا؟ کہتی ہے میری فکر چھوڑ دیں۔ اسے تو اپنا خیال نہیں، مگر میں ماں ہوں۔ اس کے بارے میں سوچنا کیسے چھوڑ دوں؟" سلیمہ بیگم غم زدہ لہجے میں بولیں۔ اور پھر کچھ لمحے پہلے جس فیصلے کو کرنے میں اسے ہچکچاہٹ محسوس ہو رہی تھی وہ آپ ہی آپ ہو گیا۔

"میں ان کے قابل تو نہیں، پھر بھی آپ مجھے اپنا بیٹا بنا لیں گی تو میری خوش قسمتی ہو گی۔" یاسین کی نگاہیں اپنی محسنہ کے سامنے اٹھ نہیں رہی تھیں۔ اس نے سلیمہ کا ہاتھ تھاما اور مدعا بیان کیا۔ سلیمہ حق دق بھتیجے کو تکنے لگیں، انہیں کانوں سنی پر بھی یقین نہ آ رہا تھا۔

"جانتے بھی ہو کہ تم کیا کہہ رہے ہو؟" چند لمحے گم صم رہنے کے بعد انہوں نے بھتیجے سے ہاتھ چھڑایا اور پیٹھ موڑ کر جائے نماز تہہ کرنے لگیں۔ یہ الگ بات ہے کہ ان کے جسم کا ہر حصہ اس وقت کان بن کر یاسین کی جانب متوجہ تھا۔

"میں۔۔۔ سچ کہہ رہا ہوں پھپھو! میں آپا۔۔۔ میرا مطلب ہے راحمہ۔۔۔ سے شادی کرنے کے لیے بخوشی تیار ہوں۔" اس کے پرزور اصرار نے جیسے سلیمہ کو زندگی بخش دی۔ ان کا چہرہ یوں چمک اٹھا جیسے گھور اندھیری رات کے بعد ایک دم سے صبح کی روشنی پھیلے۔

"مگر۔۔۔ وہ تو۔۔۔ تم سے عمر میں بڑی ہے۔ دنیا کیا کہے گی کہ میں نے تمہیں اس لیے اپنے پاس رکھا تھا۔"

خوشی کے جھٹکے سے سنبھلنے کے بعد انہوں نے حقیقت پسندی سے سوچا اور جھجکتے ہوئے اس کا اظہار بھی کردیا۔

دنیا کب چپ رہتی ہے' کہنے دیں جو کہتی ہے۔ بس آپ ساری باتوں کو چھوڑ کر شادی کی تیاریاں کریں۔" اس نے شرارتی انداز اختیار کرکے ماحول کا بوجھل پن دور کرنے کی کوشش کی۔ تو وہ بھی ہلکی پھلکی ہوکر مسکرادیں۔

یاسین خود حیران تھا کہ اس نے اتنا بڑا فیصلہ اچانک کیسے کرلیا؟ شاید قدرت کو بھی یہ ہی منظور تھا۔ ورنہ وہ اپنے دل میں راحمہ کے لیے کچھ خاص پسندیدگی کا جذبہ محسوس نہیں کرتا تھا۔ اس کا رجحان تو اپنی کزن سونیا کی طرف تھا۔ جو نک سک سے تیار ہر شام اس کی راہ تکتی تھی۔ وہ تو چند دنوں میں پھپھو سے سونیا کے گھر رشتہ لے جانے کی درخواست کرنے والا تھا کہ سب کچھ بدل گیا۔ سونیا کا خیال آتے ہی اس کی آنکھیں بھر آئیں۔

"جتنا رونا ہے.... رولو.... آج کے بعد اس کا خیال بھی ممنوع ہے۔" اس نے دل کو تنبیہہ کی۔ پوری رات اس نے اپنی ناتمام محبت کا سوگ منایا اور صبح تک دل کے دروازے سونیا کے لیے بند کردیے۔

☼ ☼ ☼

یاسین نے راحمہ کی خواہش پر اسی محلے میں چھوٹا سا پورشن کرائے پر لے لیا اور شادی کے چار دنوں بعد ہی میاں' بیوی وہاں شفٹ ہوگئے۔ راحمہ اپنے گھر والوں سے ابھی تک ناراض تھی' وہ ماں سے صحیح طور سے بات بھی نہ کرتی تھی۔ اس شادی پر اس نے بہت احتجاج کیا تھا' مگر کسی نے اس کی ایک نہ سنی۔ اسے یاسین کی دلکش شخصیت سے بھی رتی برابر دلچسپی نہ تھی۔ بلکہ اس کے اندر احساس کمتری کی ماری عورت شوہر کے ساتھ کھڑے ہوکر نظریں چرانے لگتی۔

"یہ زیادتی کی انتہا ہے۔" وہ جب بھی یاسین کی طرف دیکھتی' اسے یہ احساس جرم ہی مار ڈالتا کہ یاسین جیسے خوبرو انسان کو بڑی عمر کی کم رو عورت کا ساتھ نصیب ہوا۔

جب سلیمہ نے ——— صبح اپنے تئیں بیٹی کو خوش خبری سنائی۔ وہ تو ایسے ہتھے سے اکھڑی کہ سلیمہ کو سنبھالنا مشکل ہوگیا۔ یاسین کا سامنا ہونے پر اس نے اسے بھی خوب برا بھلا کہا۔

راحمہ کے لیے آپا کہنے والے لڑکے کو شوہر کا درجہ دینا بہت مشکل ثابت ہورہا تھا۔ تاہم باپ کے آنسوؤں اور جڑے ہوئے ہاتھوں نے اسے پتھر کا بنا دیا۔

شادی کی تقریب اس کی خواہش پر سادگی سے منعقد کی گئی تھی۔ یہ محلے کی پہلی تقریب ثابت ہوئی' جہاں دلہن کے بجائے دولہا نے تعریفیں سمیٹیں۔ سلیٹی رنگ کی شیروانی اور براؤن بنارسی پٹکے میں وہ اپنی گوری رنگت کے ساتھ اتنا چمک رہا تھا کہ نفیس سرخ کامدار جوڑے میں ملبوس اس کے برابر میں بیٹھی راحمہ پھیکی پڑگئی۔ لوگوں کے تبصرے سنتی ہوئی راحمہ نے ہونٹوں پر چپ کی مہر لگالی۔

☼ ☼ ☼

یاسین نے ماضی کو بھلا کر خوشی خوشی نئی زندگی کی ابتدا کی۔ وہ اب صرف راحمہ کا بن کر رہنا چاہتا تھا۔ مگر وہ تو جیسے پروں پر پانی نہیں پڑنے دیتی تھی۔ یاسین کی گرمجوشی کے مقابلے میں اس کا سرد رویہ اسے بہت کھلتا۔

آخر مرد تھا۔ اپنی بیوی میں چند خوشگوار تبدیلیاں دیکھنا چاہتا تھا۔ مگر راحمہ کی ضد ان کے رشتے کی خوب صورتی کا گلا گھونٹ رہی تھی۔ اس کی خواہش تھی کہ جب وہ شام کو دفتر سے لوٹے تو راحمہ دلکش ملبوسات زیب تن کیے ہلکا پھلکا تیار ہوکر' خوشبوؤں میں بسی ہوئی اسے خوش آمدید کہے۔ مگر وہ تو جیسے پتھر میں ڈھل گئی تھی۔ یاسین کی بے لوث محبت بھلا اس پر کیا اثر کرتی۔

وہ گھر میں قدم رکھتا تو بیوی بستر پر بکھرے بالوں' مسلے ہوئے کپڑوں میں اوڑھے لیٹے ملتی۔ اس کا دل خراب ہوجاتا۔

سلیمہ خود راحمہ کی ضد سے پریشان رہنے لگی تھیں۔ ابھی تک تو یاسین نے ان سے کوئی شکوہ نہیں کیا تھا۔ مگر وہ اندھی تو نہ تھیں۔ بیٹی کے ناشکرے پن پر اسے روزانہ ایک لمبا لیکچر دیتیں۔ مگر وہ کان پٹ کیے بیٹھی رہتی۔ مجبوراً" ان دونوں کے لیے کھانا پکا کر داماد کے آنے سے قبل گھر واپس چلی جاتیں۔ انہیں یہ گاڑی آگے چلتی ہوئی نظر نہیں آرہی تھی۔ ڈرتی تھیں کہ راحمہ اپنی انا اور غصے میں یاسین کو کھو نہ دے۔

گھریلو الجھنوں اور پریشانیوں کی وجہ سے یاسین کی دفتر میں کارکردگی صفر ہوگئی۔ پرائیوٹ ادارہ تھا۔ انہوں نے ایک دو وارننگ دی' پھر باہر کا راستہ دکھادیا۔

یاسین نے نہ چاہتے ہوئے بھی اپنی پریشانی بیوی سے شیئر کی تو راحمہ نے فوری طور پر اپنی چھٹیاں منسوخ کرائیں اور اسکول جوائن کرلیا۔ اب وہ مصروف رہنے لگی تھی۔ پھر عائلہ کی پیدائش ہوئی تو وہ تھوڑا بہل گئی۔ بچی کے ساتھ شوہر کے کھانے پینے کا خیال بھی رکھنے لگی اور خود بھی صاف ستھری رہنے لگی گھر بھی چمکا کے رکھتی۔ سلیمہ کو بھی بیٹی کی طرف سے سکون نصیب ہوا۔

مگر تقدیر کو شاید اس کا ناشکرا پن بھایا نہیں تھا۔ پہلے یاسین اس کے پیچھے بھاگتا تھا۔ اب وہ اس کی جانب متوجہ رہتی۔ مگر وہ پاس سے گزر جاتا۔ سرشام بن ٹھن کے جو گھر سے نکلتا تو اس کی واپسی رات گئے ہوتی۔ اس کے اندر کی عورت پوری طرح سے بیدار ہوچکی تھی۔ مگر بازپرس کرتی بھی تو کس منہ سے۔ آخر ماں کے اصرار پر اس نے یاسین کی پسند میں ڈھلنے کی ٹھانی۔

عائلہ کو ماں کے پاس چھوڑ کر پہلے وہ پارلر گئی۔ فیس ٹریٹمنٹ کے ساتھ بالوں کی لیئر کٹنگ کروائی۔ گھر آکر آنکھوں میں لینسز لگائے' جو اس نے چند دن قبل یاسین سے چھپ کر بنوائے تھے اس کے بعد گلابی کاٹن کے جدید اسٹائل کا ریڈی میڈ سوٹ زیب تن کیا۔ تھوڑی سی کوشش سے وہ اپنی عمر سے کئی سال پیچھے چلی گئی تھی۔ آئینے میں گھوم پھر کے دیکھا تو اپنا آپ اتنا برا نہیں لگا' شادی کے کئی سال گزرنے کے بعد آکر اس نے یاسین کی کہی ہوئی تمام خواہشات کو پورا کردیا۔

"آج تو ان کو حیران کردوں گی۔" کوفتہ پلاؤ کو دم دیتے ہوئے وہ مسکرا رہی تھی۔ اسے کیا خبر تھی کہ یاسین اسے اس سے زیادہ حیران کردے گا۔

"آرہی ہوں بابا۔" دروازے پر ہونے والی تیز دستک پر اس نے پرجوش انداز میں کہا تھا۔

"یاسین.... یہ کیا؟" شاید زمیں شق ہوجاتی۔ تب بھی وہ اتنا حیران نہ ہوتی جتنا دروازہ کھولنے پر یاسین کے ساتھ سجی سنوری مسکراتی ہوئی سونیا کو دیکھ کر ہوئی' اس کے پیچھے جھینپا جھینپا یاسین کھڑا تھا۔

☼ ☼ ☼

"پھپھو.... مجھے معاف کردیجئے گا۔ میں اس معاملے میں مجبور ہوگیا ہوں۔ جن حالات سے گزرا ہوں۔ وہ آپ کے سامنے ہیں۔ کوئی باہر کا ہوتا تو میں اس کے سامنے اپنی صفائیاں پیش کرتا۔ آپ سے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ میرا کتنا قصور ہے۔ یہ مجھ سے بہتر آپ جانتی ہیں۔ راحمہ میری بیوی ہے اور عائلہ میری بچی۔ میں ان دونوں کے حقوق ہمیشہ ادا کرتا رہوں گا۔ بہت کوشش کی کہ راحمہ کو منالوں اور وہ سونیا کے ساتھ رہنے پر تیار ہوجائے۔ اس وقت وہ کوئی معقول بات سننے کو تیار ہی نہیں۔ بس عائلہ کو لے کر گھر چھوڑنے پر تلی بیٹھی ہے۔ اسی لیے میں نے پہلے سونیا کو اس کے گھر چھوڑا پھر آپ کے پاس آیا ہوں۔ کل سونیا کے لیے دوسرے گھر کا بندوبست کروں گا۔ تاکہ راحمہ اسی گھر میں آرام سے رہتی رہے۔" یاسین ایک بار پھر سلیمہ سے نظریں چرانے پر مجبور تھا۔

انہوں نے نم آنکھوں سے داماد کو دیکھا۔ جس کی باتوں نے انہیں لاجواب کردیا تھا۔ بولتیں بھی تو کیا؟ بیٹی کی غلطیاں صاف نظر آرہی تھیں۔ پھر بھی کچھ تو

کہنا ہی تھا۔ شکیل تو بہنوئی کو مرنے مارنے پر تل گیا تھا۔ مگر سلیمہ نے اسے سمجھا بجھا کر باہر بھیج دیا۔

"اتنا بڑا قدم اٹھانے سے قبل تم مجھ سے پوچھ لیتے۔ دوسری شادی ضروری تھی کیا؟" وہ رندھے ہوئے گلے سے بولیں۔ یاسین نے انہیں شکوہ کناں نگاہوں سے دیکھا۔

"میں کیا کرتا؟ ایک طرف راحمہ تھی۔ جس نے میری قربانیوں، محبت کی قدر نہ کی اور دوسری طرف سونیا تھی جس نے میری محبت میں صرف قربانیاں دیں۔" یاسین بہت دلگرفتہ تھا سو ناراض لہجے میں بولا۔

"جو بھی ہے، عائلہ کا ہی خیال کر لیتے۔" انہوں نے اس وقت صرف بیٹی کی ماں بن کر کہا تھا۔

"عائلہ کا ہی تو سوچا تھا۔ نہیں چاہتا تھا کہ کل کو لوگ اسے بدکار کی بیٹی کے نام سے پکاریں۔ اسی لیے نکاح کا جائز راستہ اپنایا۔ یہ بھی تو سوچیے سونیا بھی تو کسی کی بیٹی ہے۔ میں راحمہ کے رویے سے تنگ آ کر اکثر ان کے یہاں جانے لگا تھا۔ ہماری نیتیں صاف تھیں۔ وہ ایک دوست ایک ہمدرد کے طور پر میرے دکھ درد بانٹتی تھی۔ ایک دن میرے وہاں جانے پر تبریز چچا نے ہاتھ جوڑ کر مجھے اپنے گھر آنے سے منع کر دیا کہ محلے بھر میں ان کی بدنامی ہو رہی ہے۔ یہ وجوہات تھیں جن کے باعث میں نے سونیا سے شادی کی۔" یاسین کہتے ہوئے مایوسی سے سر جھکائے باہر نکل گیا۔

اور سلیمہ چاہتے ہوئے بھی اسے آواز نہ دے سکیں۔

☼ ☼ ☼

"آپا... اب تو تمہارے کلیجے میں ٹھنڈ پڑ گئی ہے نا... ارے! تم نے ہمیشہ میرے یاسین کو دکھ ہی دیے، اب تو خوش ہو گئی ہو نا۔ وہ ہمیں چھوڑ کر ہمیشہ کے لیے چلا گیا۔ اب تم کس کا دل جلاؤ گی۔" راحمہ سفید دوپٹا اوڑھے، عائلہ کی انگلی تھامے سلیمہ کے ساتھ سن دماغ کے ساتھ سونیا کے گھر میں داخل ہوئی تو سونیا اسے دیکھ کر چیل کی طرح جھپٹی اور اس کا بازو پکڑ کر زور، زور سے بولنے لگی۔ راحمہ کو کسی بات کی پروا نہ تھی۔ وہ خود اپنے حواسوں میں نہ تھی۔ بس خاموشی سے جا کر میت کے پاس دو زانوں بیٹھ گئی۔

یاسین کا چہرہ دیکھ کر کوئی بھی یقین نہیں کر پا رہا تھا کہ وہ مر چکا ہے۔ ایسا لگتا تھا کہ میٹھی نیند سو رہا ہے۔ بھتیجے کو دیکھ کر سلیمہ کا بھی برا حال تھا۔ وہ نہ صرف مرحوم بھائی کی نشانی، بلکہ انہوں نے اسے بیٹوں کی طرح پالا تھا۔ عائلہ، باپ کی میت دیکھ کر دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔ مگر راحمہ اس کے پیروں کے پاس بیٹھی سرگوشیوں میں اس سے باتیں کرتی رہی۔ اس نے آج دل کی ہر وہ بات یاسین سے کہنا تھی جو ان کہی رہ گئی تھیں۔

"آپا... تمہیں اندازہ بھی نہیں ہو گا کہ یہ تم سے کتنی محبت کرتے تھے۔ اپنے آپ کو تمہارا مجرم کہتے تھے۔ سلیمہ پھپھو نے جو ان سے منہ موڑا تو یہ اندر سے جیسے ٹوٹ پھوٹ گئے۔ کل بھی پوری رات ان کی طبیعت خراب رہی۔ مگر ایسے حال میں بھی یہ تمہاری اور عائلہ کی ہی باتیں کرتے رہے۔ صبح میں دلیہ بنا کر انہیں اٹھانے آئی تو دیکھا کہ آنکھیں بند ہیں اور ناک سے خون جاری تھا۔ میں گھبرا کر چیخی۔ ابا کو بلایا۔ اسپتال لے کر پہنچے تو پتا چلا ختم ہو چکے ہیں۔ ڈاکٹر نے بتایا کہ برین ہیمبرج ہوا تھا۔" سونیا نے اس کے چہرے پر رنجیدگی اور خشک آنکھیں دیکھیں تو اس سے لپٹ گئی، دھیرے دھیرے بتانے لگی۔

"میں بھی تو ان سے اتنی ہی محبت کرتی ہوں۔ بس کبھی بتانے کا موقع نہیں ملا۔ اب بتاؤں گی۔ گھر آنے دو، کہیں نہیں جانے دوں گی۔" راحمہ نے اجنبی نظروں سے سونیا کو دیکھا اور مسکرا کر بولی۔

"آپا... ہوش میں آؤ... کیسی بہکی بہکی باتیں کر رہی ہو۔ ارے! ہم دونوں کی دنیا لٹ گئی ہے۔ یہ اب کبھی نہیں آئیں گے۔ نہ تمہارے گھر، نہ ہی میرے گھر۔" سونیا نے اسے جھنجھوڑا۔

"چپ ہو جاؤ تم... یاسین سو رہے ہیں اور آپ سب یہاں بیٹھی اتنا شور کیوں مچا رہی ہیں۔" اس نے سونیا کو جھڑکا اور خواتین کی طرف منہ کر کے بولی، جو بین بین کر کے ایسی جوان موت پر افسوس کر رہی تھیں۔ ہر ایک کی ترس بھری نگاہیں سونیا اور راحمہ تھیں۔

"راحمہ... میری بچی... آخری بار دیدار کر لے، اب کبھی یہ پیاری صورت نظر نہیں آئے گی۔" سلیمہ نے آگے بڑھ کر راحمہ کو یاسین کی شکل دکھائی۔ دوسری طرف سے اسے سونیا نے پکڑا ہوا تھا۔ وہ اپنا غم بھلائے راحمہ کو دلاسہ دے رہی تھی۔ جو بھی ہو تھا تو درد مشترک ہی۔

راحمہ نے ماں سے ہاتھ چھڑایا۔ پھر یاسین کی میت کو یک ٹک دیکھا۔ اور اچانک چیخیں مارتی ہوئی سونیا کے بازوؤں میں جھول گئی۔

☼ ☼ ☼

"بس بھائی! میں نے تو یہ سوچ کر متوسط طبقے کی لڑکی سے شادی کی تھی کہ وہ میرا خیال رکھے گی۔ اپنے ہاتھوں سے میرے لیے مزے مزے کے کھانے پکائے گی۔ مگر یہاں تو معاملہ ہی الٹ نکلا۔ اس نے تو فیشن و میک اپ میں ہمارے طبقے کی لڑکیوں کو بھی پیچھے چھوڑ دیا۔" عائلہ کو لگا کہ یہ شہیر کی آواز نہیں، پگھلا ہوا سیسہ ہو جس نے اسے سراپا جھلسا کے رکھ دیا۔ اس کی تھوڑی دیر قبل پارلر سے واپسی ہوئی تو پورچ میں شہیر کی گاڑی کھڑی دیکھی۔ اس کا موڈ خوشگوار ہو گیا کہ آج شوہر بڑے دنوں بعد گھر تھوڑا جلدی آ گیا ہے۔ وہ بغیر چاپ پیدا کیے اسے ڈھونڈتی ہوئی سٹنگ روم کی طرف آئی تو اندر سے آتی ہوئی آوازوں پر ٹھٹک کر رک گئی۔ رضوان بھائی جو شہیر کے دوست تھے، آئے بیٹھے تھے، وہ چائے کا پوچھنے جا ہی رہی تھی کہ اپنا ذکر سن کر تھم گئی۔

"اچھا... ہمیں لگا تھا کہ تم نے بھابھی کا انتخاب ان کی کم عمری اور خوب صورتی کی وجہ سے کیا۔" رضوان نے چائے کی چسکی لیتے ہوئے کہا۔

"ایک وجہ، اس کے چہرے پر چھائی معصومیت اور دلکشی بھی تھی۔ مگر مجھے امید تھی کہ عائلہ میرے لیے وہ سب کرے گی جس کی خواہش میرے اندر بچپن سے پنپ رہی ہے۔ اس کا سب سے پلس پوائنٹ اس کی ماں تھی۔ سادہ سی گھریلو، محنت کش خاتون، مجھے لگا وہ اپنی ماں کی طرح ہو گی۔ گھر کو گھر سمجھے گی۔ مگر اس نے مجھے مایوس کیا۔ وہ تو مما کی تصویر بن گئی جنہیں صرف اپنی ذات سے محبت ہے، جو گھر کو سنوارنے سجانے کے بجائے اپنے آپ کو نکھارنے میں مصروف رہتی ہیں۔" شہیر کا لہجہ حسرتوں سے لبریز تھا۔ دروازے سے چپکی کھڑی عائلہ کا تعارف اس شہیر سے پہلی بار ہوا تھا۔

"چھوڑ..... نا..... یار! میرا تیرا بچپن ساتھ گزرا ہے۔ میں تیری مڈل کلاسیوں والی ساری خصلتوں سے اچھی طرح سے آگاہ ہوں۔ بارہا کی سنی ہوئی کتھا کیوں دہرا رہا ہے۔" رضوان نے اس کا موڈ بحال کرنے کے لیے بات کو ٹالا۔ مگر وہ اس وقت صرف کہنے کے موڈ میں تھا۔ سننے کے نہیں۔

"یہ اندر سے ایسے تھے۔ مجھے پتا کیوں نہیں چلا۔ میں بے کار میں فالتو چیزوں کے پیچھے ہلکان ہوتی رہی۔" عائلہ نے پریشان ہو کر سوچا۔ پھر ان دونوں کی باتوں کی طرف متوجہ ہو گئی۔

"میں..... جب اسکول جاتا تو ممی سو رہی ہوتیں۔ واپس آتا تو وہ گھر سے غائب ہوتیں۔ کبھی جو شام کو ملاقات ہوتی تو وہ رات کے ڈنر کے لیے اپنی تیاریوں میں ہی مصروف ہوتیں۔ بچوں کے لیے ان کے پاس بالکل وقت نہیں تھا۔ مجھے اوروں کا تو نہیں پتا۔ مگر میں اپنی ماں کو بہت مس کرتا تھا جو ایک ورکنگ لیڈی کا چولا اوڑھ کر کہیں کھو گئی تھی۔ اپنے دوستوں کے گھروں میں دیکھتا تو ان کی ماؤں کو فکر ہوتی کہ اسکول جانے سے قبل بیٹے کے یونیفارم پر کہیں شکنیں نہ پڑ جائیں۔ مگر مما تو صرف اسی بات پر ہلکان رہتیں کہ چہرے پر کہیں عمر کے ساتھ ساتھ شکنیں نمودار نہ ہو جائیں۔ ان کے نظر انداز کیے جانے کی وجہ سے جوان ہونے پر بھی مجھے اپنے اندر ایک خلا سا محسوس ہوتا رہا۔ میں نے فیصلہ کیا تھا کہ ایسی بیوی لاؤں گا جو میری اولاد کو ماں کا پیار دے گی، مگر یہاں بھی مایوسی ہوئی۔" شہیر نے کمرے میں ٹہلتے ہوئے گلوگیر آواز میں اپنی بات مکمل کی۔ رضوان کا دل دکھ سے بھر گیا۔ وہ جانتا تھا کہ شہیر اندر سے کتنا تنہا ہے۔

"بھابھی..... بھولی بھالی سادہ طبیعت کی ہیں۔ تم ان سے اپنے دل کا حال کیوں نہیں بیان کرتے؟ ویسے بھی عورت تو مائع ہوتی ہے، جس برتن میں ڈال دو اسی میں ڈھل جاتی ہے۔" رضوان نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

عائلہ کو لگا کہ اس کی ازدواجی زندگی کی خوشیوں کا انحصار شہیر کے جواب میں چھپا ہوا ہے۔ اس نے سن ہوتے ہوئے پیروں کو ہیل والی سینڈل سے باہر نکالا، شوہر کو جیتنے کے لیے اب ان مصنوعی سہاروں کی ضرورت جو نہیں رہی تھی۔

"ہونہہ..... کہہ کر کروایا تو کیا کروایا..... یہ تو ایک انسان کے ساتھ زبردستی ہوئی نا۔ ویسے بھی وہ مجھے اتنی عزیز ہو گئی ہے کہ ایسے مسئلے چھیڑ کر میں اسے کھونے کا رسک نہیں لے سکتا۔" شہیر کی آواز نے جیسے عائلہ میں نئی جان ڈال دی۔

وہ مسکراتے ہوئے بیڈ روم کی طرف بڑھی۔ اسے بھاری جوڑے سے چھٹکارا پا کر کاٹن کا سوٹ پہننا تھا، کیونکہ آج وہ ڈنر میں اپنے ہاتھوں سے بریانی اور خوبانی کا میٹھا پکا کر شہیر کو سرپرائز دینا چاہتی تھی۔

☼ ☼ ☼

اس نے جب شہیر کو کباب اور اپنے ہاتھوں کی بنی ہوئی چائے پیش کی تو وہ بیوی کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ کاٹن کے جدید انداز میں سلے ہوئے سوٹ، دھلے دھلائے چہرے کے ساتھ سادگی سے باندھی گئی چوٹی اور ہلکی گلابی لپ اسٹک میں وہ اس کے خوابوں کی تصویر بن گئی تھی۔

"کتنی عجیب بات ہے کہ..... میرا اور امی کا نصیب ایک جیسا نکلا، مگر میں ان کی والی غلطی نہیں دہراؤں گی۔ ویسی ہی بن جاؤں گی جیسا شہیر چاہتے ہیں۔" عائلہ جب بستر پر سونے کے لیے لیٹی تو ذہن میں سوچوں کی یلغار تھی۔ اس نے سب سے دامن چھڑایا اور مسکراتے ہوئے اپنے برابر میں دراز شہیر کو دیکھا۔ جو بہت دنوں بعد ایسی پرسکون نیند سو رہا تھا۔ اس نے بھی آنکھیں موند لیں، صبح شوہر کو آفس کی تیاری میں مدد جو کروانا تھی۔

مصباح علی

"مومنہ! تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے۔"

سبرینہ دو کپ بھاپ اڑاتی چائے اور بسکٹوں والی پلیٹ اس کے قریب رکھتے ہوئے بولی تھی۔

وہ کچن کی کھڑکی سے گاہے بگاہے دیکھ رہی تھی۔ مومنہ برآمدے میں بچھی چارپائی پر اکڑوں اس طرح بیٹھی تھی کہ اس کی پشت کمرے کی جالی دار کھڑکی سے لگی تھی۔ اس نے اپنا بازو گھٹنوں پر لپیٹ رکھا تھا اور دوسرے ہاتھ کی انگلی قریب رکھے ربڑ پلانٹ کے بڑے پتوں کو چھو رہی تھی۔ ٹہنی پر ترتیب وار لگے پتوں کے عین اوپر ایک لمبی سی ننھی کونپل بن چکی تھی۔ جس کی نچلی سطح سرخی مائل اور اوپر جاتے ہوئے اس کی گلابیاں ہریالی میں بدل رہی تھیں۔ وہ اس چمکتی کونپل کو انگوٹھے اور انگشت سے چھو رہی تھی۔

وہ ان چند دنوں میں بالکل مرجھا سی گئی تھی۔ چہرے کے گلابی پن میں ہلدی جھلکنے لگی تھی۔ اس کے ہونٹ جو ہلکی سی لپ اسٹک سے ہر وقت کھلے رہتے تھے، آج کل ان پر سفیدی کی تہ چپک گئی تھی۔ آنکھوں کے گرد بھورے حلقے اس کی بے چین نیند کا غماز تھے۔

سبرینہ ـــــ کو اس کی اتنی خاموشی اور پھر اتری صورت خاصی کھل رہی تھی۔ آخر آج اس نے اس کے قریب بیٹھتے ہوئے پوچھ ہی لیا تھا۔ مگر اس کی آواز پر بھی اس میں ذرہ برابر جنبش نہ ہوئی۔ بلکہ وہ بھنویں سکوڑے پودے کو کونپل سے لے کر مٹی میں دبی جڑ تک دیکھے جا رہی تھی۔

"مومنہ! میں تم سے پوچھ رہی ہوں۔" سبرینہ نے اپنا ہاتھ اس کے گھٹنے پر رکھا۔

"ہونہہ....." وہ ذرا سا چونکی تھی۔

"خیریت ہے، تمہیں دن بدن کیا ہوتا جا رہا ہے؟؟"

"مجھے کیا ہونا ہے بھابھی۔" اس نے سرسری سا جواب دیا اور کونپل چھوڑ کر وہ بازو بھی گھٹنوں پر لپیٹ لیا۔ وہ ٹھوڑی کندھے پر ٹکائے ابھی بھی پودے کو ہی تک رہی تھی۔

"اگر کچھ نہیں ہوا تو پھر اتنی چپ کیوں رہنے لگی ہو، تم تو چند منٹ بھی خاموش نہیں رہتی تھیں، پھر اب....."

"بھابھی! آپ نے کبھی کونپلوں کو غور سے دیکھا

ہے، تلی پتلی، نازک، کتنی چمک دار ہوتی ہیں نا یہ... اپنے اندر زندگی کو مقید کیے، شگوفے پھوٹنے کی منتظر سی۔" اس کی آواز کنویں سے آتی محسوس ہو رہی تھی۔

سبرینہ نے الجھ کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ لمحہ بھر کے لیے چپ ہوئی اور اسی طرح بیٹھے بیٹھے گردن سبرینہ کی جانب موڑ دی۔

"بھابھی! یہ زیادہ کچھ تو نہیں مانگتیں، مٹی میں تو انہیں آپ لگا ہی دیتے ہیں اور پانی..." اس نے لمبی سانس کھینچی تھی۔ "پانی قدرتی نظام سے بارش کی صورت برس ہی جاتا ہے۔ مگر... انہیں پھوٹنے سے تناور شجر بننے تک..." اس نے آنکھیں بند کرتے ہوئے اپنا سر کندھے سے ہٹا کر کھڑکی کی جالی سے ٹکا لیا۔ "انہیں طوفانوں سے ڈر لگتا ہے۔ کوئی ہو جو انہیں موسموں کے عذاب سے بچالے۔"

اس نے آنکھیں کھول کر چند لمحے آسمان کو دیکھا، جہاں نیلی سی چادر پر چند سفید دھبے تھے۔

"عورت بھی تو کونپل ہی کی طرح ہے بھابھی۔" اس کی نظریں نیلی چادر سے ہٹ کر سبرینہ کی سیاہ آنکھوں پر تھیں۔

"بھابھی! خوراک اور گھر تو اسے مل ہی جاتا ہے۔ مگر... آندھیوں سے بھی بچانا ہوتا ہے... ورنہ وہ بھی سوکھے پتے کی طرح ٹوٹ کر بکھر جائیں۔" چائے کی بھاپ دب کر معدوم ہو گئی تھی۔ اب پیالیوں پر گہرے بھورے رنگ کی سلوٹی سی تہ جمی تھی۔

"مومنہ... میری بہن ایسے نہیں سوچتے اور تم تو ہر بات کو "ہوں بھاڑ میں جائیں سب" کہہ کر چٹکیوں میں اڑا دیتی تھیں، پھر اس قصہ پارینہ کو کیوں دل سے لگا کر بیٹھ گئی ہو، دفع کرو۔"

"بھابھی! یہ قصہ نہیں، سانحہ ہے، جو شخص معمولی سی تپش میں میری اوٹ نہ بن سکا، وہ آگے کیا کرے گا، زندگی میں تو بڑے بڑے طوفان آتے ہیں۔ وہ ان کا رخ کیسے موڑ سکتا ہے۔" ایک بھٹکا سا بے خیال قطرہ گالوں پر لڑھک کر اس کے دامن میں گم ہو گیا تھا۔

مومنہ اور سبرینہ دیورانی، جٹھانی تھیں۔ ان دونوں میں بہنوں کی طرح پیار اور ناراضی چلتی رہتی تھی۔ وہ ایک دوسرے سے دکھ سکھ شیئر کر کے جینے والی تھیں۔ ساتھ کھانا، ساتھ پہننا اور پھر ایک دوسرے کی عزت کے ساتھ دلجوئی بھی کرتی تھیں۔ ان کے بچوں کا بھی یہی عالم تھا۔ چند منٹوں کی لڑائی اور پھر گھنٹوں ساتھ کھیلنا۔ دونوں بہوؤں کا اتنا گٹھ جوڑ عالیہ بیگم سے برداشت نہ ہوتا تھا۔ وہ اوپر پورشن میں رہتی تھیں اور نیچے بہوؤں کی راج دھانی تھی۔ وہ ٹیرس پر کھڑی جب بھی بہوؤں کو راز و نیاز میں دیکھتیں تو ہمیشہ ان کے دل میں یہی شک آتا کہ میری ہی برائیاں کر رہی ہوں گی۔ اسی لیے کوئی چبھتا جملہ ضرور کہہ دیتی تھیں۔ سبرینہ کچھ خاموش طبع تھی۔ وہ سنتے ہی اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی جاتی۔ جبکہ مومنہ جہاں ان کی دل سے عزت کرتی تھی، وہاں غلط بات بالکل برداشت نہیں کرتی تھی۔ وہ فوراً "جواب ضرور دیتی تھی۔

"امی جان! ہم آپ کی چغلیاں تو نہیں کر رہے تھے، ہم تو صرف طہٰ کے ہوم ورک پر بات کر رہے تھے۔" یہ بات بھی درست اور بے ضرر تھی، مگر عالیہ کو کیسے برداشت ہوتی۔ وہ پاٹ دار لہجے میں بولی تھیں۔

"سب جانتی ہوں میں، یہ تم دونوں کے ڈھکوسلے... ادھر مردوں کے گھر آنے کا وقت ہوا، ادھر دونوں سر جوڑے دن کے قصے دہرانے لگ جاتی ہو، تاکہ میرے بیٹوں کا دل میری طرف سے کھٹا ہو جائے۔"

"جانے ان کا دل ہے یا دہی جو کھٹا میٹھا ہی ہوتا رہتا ہے۔" مومنہ آہستگی سے بڑبڑاتی ہوئی چپل پاؤں میں اڑسے کچن میں چلی گئی تھی۔

انہیں مومنہ پر بہت غصہ آتا تھا۔ کیونکہ سبرینہ ان کے سامنے کبھی نہ بولی تھی۔ ہر بات خاموشی سے برداشت کر لیتی تھی۔ مگر مومنہ کی عادت مختلف تھی۔ وہ چار باتیں سن لیتی، مگر پھر بول ہی پڑتی۔ مومنہ کے

جواب دینے کی اہم وجہ اس کا میاں بھی تھا۔ یوسف جہاں اپنے بیوی بچوں کی ہر ضرورت کا خیال رکھتا تھا۔ وہاں اس کے ہونٹ بھی سلے تھے۔ وہ اپنی ماں، بہن کے سامنے کبھی غلط بات پر تو کیا درست پہلو پر بھی کبھی حمایت نہ کرتا تھا۔ بلکہ خاموشی سے اس کے بارے میں تمام شکوے گردن جھکائے سنتا رہتا تھا۔ جب اس کی برداشت سے باہر ہو جاتا تو صرف اتنا کہتا۔ "میں سمجھاؤں گا اسے، آئندہ ایسا نہیں کرے گی۔" اور خاموشی سے سیڑھیاں اترتا نیچے آجاتا تھا۔ مومنہ کو اس سے صرف یہی شکوہ تھا کہ یہ جانتے ہوئے بھی کہ اس کا کوئی قصور نہیں ہے۔ خاموش رہ کر اسے مجرم ثابت کر دیتے ہیں۔ وہ اپنی بے وقعتی پر کلس کر رہ جاتی اور گردن جھٹک کر "بھاڑ میں جاؤ تم۔" کہتی اپنے کاموں میں مگن ہو جاتی تھی۔

ابھی چند دن پہلے کی بات تھی۔ مومنہ اور سبرینہ نے مشین لگا کر سارے گھر کے کپڑے دھوئے تھے۔ مومنہ سوکھے کپڑے تار سے اتار کر تہہ کر رہی تھی۔ اس نے چند سوٹ آئرن اسٹینڈ پر رکھتے ہوئے سرسری سا کہا تھا۔ "امی جان! آپ کے کپڑے میں شام میں استری کر دوں گی، اس وقت مجھے ہنڈیا بھوننی ہے۔ یوسف کھانا کھانے آتے ہی ہوں گے۔"

وہ کہتی ہوئی سیڑھیاں پھلانگتی نیچے آگئی۔ یقیناً" یوسف کے آنے کا وقت تھا۔ عالیہ بیگم کی بیٹی کی ساس جو کچھ دیر پہلے آئی تھیں۔ ان کے پاس بیٹھی تھیں۔ ان کے سامنے عالیہ بیگم کو سبکی کا احساس ہوا کہ وہ اپنی بہوؤں سے خوب کام لیتی ہیں حالانکہ مہمان خاتون نے محسوس بھی نہیں کیا تھا۔ وہ بہت اطمینان سے چائے پیتی رہیں۔ ان کے جانے کے بعد عالیہ نے اس کی خوب کلاس لی۔

"تم نے ان کے سامنے کپڑے ضرور اتارنے آنا تھا۔"

"امی جان! صحن میں سوکھے کپڑے پھیلے برے معلوم ہو رہے تھے اور ویسے بھی مجھے نہیں پتا تھا کہ اوپر آنٹی آئی ہوئی ہیں۔" وہ منمنائی تھی۔

"ہاں... تمہیں تو معلوم ہی نہیں ہے، کون آتا ہے، کون جاتا ہے، ننھی منی ہو نا، آنکھیں موندھے ایک طرف جھلنگے میں پڑی رہتی ہو۔" عالیہ زور سے گرجیں۔

"امی جان! غلطی ہو گئی ہے۔ پلیز اب جانے دیں۔" اس نے بات ختم کرنا چاہی تھی۔

"غلطی نہیں مومنہ! تم جان بوجھ کر ایسا کرتی ہو، دوسروں کو بتانا چاہتی ہو، تم پر بہت ظلم ہو رہا ہے، کپڑے دھلوا کر، استریاں کروائی جا رہی ہیں۔ کھانے پکوائے جا رہے ہیں۔" ان کا لہجہ خاصا تلخ تھا۔

"جلتی ہو نا، میری بچی سے، تم سے کہاں برداشت ہوتا ہو گا، میری بیٹی کا سکھ آرام، تم چاہ رہی ہو گی اس کی ساس جا کر ماسیاں ہٹا دے اور کاموں کا دھاوا بول دے میری بچی پر۔"

"امی جان! مجھے کیا ضرورت ہے جلنے کی، وہ انیقہ کی سسرال ہے، وہ جیسے مرضی رکھیں اسے، ان کا اپنا گھر، اپنے معاملات ہیں، یہ ہمارا گھر ہے، ہم نے اپنے طریقے سے زندگی گزارنی ہے، مجھے کیا ضرورت ہے کسی کو سنانے کی۔ آپ خوامخواہ دل میں شک کو جگہ دے رہی ہیں۔"

وہ روہانسی ہو گئی۔ جانتی تھی اگر اس نے مزید صفائی پیش کی تو وہ مزید بھڑکیں گی۔

مومنہ خالصتاً" عالیہ بیگم کی پسند تھی۔ جسے یوسف نے پورے دل سے قبول کیا تھا۔ شروع شروع میں عالیہ بیگم کو اپنی پسند پر ناز تھا۔

مگر جلد ہی عالیہ بیگم عدم تحفظ کا شکار ہو گئیں۔ انہیں لگتا تھا کہ بیٹوں کا رجحان بیویوں کی طرف زیادہ ہے۔ ان کی ہر ضرورت وقت سے پہلے پوری کرتے ہیں۔ اپنی ذات سے زیادہ بیوی، بچوں پر خرچ کرتے ہیں۔ جبکہ وہ پہلے بھی ہر رشتے کے معاملے میں بہت کیئرنگ تھے۔ اپنی ماں، بہنوں کی ضرورتوں کا خیال بھی اسی طرح رکھتے تھے۔ مگر عالیہ بیگم سے بیٹوں کی یہ تقسیم ہضم نہ ہوتی تھی۔ اسی لیے کوئی

نہ کوئی چبھتی بات کہہ دیتیں۔ جسے سبرینہ کڑوا گھونٹ سمجھ کر اتار لیتی، مگر مومنہ غلط بات پر وضاحت ضرور پیش کرتی تھی اور پھر عالیہ بیگم کی نہ ختم ہونے والی تقریر شروع ہو جاتی۔ بڑے بھیا ماں کے رویے پر اکثر انہیں سمجھا دیتے کہ.....

''آپ ایسے ہی شروع ہو جاتی ہیں، پہلے بات سمجھ تو لیا کریں۔'' اسی لیے سبرینہ کی کچھ بچت ہو جاتی تھی۔ جبکہ یوسف کا معاملہ دوسرا تھا، وہ اکثر ماں کے سامنے مومنہ کو ہی ڈانٹ دیتا کہ تم جرح نہ کیا کرو۔ وہ میری ماں ہیں۔ بڑی ہیں۔ وہ غلط نہیں ہو سکتیں۔

''مگر غلط فہمی تو ہو سکتی ہے نا۔'' مومنہ آہستہ سے بڑبڑاتی۔ جس کے جواب میں یوسف گرج کر سرزنش کرتا۔ ''مومنہ.....''

''ہونہہ.....'' مومنہ نے خفیف سی گردن جھٹکی اور یقیناً'' دل میں کہا ہوگا ''بھاڑ میں جاؤ تم۔'' اور اپنے کاموں میں مصروف ہو گئی۔

اس صورت حال سے عالیہ خوب فائدہ اٹھاتیں۔ خوب اس کی بدزبانی گنواتیں۔ یوسف اپنی ماں کے احترام میں خاموش رہتا۔ اس کی خاموشی مومنہ کے دل میں گڑی پھانس بن جاتی۔

''کبھی تو وہ دن بھی آئے جب اسے اپنے میاں کی حمایت ملے، خواہ چند لفظوں سے ہی سہی۔'' یہ حسرت اس کے دل میں زور پکڑنے لگی تھی۔

☼ ☼ ☼

وقت اپنی کچھوا چال میں مگن تھا۔ مگر اس ست روی میں کچھ خلیج پیدا ہونے لگی تھی۔ عالیہ کا رویہ اس کے ساتھ برہم تو پہلے ہی تھا، مگر اب یوسف کے ساتھ بھی، نپا تلا ہوتا جا رہا تھا۔ ہر وقت کاٹ دار تیوری چڑھی رہتی۔ ہر بات کا جواب لاتعلقی سے یا سخت الفاظ میں دیتیں۔

چند دن پہلے مومنہ کے بڑے بیٹے کا قرآن پاک مکمل ہوا تھا۔ وہ بازار سے ایک سوٹ لے آئی اور بہت رسانیت سے عالیہ کو دیتے ہوئے کہنے لگی۔

''امی جان! یہ آپ قاری صاحب کو دے دیجیے گا، وہ خوش ہو جائیں گے۔''

جواب میں عالیہ کچھ نہ بولیں۔ مگر کینہ توز سی نظریں اٹھیں اور سوٹ لے کر تخت پر ایک جانب رکھ دیا۔ مومنہ ان کی نظروں کا مطلب اس وقت تو نہ سمجھ سکی۔ مگر چند دن بعد جب وہ بچوں کے اسکول سے واپس آئی تو گھر میں گویا قیامت آگئی تھی۔ عالیہ بیگم صحن کے بیچ و بیچ بیٹھی تھیں۔ مگر اسے دیکھتے ہی شروع ہو گئیں۔

''کہاں سے آ رہی ہو تم۔''

''امی جان! وہ میں..... طہٰ کے اسکول.....''

''جھوٹ مت بولو مومنہ! میں نے خود تمہیں فاطمہ روڈ پر اترتے دیکھا تھا۔''

مومنہ ان کے تیکھے اور غصیلے لہجے پر شاکڈ تھی۔ جب وہ گھر سے نکلی تھی تو عالیہ بیگم اس سے پہلے اپنی بیٹی کے ساتھ کسی ملنے والی کے ہاں جا رہی تھیں۔ اسے طہٰ کے اسکول لازمی جانا تھا۔ کیونکہ اس کی فیس آج کل کے چکر میں یوسف نے خاصی لیٹ کر دی تھی۔ آج اس نے فیس جمع کروانے کا پورا تہیہ کر رکھا تھا۔ یوسف کو وہ صبح ہی بتا چکی تھی۔ مگر جب وہ اسکول سے واپس آنے لگی تو اس کا رکشا فاطمہ اسپتال کے آگے ٹریفک جام میں پھنس گیا تھا۔ اسپتال دیکھتے ہی اسے خیال آگیا کیوں نہ پھپھو کی عیادت کرلی جائے۔ اس کی پھپھو کئی دن سے اسپتال میں داخل تھیں اور عیادت کے لیے یوسف کے پاس وقت نہ نکلتا تھا۔ وہ اسی خیال سے رکشا رکوا کر اسپتال میں چلی گئی۔ یقیناً'' وہیں کہیں ٹریفک جام میں انیقہ اور عالیہ بیگم پھنسی ہوئی تھیں اور اسے اترتے دیکھ لیا تھا۔

''جی امی..... وہ میں.....'' اس نے وضاحت دینے کے لیے سب کھولے۔ اسی وقت یوسف بھی گھر کی راہ داری میں داخل ہوا تھا۔ کھانے کا وقت تھا۔ مگر عالیہ بیگم کی دھاڑ میں اس کی آہٹ کسی کو محسوس نہ ہوئی۔

''کیا وہ میں..... کس سے ملنے گئی تھیں، کچھ خیال

بھی ہے یا نہیں تمہیں، سارے شہر میں رکشا گھماتی پھرتی ہو، میرے بچے کی حق حلال کی کمائی جانے کن رستوں پر اڑا رہی ہو۔''

اس کی ٹانگیں وہیں شل ہو گئیں۔ وہ سن سا کھڑا ماں اور بیوی کو دیکھ رہا تھا۔

''امی جان! یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں۔ آپ جانتی ہیں، اس اسپتال میں میری پھپھو ایڈمٹ ہیں اور میں.....'' مومنہ منمنا رہی تھی۔ ''اور تم..... تم نے تو لازمی عیادت کرنی تھی، کسی کے گھر بچہ ہو جائے، کوئی مر جائے، کوئی بیمار ہو، سارے خاندان کو تم نے ہی تو پوچھنا ہے۔ ایک کاٹھ کا الو تمہارے ہاتھ لگ گیا ہے۔ خوب لٹاؤ اسے۔'' عالیہ بیگم کی آواز میں مزید تیزی آگئی۔

''امی، کیا لٹا دیا ہے میں نے۔'' اب کے مومنہ بھی تلخی سے بولی تھی۔

''بچایا ہی کیا ہے تم نے، زبان مت چلاؤ میرے آگے، سب جانتی ہوں، جو تم میری ناک کے نیچے کھیل تماشے کر رہی ہو، کتنی بری عورت ہو تم، سب پتا ہے مجھے، بہو نہیں عذاب بن گئی ہو میرے لیے، میرا بچہ کما کما کر ہلکان ہو گیا، اس غریب کے پاس گزارے کے پیسے.....'' اصل بات زبان سے پھسل چکی تھی۔

کچھ دن پہلے عالیہ بیگم نے اپنے بیٹوں سے کچھ رقم کا تقاضہ کیا تھا۔ جو ان کے داماد کو چاہیے تھی۔ بڑے بیٹے نے تو سہولت سے کہہ دیا۔ ''امی جان میں تو کل ہی مال لایا ہوں، ابھی تو پیسے نہیں ہیں۔'' مگر یوسف پریشان ہو گیا تھا۔ کیونکہ رقم بھی معمولی نہیں، تین لاکھ روپے تھی، اب بے بی گارمنٹس میں اتنی بھی بچت نہیں تھی کہ ماں کے کہتے ہی فوراً'' ہاتھ پر دھر دیتا۔ اس نے لفظوں کو بہت ناپ تول کر ادا کیا۔

''امی جان! فی الحال تو میرا ہاتھ تنگ ہے۔ مگر ایک، دو ماہ میں میری کمیٹی نکلنے والی ہے، ان شاء اللہ میں جلد انتظام کر دوں گا۔''

عالیہ بیگم کو اس کا جواب بہت برا لگا تھا کہ اچھا ہاتھ تنگ ہے۔ ابھی چند دن پہلے ہی بچوں کے کپڑے لایا تھا۔ وہ اچھے اسکولوں میں پڑھ رہے ہیں۔ اچھا کھا، پہن رہے ہیں..... بس ماں، بہن کے لیے انکار ہے۔ اس دن سے خاموشی اختیار کرلی تھی۔ مگر وہ خاموشی آج مومنہ پر ٹوٹی ——————— جب پیسوں کا لفظ منہ سے نکلا اور ساتھ ہی نظر بائیک کے ساتھ کھڑے بیٹے پر گئی تو پہلے تو وہ سٹپٹائیں۔ مگر لمحہ لگا تھا انہیں اپنی بات سنبھالنے میں۔ وہ فوراً'' یوسف کی طرف بڑھیں۔

''پوچھو یوسف! اس سے۔ کہاں سے آ رہی ہے۔ صبح کی نکلی اب تمہارے آگے آگے آئی ہے۔ میں نے اس سے پوچھ کیا لیا، مجھے کھانے کو پڑ رہی ہے۔ بڑی ہوں میں اس گھر کی۔ نظر رکھنا فرض ہے میرا۔''

''امی، ابھی یوسف نے ہونٹ کھولے ہی تھے، عالیہ پھر شروع ہو گئیں۔

''تم تو کہہ رہے تھے تمہارا گزارہ مشکل سے چل رہا ہے اور یہ سارا دن رکشوں میں پھرتی ہے۔ کہاں جاتی ہے۔ کس سے ملتی ہے۔ کچھ خبر بھی ہے تمہیں، اس کے پاس روپیہ کہاں سے آ رہا ہے۔ میں جھوٹ بول رہی ہوں تو پوچھو اس سے، قاری کو خوش کرنے کے لیے جوڑے دیے جا رہے ہیں، جانے شہر میں کس کس کو خوش کرتی پھر رہی ہے۔ کیا کیا بانٹ رہی ہے۔'' وہ رندھی آواز میں اس پر الزام لگائے جا رہی تھیں۔

مومنہ نے ابلتی آنکھوں سے ساس کو دیکھا، پھر ایک موہوم سی امید سے یوسف کو دیکھا، جو ہنوز خاموش تھا۔ اس نے ماں سے نظر ہٹا کر ایک نگاہ مومنہ کو دیکھا، اس کی نظر میں جو بھی تھا، مگر مومنہ کو وہ نگاہ جواب طلب لگی تھی۔ اس کی سانس رکنے لگی۔

''ہمیشہ مجھ سے ہی گلے رکھنا کہ میں انہیں ڈانٹ ڈپٹ کر رکھتی ہوں، میں یہ سب تمہاری عزت بچانے کے لیے کرتی ہوں۔ مگر تم آنکھیں بند ہی رکھنا۔'' وہ ناک منہ سکوڑ کر مومنہ کو ایک ہاتھ سے پرے دھکیلتی اوپر اپنے پورشن میں چلی گئیں۔

سبرینہ اپنے کمرے کی چوکھٹ پر کھڑی تمام منظر

دیکھ رہی تھی۔ اس نے چکر کھاتی مومنہ کو دیکھا تو بھاگ کر اسے سنبھالا دیا تھا۔ یوسف اپنا ماتھا اور کن پٹیاں سہلاتا اپنے کمرے میں چلا گیا۔

اس دن سے مومنہ نے اپنی صفائی پیش نہ کرنے کی قسم کھالی تھی۔ اسے اپنی ساس سے اتنا گلہ نہ تھا' جتنا یوسف سے تھا۔ وہ تو ساس تھیں۔ ان کی باتیں جتنی بھی تلخ ہوں' اسے سہنی ہی تھیں۔ مگر یوسف جس کے ساتھ اس نے زندگی کے دس سال گزار دیے' اس کا مان' اس کا سب کچھ' اس کا اتنا خیال رکھنے والا شوہر... جب اتنے بڑے بڑے الزام لگ رہے تھے۔ وہ تب بھی معمول کی طرح خاموش رہا تھا۔ اس کی حمایت کے لیے ایک لفظ نہ پھسلا اس کے منہ سے۔ کیا اتنی ہی بے وقعت تھی اس کی ذات اس کے لیے۔ ـــــ دس سال میں وہ اس پر اپنا اعتبار نہ بٹھا سکی تھی۔ کیا اسے یقین تھا کہ وہ بری عورت ہے؟ اور برے رستے اس کی کمائی اجاڑ رہی ہے؟

یہ کسک اسے اندر ہی اندر دیمک کی طرح کھانے لگی تھی۔ اب اسے کوئی مان نہ رہا تھا کہ یوسف کبھی اسے کسی طوفان سے بچا سکے گا۔ مگر اسے اس گھر میں زندگی گزارنا تھی' اپنے چار بچوں کی خاطر اس ساتھ کو نبھانا تھا۔ وہ دل پر پتھر کی سل رکھے جی رہی تھی۔

دوسری طرف یوسف بھی جانے کیوں خاموش رہنے لگا تھا۔

اس کی خاموشی بھی مومنہ کے دل میں گڑتی جا رہی تھی۔ وہ اس کی نظروں میں خود کو گرا ہوا محسوس کرنے لگی۔ اس کا معمول تھا وہ گھر آتے ہی فوراً" اوپر چلا جاتا تھا جو سامان لاتا ماں کے ہاتھ میں دیتا تھا۔ مگر اب وہ خاموشی سے آکر بیڈ پر لیٹ جاتا اور سبزی' پھل وغیرہ کسی بچے کے ہاتھ اوپر بھجوا دیتا۔ عالیہ بیگم کتنی دیر ٹیرس پر کھڑی نیچے کی خاموشی تکتی رہتیں۔ بچے بھی سہمے سہمے لگتے تھے۔ نہ بچوں کا شور' نہ مومنہ کی ہنسی اور پھر بیٹے کی اتری صورت' عالیہ کا دل گھبرا سا گیا۔ وہ بہانے بہانے سے نیچے کے چکر لگاتی رہتیں۔ مگر سب کچھ ہنوز ہی ملتا۔

☼ ☼ ☼

مومنہ اپنے چھوٹے بیٹے کو سُلا کر کچن میں کسی کام سے آئی تھی۔ کچن کے برابر ایک اسٹور نما کمرا تھا۔ جو کم و بیش ہی استعمال ہوتا تھا۔ آج وہاں سے مدھم آوازیں آرہی تھیں۔ وہ غیر ارادی طور پر چند قدم دروازے کی طرف بڑھی۔

"امی جان! شہر کے حالات دیکھے ہیں آپ نے' مہنگائی' مندا کاروبار' ہڑتالیں اور سب سے بڑھ کر ٹارگٹ کلنگ' ہم جان ہتھیلی پر رکھ کر باہر نکلتے ہیں اور جب گھر آئیں وہاں بھی سکون نہ ملے... ایسے میں شکلیں اداس ہی ہوں گی نا۔"

"کک... کیا مطلب... کس نے سکون لے لیا تمہارا۔" عالیہ بیگم بیٹے کی بات پر سٹپٹا گئیں۔

"جو کچھ اس دن ہوا' کیا وہ سکون آور تھا۔ امی! آپ نے کبھی غور کیا ہے کہ میں آپ کے آگے کچھ نہیں بولتا۔ مجھے خوب اندازہ ہے کہ آپ اکثر غلط فہمی کا شکار ہوتی ہیں' مگر میں نے کبھی آپ کے سامنے مومنہ کا فیور نہیں کیا' جس پر وہ اکثر گلہ بھی کرتی ہے' جانتی ہیں کیوں..." عالیہ بیگم نے جواب طلب نگاہ یوسف کی طرف اٹھائی۔

"کیونکہ جہاں ماؤں کو بیٹوں پر مان ہوتا ہے کہ وہ فرماں بردار رہیں' وہاں بیٹوں کو بھی مان ہوتا ہے کہ ان کی ماں کبھی ایسی بات نہ ہونے دے' جس سے ان کی ماں' ان کی بیوی کے سامنے ہلکی پڑ جائے یا نظر سے گر جائے' وہ ہمیشہ ان کے سامنے فخر سے اپنی ماں کو ہی آئیڈیلائز کرتے ہیں... مگر اس دن... آہ... آپ نے مومنہ کے سامنے خود کو ہلکا کر کے مجھے بھی اس کی نظر میں گرا دیا... میں کتنا ٹوٹ گیا ہوں' آپ کو اندازہ نہیں ہے' مجھ میں اس سے نظر ملانے کی ہمت نہیں ہے۔"

وہ بہت ٹوٹا ہوا بول رہا تھا۔ عالیہ بیگم کے دل کو کچھ ہوا۔ انہیں احساس ہوا تھا کہ داماد کے بے جا مطالبے پر خوامخواہ اپنے گھر فساد برپا کیا۔

"امی جان! عورت سے زیادہ بھولی اس دنیا میں کوئی مخلوق نہیں ہے' جہاں ذرا سی جھوٹی سچی تعریف' ذرا سا اعتماد اسے چٹان کی طرح مضبوط بنا دیتا ہے کہ وہ اپنی ہمت سے کئی گنا زیادہ کام کر لیتی ہے۔ وہاں ذرا سی حوصلہ شکنی' عدم اعتماد اسے ریت کی طرح بکھیر دیتا ہے اور مومنہ آج کل ریت کی مانند ڈھے رہی ہے۔"

"میں نے... میں نے اسے خود دیکھا تھا یوسف اس لیے پوچھ لیا۔" وہ گھگھیا کر بولیں۔

"امی! آپ نے پوچھا نہیں تھا' اعلان کر رہی تھیں' بتا رہی تھیں' جتا رہی تھیں۔" یوسف کچھ آگے کو سرک کر بیٹھا۔

"امی! دنیا میں ہر نظر آنے والی چیز اور کسی حد تک رشتے بھی فانی ہوتے ہیں۔ مگر... مگر منہ سے نکلے الفاظ کمان سے نکلے تیر کی طرح ہوتے ہیں۔"

ان کے بیٹے کی جرح ختم نہیں ہوئی تھی غالباً" یوسف سارا میل آج دھونا چاہتا تھا۔

"امی جان آپ کا مقام اپنی جگہ' مگر میں مومنہ کو بھی دس سال سے جانتا ہوں' وہ آج تک مجھے بتائے بغیر کہیں نہیں گئی' کسی سے نہیں ملی' اس دن بھی وہ مجھے بتا کر ہی گئی تھی' بلکہ میں نے اسے کہا تھا جانے کو۔"

یہ الفاظ سنتے ہی مومنہ کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ جو شخص اس کی حمایت میں کبھی سچا لفظ نہیں بولا تھا۔ آج اس کی صفائی میں مصلحتاً" جھوٹ بول رہا تھا۔ وہ بھی اپنی ماں سے۔

یقیناً" وہ بتا کر ضرور جاتی' اگر اس کا پروگرام اچانک نہ بنتا۔ مگر یوسف کو اس پر اعتبار تھا۔ اس کا مان نہیں ٹوٹا تھا۔ یوسف کے لفظ اس کے جلتے سسکتے دل پر ٹھنڈی پھوار کی طرح لگے تھے۔

"تم یہ چاہتے ہو نا میں اس سے معافی مانگوں' مانگ لیتی ہوں' میں اس کے پاؤں پکڑ لوں گی' مگر خدا کے لیے گھر کا ماحول ٹھیک کرو' یہ مجھے کاٹ کھانے کو دوڑ رہا ہے۔"

"امی! یہ ہم نے کب کہا کہ آپ معافی مانگیں۔"

یوسف نے بڑھ کر عالیہ بیگم کے دونوں ہاتھ تھامے اور چوم لیے۔ "میں یہ کبھی نہیں چاہوں گا کہ میری ماں' میری بیوی سے معافی مانگے' لیکن جو کچھ اس دن ہوا مجھے اس پر افسوس ضرور ہے' شاید اس کا کفارہ کبھی نہ ادا کر سکوں۔" وہ عالیہ بیگم کے قدموں میں بیٹھا تھا۔

"تم نہیں کر سکتے' مگر میں ایک منٹ میں کر دوں گی۔" وہ مومنہ کی فطرت جانتی تھیں کہ وہ غصہ اور غلط بات برداشت نہیں کرتی' مگر پیار سے ایک آواز دینے کی دیر ہے۔ وہ فوراً" مسکاتی ہوئی آجائے گی۔ سو عالیہ بیگم نے مزید دیر نہیں کی۔

"مومنہ کہاں ہو تم... چائے ہی بنا لاؤ' کتنے دن ہو گئے تمہارے ہاتھ کی چائے نہیں پی۔"

"جی اچھا امی... لاتی ہوں۔" وہ بھی فرماں برداری سے کہتی چند منٹوں ـــ بعد ہی ٹرے میں تین کپ رکھے لے آئی۔ کیونکہ عالیہ کے ساتھ دونوں بیٹے بھی بیٹھے تھے۔

"تم اپنے لیے نہیں لائیں۔" انہیں کپوں میں کمی کا احساس ہوا۔

"اپنے لیے بھی لے آؤ... یا ایسا کرو' صرف کپ لے آؤ' اسی میں سے آدھی آدھی کر لیتے ہیں اور ہاں..." جب وہ جانے کو مڑی تو پھر عالیہ بیگم نے سر پر ہاتھ مارا۔

"سبرینہ کو بھی لے آؤ' اکیلے چائے پینے کا مزا تھوڑی آتا ہے۔"

مومنہ کے پیچھے کھڑی سبرینہ حیرت سے کبھی ساس اور کبھی یوسف کو دیکھ رہی تھی۔ جس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔

یوسف چائے کی چسکیاں بھرتا گہری نظروں سے مومنہ کو تک رہا تھا۔ جہاں آج کوئی گلہ' کوئی خفگی نہیں تھی' بلکہ محبت بھرے تحفظ کا احساس جگمگا رہا تھا۔

عنیقہ محمد بیگ

قسمت

"ہادیہ! جو لوگ ہمیں بہت برے لگتے ہیں، وہ اچانک اچھے لگنے لگیں تو اسے کیا کہیں گے؟" رخسار نے آہ بھر کر پوچھا۔ ہادیہ جو فائن آرٹس کی کلاس کے بعد اسکیچ بنانے میں مصروف تھی ہنس کر بولی۔ "دماغ کا خلل!"

"افوہ... اسکیچ گھر جا کر بنا لینا۔ میری بات کا ٹھیک سے جواب دو۔" رخسار نے ہادیہ سے پنسل چھین لی۔

"پہلے یہ بتاؤ کہ وہ کون ہے جو اچانک اچھا لگنے لگا ہے۔" ہادیہ ابھی بھی سنجیدہ نہیں تھی۔

ناولٹ

رخسار نے مسکرا کر کہا۔ "شہزاد، میرا کزن۔" ہادیہ حیرانی سے بولی۔

"کیا؟ وہ شہزاد جو چھ ماہ سے تمہارے گھر میں رہائش پذیر ہے۔ تمہاری خالہ فاطمہ کا بیٹا شہزاد، اس کی بات کر رہی ہو کیا؟" شہزاد جس کو گھر سے بھگانے کے لیے رخسار روز اس کے خلاف پلان بنایا کرتی تھی اور اس کی وجہ یہ تھی کہ شہزاد کی آمد سے رخسار کو اپنا پیارا سا کمرہ چھوڑنا پڑا اور اوپر سے اس کی اماں بھی شہزاد پر زیادہ توجہ دینے لگی تھیں۔ شہزاد نے اس کے پیار میں حصہ بٹا لیا تھا۔ ہر چیز شہزاد کی فرمائش کے مطابق ہوتی۔ شہزاد کو کریلے پسند تھے اور رخسار کریلوں کے نام سے بھاگتی تھی۔

"اماں! یہ کیا ہے۔ کریلے کیوں پکا لیتی ہیں آپ؟ کیا بازار میں باقی ساری سبزیاں ختم ہو گئیں؟" رخسار کالج سے واپس گھر پہنچی... تو پیٹ میں بھوک کے مارے چوہے کود رہے تھے۔ وہ سیدھا کچن کی طرف گئی۔ صبح خالی پیٹ کالج کا رخ کرنا اور کالج میں بھی ہلکا پھلکا لینے سے رخسار گھر آ کر کھانے پر ٹوٹ پڑتی تھی۔

شہزاد ٹیبل پر بیٹھا مزے سے کریلے گوشت کھا رہا تھا اور زبیدہ سامنے کرسی پر بیٹھی اسے پنکھا جھل رہی تھیں۔

زبیدہ نے مسکرا کر کہا... "شہزاد کو کریلے پسند ہیں... بس اس لیے پکائے ہیں۔ تم کل رات کی مونگ کی دال سے روٹی کھا لو۔"

رخسار غصے سے کچن سے نکل گئی اور شہزاد مزے

سے کھانا کھانے میں مصروف رہا۔ جیسے اس کے کان میں رخسار کی آواز ہی نہ پڑی ہو۔ شہزاد کی آمد نے ان کی بیٹے کی حسرت پوری کردی تھی۔ انہوں نے شہزاد کو گلے سے لگالیا۔ مگر رخسار سے شہزاد۔ کی ذات گھر میں ہضم نہیں ہورہی تھی۔

شہزاد کے باپ نے ایک کمسن لڑکی سے دوسری شادی کرلی۔ اسلام میں چار شادیوں کی اجازت ہے۔ شہزاد یہ تو جانتا تھا۔ مگر جابر خان نے کمسن بیوی کے پٹی پڑھانے پر شہزاد کو گھر سے نکال دیا۔ شہزاد کہاں جاتا۔ اس نے خالہ کے گھر پناہ لی تھی۔ زبیدہ کو بیٹے کی آرزو تھی۔ ویسے بھی بھانجا تھا۔ جھٹ سے ممتا کا دروازہ کھول دیا۔ جو رخسار کے لیے قابل قبول نہ تھا۔

شام کو زبیدہ چائے لے کر رخسار کے پاس آئیں۔ وہ کمرے سے باہر نہیں نکلی تھی۔ زبیدہ نے چائے کا مگ رخسار کے ہاتھ میں دیا۔ رخسار جو چائے کی دیوانی تھی۔ جھٹ ناراضی بھول کر چائے کا مگ پکڑلیا۔

"اماں! یہ شہزاد ہمارے گھر سے کب واپس جائے گا۔" رخسار نے چائے کا گھونٹ بھر کر پوچھا۔ زبیدہ نے خفگی سے کہا۔

"رخسار کچھ تو لحاظ کرو، میری مری بہن کا بیٹا ہے۔ میں اس کا واحد سہارا ہوں۔ ایسے موقع میں اس کا ساتھ نہیں دوں گی۔۔۔ تو کون دے گا۔ رخسار چپ ہوگئی۔ اسے شہزاد پر ترس آیا تھا۔ ماں مر کر ساتھ چھوڑ گئی تھی، تو باپ نے جیسے جی چھوڑدیا تھا۔

شہزاد روز صبح کام کے لیے نکل جاتا اور شام کو تھکا ہارا گھر پہنچتا۔ فراز خان نے اپنے دوست احباب کے ذریعے تین ہزار ماہوار پر شہزاد کو ایک گارمنٹس کی دکان پر ملازمت دلوادی تھی۔ زبیدہ بیگم نے احتجاج بھی کیا تھا۔

"بی اے پاس شہزاد کو کسی دفتر میں ملازمت دلوا دیتے۔"

فراز خان نے تلخی سے کہا۔ "زبیدہ بیگم ملازمت ملنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ بیکاری سے تو بیگار بھلی۔" رخسار نے بھی فواز کا ساتھ دیا کہ ابا ٹھیک ہی تو کہتے ہیں۔

شہزاد نے ان کی باتیں سن لی تھیں۔ شہزاد کا دل چاہنے لگا کہ وہ زبیدہ خالہ کا گھر چھوڑ کر چلا جائے۔ مگر پھر یہ سوچ کر خاموش ہوگیا کہ فراز انکل ٹھیک ہی تو کہہ رہے ہیں۔ خالی جیب میں تین ہزار کی آمد بھی بڑی بات ہوتی ہے اور یوں شہزاد نے فراز انکل کے ایڈریس پر گارمنٹس کی راہ پکڑلی۔ پھیکی سی آسمانی شرٹ پہن کر شہزاد گارمنٹس شاپ پر جا پہنچا۔ دکان کے مالک جمال شاہ نے ایک گہری نظر شہزاد پر ڈالی اور پھر سنجیدگی سے کہا۔

"پہلے کہیں سیلز مین کا کام کیا ہے۔"

"نہیں۔ مجھے اس کام کا کوئی تجربہ نہیں ہے۔" شہزاد نے سچ بولا۔

"پھر پہلی بات تو یہ ہے کہ تمہیں اپنے لباس کا خیال رکھنا ہوگا۔ تم شرٹ چینج کرلو۔" جمال شاہ نے شہزاد کی شرٹ پر نظر ڈال کر کہا تھا۔

شہزاد نے حیرت سے کہا۔ "وہ کیوں؟"

"سیلز مین کو چاق و چوبند اور خوش لباس ہونا چاہیے۔ تم شرٹ بیچ رہے ہو تو خود بھی اچھی شرٹ میں نظر آنا ضروری ہے۔"

جمال شاہ نے دوسرے سیلز مین کو پچھلے سال کے پڑے مال میں سے ایک شرٹ شہزاد کو دینے کے لیے کہہ دیا۔ شہزاد نئی شرٹ پہن کر آیا تو اسد نے مسکرا کر کہا۔

"اس میں جناب کافی خوب صورت لگ رہے ہیں۔" اسد بھی غریب گھرانے سے تعلق رکھتا تھا۔ اس لیے اس کے دل میں شہزاد کے لیے ہمدردی امڈ آئی۔ جبکہ شہزاد کو ہمدردی جیسے جذبے سے نفرت ہوتی جارہی تھی۔

"دل رکھنے کے لیے کہہ رہے ہو۔"

"نہیں ایک غریب دوست اپنے غریب دوست کو دلاسا دینے کی کوشش کررہا تھا۔" اسد سنجیدہ ہوگیا۔

"گھر میں کتنے لوگ ہیں۔" شہزاد نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"بس دو وقت کا کھانا سب کو کھلا رہا ہوں۔ دو بہنیں اور بوڑھے ماں باپ ہیں۔" اسد نے بے بسی سے کہا تھا۔

شہزاد نے آہ بھر کر کہا۔ "خدا کا شکر ادا کرو کہ تمہارے پاس تمہاری فیملی ہے۔ جن سے دکھ سکھ بانٹ لیتے ہو۔ میرا حال تو بے حال ہے۔ ماں فوت ہوگئی۔ باپ نے دوسری شادی کرلی اور نئی ماں جو مجھ سے کم عمر تھی ـــــ مجھے محبت کے پیغام دینے لگی۔ ابا سے شکایت کی تو الٹا ابا نے مجھے ذلیل کرکے گھر سے نکال دیا۔ نہ گھر رہا، نہ باپ کا پیار۔ میری ماں کی اکلوتی بہن زبیدہ خالہ نے سہارا دیا ہوا ہے۔ ورنہ کب کا مر چکا ہوتا۔" شہزاد نے اپنی داستان سنائی تو اسد بھی اداس ہوگیا۔

پہلی تنخواہ اس نے آدھی خالہ زبیدہ کو گھر میں دی۔ جو خالہ زبیدہ نے لے لی۔ شہزاد، زبیدہ کا بھانجا تھا۔ وہ نہیں چاہتی تھیں کہ فراز خان اسے مفت کی روٹیاں توڑنے کا طعنہ دے۔

زبیدہ نے پندرہ سو میں پانچ سو کے نوٹ کا اضافہ کردیا اور دو ہزار فراز خان کو رات کو دیے۔

"زبیدہ! یہ پیسے کہاں سے آئے ہیں؟" فواز نے حیرت سے پوچھا۔

زبیدہ نے مسکرا کر کہا۔ "شہزاد کو پہلی تنخواہ ملی ہے۔ اس میں سے اپنا خرچ دیا ہے۔" زبیدہ نے جتلا کر کہا تھا کہ شہزاد ان پر بوجھ نہیں بننا چاہتا۔

"کتنے دن یہاں رہے گا۔ اس کو اب اپنا ٹھکانہ ڈھونڈنا چاہیے۔ رخسار بھی جوان ہے۔ کل کو خدانخواستہ کوئی بات نکل آئی تو لوگوں کو کیا صفائی پیش کروں گا۔" فراز خان نے پیسے تکیے کے نیچے رکھتے ہوئے بیزاری سے کہا۔ اس کی بہن عرشی نے اس کے کان بھرے تھے۔

"جوان لڑکا گھر میں رکھنا ٹھیک نہیں۔ کل کو خدانخواستہ رخسار کے رشتے میں کہیں رکاوٹ کا باعث نہ بن جائے۔"

"اگر آپ کا بھانجا ہوتا تو کیا کرتے؟ تم اسے بھی گھر سے نکال دیتے۔ میں اسے کیسے نکال دوں۔ اس کا کوئی دوسرا ٹھکانا نہیں ہے۔"

"تو لوگوں کو کون جواب دے گا۔ آج عرشی نے بات کی۔ کل پورا خاندان بول اٹھے گا۔" فراز خان نے فکرمندی سے کہا تھا۔ جبکہ وہ زبیدہ کے احساسات کو بھی سمجھ رہا تھا۔ شہزاد شریف لڑکا تھا۔ وہ یہ بھی جانتا تھا۔ مگر باہر والوں کو کیسے سمجھا سکتا تھا۔ زبیدہ کے میکے کا فرد ہونے پر۔۔۔ فراز کے گھر والے بات کو زیادہ اچھال رہے تھے۔

"کیوں نہ ہم شہزاد کو اپنا داماد بنالیں۔ اس طرح ہماری اکلوتی بیٹی ہماری نظروں کے سامنے رہے گی۔" زبیدہ نے فراز کے سامنے اپنی دل کی بات رکھ دی۔

فراز خان سوچ میں پڑگیا۔ اس کی اکلوتی بیٹی گھر میں ہی بہو بن جائے تو اس سے اچھا کیا فیصلہ ہوگا۔ فراز کے دوست ارباز کی بیٹی کو دو ماہ کے بعد طلاق ہوگئی تو فراز اس حادثے سے ڈر گیا تھا۔ جوان بچی کی زندگی تباہ کردی تھی۔ ارباز نے تو ان لوگوں کے سامنے ہاتھ جوڑے تھے کہ ایسا ظلم نہ کریں، مگر ان لوگوں نے کہا کہ لڑکے کو لڑکی پسند نہیں آئی۔ وہ کسی اور لڑکی سے پیار کرتا ہے۔ دبئی میں شادی کرلی۔ اب گھر چھوڑ کر چلا گیا ہے۔ طلاق کے کاغذات بھجوادیے ہیں۔ اب ہم سسرال میں کیسے رکھ سکتے ہیں۔ ارباز کو ہارٹ اٹیک ہوا اور ایک ہنستی مسکراتی فیملی پر غم کے بادل چھا گئے۔ وقت کے ساتھ ساتھ شہزاد اپنے پاؤں پر کھڑا ہوجائے گا۔ یوں فراز خان نے تمام تر فیصلہ وقت پر چھوڑدیا تھا۔

شہزاد اب پہلے جیسا سادہ اور سچا شہزاد نہیں رہا تھا۔ اس نے ملازمت میں چرب زبانی اور جھوٹ بولنا سیکھ لیا تھا۔ اس نے زبیدہ کو ہزار روپے دیے تھے۔ یہ کہہ کر کہ اس ماہ تنخواہ کم ملی ہے۔ دکان میں خسارہ ہورہا ہے۔ زبیدہ جو اس کو داماد کے روپ میں دیکھ رہی تھیں انہوں نے خوشی خوشی ہزار روپے پکڑ لیے۔ وہ شہزاد کی پسند کے کھانے بناتیں مگر اس کی ہر من پسند ڈش کا رخسار ستیاناس کردیتی۔

شہزاد جب ملازمت سے گھر آتا تو خالہ زبیدہ اور فراز

خان کھانا کھا کر اپنے کمرے میں چلے جاتے۔ رخسار ہی کھانا اس کو دیتی۔ کبھی نمک زیادہ کردیتی، تو کبھی پانی ڈال دیتی، روٹیاں گرم کرنے کے بہانے زیادہ سینک دیتی۔ شہزاد کو پاپڑ جیسی روٹیاں کھانا پڑتیں۔ مگر رخسار مسکرا کر معذرت کرلیتی۔ جس پر شہزاد خاموش ہوجاتا۔ مگر وہ جانتا تھا کہ وہ جان بوجھ کر اس کو اذیت دینے کے لیے کررہی ہے۔

☼ ☼ ☼

کالج میں رخسار نے شہزاد کا مسئلہ بتایا تو ہادیہ نے سوچ کر کہا۔

"تم اس کے کمرے میں مرا ہوا چوہا رکھ دینا۔ اس کی بدبو سے ہی کمبخت مرجائے گا اور تمہارے گھر کی جان چھوڑدے گا۔"

"وہ مرد کا بچہ ہے۔ چوہے سے ڈرنے والا نہیں ہے۔" رخسار نے خفگی سے کہا۔

"تم ایسا کیوں نہیں کرتیں، اس کے کمرے میں سانپ رکھ دو۔" آفرین جو کینٹین ٹیبل پر ہاتھوں سے ڈھولک بجارہی تھی۔ اس نے ہنس کر مشورہ دیا۔

"یہاں چوہا نہیں مل رہا اور تم سانپ کا بندوبست کروانے کا کہہ رہی ہو۔" ہادیہ نے کہا۔

رخسار نے ایک دم کہا۔ "شفو بابا سے کہتے ہیں کہ ہمیں مرا ہوا چوہا لا کردیں۔"

رخسار نے شفو بابا جو کالج کینٹین کے چھوٹے موٹے کام کرتا تھا۔ اس سے بات کی۔

"بابا رخسار کو مرا ہوا چوہا چاہیے۔" ہادیہ نے ہنسی دبا کر کہا تھا۔

"چوہا اور وہ بھی مرا ہوا، کیوں، تم لوگ فائن آرٹس سے سائنس اسٹوڈنٹ کیسے بن گئے ہو؟"

رخسار نے گھبرا کر کہا۔ "بابا وہ ہمیں اسکیچ کے لیے چوہا چاہیے۔"

رخسار کی باربار التجا پر شفو بابا نے کل کا وعدہ کیا۔ تب ہادیہ، آفرین اور رخسار خوش ہوگئیں۔

وعدے کے مطابق شفو بابا نے ــــ ایک شاپر دے دیا۔ جس کو ہادیہ نے بمشکل کالج سے چھٹی ہونے کے بعد پکڑا اور رخسار کے گھر کے اندر دے گئی۔

زبیدہ سے آنکھ بچا کر چوہے والا شاپر شہزاد کے بیڈ کے نیچے رکھ دیا گیا۔ شام کو شہزاد کے گھر آنے کا بے صبری سے رخسار انتظار کرنے لگی۔ تقریباً" رات کے بارہ بجے کے بعد شہزاد اپنے کمرے میں پہنچا۔ رخسار بھی خاموشی سے اسٹور روم میں چلی گئی۔ اسٹور روم کو رخسار نے اپنا کمرہ بنالیا تھا۔ وہ بار بار اسٹور روم کا دروازہ کھول کر دیکھ رہی تھی کہ شہزاد کمرے سے نکلا یا نہیں۔

ایک گھنٹے کے بعد شہزاد کو کمرے میں بدبو سی محسوس ہونے لگی۔ شہزاد کام سے تھکا ہارا آیا تھا۔ نیند سے برا حال تھا۔ بدبو سے بیزار ہوکر کمرے میں چاروں طرف دیکھا۔ بدبو بیڈ کے نیچے سے ہی آرہی تھی۔ اس نے غصے سے بیڈ اٹھایا اور بیڈ کے نیچے پڑے کالے شاپر کو کھولا تو مرا ہوا چوہا اس کو گھور رہا تھا۔ شہزاد نے کھڑکی کھولی اور شاپر باہر پھینک دیا۔ شہزاد کے کمرے میں ایک کھڑکی روڈ کی طرف کھلتی تھی۔ ہاتھ دھوئے اور کمرے میں پرفیوم چھڑک کر بستر پر لیٹ گیا۔ اسے رخسار پر شدید غصہ آرہا تھا۔ پھر ایک پھیکی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر سج گئی۔ جب بچپن میں وہ مرے چوہے کی دم پر رسی باندھ دیا کرتا تھا اور محلے کے بچوں کو ڈراتا تھا۔ اس کی ماں ڈانٹ ڈپٹتی اور اس کے ہاتھ کلمہ پڑھا کر پاک کرتی۔ شہزاد کی آنکھوں میں نمی تیرنے لگی۔ اس کی ماں اکثر کہا کرتی تھی۔ شہزاد میں نہ رہی تو پھر تجھے معلوم ہوگا کہ ماں کیا ہے۔ وہ ماں کی یاد میں کھوگیا اور پھر نیند نے اس کو اپنی آغوش میں لے لیا، جبکہ دوسری طرف رخسار، شہزاد کے کمرے سے نکلنے کی منتظر تھی۔ شہزاد مزے سے سو رہا تھا۔ مگر رخسار نے وہ رات بے چین ہوکر گزاری کہ شہزاد کی طرف سے کیوں کوئی ردعمل نہیں ہوا۔ اگلے دن کالج میں رخسار نے جمائیاں لیتے ہوئے تمام صورت حال بتائی۔

"مجھے تو لگتا ہے کہ وہ چوہا نہیں، بلکہ چوہیا تھی، جس کی وجہ سے تمہارا کزن کمرے سے باہر نہیں نکلا۔" آفرین نے ہنس کر کہا تھا۔

پھر اگلے دن کا پلان یہ بنایا گیا کہ شہزاد کے تکیے کے غلاف پر ایک چمچہ سرخ مرچ مل دی جائے اور تکیے کو چادر سے ڈھانپ دیا جائے۔ جب شہزاد مزے سے سونے لگے گا تو

سرخ مرچیں اس کا برا حال کردیں گی۔

کالج پلان پر عمل کیا تھا۔ مرچوں کی وجہ سے اس کے نازک ہاتھوں میں جلن ہونے لگی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ اس کے ہاتھوں کی جلن سے اس کا یہ حال ہے تو شہزاد کا تو برا حال ہوجائے گا اور یقیناً" اس کا کمرہ چھوڑ کر بھاگ جائے گا۔

شام کو شہزاد گھر پہنچا تو رخسار اسٹور روم میں جا گھسی۔ چور کی داڑھی میں تنکا، رخسار نے زبیدہ کو سر درد کی اطلاع دے کر سونے کا بہانہ بنالیا تھا اور اپنے اسٹور روم کے دروازے کی آڑ سے شہزاد کے روم کی طرف ٹکٹکی باندھ لی۔

شہزاد نے باتھ لیا اور بستر پر گرا۔ تکیہ پر سر رکھتے ہی اس نے کھانسنا شروع کردیا۔ اس کی گردن، کان میں جلن محسوس ہونے لگی۔ آنکھوں اور ناک سے پانی بہنے لگا۔ اس نے سر اٹھا کر تکیہ دیکھا تو پسی سرخ مرچیں اس کے ہاتھوں میں لگ گئیں۔ شہزاد جلدی سے باتھ روم کی طرف بھاگا۔ رخسار جو اس منظر کو دیکھنا چاہتی تھی اچھل پڑی، شہزاد کے کھانسنے کی آواز اسٹور روم تک آرہی تھی۔ اس کو یقین تھا کہ شہزاد اب اس کا کمرہ خالی کرکے بھاگ جائے گا۔ وہ باتھ لے کر نکلا تو اس کی نظریں رخسار پر پڑیں جو مزے سے لاؤنج میں بیٹھی ٹی وی دیکھ رہی تھی۔ وہ اس کی طرف بڑھا۔ رخسار شہزاد کو اپنے پاس آتا دیکھ کر گھبرا سی گئی۔

شہزاد نے سنجیدگی سے کہا۔ "مرا ہوا چوہا اور سرخ مرچوں کے لیے شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں۔ کیا میں جان سکتا ہوں کہ آپ ایسا کیوں کررہی ہیں؟" شہزاد نے سنجیدگی سے کہا۔

"نہیں، نہیں میں نے تو نہیں ایسا کیا۔ آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔"

"دیکھو رخسار! میں مجبور ہوں' ابھی میں اپنے پیروں پر کھڑا نہیں ہوا ـــــ موت نے مجھ سے میری ماں چھین لی' باپ نے گھر سے نکال دیا' تعلیم ادھوری رہ گئی' دو وقت کا کھانا بمشکل کھاتا ہوں' میں جانتا ہوں کہ میں تم لوگوں کے لیے بوجھ ہوں' مگر جوں ہی مجھے کوئی اچھی ملازمت مل جائے گی' میں یہ گھر چھوڑ دوں گا۔ پلیز مجھے مزید تنگ مت کرو' میں زندگی سے پہلے ہی تنگ ہوں۔" شہزاد افسردگی سے کہہ کر چلا گیا۔

رخسار بری طرح شرمندہ ہو گئی۔

اس رات رخسار سو نہیں سکی۔ وہ خود کو کوس رہی تھی کہ اس کی عقل پر کیسا پردہ پڑ گیا تھا کہ وہ اپنے کزن کا دکھ نہیں سمجھ سکی۔

اگلے دن کالج میں ہادیہ نے پلان کے متعلق پوچھا تو رخسار خاموش رہی۔

"کیا ہوا' وہ گھر چھوڑ کر چلا گیا ہے کیا؟" آفرین نے رخسار کی خاموشی دیکھ کر پوچھا۔

رخسار نے افسردگی سے کہا۔ "نہیں وہ نہیں گیا مگر میں نے بہت غلط کیا۔"

ہادیہ اور آفرین بھی خاموش ہو گئیں۔ کیونکہ وہ بھی خود کو قصوروار سمجھ رہی تھیں۔

☼ ☼ ☼

رخسار کا رویہ شہزاد کے ساتھ بدل گیا تھا۔ روز شام کو شہزاد اور رخسار گپ شپ کرتے' یہ گپ شپ کب محبت میں بدل گئی۔ یہ رخسار کو تب اندازہ ہوا جب جمال شاہ نے مال لینے کے لیے شہزاد کو دوسرے شہر بھیجا۔ وہ رات رخسار نے بے چینی سے کاٹی' ہر پل دروازے پر دستک کا انتظار ـــــ رہا تھا۔ رخسار کی نیند بھوک پیاس اڑ سی گئی۔

☼ ☼ ☼

"بیٹا خاندان میں ایک رخسار اور دوسری فرح ہے۔ جس سے کہتے ہو' میں اس کے گھر چلی جاؤں گی۔"

نزہت نے اپنے بیٹے کو لندن میں کال کر کے کہا تھا۔ جواد لندن میں ملازمت کے سلسلے میں گیا تھا۔ نزہت فراز خان کی بڑی بہن تھیں۔ ان کی دلی خواہش تھی کہ جواد کی شادی یا تو رخسار سے ہو جائے یا پھر فرح سے؟" فرح ان کی بہن عرشی کی بیٹی تھی۔ فرح کے نخرے تو آسمان کو چھوتے تھے۔ جبکہ رخسار گھریلو تھی' بلکہ شہزاد کی محبت میں تو زیادہ ہی سگھڑ بن گئی تھی۔

نزہت نے جب رخسار کے ہاتھ کا کھانا کھایا تو اسے بہت اچھا لگا۔

زبیدہ نے کہا کہ شوہر کے دل تک پہنچنے کا راستہ اس کے معدے سے گزر کر جاتا ہے۔ اس لیے ماؤں کو چاہیے اپنی بیٹیوں کو کچن کے کاموں سے جوڑ کر رکھیں۔ نزہت نے بھی ان کا ساتھ دیا۔ جبکہ عرشی برا مان گئی۔ فرح جو کچن کے نام سے دور بھاگتی تھی۔ نزہت کی یوں رخسار کی تعریف پر منہ پھلا کر بیٹھ گئی۔

فرح جواد کو پسند کرتی تھی۔ عرشی بھی یہی چاہتی تھیں کہ نزہت' فرح کو اپنی بہو بنا لیں۔ مگر بات نزہت کی نہیں' بلکہ جواد کی تھی۔

لندن میں قیام ـــ کیے اس کو پانچ سال ہونے والے تھے۔ ان پانچ سالوں میں لندن میں اس نے یہ محسوس کیا کہ اپنا ملک اپنا ہی ہوتا ہے۔ کسی بھی دھماکے پر تمام مسلمانوں کو بری نگاہ سے دیکھنا شروع ہو جاتا۔ پاکستان میں انجینئرنگ کے بعد لندن کی ایک کمپنی میں بطور انجینئر کام کرنا اس کا خواب تھا۔ مگر پانچ سال لندن میں رہنے کے بعد اس کو یوں لگا کہ وہ لندن میں نہیں رہ سکتا۔ اس نے فیصلہ کیا تھا کہ وہ پاکستان واپس لوٹ جائے گا۔

☼ ☼ ☼

"اماں دیکھو' میں نے کریلے ٹھیک پکائے ہیں۔" امتحانات سے فارغ ہو کر رخسار نے کچن کا کام سنبھال لیا تھا۔

"آج سورج مغرب سے نکلا ہے کیا؟" قیمہ بھرے کریلے دیکھ کر زبیدہ نے مسکرا کر کہا تھا۔

"اماں بس آج دل چاہا کہ کریلے پکاؤں۔ آپ کو پسند نہیں ہیں کیا؟"

زبیدہ نے ہنس کر کہا۔ "مجھے بھی پسند ہیں۔ مگر شہزاد کو زیادہ پسند ہیں۔" زبیدہ جو کب سے شہزاد کو داماد کی جگہ دل میں دے چکی تھیں۔ رخسار کا شہزاد کی طرف جھکاؤ دیکھ کر اور بھی مطمئن ہو گئیں کہ ان کی بیٹی ہی ان کی بہو بن کر اس کے پاس رہے گی۔ ایک ماں کا دل تو یہی چاہتا ہے کہ اس کے بچے کو کسی بھی قسم کی تکلیف نہ ہو۔

دوسری طرف شہزاد جمال شاہ کی ملازمت سے تنگ آ چکا تھا۔

جب ایک کسٹمر نے شہزاد کے بُرے رویے کی شکایت کر دی۔ شہزاد نے اس سے غصہ سے کہا۔

"شرٹ خریدنے کے لیے پیسے نہیں ہیں.... تو دکان پر لینے کیا آئے ہو۔" جس پر دکان پر ہنگامہ سا ہو گیا۔ باقی گاہکوں نے جلدی سے دکان کو چھوڑا کہ کہیں کوئی سین پستول کا نہ ہو جائے۔ آج کل کس کی جیب سے کب پستول نکل آئے۔ کوئی اعتبار نہیں تھا۔

جمال شاہ نے کسٹمر کا غصہ ٹھنڈا کیا اور شہزاد کو بہت باتیں سنائیں۔

شام کو شہزاد گھر میں داخل ہوا تو بہت افسردہ تھا۔

رخسار نے شہزاد کو افسردہ دیکھا' تو وہ فکر مند سی ہو گئی۔ زبیدہ اور فراز خان کھانا کھا کر سو گئے تھے۔ جبکہ رخسار' شہزاد کے لیے بھوکی بیٹھی تھی۔ شہزاد کے منہ' ہاتھ دھونے کے بعد وہ کھانا لے کر سیدھا شہزاد کے روم میں چلی گئی۔ شہزاد نے ہاتھ لے لیا تھا۔ ابھی وہ بال تولیے سے خشک کر رہا تھا کہ رخسار کھانا لے آئی۔ قیمہ بھرے کریلے دیکھ کر شہزاد کا غصہ ٹھنڈا ہو گیا اور اس نے قیمہ بھرے کریلوں سے پورا انصاف کیا۔ شہزاد نے بھی اسے آج کے واقعہ کے متعلق بتایا۔ رخسار کے علاوہ وہ کس سے اپنے دل کا درد بیان کرتا۔ ضرورت پڑنے پر وہ رخسار کو اپنا دوست سمجھ لیتا اور ضرورت ختم ہونے پر بیگانہ سا ہو جاتا۔

"ہم غریب پیدا ہی اس لیے ہوئے ہیں کہ ذلت سہتے رہیں۔" اس نے افسردگی سے کہا۔

رخسار نے اسے تسلی دی اور مسکرا کر کہا۔

"آپ پرائز بانڈ خرید لیں۔ میری دوست ہادیہ کے ابا بانڈز فروخت کرنے کا کام کرتے ہیں۔ پہلے ان کے گھر کا حال برا تھا۔ ان کا پرائز بانڈ نکل آیا تو انہوں نے کاروبار شروع کر دیا آج لاکھوں میں کھیل رہے ہیں۔ ہادیہ کو دیکھ کر میں نے اور آفرین نے بھی پرائز بانڈ خریدے ہوئے ہیں۔ آپ اپنے لیے ایک پرائز بانڈ خرید لیں۔ قسمت کا کیا پتا.... کب خاک سے عرش پر پہنچا دے۔" شہزاد نے اپنی تنخواہ میں سے پندرہ سو روپے رخسار کو دیے اور زبیدہ کو اس مہینے خرچ نہیں دیا۔ رخسار نے زبیدہ کو بتا دیا تھا کہ شہزاد نے ایک پرائز بانڈ خریدا ہے۔ اس لیے اس ماہ خرچ نہیں دے سکا۔

زبیدہ بیگم کئی بار فراز سے کہہ چکی تھیں کہ وہ شہزاد کو کسی اچھی جگہ ملازمت دلوا دیں۔ فواز کے پاس کو ڈرائیور کی ضرورت پڑی تو انہوں نے شہزاد کو وہاں رکھوا دیا۔ تنخواہ اچھی تھی۔

شہزاد دوسرے دن ہی چلا گیا۔ اشرف خان فراز کو جانتے تھے۔ اس لیے فوراً ہی اسے رکھ لیا گیا۔

اشرف خان کی وسیع و عریض کوٹھی کے پورچ میں تین شان دار گاڑیاں کھڑی تھیں۔ وہ حیرانی سے انہیں دیکھ رہا تھا۔ تب ہی لاؤنج سے ایک دبلی پتلی نازک سی لڑکی باہر نکلی۔ اس کی دودھیا رنگت چاندنی کو شرما رہی تھی۔ اس نے شہزاد کو گاڑی کی چابی تھما کر کہا۔

"کالج جانا ہے۔ یہ بلیک گاڑی کی چابی ہے۔"

اس نے جلدی سے بڑھ کر دروازہ کھولا۔ لڑکی گاڑی کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ شہزاد نے گاڑی اسٹارٹ کی اور گاڑی ہوا سے باتیں کرنے لگی۔

اشرف کی اکلوتی بیٹی عائشہ کو اللہ تعالیٰ نے فرصت سے بنایا تھا۔ سونے کا چمچہ منہ میں لے کر پیدا ہونے والی عائشہ کے دل میں انسانیت کا درد تھا۔ فراز نے جب عائشہ کو رخسار کے متعلق بتایا کہ اس کے لیے لڑکا تلاش کیا ہے۔ جو اس کا خالہ زاد ہے۔ مگر بے روزگار ہے تو عائشہ نے فراز انکل کی بیٹی رخسار کی زندگی میں خوشیاں لانے کے لیے شہزاد کو ملازمت پر رکھ لیا۔

شہزاد چپکے چپکے شیشے سے عائشہ کو ــــ دیکھ رہا تھا۔

کالج آگیا تھا۔ اس نے گاڑی سے اترتے ہوئے کہا "تمہاری جاب پکی ہے۔ بابا کو میں فون کردوں گی تم ایک بجے مجھے لینے آجانا۔" عائشہ نے مسکرا کر کہا تھا۔ شہزاد اس کی مسکراہٹ سے مسحور سا اسے دیکھتا رہ گیا تھا۔

"بھیا! آپ کو کچھ نظر نہیں آرہا ہے۔ رخسار کا جھکاؤ شہزاد کی طرف کچھ زیادہ ہی ہے۔ اس دن رخسار نے ہمارے ساتھ کھانا نہیں کھایا۔ اپنے کمرے میں بند رہی۔ مگر جب شہزاد آیا تو اس کے کمرے میں جا گھسی۔ آپ رخسار کو سمجھائیں۔ کل کو خدانخواستہ شہزاد اپنے باپ کی طرح نکلا تو ہم کسی کو منہ دکھانے کے لائق نہیں رہیں گے۔" فراز کی بہن عرشی نے فراز سے کہا تھا۔

عرشی نے اپنی بڑی بہن نزہت کو شہزاد کے بارے میں بتایا تھا اور رخسار کے متعلق الٹی سیدھی باتیں کی تھیں۔ جس سے نزہت کا دل بھی رخسار کی طرف سے کھٹا ہوگیا۔ وہ اپنے بیٹے جواد سے رخسار کا رشتہ کرنا چاہتی تھیں۔ جواد لندن چلا گیا تو یہ سلسلہ کھٹائی میں پڑ گیا۔

عرشی کی باتیں سن کر فراز خان سوچ میں پڑ گئے تھے۔

★ ★ ★

"زبیر مجھے روز' روز چھپ چھپ کر ہوٹل میں ملنا اچھا نہیں لگتا۔"

زبیر نے رخشی کا ہاتھ پکڑلیا اور مسکرا کر کہا۔

"میں تو تمہیں کہہ رہا ہوں ہم شادی کرلیتے ہیں۔"

رخشی نے منہ بسور کر کہا۔

"میں ایم بی اے کرنا چاہتی ہوں۔ بینک میں ملازمت میرا خواب ہے۔ میں بہت ساری چیزیں خریدنا چاہتی ہوں۔ ڈھیر سارا میک اپ کا سامان' جوتے' بوتیک ڈریسز' بہترین جوئیلری۔"

زبیر نے مسکرا کر کہا۔ "جان میں حاضر ہوں۔ مجھے بتاؤ کتنے پیسے چاہئیں۔"

زبیر نے رخشی کا ہاتھ تھامے ہوئے کہا۔

"نہیں مجھے تمہارے پیسوں کی ضرورت نہیں ہے اور تم کب تک میرا بوجھ اٹھاؤ گے۔" رخشی نے آہ بھر کر کہا تھا۔

"جب تک جسم میں روح ہے۔" رخشی دھیرے سے مسکرا دی۔ زبیر نے پانچ ہزار کا نوٹ جیب سے نکال کر دیا۔ جو رخشی نے مسکرا کر اپنے پرس میں رکھ لیا۔ کبھی دس ہزار' تو کبھی پانچ ہزار ہر ہفتے زبیر کے کاروبار کی آمدنی میں رخشی کا حصہ مقرر تھا۔ زبیر سچے دل سے رخشی کو اپنا مان چکا تھا۔ مگر رخشی ہر وقت یہ احساس دلاتی کہ وہ اس کی مقروض ہے اور پڑھ لکھ کر قابل بننا چاہتی ہے۔ گھر کا راشن ہو یا پھر بجلی کا بل رخشی کے گھر کا چراغ زبیر کے دم سے روشن تھا۔

☼ ☼ ☼

"رخشی! تم کدھر ہو؟" زبیر نے رخشی کو کال کرکے پوچھا۔ وہ دو دن سے غائب تھی۔ نہ زبیر کی کوئی کال ریسیو کی اور نہ کسی میسج کا جواب دیا تھا۔

"بیمار ہوں..... ڈاکٹر کے پاس ہوں..... بخار بہت تیز ہے۔" رخشی نے کمزور آواز میں کہا تھا۔

"تم! کس ڈاکٹر کے پاس ہو۔ میں وہاں آجاتا ہوں۔" زبیر نے فکرمندی سے پوچھا۔

"نہیں' میں حنا کے ساتھ ہوں۔" رخشی نے بیزار ہوکر جواب دیا۔ حنا' رخشی کی دوست تھی اور اسی کے محلے میں رہتی تھی۔ زبیر نے حنا سے بات کرانے کو کہا تو رخشی نے حنا کو فون تھمادیا۔

"ہیلو..... حنا کیسی ہو..... پلیز رخشی کا خیال رکھنا۔" زبیر نے التجا بھرے لہجے میں کہا تھا۔

"جی بھائی جان' آپ فکر مت کریں۔ رخشی بالکل ٹھیک ٹھاک ہے۔" حنا نے غصے سے رخشی کو دیکھ کر کہا۔ جو دہی بھلے کی پلیٹ پر مسالا ڈال رہی تھی۔

"نہیں' اس کی آواز سے اندازہ ہورہا تھا کہ اس کو بخار سے کافی کمزوری ہوگئی ہے۔ پلیز اس کو گھر جاکر سوپ دینا۔ سوپ اس کو طاقت دے گا۔ میں جعفر کے ہاتھ کچھ پیسے بھیج دوں گا۔ تم فروٹ' چکن وغیرہ منگوالینا۔" زبیر نے لمبی چوڑی ہدایت کے بعد فون بند کیا۔

حنا نے غصے سے رخشی کو دیکھا۔ جو دہی بھلے کی پلیٹ صاف کرچکی تھی اور اب سموسوں کا آرڈر دے کر آئی تھی۔

"زبیر کے ساتھ یہ کیا ڈرامہ چلا رکھا ہے۔ تم نے زبیر کو جھوٹ کیوں بولا کہ تم بیمار ہو اور کلینک پر بیٹھی ہو۔ جبکہ ہم تو بازار میں گھوم رہے ہیں۔"

"تم زبیر کی چھوڑو اور سموسوں کا مزہ لو۔" رخشی نے دوسرا سموسہ اٹھاتے ہوئے کہا۔

"وہ جعفر کے ہاتھ پیسے بھیج رہا ہے۔ وہ سمجھ رہا ہے کہ تم بیمار ہو اور تمہیں پیسوں کی ضرورت ہوگی۔"

"یہ تو اچھی بات ہے۔ ان پیسوں سے تمہیں بھی ایک سوٹ خرید دوں گی۔" رخشی نے مسکرا کر کہا تھا۔

حنا حیرت سے رخشی کو تکنے لگی۔ جس کے چہرے پر زبیر کے لیے محبت نام کا کوئی جذبہ نہیں تھا۔

☼ ☼ ☼

"کیسی ہو ہادیہ..... گھر کا چکر ہی لگالیتیں۔ یوں فون پر منگنی کی اطلاع دے رہی ہو۔ میں نہیں آؤں گی۔" رخسار نے منہ بسور کر فون پر کہا تھا۔

ہادیہ نے ہنس کر کہا۔ "اپنے "ان" کو بھی ساتھ لے کر آنا۔" ہادیہ نے شہزاد کے لیے کہا تھا۔

"شہزاد آج کل اشرف خان کے گھر کا ہو کر رہ گیا ہے۔ رات کو دیر سے آتا ہے اور صبح ــــ جلدی چلا جاتا ہے۔ شہزاد سے خفا بھی ہوجاؤں تو اس کو احساس تک نہیں ہوتا کہ مجھے منا ہی لے۔" رخسار نے افسردگی سے کہا۔

"تم نے شہزاد کو اپنے دل کی بات بتائی ہے؟" ہادیہ نے تجسس سے پوچھا۔

"نہیں..... یہ بھی کوئی بتانے والی بات ہے۔ شہزاد جانتا ہوگا' جب وہ میری طرف دیکھتا ہے تو میری آنکھوں میں اس کے علاوہ کسی کا عکس نہیں ہوتا۔" رخسار نے محبت میں ڈوب کر جواب دیا تھا۔

"رخسار! تم اس کی محبت میں اتنا آگے نکل چکی ہو اگر وہ کسی اور کی طرف مائل ہوگیا تو کیا ہوگا۔" ہادیہ نے افسردگی سے کہا تھا۔

"نہیں' نہیں' ایسا کچھ نہیں ہونے والا اور ابھی شہزاد اپنے پاؤں پر کھڑا نہیں۔ وہ اپنے مستقبل کو لے کر بہت پریشان ہے۔ پہلے سیلز مین تھا۔ اب ابا نے اس کو ڈرائیور کی نوکری دلوائی ہے۔ ایسے حالات میں اس طرح کی بات کرنا مناسب نہ ہوگا۔" رخسار نے سنجیدگی سے کہا تھا۔ ہادیہ خاموش ہوگئی۔ مگر ہادیہ نے شہزاد کو بھی اپنی منگنی پر ساتھ لانے کی تاکید کی تھی۔ رخسار سوچ میں پڑ گئی کہ وہ کیسے شہزاد کو ہادیہ کو منگنی میں جانے کے لیے راضی کرے گی۔

☼ ☼ ☼

شام کو شہزاد گھر پر آیا' تو رخسار نے کھانا گرم کرکے اس کے سامنے رکھا۔ وہ خاموشی سے کھانا کھانے لگا۔

"شہزاد کیا بات ہے۔ کافی دنوں سے دیکھ رہی ہوں..... تمہارا موڈ آف رہتا ہے۔ کیا مجھ سے کوئی غلطی ہوگئی؟" رخسار نے معصومیت سے پوچھا۔

"نہیں..... ایسی کوئی بات نہیں..... سارا دن گاڑی چلانے سے تھکاوٹ ہوجاتی ہے۔" شہزاد جو عائشہ کے خیالوں میں کھویا رہنا چاہتا تھا۔ اس کو رخسار کی آواز کیسے بھلی محسوس ہوتی۔ عائشہ کو دیکھنے کے بعد اس کے دل کی دھڑکنیں صرف عائشہ کی ہو کر رہ گئی تھیں۔

"ہادیہ کی منگنی پر تم میرے ساتھ چلوگے۔ ہادیہ نے تمہیں بھی دعوت دی ہے۔"

"کیوں..... میں ہادیہ کا کیا لگتا ہوں۔ جو ہادیہ نے اپنی منگنی کا دعوت نامہ مجھے بھیجا ہے۔" شہزاد نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

"تم میرے کزن ہو اور پھر ہادیہ کی منگنی میں مجھے کون لے کر جائے گا۔ ابا کو برسوں سے سینے میں درد کی شکایت ہے۔ امی نے کہا ہے کہ شہزاد تمہیں چھوڑنے

اور لینے چلا جائے گا۔ کیا تم میرے لیے اتنا بھی نہیں کرسکتے کہ ایک دن کی چھٹی لے لو۔" رخسار نے مان بھرے لہجے میں پوچھا۔

"چھٹی.... نہیں، نہیں.... ابھی دوسرا مہینہ تو مجھے وہاں ہو رہا ہے۔ اشرف صاحب ناراض ہوں گے۔"

شہزاد نے چھٹی نہ کرنے کی دلیل پیش کی۔ جبکہ وہ تو سارا دن عائشہ کے ساتھ رہتا تھا۔ کبھی عائشہ میڈم کو کسی دوست کے گھر پر لے کر جا رہا ہے۔ تو کبھی شاپنگ سینٹر، کبھی بیوٹی پارلر، تو کبھی دوستوں کے ساتھ ہوتی تو ریسٹورنٹ کے باہر کھڑا اس کا انتظار کرتا رہتا۔ اشرف صاحب نے شہزاد کو ایک طرح سے عائشہ کا باڈی گارڈ مقرر کر دیا۔ کیونکہ اشرف صاحب کو بھتہ خوروں کے فون آتے رہتے تھے۔

رخسار نے لمبی آہ بھری اور پھر خاموشی سے شہزاد کو تکنے لگی جو اس کی محبت سے بے خبر کھانا کھانے میں مصروف تھا۔

☼ ☼ ☼

ہادیہ کی منگنی کی تقریب میں رخسار بجھی سی رہی۔

ہادیہ کی منگنی کی تقریب میں اس کی دوستوں، بہنوں، بھائیوں نے ناچ گانا کیا۔ مگر رخسار خاموش ایک کونے میں بیٹھی رہی۔ آفرین نے اس کی خاموشی محسوس کر کے کہا۔

"رخسار کیا بات ہے۔ تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ اتنی بدل گئی ہو۔ جب سے آئی ہو ایک دفعہ بھی تمہارے چہرے پر پہلی جیسی مسکراہٹ نہیں دیکھی اور ہاں وہ تمہارا کزن شہزاد کیسا ہے۔ کیا اس نے تمہارا گھر چھوڑ دیا تھا؟" آفرین نے کالج کا زمانہ یاد کر کے کہا تھا۔

"نہیں.... وہ ہمارے گھر میں ہی رہتے ہیں۔" شہزاد کے نام سے رخسار کی آنکھوں میں چمک سی آگئی۔

"اور آپ کی خانہ آبادی کیسی چل رہی ہے؟" رخسار نے ہنس کر پوچھا تھا۔ آفرین نے آہ بھر کر کہا۔

"شادی کا ایک سال ہی سکون سے گزرا۔ پھر ساس صاحبہ کے طعنے جاری۔ کبھی کسی بات پر نصیحت.... تو کبھی کسی بات پر منہ پھلا کر بیٹھ جاتی ہیں۔ مگر تمہارے مزے ہیں، شہزاد کی والدہ نہیں ہیں۔ جلدی سے شادی کر ڈالو اور خوب مزے کرو۔"

آفرین نے ہنس کر کہا تھا۔ مگر رخسار آفرین کو کیسے بتاتی کہ شہزاد اس لیے شادی نہیں کرنا چاہتا کہ وہ اپنے پاؤں پر نہیں کھڑا ہے۔ ایک شام رخسار نے باتوں باتوں میں شہزاد سے پوچھا تھا۔

"شہزاد آپ کی بیوی کیسی ہونی چاہیے۔ آپ کے ذہن میں اس کا کیا تصور ہے؟"

شہزاد نے ہنس کر کہا۔ "میرے ذہن میں صرف غربت دور کرنے کی باتیں ہیں۔ میں فضول باتوں کو ذہن میں جگہ نہیں دیتا۔"

"کیوں.... آپ کی نظر میں شادی فضول ہے کیا؟" رخسار نے افسردگی سے پوچھا۔

شہزاد نے سنجیدگی سے کہا۔ "شادی کرنے سے ذمہ داری بڑھ جائے گی۔ میں خود کا بوجھ نہیں سنبھال سکتا، تو اپنی بیوی کو کیسے سنبھال سکوں گا۔"

"تو کیا جو لوگ غریب ہوتے ہیں وہ شادی نہیں کرتے۔"

"میں نے یہ کب کہا کہ غریب شادی نہیں کر سکتا۔ میرا کہنے کا مطلب تھا کہ جو شخص اپنی ذمہ داری پوری نہیں کر سکتا وہ اپنے بیوی، بچوں کو کیسے سنبھال سکتا ہے۔" شہزاد نے مسکرا کر کہا۔

"کیا پتا بیوی کی قسمت سے آپ کو دولت مل جائے۔"

"ہاہاہا!" شہزاد نے قہقہہ لگا کر کہا۔ "دولت اس طرح نہیں آتی اور میرا کون سا کاروبار چل رہا ہے۔ جہاں سے دولت آجائے گی۔"

رخسار مسکرا کر بولی۔ "شہزاد! وہ آپ نے جو پرائز بانڈ لیا ہے، کیا پتا ایک دن آپ کی قسمت بھی جاگ اٹھے اور آپ ایک دن میں امیر بن جائیں۔" رخسار شہزاد کے لیے دعائیں مانگنے لگی کہ اس کا پرائز بانڈ نکل آئے۔ تاکہ وہ غربت کی احساس کمتری سے نکل جائے۔

☼ ☼ ☼

"یار! کبھی ملنے ہی آجاؤ، کہاں ہو آج کل، کون سی ملازمت کر رہے ہو۔" اسد نے شہزاد کو فون کیا تھا۔

"میں جمال شاہ کی شکل نہیں دیکھنا چاہتا، اتنی بے عزتی کر کے اس نے مجھے نوکری سے نکالا تھا۔ میں وہاں قدم بھی نہیں رکھنا چاہتا۔"

اسد نے ہنس کر کہا۔ "اچھا دفع کر کسی اور جگہ مل لیں گے۔ یہ بتا، سنا ہے تو گاڑی میں پھرتا رہتا ہے۔ گاڑی کیسے خریدی ہے؟ اتنے پیسے کہاں سے آئے؟ کوئی جادو کا چراغ مل گیا ہے۔"

"جادو کا چراغ نہیں ملا۔ البتہ ڈرائیور کی نوکری ضرور مل گئی ہے۔ مگر اس میں بھی ایک مشکل پڑ گئی ہے۔" شہزاد نے ہنس کر کہا۔

"کیوں...." اسد نے گھبرا کر پوچھا۔

"یار جس کا ڈرائیور ہوں۔ وہ ایک امیرزادی ہے اور پری کی طرح دکھتی ہے۔ جب وہ میرے ساتھ ہوتی ہے تو مجھے ہوش نہیں رہتا۔ سوچتا ہوں کہیں اس کو پتا چل گیا تو مجھے نوکری سے باہر نہ نکال دے۔" شہزاد نے سنجیدگی سے کہا۔

"ہاہا! ڈرائیور سے دولہا بننے کا سوچ رہا ہے۔" اسد نے چھیڑ کر کہا تھا۔

"نہیں میری قسمت میں وہ شہزادی کہاں ہوگی؟" شہزاد نے افسردگی سے کہا۔

"چلو خوابوں میں تو تمہارے ساتھ ہوتی ہے۔ اتنا کم ہے کیا۔" اسد نے ہنس کر کہا اور شہزاد بھی ہنس پڑا تھا۔

شہزاد اور اسد، یہی باتیں کر رہے تھے کہ اچانک زبیدہ کی چیخ سن کر شہزاد گھبرا گیا اور اسد کو خدا حافظ کہہ کر زبیدہ کے کمرے کی طرف لپکا۔ جہاں زبیدہ اور رخسار، فراز کے ہاتھ پاؤں مسل رہی تھیں۔

زبیدہ نے رو کر کہا۔ "شہزاد جلدی سے رکشے کا انتظام کرو۔ تمہارے انکل کو اچانک سینے میں درد ہوا اور وہ بے ہوش ہو گئے۔" وہ فوراً" فراز خان کو اسپتال لے کر گئے۔ لیکن فراز خان کا وقت پورا ہو چکا تھا۔ ڈاکٹر نے دیکھتے ہی کہا ان کی ڈیتھ آدھے گھنٹے پہلے ہی ہو چکی ہے۔

زبیدہ کی دنیا اجڑ گئی تھی اور اب ان کو فکر کھانے لگی کہ لوگوں کی انگلیاں ان کے گھر پر اٹھیں گی۔ اس لیے چالیسویں کے بعد زبیدہ نے شہزاد سے بات کرنا مناسب سمجھی۔

"جی خالہ جان آپ نے مجھے بلوایا تھا۔ کوئی ضروری کام ہے کیا؟"

زبیدہ نے آہ بھر کر کہا۔ "شہزاد تم تو جانتے ہو کہ یہ دنیا کیسی ہے۔ لوگ اس وقت بھی طرح طرح کی باتیں کرتے تھے جب فراز زندہ تھے۔ مگر اب وہ ہمارے سر پر نہیں ہیں۔ بیٹا میری اور تمہارے فراز انکل کی خواہش تمہیں اپنا بیٹا بنانے کی تھی۔ مگر فراز کو خدا تعالیٰ نے مہلت ہی نہیں دی کہ وہ اپنی بچی کی خوشیاں دیکھ سکتے۔ میری زندگی کا کوئی بھروسا نہیں۔ اس لیے میں یہ چاہتی ہوں کہ تم رخسار سے منگنی کر لو، تاکہ لوگوں کو باتیں بنانے کا موقع نہ مل سکے۔"

شہزاد کے پیروں تلے زمین نکل گئی۔ زبیدہ کے اس فیصلے کے لیے وہ تیار نہیں تھا۔ مگر مجبوری کے وقت زبیدہ نے اس کو اپنے گھر میں رکھا تھا۔ اگر منگنی سے انکار کرتا تو گھر چھوڑنا پڑتا۔ پانچ ہزار ماہوار میں وہ کرائے کا کمرہ لیتا یا پھر ضروریات زندگی کی اشیاء۔ اس نے اسد سے مشورہ کیا۔

"یار تمہاری خالہ ٹھیک ہی کہتی ہیں، جوان بیٹی گھر پر ہے۔ ایسے میں تمہاری موجودگی سے لوگ باتیں بنائیں گے۔ تم رخسار سے منگنی کر لو۔ برے وقت میں ان لوگوں نے تمہارا ساتھ دیا ہے۔ اب تمہاری باری ہے۔" اسد نے سنجیدگی سے سمجھا کر کہا تھا۔

"مگر احسان کے بدلے کا مطلب یہ تو نہیں کہ میں اپنا دل نکال کر ان کے ہاتھ میں دے دوں۔ تم جانتے ہو کہ میں عائشہ سے محبت کرتا ہوں۔" شہزاد نے بیزار ہو کر کہا۔

"کیا وہ بھی تم سے محبت کرتی ہے؟" اسد نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"اس کا مجھے اندازہ نہیں ہے۔ البتہ اس کی آنکھوں میں مجھے اپنے لیے پیار نظر آتا ہے۔" شہزاد نے عائشہ کی محبت کا احساس دلایا۔

"مالک اپنے نوکر کا خیال رکھتا ہے۔ مگر اس کا ہرگز مطلب نہیں کہ وہ نوکر کو مالک بنالے۔ شہزاد اگر عائشہ تم سے محبت کا اعتراف کرتی تو وہ محبت ہوتی۔ میرا مشورہ ہے کہ تم رخسار سے منگنی کرلو۔" اسد نے شہزاد کو کندھا دبا کر سمجھاتے کہا تھا۔

شہزاد نے مجبور ہو کر سادگی کے ساتھ رخسار کے ہاتھ میں اپنے نام کی انگوٹھی ڈال دی۔ انگوٹھی کے پیسے بھی زبیدہ بیگم نے شہزاد کو دیے تھے۔

☼ ☼ ☼

"حیدر! میں کب سے تمہارا ریسٹورنٹ میں انتظار کررہی ہوں کدھر ہو۔" رخشی نے منہ بسور کر فون پر کہا تھا۔

دوسری طرف سے حیدر مسکرا کر بولا۔ "میری جان بس پانچ منٹ تک پہنچ جاتا ہوں۔"

رخشی بے صبری سے ریسٹورنٹ کے دروازے کو تکنے لگی۔ رخشی، حیدر کا انتظار کررہی تھی۔ ریسٹورنٹ میں حیدر کے بجائے اس نے زبیر کے دوست سعد کو اپنے کچھ دوستوں کے ساتھ داخل ہوتے دیکھا تو رخشی کے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہوگئے۔

اس نے جلدی سے اپنا منہ دوپٹے سے چھپایا اور گھبراہٹ کے ساتھ نکل گئی۔ اسے کو یوں لگا جیسے سعد نے اس کو ریسٹورنٹ میں دیکھ لیا ہو۔ جبکہ رخشی کی پرسوں ہی سعد سے بات ہوئی تھی۔ زبیر نے سعد کو رخشی کی ناساز طبیعت کے متعلق بتایا... تو سعد نے بھابھی کی خیریت جاننے کی کوشش کی۔ رخشی نے ہلکی آواز رکھ کر بخار کا زور جتایا۔

رات کو حیدر نے غصے میں فون کر کے پوچھا۔

"ملنے کا اتنا شوق تھا تو ریسٹورنٹ سے غائب کہاں ہوگئی تھیں۔"

"حیدر! سعد وہاں آپہنچا تھا۔ خدا کا شکر ادا کرو کہ اس نے مجھے وہاں پر نہیں دیکھا۔ ورنہ زبیر کو سب کچھ پتا چل جاتا۔" رخشی نے فکرمندی سے جواب دیا تھا۔ وہ شام کے واقعے سے کافی گھبرا چکی تھی۔

"اوہو... اچھا یہ بتاؤ میرا کام کردیا ہے۔" حیدر نے بیزار ہو کر پوچھا۔

"حیدر! اتنی بڑی رقم میں کیسے لوں۔ زبیر سے کیا کہوں۔ اگر اس کو کسی قسم کا شک ہوگیا تو کیا ہوگا۔ تم نے کبھی سوچا ہے۔ میں زبیر سے اور جھوٹ نہیں بول سکتی۔ میں زبیر کو سچ بتادینا چاہتی ہوں کہ میں حیدر سے پیار کرتی ہوں۔" رخشی نے لرزتی آواز میں کہا تھا۔

"پاگل ہوگئی کیا؟" حیدر نے گھبرا کر کہا۔ "کیا سوچے گا زبیر کہ میں نے اس کے ساتھ دھوکہ کیا۔ یار وہ میرا دوست ہے... سب دوستوں کے درمیان میری عزت دو کوڑی کی رہ جائے گی۔" حیدر نے گھبرا کر کہا تھا۔

"حیدر! مجھے ڈر لگتا ہے۔ زبیر مجھ سے بے پناہ محبت کرتا ہے اور میں اس کی دولت ہتھیانے کے لیے جھوٹ پہ جھوٹ بول رہی ہوں۔ جبکہ پیسوں کی تمہیں ضرورت تھی۔ ورنہ میں کبھی بھی زبیر کے ساتھ افیئر کا جھوٹا ڈرامہ نہ کرتی۔ حیدر صرف تمہاری محبت کو پانے کے لیے میں نے زبیر کو قبول کیا کہ تمہارا کاروبار سیٹ ہوجائے گا۔ کبھی دس ہزار، تو کبھی بیس ہزار زبیر سے بٹور کر تمہیں دے رہی ہوں۔ مجھے بتاؤ، اتنے پیسوں کا تم کیا کررہے ہو۔" رخشی نے تلخی سے پوچھا تھا۔

"اوہو... میری جان بس تھوڑی دیر تک اور ڈرامہ چلنے دو۔ زبیر کو کوئی فرق نہیں پڑنے لگا۔ تم کسی بھی بہانے سے پچاس ہزار مانگ لو۔ زبیر کی دولت کم نہیں ہوگی۔" حیدر کالج سے لے کر کاروبار تک زبیر سے حسد کرتا تھا۔ مگر زبیر کے لیے حیدر اس کے بہترین دوستوں میں تھا۔ حیدر نے رخشی کو زبیر کی زندگی میں داخل کیا تھا۔ رخشی نے زبیر کو باقاعدہ پلان بنا کر بے وقوف بنایا۔ رخشی، حیدر کے محلے میں رہتی تھی۔ اس کو اپنا دل دے بیٹھی۔ مگر حیدر کا کہنا تھا بزنس مین بننے کے بعد ہی وہ شادی کرسکے گا۔

"اور اگر جلد شادی کرنا چاہتی ہو تو پھر میرے پاس ایک پلان ہے۔" حیدر نے رخشی سے کہا۔

"کیا؟" رخشی حیدر سے جدائی برداشت نہیں کرسکتی تھی اور حیدر جس کو دولت کی ہوس نے اتنا اندھا کردیا کہ اس نے اپنی محبوبہ رخشی کے ذریعے زبیر کو پھنسایا۔ شروع میں رخشی نے انکار کیا۔ مگر پھر مجبور ہو کر وہ حیدر کی راہ پر چل پڑی۔ مگر حنا کے سوالات اس کو پاگل کردیتے۔ حیدر نے پچاس ہزار لینے کے لیے کہہ دیا تھا اور رخشی نے رات بے چینی سے کاٹی کہ نہ جانے اس کو کتنے جھوٹ اور بولنے پڑیں گے۔

☼ ☼ ☼

شہزاد کے نام کی انگوٹھی کو دن رات رخسار چومتی۔ اس نے اپنا پیار پالیا تھا۔ مگر شہزاد، رخسار سے بیزار رہتا۔ جب رخسار نے منگنی کے دوسرے دن اپنی دوستوں کے لیے چھوٹی سی پارٹی گھر میں رکھی۔

"جناب انگوٹھی تو کمال کی ہے... مگر انگوٹھی پہنانے والا کب نظر آئے گا۔" ہادیہ نے مسکرا کر پوچھا۔

صبح ملازمت پر جانے سے پہلے رخسار نے شہزاد کو پارٹی کی اطلاع دے دی تھی۔ مگر اس کے باوجود شہزاد، اسد سے ملنے اس کے گھر پر چلا گیا۔ ہادیہ، آفرین اور رخسار کی چند کلاس فیلوز شہزاد کے انتظار میں بیٹھی رہیں۔ مگر شام رات میں بدلنے لگی، تو سب دوستوں نے اجازت مانگی۔ رخسار شرمندہ ہوگئی۔ جبکہ زبیدہ کا کہنا تھا کہ اشرف صاحب نے چھٹی نہیں دی ہوگی۔ اس لیے وہ وقت پر نہیں آسکا۔

رخسار کے دل پر ضرب سی پڑی۔ اس کو آفرین کی باتیں یاد آنے لگیں۔

"رخسار! وہ تم سے محبت تو کرتا ہے نا؟" عجیب سی بات تھی کہ اس سوال کا رخسار کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ رخسار جو ہر وقت شہزاد کی جی حضوری کے لیے کھڑی رہتی تھی۔ اس کا کمرہ صاف کرتی اس کے کپڑے دھو دیتی۔ کبھی کوئی ڈش تیار کرتی، تو کبھی کوئی شہزاد کھانے کا شوقین تھا۔ اس لیے رخسار نے کچن کے کاموں میں مہارت حاصل کرنے کی کوشش کی، دبلی پتلی رخسار کو اپنی صحت کی کوئی فکر نہ تھی۔ بخار ہو یا کھانسی، وہ شہزاد کے کاموں میں مصروف رہتی تھی۔

رات کو شہزاد گھر آیا تو رخسار نے اس سے صاف گوئی سے بات کی۔

"شہزاد! تم صاف صاف بتاؤ... یہ منگنی، تمہارے لیے مجبوری ہے کیا؟"

"نہیں... مگر پلیز رات بہت ہوگئی۔ کل بات کرتے ہیں۔" شہزاد نے بیزاری سے کہا تھا۔

"اگر آپ مجھ سے محبت نہیں کرتے تو یہ منگنی توڑ دیں۔" رخسار کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ وہ شہزاد کے پارٹی پر نہ آنے کی وجہ سے، بہت دل برداشتہ تھی۔ وہ آنسو چھپاتے ہوئے اپنے کمرے میں آگئی۔ جبکہ زبیدہ بیگم بھی اس کے تیز بولنے کی آوازیں سن کر بیدار ہوچکی تھیں۔ وہ رخسار کے کمرے میں چلی آئیں۔

"شہزاد اپنی نوکری کی وجہ سے مجبور ہے۔" رخسار کو روتے دیکھ کر زبیدہ نے پیار سے رخسار کو سمجھایا۔ "تم اس چیز کے لیے فکرمند نہ ہو۔ وقت کے ساتھ سب ٹھیک ہوجائے گا۔" رخسار نے تہیہ کرلیا تھا کہ اب وہ شہزاد سے دور رہے گی۔ یوں رخسار صبح دیر سے اٹھتی۔ کہ شہزاد گھر سے چلا جائے اور شہزاد کی واپسی پر وہ کھانا بنا کر رکھ دیتی اور خود اسٹور روم میں گھس جاتی۔ تاکہ شہزاد کو اس کی غلطی کا احساس ہو۔

شہزاد، رخسار کے رویے پر پشیمان سا ہوگیا۔ زبیدہ بیگم کی خاموشی اور رخسار کے رویّے سے شہزاد کو فکر ستانے لگی کہ کہیں رخسار نے منگنی توڑ دی تو اس کو گھر سے جواب دے دیا جائے گا۔ شہزاد نے آخرکار اسد سے مشورہ دے مانگا۔

اسد نے تمام صورت حال سن کر کہا۔ "یار! تمہیں

چاہیے کہ وقت پر گدھے کو باپ بنالو۔ رخسار کی محبت کا جواب محبت سے دو۔ بعد میں دیکھا جائے گا اسے چھوڑ دینا۔" اسد نے مسکرا کر کہا تھا۔

شہزاد نے گھبرا کر کہا "یار! وہ میری خالہ کی بیٹی ہے۔ میں اسے دھوکا نہیں دے سکتا۔ میں اس سے محبت نہیں کرتا' بلکہ میں عائشہ سے محبت کرتا ہوں۔" شہزاد نے افسردگی سے کہا۔

"عائشہ بھی تم سے محبت کرتی ہے کیا؟" اسد نے مسکرا کر پوچھا۔

"نہیں... لیکن لگتا ہے کہ وہ مجھ کو پسند کرتی ہے۔"

"تمہیں کیسے علم ہوا؟"

"یار...! اشرف صاحب کا ڈرائیور طفیل آگیا ہے۔ طفیل صاحب نے عائشہ کے لیے گاڑی نکالی۔ مگر عائشہ نے ان سے کہا کہ آپ بابا کو لے جائیں۔ میں شہزاد کو لے جاتی ہوں۔" شہزاد نے مسکراتے ہوئے بتایا تو اسد کی ہنسی چھوٹ گئی۔

"اس سے یہ مطلب کہاں نکلتا ہے کہ وہ تمہیں پسند کرتی ہے؟"

"یار! اس کی دوست جب ساتھ ہوتی ہے تو مجھ سے بہت باتیں کرتی ہے۔ جبکہ عائشہ اس کو منع کرتی ہے مجھے تو لگتا ہے عائشہ میری بینش کی گفتگو سے جل اٹھتی ہے۔" شہزاد نے قہقہہ لگا کر کہا تھا۔

"واہ... یار کیا بات ہے۔ سالی صاحبہ بھی بنالی ہے۔" اسد نے شامی کباب اٹھاتے ہوئے کہا۔

"بینش بہت اچھی ہے۔ کاش تو بھی گاڑی میں ہوتا۔ تو میں تیری اس سے دوستی کروادیتا۔"

"ہاہاہا... اپنی دال گل نہیں رہی ہے۔ اور میری دال گلانے کی سوچ رہا ہے۔ یار مجھے ان امیرزادیوں سے دور ہی رکھ۔ میری اوقات اتنی نہیں ہے۔ ان کا ایک دن کا خرچا میری دو ماہ کی تنخواہ کے برابر ہوگا۔" اسد نے ہنس کر کہا تھا۔

شہزاد افسردہ ہوگیا۔ واقعی عائشہ پرستان کی ملکہ تھی اور وہ ایک غریب بندہ تھا۔ جس کے پاس رہنے کو گھر تک نہیں تھا۔ گھر پر رہنے کے لیے رخسار کو بے وقوف بنا رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

"عائشہ! مجھے تمہارے ڈرائیور کی نیت تمہارے بارے میں کچھ ٹھیک نہیں لگتی۔" حرا نے مسکرا کر عائشہ کو فون پر بتایا۔ عائشہ جو نصرت فتح علی خان کی کیسٹ سن رہی تھی۔ حرا کے فون پر ڈسٹرب ہو کر کہنے لگی۔

"یار اتنا مزا آرہا تھا۔ تمہاری کال نے سارا مزہ خراب کردیا۔"

حرا نے قہقہہ لگا کر کہا۔

"جناب آپ کے ڈرائیور کا آپ پر دل آچکا ہے۔"

عائشہ نے حیرت سے کہا۔ "حرا کیا پاگل ہوگئی ہو۔ میں اور ڈرائیور کے ساتھ..." عائشہ ہنس پڑی تھی۔

عائشہ حرا کے گھر... آئی تھی۔ جب واپسی پر حرا کی والدہ کو خدا حافظ کہہ رہی تھی شہزاد گاڑی کے پاس کھڑا تھا۔ تب حرا کی نظریں شہزاد کی نظروں سے ٹکرائیں جو نہایت محویت سے عائشہ کو دیکھ رہا تھا۔ حرا' عائشہ کا کچھ سامان گاڑی میں رکھوانا چاہتی تھی۔ اس نے دوبار اسے پکارا۔ لیکن شہزاد اتنا محو تھا کہ اس نے حرا کی آواز نہیں سنی تھی۔

حرا نے قریب جا کر زور سے پکارا تو شہزاد چونکا تھا۔ حرا نے اس کی کیفیت سے نوٹ کیا کہ شہزاد عائشہ سے متاثر ہوچکا ہے اور عائشہ سے محبت کسی کو بھی ہوسکتی تھی۔ اپنے ماں' باپ کی اکلوتی اولاد تھی۔ دولت کی کمی نہیں تھی۔ عائشہ کے ہم سفر کو خوب صورتی کے ساتھ دولت بھی مل جانی تھی۔

"یار! تم اس کو ملازمت سے نکال دو۔ اس کی نیت ٹھیک نہیں ہے۔"

عائشہ نے مسکرا کر کہا۔ نہیں... اس کو ملازمت سے نکالنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔

حرا نے ڈر کر کہا۔ "تو پھر کیا کرو گی؟"

"تماشا دیکھتے ہیں' کیا کرتا ہے۔ سزا تو اس کو ملنی چاہیے' کیونکہ وہ اپنی منگیتر کو دھوکہ دے رہا ہے۔" عائشہ نے تلخی سے کہا۔

"کیا... سچ میں اس کی منگنی ہوچکی ہے؟" حرا نے حیرت سے پوچھا۔

عائشہ نے خفگی سے کہا۔ "وہ شاید اس بات سے انجان ہے کہ میں اس کی منگنی کے بارے میں جانتی ہوں۔ فراز انکل شہزاد کی ملازمت کے وقت کہہ کر گئے تھے کہ وہ شہزاد کو اپنا داماد بنانا چاہتے ہیں۔ انکل فراز میرے باپ جیسے تھے۔ اس لیے شہزاد کو ڈرائیور رکھ لیا تھا۔ لیکن مجھے کیا معلوم تھا کہ میری مہربانی اسے خوش فہمی میں مبتلا کردے گی۔"

☼ ☼ ☼

"زبیر... وہ... مجھے کچھ پیسوں کی ضرورت ہے۔" زبیر ریسٹورنٹ میں رخشی سے شادی کے لیے زور دے رہا تھا۔ جب رخشی نے اس سے پیسوں کا مطالبہ کیا۔ زبیر نے حیرت سے دیکھا اور پھر پوچھا۔

"کیا بات ہے... رخشی! تم اتنی پریشان کیوں ہو؟" رخشی نے گھبرا کر کہا۔ "وہ میرے خالو فوت ہوگئے ہیں۔ خالہ کا کرائے کا مکان تھا۔ جس کا کرایہ پچھلے دو سالوں سے خالو نے نہیں دیا تھا۔ اب وہ مکان کا مالک خالہ کو تنگ کررہا ہے۔ پلیز زبیر مجھے پچاس ہزار دے دو۔ میں جاب ملتے ہی واپس دے دوں گی۔" رخشی نے زبیر کا ہاتھ پکڑ کر کہا تھا۔

"اوہو... کیا ہوگیا ہے۔ میرے پیسے تمہارے ہی پیسے ہیں۔ بس جلدی سے مسز زبیر بننے کا خواب دیکھنا شروع کردو۔ میری مما باہر سے واپس آرہی ہیں۔ اب بتاؤ... کب ان کو تمہارے گھر بھیجوں۔"

رخشی کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں کہ اب وہ کیا جواب دے۔ کیونکہ وہ زبیر کو صرف دولت کی خاطر جھیل رہی تھی۔ زبیر نے رخشی کو پچاس ہزار کا چیک کاٹ دیا۔ رخشی پشیمان تھی کہ جب وہ زبیر کو اپنی سچائی سے آگاہ کردے گی تو کیا ہوگا۔ وہ سیدھا حیدر کے گھر پہنچی... حیدر مزے سے نیند کی آغوش میں تھا۔

"یہ کوئی سونے کا وقت ہے۔ آج کارخانے سے چھٹی کیوں کی ہے؟" رخشی نے پچاس ہزار کا چیک دے کر خفگی سے پوچھا۔

حیدر نے جھٹ سے پچاس ہزار کا چیک جیب میں رکھ لیا اور جمائی لے کر کہنے لگا۔

"میری جان سارا مہینہ تو کام کرتا ہوں۔ آج ہی چھٹی کی ہے۔"

"اتنا کام کرتے ہو... تو پیسے کہاں ہیں۔ ہم زبیر کی دولت کیوں اینٹھ رہے ہیں۔"

رخشی جھوٹ بول بول کر تھک چکی تھی۔ حیدر نے ہنس کر کہا۔

"بس کچھ دن اور ہیں... پھر میں اپنا کارخانہ سیٹ کرلوں گا۔ ہم جلدی شادی کرلیں گے۔"

"تمہارے یہ جھوٹے وعدے پچھلے دو سال سے سن رہی ہوں۔ حیدر میں تم سے محبت کرتی ہوں۔ پلیز میری محبت کی اتنی تذلیل مت کرو۔" رخشی نے حیدر کا ہاتھ تھام کر التجا سے کہا تھا جو زبیر کی دولت ہتھیانے کے چکروں میں پڑ کر اپنا ضمیر بھی مار چکی تھی۔ مگر حنا اس کی دوست نے ایک دن حیدر کے تمام پیغامات رخشی کے سیل فون سے پڑھ کر کہا۔

"پاگل ہوگئی ہو۔ کیوں اپنے ہاتھوں سے خود کو برباد کررہی ہو۔ حیدر صرف تمہیں استعمال کررہا ہے' جبکہ زبیر تم سے محبت کرتا ہے' تمہیں اپنانا چاہتا ہے۔"

"پلیز حنا یہ میرا معاملہ ہے۔ میں اپنا اچھا برا سمجھ سکتی ہوں۔" رخشی نے غصے سے کہا تھا۔

"رخشی! تم کتنا گر گئی ہو۔ تمہیں احساس نہیں ہے۔ تم کیا کررہی ہو۔ کل کو زبیر کو تمہاری اصلیت کا علم ہوگا تو کہاں سے اتنا قرض واپس کروگی۔"

اس وقت تو رخشی' حنا سے ناراض ہو کر چلی آئی تھی۔ لیکن اس کی باتیں دل میں کھٹک سی پیدا کرگئی تھی۔ اس وقت بھی وہ بہت غصہ میں تھی۔ ایسے موقعوں پر حیدر اسے میٹھی میٹھی باتیں کرکے بہلا لیتا تھا۔ حیدر نے اسے باہر کھانا کھلانے کی آفر کی۔ رخشی

خاموش تھی جبکہ حیدر پچاس ہزار کا چیک لے کر بہت خوش تھا۔

☼ ☼ ☼

اسد کے مشورے پر شہزاد نے رخسار سے جھوٹی محبت کا اظہار شروع کردیا تھا۔ رات کو وہ اس کے لیے گجرے لے کر آیا تھا۔ وہ گجرے دیکھ کر خوشی سے پھولے نہ سمائی۔ اس نے اسی وقت وہ گجرے پہن لیے۔

"رخسار! یہ گجرے تمہاری کلائیوں کے لیے ہی بنائے گئے ہیں۔" اس نے رخسار کی تعریف کرتے ہوئے کہا تھا۔

انسان اپنے مفاد کے لیے کسی کے دل سے بھی کھیل سکتا ہے۔ رخسار نہ جانتی تھی جن گجروں کو دیکھ کر وہ خوشی سے پاگل ہو رہی تھی۔ اس کو کیا معلوم تھا کہ ان میں کانٹے چھپے ہوئے ہیں۔

زبیدہ بھی رخسار کو خوش دیکھ کر خوش ہوگئیں۔ وہ پچھلے ایک ہفتے سے پریشان تھیں کہ کیا شہزاد کے ساتھ رخسار کی منگنی کا فیصلہ غلط تھا۔ مگر شہزاد کی طرف سے پیار کا اظہار دیکھ کر زبیدہ کا موڈ ٹھیک ہوگیا۔ دونوں ماں' بٹی کو خوش دیکھ کر شہزاد کو ایک لمحہ کے لیے پچھتاوا ہوا۔ مگر پھر عائشہ کے خوابوں نے اس کو ہر رشتہ بھلا دیا۔

☼ ☼ ☼

"مما میں حرا کے گھر جارہی ہوں۔ دو گھنٹے تک واپس آجاؤں گی۔" عائشہ نے الفت بیگم سے کہا۔

"بیٹا جلدی آجانا۔ آج امریکہ سے اسامہ کی فیملی نے آنا ہے۔" الفت بیگم نے ہنس کر کہا تھا۔

"مما! اسامہ کون؟" عائشہ ان کے بیڈ پر بیٹھ گئی اور ان کا ہاتھ تھام لیا۔ وہ کار حادثے میں اپنی ٹانگوں سے محروم ہوچکی تھیں۔

"اسامہ۔۔۔ تمہارے بابا کے دوست کا بیٹا ہے۔ امریکہ میں لیدر کمپنی چلا رہا ہے۔ بہت اچھا لڑکا ہے۔ مجھے اور تمہارے بابا کو بہت پسند ہے۔ مگر میری بچی آخری فیصلہ تمہارا ہوگا۔" انہوں نے پیار سے عائشہ کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ عائشہ مسکرادی۔

بینش کی برتھ ڈے تھی اور عائشہ کو تحفہ بھی خریدنا تھا۔ عائشہ نے سرخ لباس پہنا ہوا تھا۔ شہزاد کو یوں لگا جیسے گاڑی کی پچھلی سیٹ پر سرخ گلاب کھلا ہو' اس کی نظریں بار بار آئینے کی طرف اٹھ رہی تھیں۔ عائشہ اس کی یہ حرکت نوٹ کررہی تھی۔ اس نے ٹوکا۔

"شہزاد! کیا آج میں بہت اچھی لگ رہی ہوں۔؟"

شہزاد کی چوری پکڑی گئی تھی۔ وہ بوکھلا گیا۔ عائشہ نے اپنا سوال دہرایا تو وہ خود کو سنبھال کر بولا۔ "جی ہاں' آپ بہت اچھی لگ رہی ہیں۔" عائشہ ہنس کر خاموش ہوگئی۔

شہزاد کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ عائشہ کو بینش کے گھر ڈراپ کرنے کے بعد شہزاد کو یوں لگا جیسے وہ ہواؤں میں اڑ رہا ہے۔

دوسری طرف عائشہ بینش سے کہہ رہی تھی۔

"تم سچ کہہ رہی تھیں۔ شہزاد مجھے پھنسانا چاہتا ہے۔ میں نے فراز انکل کی سفارش پر اسے رکھا تھا۔ وہ اس دنیا سے چل بسے۔ شہزاد بہت گھٹیا انسان ہے۔ جس کے گھر میں رہا۔ اس کو ہی ڈس رہا ہے۔" عائشہ نے نفرت سے کہا۔

"عائشہ تم انکل فراز کی بیٹی تک یہ بات پہنچادو کہ جس شخص سے وہ محبت کرتی ہے وہ اس کے قابل نہیں ہے۔" بینش نے غصے سے کہا۔ اس نے اشرف صاحب کے گھر پر فراز خان کو دیکھا تھا۔ بہت شریف اور مشفق انسان تھے۔ عائشہ اور بینش کو اپنی بیٹیاں مانتے تھے۔

عائشہ نے افسردگی سے کہا۔ "نہیں رخسار کو خود پتا چل جائے تو بہتر رہے گا۔ ہم لوگ شہزاد کے متعلق کوئی بات کریں گے تو وہ ہماری بات نہیں مانے گی۔ وہ ہمیں جھوٹا اور شہزاد کو سچا سمجھے گی۔ کیونکہ محبت اندھی ہوتی ہے۔"

بینش بھی خاموش ہوگئی۔ پھر عائشہ اور بینش نے نوکروں کی مدد سے پارٹی کو ارینج کیا۔ انہیں کام کرتا دیکھ کر بینش کی امی اور ابو بہت خوش تھے کہ ان کی بچیاں کسی کام کو عار نہیں سمجھتیں۔ الفت بیگم گھریلو خاتون تھیں۔ وہ اکثر عائشہ سے کہتی تھیں۔

"شادی کے بعد عائشہ سسرال میں وہ لڑکیاں عزت پاتی ہیں جو گھر کے کاموں میں طاق ہوتی ہیں۔"

الفت بیگم اور اشرف صاحب دیہات سے تعلق رکھتے تھے۔ اشرف صاحب کی محنت نے ان کو ایک کامیاب بزنس مین بنادیا۔ الفت بیگم نے ہر قدم پر ان کا ساتھ دیا تھا۔ اشرف صاحب نے ایک دکان سے کارخانہ اور پھر بڑی کمپنی کھڑی کردی۔ اشرف صاحب مسکرا کر کہتے۔

"ہر کامیاب آدمی کے پیچھے ایک عورت کا ہاتھ ہوتا ہے اور وہ عورت میری بیوی الفت ہے۔" وہ دن الفت کے لیے بہت خوشی کا تھا جب عائشہ نے کہا تھا کہ وہ آج اپنے امی' ابو کو اپنے ہاتھوں سے کھانا بنا کر کھلائے گی۔ وہ اپنی ماں کے لیے سوجی کا حلوہ بنا رہی تھی۔ جس کی ترکیب اس نے الفت بیگم سے سمجھ لی تھی۔ عائشہ کا ایک پاؤں کچن میں تھا اور دوسرے ہی لمحے الفت کے کمرے میں جا کر پوچھتی ۔۔۔ کہ کیا کرنا ہے۔ سوجی براؤن ہوچکی ہے۔ پانی ڈال دوں؟ الفت بیگم عائشہ کی حرکت پر لطف اندوز ہو رہی تھیں۔ ان کو اپنا وقت یاد آرہا تھا کہ کیسے وہ اپنی اماں سے پوچھ پوچھ کر ہنڈیا بنایا کرتی تھیں اور آج ان کی بیٹی پوچھ رہی ہے۔ وقت کا پہیہ چلتا رہے گا۔ مائیں ہمیشہ اپنی بیٹیوں کو کچن کے کاموں کی تربیت دیتی رہیں گی کہ کبھی سسرال میں ان کی بچیوں کو کوئی تکلیف نہ ہو۔ الفت نے بھی عائشہ کو کچن کے کاموں کی طرف دھکیلا تھا اور عائشہ نے بہت جلد چند ڈشز سیکھ لی تھیں۔ جس سے الفت کافی حد تک مطمئن ہوگئی تھیں۔

☼ ☼ ☼

"ہیلو رخشی۔۔۔ کیسی ہو۔۔۔ طبیعت کیسی ہے؟ بخار کم ہوا؟" زبیر نے فکرمندی سے پوچھا تھا۔

رخشی جو مزے سے ٹی وی دیکھ رہی تھی۔ اس نے بیزار ہو کر فون اٹھایا تھا۔ رخشی ہمیشہ بخار کا بہانہ بنا کر زبیر کو اپنے سے دور رکھتی تھی۔ مگر ضرورت پڑنے پر وہ زبیر کو کال پہ کال کرتی۔ وہ حیدر کی محبت میں دیوانی تھی۔ کبھی حنا کے کہنے پر زبیر کے لیے اس کے دل میں ہمدردی کا جذبہ پیدا ہوجاتا۔ مگر پھر حیدر کی چکنی چپڑی باتوں پر وہ زبیر سے بددل ہوجاتی۔ رخشی نے مختصر سی بات کے بعد فون بند کیا تو سامنے حنا کو پایا۔۔۔ جو اس کے لیے میٹھے چاول لے کر آئی تھی۔

رخشی نے میٹھے چاولوں کی پلیٹ پکڑلی اور خوشی سے پوچھا۔ "کیا بات ہے۔ کوئی خوش خبری ہے کیا؟"

حنا نے ہنس کر کہا۔ "جی نہیں۔ لیکن میری اماں صاحبہ کا کہنا ہے لڑکی کو میٹھا پکانا ضرور آنا چاہیے۔ اس لیے مجھے تقریباً" ہر ہفتے کوئی میٹھا پکانے کو کہتی ہیں۔ آج میٹھے چاول بنائے ہیں۔" حنا نے ہنس کر بتایا۔

"واہ گریٹ۔ کیا بات ہے۔ سیکھو جناب۔ دلہن کا پہلا کام کچن میں میٹھا پکانا ہی ہوتا ہے۔ جو وقت کے ساتھ سب کے لیے کڑوا ہوجاتا ہے۔" رخشی نے میٹھے چاولوں کا ایک چمچہ کھا کر کہا تھا۔

"زبیر بھائی کا کیا حال ہے۔ ابھی ان سے بات کررہی تھیں کیا؟" حنا نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"ہاں۔۔۔" رخشی نے بددلی سے جواب دیا۔ وہ جانتی تھی۔ حنا زبیر کے حق میں بولے گی۔ اس لیے خاموشی سے چاول کھانے میں مصروف ہوگئی۔

☼ ☼ ☼

"بہت مزے کی بریانی پکائی ہے۔ کیا بات ہے۔ جی۔ زبردست۔" شہزاد نے رخسار کے بریانی بنانے پر داد دی۔ رخسار نے بھی دوپہر سے شام تک خود کو بریانی کے لیے وقف کردیا تھا تو خاص تو پھر بننی ہی تھی۔ رخسار اپنی تعریف سن کر پھولے نہ سما رہی تھی۔

شہزاد نے جمائی لے کر رخسار پر ظاہر کیا کہ اسے نیند آرہی ہے۔ رخسار کی باتیں آج اسے زیادہ ہی بور کررہی تھیں۔ کیونکہ آج تو عائشہ نے اس سے ہنس کر بات کی تھی۔

رخسار نے شہزاد کی بوجھل آنکھیں دیکھیں تو اٹھتے ہوئے بولی۔

"آپ سو جائیں شہزاد! کل بات کر لیں گے۔" اس کے جانے کے بعد شہزاد نے سکون کی سانس لی اور عائشہ کے خوابوں میں کھو گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"سچ میں آفرین کے ساتھ ایسا ہوا۔ آفرین کہاں ہے۔ ٹھیک تو ہے۔ میں تو عادل بھائی کی اس حرکت پر حیران ہوں' توبہ۔" ہادیہ نے رخسار کو اطلاع دی تھی کہ آفرین کے شوہر عادل نے دوسری شادی کر لی ہے۔ رخسار کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی تھی۔ ہادیہ نے بتایا۔ آفرین بہت بیمار ہو گئی تھی۔ وہ اپنی خالہ کے گھر ملتان چلی گئی ہے اور اب عادل سے طلاق لینا چاہتی ہے۔ رخسار کو آفرین کی باتیں یاد آ رہی تھیں۔

مرد کا بھروسا نہیں ہے۔ کب اپنا رنگ دکھا جائے۔ اس لیے شہزاد کو اپنی مٹھی میں رکھو اور جلدی سے شادی کر لو۔ ہادیہ کی منگنی پر اس نے کہا تھا۔ رخسار کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ آفرین نے کتنا بڑا دھوکا کھایا تھا۔ وہ بچی نہیں تھی۔ شہزاد کا رویّہ بھی محسوس کر رہی تھی۔ اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ شہزاد سے دوٹوک بات کر کے اس بات کو صاف کرے گی۔ اگر شہزاد اس سے محبت نہیں کرتا تو اس رشتہ کا ختم ہونا ہی بہتر ہے۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ جو کچھ آفرین کی زندگی میں ہوا ہے اس کے ساتھ بھی ہو۔ وہ دل کے کھیل میں دھوکا نہیں کھانا چاہتی تھی۔

☼ ☼ ☼

"کل تمہارے گھر ماما آ رہی ہیں۔" زبیر نے خوشی سے رخشی کو فون پر اطلاع دی۔ رخشی ہڑبڑا سی گئی۔ اس سے پہلے رخشی کوئی بہانہ بناتی' زبیر کے کچھ مہمان آ گئے۔ جس کی وجہ سے اس نے فون بند کر دیا۔ رخشی نے حیدر کو فون کیا۔ تیسری دفعہ کال کرنے پر حیدر نے رخشی کا فون ریسیو کیا۔

رخشی نے گھبرا کر کہا۔ "حیدر کہاں ہو؛ کل زبیر اپنی والدہ کو میرے گھر بھیج رہا ہے۔ اف خدایا۔ اب بتاؤ' میں کیا کروں" رخشی نے گھبرا کر کہا تھا۔

"اوہو یار' تم سے مذاق کر رہا ہو گا۔ اس کی مما تو لندن میں ہیں۔" اس نے بیزاری سے کہا تھا۔ اس کے لیے رخشی کا وجود صرف زبیر کی دولت ہتھیانے کے لیے تھا۔ مگر رخشی پیار میں اندھی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

"رخشی! جس کمپنی کو مال بھیجا تھا۔ اس نے واپس کر دیا ہے۔ بہت نقصان ہوا ہے۔ ایسے میں پلیز صرف واحد تم ہو..... جو میرے کام آ سکتی ہو۔ پلیز زبیر سے پچاس ہزار روپے اور لے دو۔" حیدر نے التجا بھرے لہجے میں کہا تھا۔

"پلیز حیدر..... خدا کا خوف کرو۔ میں پاگل ہو جاؤں گی۔ مجھے زبیر کے ساتھ مزید ڈرامے بازی نہیں کرنی ہے۔ پلیز حیدر! یہ مجھ سے نہیں ہو گا۔" رخشی نے افسردگی سے کہا تھا۔

"رخشی! اس دنیا میں واحد تم ہی میرا سہارا ہو۔ پلیز رخشی صرف یہ آخری دفعہ مانگو گی۔ میں کل ہی اپنی اماں سے بات کرتا ہوں۔ پھر شادی کر لیں گے۔ پلیز آخری دفعہ زبیر سے پیسے مانگ لو۔" حیدر نے بے شرمی سے کہا تھا۔

رخشی خواب سجانے لگی۔ مگر یک دم اس کا چہرہ افسردہ ہو گیا کہ زبیر کی والدہ اور زبیر کو کیسے ہینڈل کیا جائے۔ جبکہ زبیر کو وہ سچ نہیں بتا سکتی تھی۔ کیونکہ زبیر سے اسے مزید پچاس ہزار روپے لینا تھے۔ کافی سوچنے کے بعد وہ سیدھا حنا کے گھر میں پہنچی۔ حنا کی ماں کھانا بنا رہی تھیں اور حنا بھی اپنی ماں کا ہاتھ بٹا رہی تھی۔ وہ رخشی کو دیکھ کر مسکرائیں رخشی نے ہنس کر کہا۔

"روبینہ خالہ! آپ کا سر درد دور کرنے کے لیے آئی ہوں۔ میری ایک دوست نوشین کو اپنے بھائی کے لیے رشتہ چاہیے۔ میں نے حنا کے لیے اس کی والدہ کو گھر پر مدعو کر لیا ہے۔ کل وہ آپ کی طرف آ رہی ہیں۔ آپ گھر صاف کر لیں۔ میں کل ان کو لے کر آؤں گی۔" روبینہ نے اسے بیٹھنے کو کہا۔ لیکن اس نے ضروری کام کا بہانا بنا دیا۔ وہ حنا سے زیادہ بات نہیں کرنا چاہتی تھی۔ وہ اس سے لازمی اس رشتے کے بارے میں سوال کرتی۔ حنا' رخشی کی اطلاع پر حیرت زدہ ہو گئی کہ اچانک کون سی نئی دوست نوشین نکل آئی ہے۔ جبکہ حنا نے دس سال کی دوستی میں نوشین کا نام نہیں سنا تھا۔

رخشی نے زبیر سے پیسے منگوا کر حیدر کو بھجوا دیے اور پھر بے صبری سے حیدر کی والدہ کا انتظار کرنے لگی۔ رخشی نے سوچ لیا تھا کہ حیدر کی والدہ کے گھر آنے کے بعد وہ زبیر کو سچ بتا دے گی۔ بلکہ وہ حنا کے لیے اس کو راضی کر لے گی۔ زبیر کی والدہ شائستہ' زبیر کے ایڈریس کے مطابق رخشی کے گھر پہنچیں۔ رخشی نے اپنے پلان کے مطابق ہنس کر شائستہ کا استقبال کیا اور حنا کے گھر لے گئی۔ دونوں گھروں کے بیچ ایک دیوار حائل تھی۔ یوں رخشی نے چالاکی سے حنا کو اس لڑکی کے طور پر ملوایا جسے زبیر پسند کرتا تھا۔ حنا اچھی' خوش شکل' سلیقہ مند لڑکی تھی۔ زبیر کی والدہ کو بہت اچھی لگی۔ یوں بھی زبیر کی پسند تھی۔ انہوں نے فوراً" ہی رشتہ دے دیا۔ حنا کے گھر والوں کے لیے زبیر جیسا رشتہ اللہ کا کرم تھا۔ کیونکہ حنا کے والد زبیر کی فیکٹری میں معمولی ملازم تھے۔ زبیر کی والدہ کے قدم اپنے گھر پر دیکھ کر وہ گھبرا گئے اور جب ان کی آمد کا مقصد پتا چلا تو خوشی سے پھولے نہ سمائے۔ رسمی طور پر سوچ و بچار کے لیے بھی وقت نہ لیا۔ فوراً" ہاں کر دی۔ شائستہ نے اپنے ہاتھ کی انگوٹھی رسم کے طور پر پہنا دی۔ جس سے نہ جانے کیوں رخشی کے دل پر ضرب پڑی تھی۔ اب وہ بے چینی سے حیدر کی ماں کا انتظار کر رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

زبیر کے علم میں جب یہ بات آئی کہ اس کی والدہ کو رخشی' حنا کے گھر لے گئی اور منگنی کی انگوٹھی حنا کو پہنائی گئی۔ تو زبیر نے رخشی کو فون کیا تھا۔

"رخشی یہ کیا ڈرامہ ہے۔ تم نے مما کو حنا کی طرف بھیج دیا۔ تم نے ایسا کیوں کیا؟" وہ غصہ سے پاگل ہو رہا تھا۔

رخشی چند منٹ پہلے حیدر سے بات کر کے اس کی والدہ کے کل آنے پر خوش تھی۔

اس نے بیزار ہو کر زبیر کو سچ بتا دیا۔ زبیر کی آواز حلق میں پھنس گئی کہ حیدر اس کا دوست اور رخشی صرف دولت کے لیے اس کو استعمال کر رہے تھے۔ زبیر کے لیے خود کو سنبھالنا مشکل ہو گیا۔ رخشی کی حقیقت دیکھ کر اس کا دل رونے لگا۔ محبت میں اتنا بڑا دھوکہ ملنے پر وہ کسی کو کچھ بتانے کے قابل بھی نہیں رہا۔ اتنا بڑا دھوکا' وہ اپنی ماں کو کیا بتاتا جنہیں اصرار کر کے رخشی کے گھر بھیجا تھا۔ وہ تو یہی سمجھ رہی تھیں کہ حنا ہی وہ لڑکی ہے جو زبیر کی محبت تھی۔ شاید زبیر کے لیے خدا تعالیٰ کا یہ خاص کرم تھا کہ کبھی اس نے رخشی کا نام لے کر اس کو متعارف نہیں کروایا تھا۔ خاندان بھر میں زبیر کی منگنی کی خوشیاں منائی جا رہی تھیں کہ زبیر نے اپنا پیار پا لیا۔ مگر زبیر بند کمرے میں بیٹھا سوچ رہا تھا کہ اب وہ کیا فیصلہ لے گا۔

☼ ☼ ☼
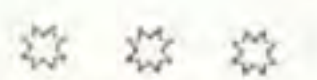
"خرم! بازار میں پرائز بانڈ کی لسٹ آ گئی ہو گی۔ پلیز لے آؤ۔" رخسار نے پیار سے اپنے منہ بولے بھائی خرم سے کہا تھا۔ رخسار' خرم کو ٹیوشن پڑھاتی تھی۔ خرم ساتویں کلاس میں پڑھ رہا تھا۔ گھر میں فارغ رہنے کی وجہ سے رخسار نے خرم کو ٹیوشن دینی شروع کر دی۔ خرم کے گھر میں آنے سے زبیدہ کو کافی آرام ہو گیا۔ بازار کا سودا سلف خرم ہی خرید کر لے آتا تھا۔ پچھلے چھ ماہ سے وہ یوں ہی بانڈز کی لسٹ دیکھتی۔ مگر انعام کوئی نہیں ہوتا' تو وہ افسردہ ہو جاتی۔ امید پر دنیا قائم ہے۔ زبیدہ اکثر کہا کرتی تھیں۔

خرم پرائز بانڈ کی لسٹ دے کر اپنے گھر چلا گیا اور رخسار جلدی سے اسٹور روم کی طرف بھاگی۔ رخسار نے صندوق میں سے اپنا بانڈ نکالا اور بانڈ نمبر چیک کرنا شروع کیے۔ یک دم اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ اس کے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہو گئے۔ پرائز بانڈ

پر پہلا انعام بیس لاکھ روپے کا تھا جو کہ اس بانڈ کا نمبر تھا۔ وہ جلدی سے زبیدہ کے کمرے کی طرف بھاگی کہ اپنی ماں کو خوش خبری سنائے ۔ مگر صحن میں پہنچتے ہی اس کے قدم رک گئے۔ اس کو شہزاد کے بانڈ کا خیال آیا۔ وہ جلدی سے شہزاد کے کمرے کی طرف بھاگی۔ شہزاد نے اپنا بانڈ دراز میں رکھا ہوا تھا۔ اس نے جلدی سے شہزاد کے بانڈ کو چیک کیا۔ مگر شہزاد کا انعام نہیں نکلا تھا۔ رخسار' شہزاد کے کمرے میں بیٹھ گئی۔ اپنا نکلا ہوا بانڈ اور شہزاد کا بانڈ دونوں دیکھنے لگی۔ پھر رخسار کے دل سے آواز اٹھی۔

شہزاد غربت سے پہلے ہی احساس کمتری میں مبتلا ہے۔ ایسے میں تمہارا انعام نکلنے پر وہ خود کو کمتر سمجھے گا۔ اگر اپنی محبت کو پانا ہے تو یہ بانڈ انعام شہزاد کی قسمت میں لکھ دو۔ تاکہ وہ غربت کے احساس سے نکل سکے۔ شادی کے بعد تم ہی تو ان پیسوں کو استعمال کرنے والی ہو۔ شہزاد تمہارا ہو جائے گا اور اس کو کبھی معلوم نہیں ہو گا کہ تم نے اس کی قسمت کو بدلا تھا۔

رخسار نے اپنی محبت کو پانے کے لیے اپنا پرائز بانڈ جو بیس لاکھ روپے کی رقم کا تھا شہزاد کی دراز میں رکھ دیا اور شہزاد کا بانڈ لے کر اسٹور روم میں آگئی۔ رخسار نے ہادیہ کو فون کر کے بتایا۔

"کیا... واہ گریٹ کیا بات ہے۔ اتنا بڑا انعام نکل آیا۔ یار مجھے ———— بہت خوشی ہوئی ہے۔" ہادیہ نے خوشی سے کہا۔

"ہادیہ! میں نے وہ بانڈ شہزاد کے نام کر دیا ہے۔" رخسار نے سنجیدگی سے کہا۔

"کیا... کیا؟" ہادیہ کے حلق میں آواز پھنس سی گئی۔ وہ رخسار کے اس فیصلے کو سن کر حیرت زدہ ہو گئی کہ رخسار نے اپنا بانڈ شہزاد کی دراز میں رکھ دیا ہے۔

"ایسا کیوں کر رہی ہو۔ اللہ تعالیٰ نے تمہیں دولت سے نوازا ہے۔ اس کی ناشکری مت کرو۔" ہادیہ نے سمجھایا۔

"ہادیہ' شہزاد پہلے ہی ملازمت کے لیے پریشان ہے۔ ان پیسوں سے وہ اپنا کاروبار چلا سکتا ہے۔ اس کو ملازمت کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ میں شہزاد کو خوش دیکھنا چاہتی ہوں۔" رخسار نے شہزاد کی محبت میں سرشار ہو کر کہا۔

"تم اس کو خود بھی یہ پیسے دے سکتی ہو۔ پھر اس کو انجان کیوں رکھ رہی ہو۔ آفرین کے ساتھ جو ہوا... وہ کم ہے کیا؟ اتنا بڑا فیصلہ کرنے سے پہلے سوچ لو۔" ہادیہ نے سنجیدگی سے کہا۔

"شہزاد مجھ سے پیسے نہیں لے گا۔ میں اس کو یہ احساس نہیں دلانا چاہتی... کہ وہ میری وجہ سے 'اپنے پاؤں پر کھڑا ہوا ہے۔ میں نہیں چاہتی... کہ شادی کے بعد وہ خود کو مجھ سے کم تر محسوس کرے۔ میں نے اپنا نصیب اور اپنی زندگی شہزاد کے سپرد کر دی۔ اب آگے وہ اوپر والا فیصلہ کرے گا۔"

رخسار نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ ہادیہ فکر مند سی ہو گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

زبیر بند کمرے میں حنا سے ہونے والی منگنی کا فیصلہ سوچ رہا تھا کہ اس کے سیل فون پر حنا کی کال آنے لگی۔ زبیر نے فکر مندی سے اٹھایا۔ دوسری طرف حنا تھی۔ جس کی آواز میں افسردگی کے ساتھ نمی تھی۔

"زبیر! یہ آپ نے کیا کیا؟ آپ تو میری دوست رخشی سے محبت کرتے تھے۔ میں تو... آپ سے رخشی کی وجہ سے بات کرتی تھی۔" حنا کو جب معلوم ہوا کہ اس کا منگیتر زبیر ہے۔ وہی زبیر جو رخشی کو چاہتا تھا تو وہ ہکا بکا رہ گئی۔ اس نے رخشی سے بات کی۔ تو اس نے سارا الزام زبیر کے سر ڈال دیا۔ "مجھے تو خود اس فیصلے کا علم نہیں تھا۔ تم زبیر سے پوچھ لو کہ وہ کیوں یہ چاہتا ہے؟" رخشی نے بے نیازی سے کہا۔

"اپنی دوست رخشی سے پوچھو... کیا تم نہیں جانتی تھیں کہ وہ مجھے دھوکہ دے رہی تھی؟" زبیر نے تلخی سے کہا تھا۔ وہ حنا کو بھی قصوروار سمجھ رہا تھا۔ "زبیر میں نے رخشی کو بہت سمجھایا تھا۔ لیکن اس کی آنکھوں پر لالچ کی پٹی بندھی تھی۔ اگر میں آپ کو یہ سب بتاتی تو آپ ہرگز میرا یقین نہ کرتے۔ کیونکہ آپ کی آنکھوں پر بھی رخشی کی محبت کی پٹی بندھی تھی۔ آپ رخشی کا ہی یقین کرتے۔ اس لیے میں نے خاموشی میں ہی عافیت سمجھی۔ میں آپ سے صرف اتنا کہنا چاہتی ہوں کہ آپ ——— جلد فیصلہ لے لیں۔ کیونکہ میں نہیں چاہتی کہ بات آگے بڑھے اور میرے والدین کو بعد میں دھکا لگے آپ کی والدہ شادی کی تاریخ لینے آج ہمارے گھر آ رہی ہیں۔ پلیز آپ ان کو منع کر دیں۔" ——— حنا نے لرزتی آواز میں کہا تھا۔

جو بھی ہوا تھا' برا تھا' مگر پھر بھی زبیر کا دل مطمئن تھا کہ اس نے رخشی کی اصلیت کو شادی سے پہلے ہی جان لیا ہے۔ اگر شادی کے بعد رخشی اور حیدر کا افیئر سامنے آتا تو شاید وہ یہ دھوکا برداشت نہیں کر پاتا زبیر نے اپنا فیصلہ قدرت پر چھوڑنا مناسب سمجھا۔ کہیں نہ کہیں اس کے دل میں حنا کے لیے بھی ہمدردی تھی کہ اس سارے مسئلے میں حنا کی زندگی کو تباہ نہیں ہونا چاہیے۔ کیونکہ وہ بے قصور تھی۔

☼ ☼ ☼

"زبیدہ خالہ! میرا بیس لاکھ روپے کا پرائز بانڈ نکلا ہے۔"

شہزاد نے اچھل کر بتایا تھا۔ زبیدہ بھی بہت خوش تھیں۔ رخسار' شہزاد کو خوش دیکھ کر اپنے فیصلے پر اور مطمئن ہو گئی۔ شہزاد کے پاؤں خوشی سے زمین پر ٹک نہیں رہے تھے۔ وہ اپنے دوستوں کو فون کر کے بتانے لگا۔

رخسار جس نے بانڈ کی خوشی میں پہلے ہی کیک منگوا لیا تھا۔ اس نے چائے بنانے کے لیے کچن کا رخ کیا۔ خوشی سے بھوک تو اڑ چکی تھی۔ اس لیے زبیدہ نے بھی چائے کا کہا۔

رخسار چائے بناتے ہوئے آنے والے وقت کے خوش کن خیالوں میں کھوئی ہوئی تھی۔ زبیدہ کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ زبیدہ نے مسکرا کر کہا۔

"بیٹی! رخسار دھیان کدھر ہے۔ چائے کو جوش آچکا ہے۔" چائے ابل ابل کر چولہے پر گر رہی تھی۔ رخسار نے مسکرا کر چولہا بند کیا۔ کیک اور چائے لے کر لاؤنج میں آگئی۔

زبیدہ نے شہزاد کو بلانے کے لیے کہا تھا۔ شہزاد اپنے کمرے میں دوست اسد کو فون کر کے بتا رہا تھا کہ اس کا بیس لاکھ روپے کا بانڈ نکلا ہے۔ رخسار شہزاد کے کمرے میں پہنچی تو دروازے میں ہی ٹھٹک گئی۔ شہزاد اسد سے کہہ رہا تھا۔

"رخسار میری مجبوری تھی۔ میں نے اپنی ضرورت کے لیے یہ گھنٹی گلے میں ڈال لی تھی۔ اللہ نے میری سن لی۔ میں ایک چھوٹا سا مکان لے سکتا ہوں۔ میں رخسار سے منگنی توڑ دوں گا اور عائشہ سے اپنی محبت کا اعتراف کروں گا۔ اب تو میرے پاس اتنے پیسے ہیں کہ میں ایک گھر لے کر عائشہ کو اس میں رکھ سکتا ہوں۔ اگر وہ میری محبت کو قبول کر لے... تو میں یہ بیس لاکھ ایک کروڑ میں تبدیل کر دوں گا۔"

یہ سن کر رخسار پر تو جیسے قیامت ٹوٹ پڑی۔ وہ جو خوشی خوشی شہزاد کو بلانے آئی تھی۔ الٹے قدموں واپس پلٹی تھی۔ شہزاد کی محبت کی اصلیت جاننے کے بعد اس کو دنیا اندھیر نظر آئی تھی۔

☼ ☼ ☼

"حیدر! تمہاری اماں نہیں آئیں۔ میں سارا دن انتظار کرتی رہی۔"

رخشی نے غصے میں حیدر کو فون پر کیا تھا۔ رخشی نے اپنے گھر والوں کو حیدر کے متعلق آگاہ کر دیا تھا۔ رخشی کے گھر والے بھی طیش میں تھے کہ حیدر نے وقت دے کر اپنی والدہ کو کیوں نہیں بھیجا ہے۔ رخشی کی دونوں بھابھیاں بھی باتیں بنا رہی تھیں۔

"مجھے نہیں کرنی کوئی شادی وادی' کیا کر لوگی۔" حیدر رخشی کے غصے پر بھڑک کر اپنی اصلیت پر اتر آیا تھا۔

"حیدر! مجھے تم سے یہ امید نہیں تھی۔" رخشی کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ اس نے روتے

ہوئے کہا۔

"ہاں..... ہاں..... مجھ سے کوئی امید نہ رکھو۔ میں شادی کرنا ہی نہیں چاہتا۔ ایک ایسی لڑکی کے ساتھ ساری عمر گزارنا میرے بس کی بات نہیں اور تم جیسی لڑکی کے ساتھ تو توبہ ہے..... جو بہت بے وقوف اور جھوٹی بھی ہے۔" حیدر نے ہنس کر کہا تو..... رخشی چیخ کر بولی۔

"ہاں میں بے وقوف ہی تھی جو تمہاری باتوں میں آگئی اور تمہارے کہنے پر جھوٹ بولتی رہی۔"

"اگر تم میں عقل ہوتی تو اتنا تو سوچتیں کہ اگر مجھے تم سے محبت ہوتی تو کیا میں تمہیں زبیر کے پاس جانے دیتا۔ میں تو بس تمہیں اپنے فائدے کے لیے استعمال کر رہا تھا۔ مگر تم نے زبیر کی منگنی حنا سے کروادی۔ اب مس رخشی، تم مجھے کوئی فائدہ نہیں دے سکتیں۔ اس لیے میری طرف سے خدا حافظ ہے۔"

حیدر نے قہقہہ لگا کر کہا تھا۔

"حیدر پلیز..... میرے ساتھ ایسا مت کرو۔ میں نے اپنے گھر والوں کو بتا دیا ہے۔ میرے گھر والے مجھے جان سے مار دیں گے۔" رخشی رو پڑی تھی۔ مگر حیدر نے خدا حافظ کہہ کر فون بند کر دیا۔ رخشی جو چند لمحے پہلے خود کو دلہن کے روپ میں دیکھ رہی تھی۔ اس کے سارے خواب ٹوٹ گئے تھے۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

اگلی صبح شہزاد مسکرا کر ملازمت کے لیے نکلا۔ رخسار جانتی تھی کہ شہزاد دو چار دن کا مہمان ہے۔ کیونکہ کل رات اسد کو فون پر شہزاد نے کمرے کا بندوبست کرنے کے لیے کہہ دیا تھا۔ رخسار نے زبیدہ سے اپنا دکھ چھپا لیا۔ وہ اپنی ماں کی فکر کو مزید بڑھانا نہیں چاہتی تھی۔ ہادیہ نے تو رخسار سے کئی دفعہ کہا تھا کہ شہزاد کو حقیقت سے آگاہ کرو..... مگر رخسار نے یہ کہہ کر بات ختم کر دی کہ پیار پانے کا نام نہیں۔ پیار دینے کا نام ہوتا ہے۔ میں نے اس سے محبت کی تھی۔ میں اس کے دل میں جگہ نہ پا سکی۔ یہ میرا نصیب ہے۔

ہادیہ بھی خاموش ہو گئی۔ شہزاد اشرف صاحب کی طرف جانے کے بجائے اسد سے ملا۔ دونوں نے مل کر ایک کرائے کا مکان تلاش کیا۔ شہزاد نے بانڈ کیش کروانا تھا۔ اتنی بڑی رقم وہ بینک سے کلیئر کروانا چاہتا تھا۔ وہ بانڈ کو اپنے پرس میں ڈال کر نکلا تھا۔ اللہ تعالیٰ کی مرضی اور ہی تھی۔ کہ اس کی جیب سے پرس نکل کر گر گیا۔ اس کو علم ہی نہ ہوا۔ شہزاد کو خبر تب ہوئی جب ریسٹورنٹ میں کھانے کے بعد بل دینے کے لیے جیب میں ہاتھ ڈالا۔ پرس نہ پا کر وہ گھبرا گیا۔ اس نے اسد کو بتایا۔ اسد کا رنگ بھی پیلا ہو گیا۔ بات ہی اتنی بڑی تھی۔ شہزاد کی زندگی کی پلاننگ پل بھر میں اللہ تعالیٰ نے ختم کر ڈالی۔ شہزاد ہر جگہ بھاگا۔ جہاں جہاں وہ گیا تھا۔ مگر پرس نہ ملا۔ بیس لاکھ تعالیٰ نے دے کر اس سے چھین لیے تھے۔

وہ ہکا بکا اسد کو تک رہا تھا۔ اس کے پاس بولنے کو کچھ بچا ہی نہ تھا۔ کچھ دیر پہلے وہ بار بار اسد سے کہہ رہا تھا کہ رخسار سے تو اس کی جان چھوٹ گئی۔ اب وہ اپنی مرضی سے شادی کرے گا۔ کبھی بھی زبیدہ خالہ کے گھر کی طرف نہیں جائے گا۔ اب قدرت کے اس فیصلے پر ششدر تھا۔ اسد کے پاس شہزاد کے لیے کوئی تسلی نہ تھی۔ اسے پشیمانی ہو رہی تھی۔ اللہ سے معافی مانگنے لگا۔ اسی نے ہی شہزاد کو رخسار سے ــ جھوٹی محبت کا ڈرامہ رچانے کے لیے کہا تھا۔

☼ ☼ ☼

زبیر نے حنا کی خوشیاں نہیں چھینیں۔ اور قدرت کا فیصلہ سمجھ کر حنا ہی کو اپنانے کا فیصلہ کر لیا۔ حنا کی رسم مہندی کی تقریب پر رخشی بھی پہنچی۔ حنا کے لیے زبیر نے اتنا کچھ بھیجا تھا کہ حنا کے خاندان اور رخشی کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

رخشی دل ہی دل میں خود کو کوسنے لگی کہ اس نے اپنا نصیب حنا کو دے دیا۔ جبکہ یہ سب کچھ اس کا تھا۔ حنا کو زبیر نے اپنے نام کی عزت دی، جو ساری دنیا دیکھ رہی تھی اور رخشی کے لیے طعنے ہی رہ گئے۔ حیدر سے مایوس ہونے کے بعد رخشی نے زبیر سے بہت دفعہ معافی مانگی۔ وہ دوبارہ اس کی زندگی میں آنا چاہتی تھی مگر زبیر نے رخشی کے لیے اپنا دل پتھر کر لیا۔ جس کو رخشی پگھلا نہ سکی۔ کیونکہ دوسری طرف حنا کی وفا تھی۔

بارات آئی تو رخشی سے برداشت نہیں ہوا۔ دلہن بنی حنا کو رخشی نے گلے سے لگا کر کہا تھا۔

"میں نے اپنے ہاتھوں اپنا نصیب اجاڑ دیا۔ زبیر کو کھو دیا۔ حیدر مجھے چھوڑ چکا ہے۔"

رخشی یہ کہہ کر روتی ہوئی چلی گئی حنا کی آنکھیں بھی بھر آئیں اس نے بار بار رخشی کو سمجھایا تھا۔ زبیر کا پیار مت ٹھکراؤ۔ وہ تم سے سچا پیار کرتا ہے۔ مگر حنا کو کیا معلوم تھا کہ یہ سچا پیار اس کی قسمت تھا۔ اس کی پاک نیت کی وجہ سے آج اس کی زندگی میں خوشیاں ہی خوشیاں تھیں اور رخشی کی زندگی میں اندھیرا تھا۔ جو سدا رہنے والا تھا۔

☼ ☼ ☼

جواد لندن سے واپس آیا تو سیدھا فراز انکل کے افسوس کے لیے رخسار کے گھر پہنچا۔ نزہت اپنے بیٹے کی واپسی پر بہت خوش تھیں۔ زبیدہ نے جواد کی خاطر مدارت کی۔ پیلے لباس میں افسردہ سی رخسار جواد کو بہت معصوم سی لگی۔ وہ رخسار کو پہلے بھی پسند کرتا تھا۔

نزہت نے رخسار کی منگنی کے متعلق بتایا تو جواد کو بہت دکھ ہوا۔ رخسار نے صاف صاف کہہ دیا کہ وہ شہزاد سے شادی نہیں کرنا چاہتی اور یہ منگنی توڑنا چاہتی ہے۔ زبیدہ کو یہ سن کر شدید دھچکا لگا۔ وہ رخسار کی آنکھوں میں شہزاد کی محبت دیکھ چکی تھیں۔ اس اچانک فیصلہ نے ان کو حیران و پریشان کر دیا تھا۔ رخسار نے حقیقت پر پردہ ہی رکھا۔ زبیدہ کے سوالوں میں جواب میں صرف ایک ہی بات کہتی رہی کہ وہ شہزاد سے شادی نہیں کرنا چاہتی۔ زبیدہ یہ منگنی ختم کر دیں۔ ابھی دونوں اسی بحث میں پڑی تھیں کہ شہزاد گھر میں داخل ہوا۔ شہزاد کو دیکھ کر زبیدہ نے اس سے سوال کر دیا۔

"کیا بات ہے شہزاد..... رخسار کے ساتھ تمہارا کیا جھگڑا ہوا ہے۔ــــــــ اس نے منگنی کی انگوٹھی اتار دی ہے۔"

شہزاد کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ وہ سمجھ گیا کہ رخسار نے یہ فیصلہ اس کی اسد سے بات چیت سننے کے بعد کیا ہے کہ جب وہ اسد سے بات کر رہا تھا تو دروازے پر آہٹ ہوئی تھی۔ مگر اس نے نظرانداز کر دی تھی۔ اسے کون سی پروا تھی کہ رخسار سن لے گی۔

شہزاد نے زبیدہ کو بانڈ کھو جانے کا بتایا تو زبیدہ بری طرح پریشان ہو گئیں۔ ایک طرف اپنی بیٹی کا فیصلہ۔ دوسری طرف شہزاد کے بانڈ کی گمشدگی۔ وہ رونے لگیں "پتا نہیں اللہ تعالیٰ میرے بچوں کو کن گناہوں کی سزا دے رہا ہے۔"

شہزاد سوچ رہا تھا۔

جو سزا خدا تعالیٰ نے مجھے دی ہے۔ میں اسی کا مستحق تھا۔ میں معصوم رخسار کی زندگی تباہ کرنا چاہتا تھا۔ قدرت نے مجھے میری اوقات بتادی۔

دوسری طرف رخسار نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا تھا کہ بانڈ نکلنے کی وجہ سے اس کو شہزاد کا اصلی چہرہ دیکھنے کو ملا۔ ورنہ وہ ساری زندگی شہزاد کی جھوٹی محبت کا دم بھرتی رہتی۔

رخسار نے منگنی توڑ دی۔ زبیدہ یہ منگنی توڑنا نہیں چاہتی تھیں۔ مگر رخسار کی وجہ سے مجبور ہوگئیں۔ وہ ان کی اکلوتی بیٹی تھی۔ وہ اس کی آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھ سکتی تھیں۔ مجبور ہو کر انہوں نے شہزاد کو جواب دے دیا۔

منگنی ٹوٹنے کے بعد عائشہ نے اس کو دو ٹوک جواب دے کر ملازمت سے نکال دیا کہ وہ فراز انکل اور رخسار کے لیے اس کو برداشت کررہی تھی۔ کیونکہ اس نے انکل فراز سے وعدہ کیا تھا کہ وہ رخسار کے منگیتر کو کبھی جاب سے نہیں نکالے گی۔

شہزاد یہ جان کر شرمندہ ہوگیا کہ عائشہ اس کے اور رخسار کے رشتے سے واقف تھی۔ عائشہ کی شادی اسامہ سے ہوگئی اور شہزاد کا خواب ادھورا رہ گیا۔ مگر اس نے عائشہ کی بات کو دل سے لگالیا کہ پیار میں جو لوگ دھوکا دیتے ہیں وہ انسان تو کیا جانور بھی کہلانے کے لائق نہیں۔ کیونکہ جانور بھی پیار کے جذبے سے آشنا ہوتے ہیں۔ اس نے فیصلہ کرلیا کہ اب وہ کبھی دوسروں کو استعمال نہیں کرے گا اور غربت مٹانے کے لیے محنت سے کام لے گا۔ نہ دوسروں کی زندگیوں سے کھیل کر.....

رخسار کی منگنی ٹوٹنے کی خبر سے جواد کی مراد بر آئی تھی۔ نزہت تو پہلے ہی یہی چاہتی تھیں۔ اس لیے جھٹ انہوں نے شادی کا بندوبست کرلیا۔ شہزاد نے رخسار سے بار بار معافی مانگی تھی۔ رخسار نے شہزاد کو معاف تو کردیا۔ مگر اپنی زندگی کو اس کے نام نہیں کیا اور جواد کے حق میں فیصلہ دے دیا۔

وہ دلہن بن کر جواد کا انتظار کررہی تھی۔ جواد پھولوں کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا۔ رخسار نے سچے دل سے اپنے تمام ارمان جواد کے لیے سجا رکھے تھے۔ جواد نے اس کا گھونگھٹ اٹھایا اور منہ دکھائی میں انگوٹھی پہنائی۔

"اتنی مہنگی انگوٹھی کی کیا ضرورت تھی۔ کہیں گم ہوگئی تو؟" رخسار نے گھبرا کر کہا۔

"گم ہوگئی تو کیا۔ تم میرے لیے کسی قیمتی ہیرے سے کم نہیں ہو اور یہ ہیرا اللہ تعالیٰ کے کرم سے ہمیں ملا ہے۔"

جواد نے بتایا کہ جب وہ ایئرپورٹ سے آرہا تھا تو اس کی گاڑی خراب ہوگئی جس کی وجہ سے اسے اترنا پڑا۔ راستے میں اس کو ایک بٹوا گرا ملا۔ جس کو اس نے کھولا۔ تو چند روپوں کے ساتھ ایک بانڈ پرائز بانڈ کی لسٹ میں لپٹا ہوا تھا۔ اس نے بانڈ کو لسٹ میں چیک کیا تو وہ فرسٹ پرائز بیس لاکھ روپے کی مالیت کا تھا۔ جواد نے بتایا روڈ کے چاروں طرف کسی فرد کا نام و نشان نہیں تھا۔ اس لیے اس نے بٹوا یہ سوچ کر پاس رکھ لیا کہ شاید یہ اللہ تعالیٰ کا اس پر کوئی کرم ہے کہ جس نے اس کو اتنے زیادہ پیسوں سے نوازا اور پھر جواد نے ہنس کر کہا۔ میں نے یہ بھی سنا ہے کہ مرد کے پاس دولت اس کی بیوی کے نصیب سے آتی ہے۔ شاید یہ بانڈ مجھے تمہاری قسمت سے ملا ہے۔

رخسار حیران رہ گئی اور اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنے لگی کہ اس نے پھر سے اس کی قسمت کو واپس کیا ہے۔ ورنہ ساری زندگی اس کو ملال رہنا تھا کہ اس نے شہزاد کے حوالے اتنی بڑی رقم کی تھی۔ قسمت بھی ان لوگوں کی بدلتی ہے جس کی نیت صاف ہوتی ہے۔ رخسار کی زندگی میں جواد اور زبیر کی زندگی میں حنا آگئی۔ کیونکہ رخسار اور زبیر کے دل میں سچی محبت تھی۔ جس کے لائق رخشی اور شہزاد نہیں تھے۔

کسے مسیحا کرو

رضیہ مہدی

سارے گھر میں پراٹھوں کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی مگر یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ یہ روزانہ کا معمول تھا مگر جانے کیوں شہلا کو آج ڈپریشن کی تیز لہر نے اپنی گرفت میں جکڑ رکھا تھا۔

"حد ہوگئی یہاں کوئی ایسا بھی نہیں جو ایک کپ چائے..... چائے چھوڑ ایک گلاس پانی کو ہی پوچھ لے۔ سب یوں سو رہے ہیں جیسے رات بھر جاگے ہوں۔" وہ مسلسل کڑھ رہی تھی۔

دیوار سے دیوار ملی ہوئی تھی شاکرہ کے گھر کی جہاں سے گرما گرم پراٹھوں اور آملیٹ کی اشتہا انگیز خوشبو اور شاکرہ کی چیختی ہوئی آواز مل کر اسے اور بھی بدمزا رہی تھی۔

"یہ شاکرہ صبح صبح اتنا چیختی کیوں ہے؟" اسے خیال نہیں رہتا کہ شاکرہ تو زور سے بولنے کی عادی ہے۔ یہ اس کے اپنے گھر کا سناٹا ہے جس کی وجہ سے اس کی آواز گونجتی ہے۔

شاکرہ اپنے دونوں بیٹوں کو آواز دیتی رہتی تھی مسلسل۔

"اب اٹھ بھی جاؤ صائم..... دائم..... غضب خدا کا ذرا شرم و حیا نہیں تم دونوں میں۔ بوڑھا باپ کب تک ہڈیاں گھسائے گا۔ اب تو کچھ ہوش کرو۔" شاکرہ کی آواز صاف صاف شہلا تک آرہی تھی۔

"اوں ہوں صفدر اور بوڑھا..... میرے برابر ہی کا تو ہے۔" وہ استہزائیہ ہنسی۔ "اور لگتا تو مجھ سے کہیں زیادہ جوان ہے۔"

"جوان..... تو تم خود کو جوان سمجھتی ہو؟" اس نے اپنی دکھتی ہوئی ایڑی دبائی۔ پچاس سال یا پچاس صدیاں مگر مجھے کوئی بوڑھا تو نہیں سمجھتا۔ ابھی کل ہی تو رمیز بیٹھا سمجھا رہا تھا۔ وہ یاد کرنے لگی۔

"امی! آپ اتنی جلدی ہانپ کیوں ہو جاتی ہیں۔ ذرا ذرا سی بات پر اتنا غصہ کرنے سے ہی طبیعت خراب رہتی ہے آپ کی۔"
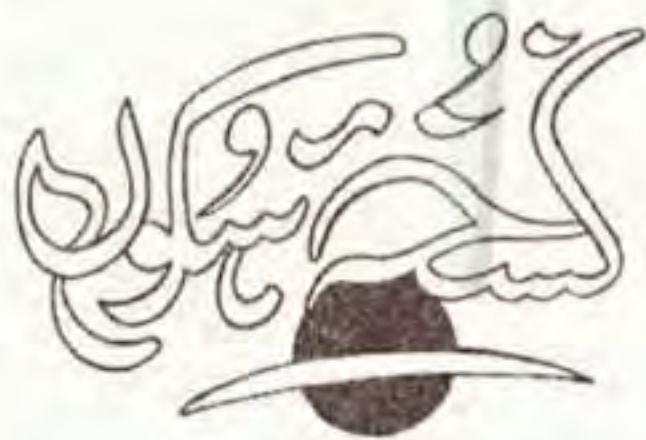
وہ چپ رہی حالانکہ بتانا چاہتی تھی "یہ ذرا سی بات نہیں تھی اور غصہ نہ کروں تو کیا کروں تم لوگوں کو کہاں خیال ہے کچھ۔ اب مجھ سے پہلے جتنے کام نہیں ہوتے صبح دفتر جانے کی جلدی جلدی میں بھی دوپہر کے لیے کچھ نہ کچھ کر کے جاتی تھی۔ پھر سات بجے بسوں کے دھکے کھا کر واپسی ہوتی تھی وہ بھی جو سی این جی اسٹیشن بند ہوں ورنہ وہ بس اسٹاپ پر ہی گھنٹوں رکتی رہتی۔ یہ کمبخت ایڑی کا درد ایسے تو نہیں جان لیوا بنا جا رہا تھا' پھر بھی شام کی تیاری اسے آتے ہی کرنی ہوتی تھی کہ انصر عشا پڑھتے ہی کھانا کھانا چاہتا تھا۔ دیر ہو جائے تو اس کا موڈ بگڑ جاتا تھا۔ خیر اس کا موڈ اچھا بھی کبھی دیکھا جا سکتا تھا۔۔۔ یہ سوچنے کے لیے شہلا کے پاس وقت کہاں ہوتا تھا۔

انصر شادی کے فوراً" بعد ہی شہلا پر کھل گیا تھا۔ وہ یوں بھی کوئی لگی لپٹی رکھنے کا کب قائل تھا مگر اس کا مزاج یوں تند سے تند تر ہوتا جائے گا۔ اس کا اندازہ شہلا کو بالکل نہیں تھا۔ اب تو روزانہ کوئی نہ کوئی ایسی بات ضرور ہو جاتی' جو اس کی نیند لے اڑتی۔ شوگر کا لیول کہاں بھاگا جاتا تھا اور بلڈ پریشر اف توبہ! مگر میاں تو میاں بیٹا بھی سمجھانے بیٹھ جاتا تھا۔ "امی! آپ اتنا ہانپو کیوں ہو جاتی ہیں۔"

وہ ابھی بال ہی بنا رہی تھی کہ ڈور بیل نے اسے متوجہ کر لیا۔ اسے معلوم تھا' عروج ہوگی۔ روزانہ دونوں ساتھ ہی تو گھر سے نکلتی تھیں۔ عروج شہلا کی چچا زاد تھی اور اس کے چھوٹے دیور افسر کی بیوی بھی۔ شہلا گھبرا کر بھاگی۔ کہیں عروج دوسری بار بیل نہ بجا دے کہ انصر کو غصہ آجائے گا۔

عروج بڑے رکھ رکھاؤ سے رہتی تھی اور صبح دفتر بھی بڑے قرینے سے جاتی تھی۔ فیشن کے مطابق خوب صورت اور دلکش ملبوسات ' میک اپ اور میچنگ جوتوں میں وہ اچھی بھی بہت لگتی تھی مگر صبح اس کا موڈ اکثر بگڑا ہی ہوتا تھا۔

"میری قسمت تو خراب تھی ہی مگر تم مائنڈ نہ کرنا شہلا باجی! اس میں سارا ہاتھ تمہارا ہی ہے۔" جس دن مزاج زیادہ برہم ہوتا' وہ یہ بات دہرانا نہیں بھولتی۔

شہلا کیا کہتی۔ یہ سچ ہی تھا۔ اسی نے اپنی ساس کی توجہ اپنی کزن کی طرف دلائی تھی۔ اسے کیا معلوم تھا کہ ......

جلدی میں برش ہاتھ میں ہی تھا' جب وہ دروازے پر پہنچی۔

"آج بھی کچھ کھایا پیا نہیں ہے نا؟" عروج نے اس کے چہرے کو فوراً" پڑھ لیا۔

"اپنے تلقین شاہ کو کہا کرو کہ اتنی بھی آرام طلبی اچھی نہیں۔ نصیحتیں تو سب کو یوں کرتے ہیں کہ جیسے ساری دنیا میں یہ واحد ہیں جو دودھ سے دھلے ہوئے ہیں۔"

شہلا چپ رہی مگر عروج مسلسل بولتی رہی۔

"شوگر والوں کو اپنا بہت خیال رکھنا چاہیے۔ یوں فاقے کرنا اور خاص طور پر ناشتا چھوڑنا توبہ! کسی دن دیکھ لینا گری پڑی ہوگی کہیں۔"

"اللہ نہ کرے۔" اس نے دہل کر کہا۔

وہ دونوں شاکرہ کے دروازے پر سے گزر رہی تھیں اسی وقت صفدر گاڑی نکال رہا تھا۔

اس نے مسکرا کر ان دونوں کو دیکھا۔ تب ہی شاکرہ ہاتھ میں نفاست سے پیک کیا ہوا اس کا لنچ لیے نظر آئی وہ دونوں جلدی میں تھیں۔ اس لیے بس سلام تک ہی ملاقات محدود رہی۔ شاکرہ نے بھی اچھی سی مسکراہٹ چہرے پر سجا کر جٹھانی اور دیورانی دونوں کو وش کیا۔ دو چار قدم بعد عروج نے ذرا سا پیچھے ہو کر ایک ترچھی سی نظر گیٹ بند کرتی شاکرہ پر ڈالی اور پھر شہلا کو دیکھا اور نظروں نظروں میں کیا ہوا تقابل شہلا پر اس کی برتری واضح کر گیا۔ شاکرہ صبح صبح لان کے ایک اچھے سے سوٹ میں ہلکے ہلکے میک اپ کے ساتھ کافی اچھی لگ رہی تھی۔

وہ دونوں آگے بڑھ گئیں۔ "شہلا باجی! تم نے دیورانی سے کچھ نہیں سیکھا؟" اس کی نظریں کہہ سمجھا رہی تھیں۔ شکر ہے لب خاموش تھے اور شہلا اسے ہی غنیمت جان رہی تھی۔

شہلا' شاکرہ اور عروج کی ساس ساجدہ بیگم بہت منتظم کار خاتون تھیں۔ میاں ان کے پرستار بھی تھے اور معاون بھی' جو بیگم کہہ دیتی تھیں وہ اس میں مین میخ نکالنے کے بالکل عادی نہیں تھے۔ ساجدہ بیگم کیونکہ تمام عمر ایک چھوٹے سے فلیٹ میں رہی تھیں' سوان کی خواہش تھی کہ ان کے بیٹے کھلے مکانوں میں رہیں۔ ان کی ساس نے ان پر بہت مظالم ڈھائے تھے مگر وہ ہمیشہ کہتی تھیں کہ وہ اپنی بہوؤں کو بیٹی بنا کر لائیں گی اور بیٹی ہی سمجھیں گی ہمیشہ۔

انہوں نے اپنی دونوں خواہشیں بحسن و خوبی پوری کیں۔ جب ان کے بیٹے بڑے ہوئے اور جاب شروع کی تو انہوں نے علیحدہ علیحدہ تینوں کا حساب رکھا اور ایک متوسط طبقے کی آبادی کے قریب جب پلاننگ شروع ہوئی تو دو دو سو گز کے تین جڑے ہوئے پلاٹ خرید لیے تینوں کے نام۔ اس میں ان کی عمر بھر کی جمع پونجی لگ گئی مگر وہ خوش تھیں' پھر رفتہ رفتہ تقریباً" ایک ہی نقشے سے تینوں مکان بنوائے۔ البتہ فنشنگ مکانوں کی ایسی ہوئی کہ جیسے بیٹوں نے پیسے دیے۔ جو جیسا کماتا تھا گھر ویسا ہی نظر آتا تھا۔ تینوں گھروں کی ملحقہ اندرونی دیواریں نیچی رکھی گئیں اور یوں گرم پراٹھوں کی خوشبو اور تیز آواز دونوں آنا آسان ہو گیا۔

شاکرہ ان کی بھانجی تھی مگر شہلا اور عروج سے ان کی کوئی خاص رشتہ داری نہیں تھی مگر وہ جو انہوں نے کہا تھا کہ میں اپنی بہوؤں کو بیٹیاں سمجھوں گی تو وہ انہوں نے تینوں کے ساتھ یکساں نبھایا۔ بہویں تینوں انہوں نے خود ہی پسند کیں اور بیٹوں نے ہنسی خوشی رضامندی دے دی۔

دونوں ساس سسر ہمیشہ اپنے گھر میں رہے اور بیٹوں کی شادی کے ایک ہفتے بعد انہوں نے گھر کی چابی ان کے حوالے کی اور انہیں علیحدہ کر دیا۔ بیٹوں کی شادیوں کے بعد انہوں نے ایک دن سب کو اپنے گھر بلایا اور اطمینان سے سمجھایا کہ ہماری تم لوگوں سے بس ایک فرمائش ہے کہ آپس میں لڑائی جھگڑے سے گریز کرنا اور مل کر رہنا ویسے سب کے گھر علیحدہ' کچن الگ' اپنی اپنی دنیا الگ ہے۔ کسی کا کسی پر کوئی دعویٰ نہیں۔ جھگڑے عموماً" وراثت اور جائداد پر ہوتے ہیں۔ یہاں تم اپنے اپنے گھروں کے مالک ہو اور ہمارے پاس کچھ ایسا نہیں جو تقسیم ہو۔"

تینوں بیٹوں کو اپنے والدین کا کہا ازبر تھا اور وہ کبھی کبھی گھر میں دہراتے بھی تھے۔ بیویاں تینوں کی آپس میں کسی اختلاف کے بغیر آرام سے رہ رہی تھیں۔ وہ بھی اپنے ساس اور سسر کے احترام میں ہمیشہ ذرا ذرا سی بات کو لے کر فساد کھڑے کرنے سے گریز کرتی تھیں کچھ تو یہ تھا کہ مزاجاً" وہ تینوں اچھی تھیں۔ کچھ یہ بھی بات تھی کہ اپنی دنیا میں اپنا راج تھا۔ شکوے شکایت کی گنجائش بھی نہیں نکلتی تھی۔

شہلا جٹھانی تھی مگر عملاً" شاکرہ ہی لیڈر آف دی ہاؤس کا کردار ادا کرتی تھی۔ اس کا انداز آئی اور چھا گئی والا ہوتا۔ میاں بیوی کی بھی آپس میں اچھی بنتی تھی شاکرہ اور شہلا کا کچن جڑا ہوا تھا۔ شاکرہ کیوں کہ کوئی جاب وغیرہ نہیں کرتی تھی اور گرہستی کے ساتھ ساتھ کچن کو بہت وقت دینے کی عادی تھی جبکہ شہلا جاب کرتی تھی۔ سو جب گھر میں ہوتی تو ہی کچن آباد ہوتا البتہ عروج بھی جاب کرتی تھی اور شہلا ہی کی طرح شام ڈھلے آتی تھی گھر میں' مگر عروج کا کچن بھی آباد رہتا تھا کہ افسر کھانا بنانے میں ذرا بھی عار محسوس نہیں کرتا تھا اور کھانا بنانا ہی کیا' وہ کپڑے استری کرنے اور بچوں کے کام کرنے میں بھی لگا رہتا تھا اور تو اور صبح اٹھ کر فوراً چائے بنا لیتا اور عروج کو اس کی پسند سے ناشتا بھی کروا دیتا تھا۔

شہلا بہت محنتی تھی اور اس نے کبھی اپنی تھکن کا اظہار نہیں کیا۔ وہ ایک کے بعد ایک کام کرتی جاتی۔ جب بچے چھوٹے تھے تو وہ ان کو سلا کر پھر کچن کا کام کرتی۔ کپڑے دھوتی انہیں رکھتی اٹھاتی' استری کرتی پھر جب بچوں کی پڑھائیاں شروع ہوئیں تو اس کا کام اور بھی بڑھا۔ وہ اپنے بچوں کو خود ہی پڑھاتی تھی۔ ان

کے اسکول اور کالج کے مسائل بھی خود ہی نمٹاتی رہی کہ انصر کو نہ اس کے شانہ بشانہ کام کرنے کا شوق تھا نہ فرصت۔ وہ دفتر سے چار بجے آجاتا تھا۔ تھوڑا آرام کرتا، پھر تازہ دم ہونے کے لیے اپنے دوستوں کی طرف نکل جاتا تھا اور اکثر واپسی میں دیر ہی ہو جاتی تھی۔ شہلا کھانا لیے بیٹھی رہتی۔ وہ اس پر کچھ خوش نہ ہوتا بلکہ خفا ہی ہوتا۔

"کھانا کھالیا کرو بھئی۔ مجھے یہ چونچلے بالکل اچھے نہیں لگتے۔"

اس نے واضح طور پر شہلا کو بتا دیا کہ وہ مرد بچہ ہے اور بیوی کے پلو سے لگے رہنے کو سخت ناپسند کرتا ہے بلکہ زن مریدوں سے نفرت کرتا ہے۔

شہلا جوان تھی اس وقت۔ اس کے اندر بھی ان ساری باتوں کے جواب مچلتے تھے مگر جب اس نے کہنا چاہا کہ آپ کے والد تو... مگر اتنی نامناسب اور تہذیب سے گری بات منہ سے نکالنے کی اس کے ضمیر نے اسے اجازت ہی نہیں دی۔

بچے اسکول جانے لگے تو وہ چھ بجے ان کا ناشتا تیار کرتی۔ اصرار کر کر کے کھلاتی، پھر وین میں بٹھا کر آتی تو اپنی تیاری کے ساتھ ساتھ انصر کا ناشتا اس کے دفتر جانے کے لیے لنچ بھی تیار ہوتا رہتا۔

صفدر بینک میں تھا اور زینہ بہ زینہ ترقی کی سیڑھی پر چڑھ رہا تھا۔ شاکرہ کی شروع سے عادت تھی کہ گھر کے ساتھ ساتھ وہ خود پر بھی بھرپور توجہ دیتی۔ وہ باقاعدہ پارلرز کے چکر لگاتی تھی۔ موسم اور فیشن کے مطابق لباس زیب تن کرتی۔ ساتھ ہی ساتھ کچن کے کاموں میں بھی وہ اچھی تھی۔ گھر بھی ماسی کے ساتھ لگ لگ کر چمکاتی رہتی۔

شہلا اسے اکثر سراہتی تھی مگر عروج غصہ کرتی تھی۔ "خوامخواہ ان کو چڑھایا مت کرو۔ وہ کرتی کیا ہیں، دن میں بیوٹی سلیپ ضروری ہے۔ پارلرز کے چکر اور بازاروں کے چکر تو سمجھیں نہ کریں تو دن نہ گزرے۔ سارا دن ٹی وی چینلز "کیا پکایا جائے اور کیسے پیش کیا جائے۔" سکھاتے رہتے ہیں۔ اب ایسے میں کوئی کوڑھ مغز ہی ہو گا جو نہ سیکھ سکے۔"

تینوں بھائیوں کے گھر دو دو بچے تھے۔ شہلا کی ایک بیٹی کنزی اور بیٹا رمیز۔ شاکرہ کے دو بیٹے صائم اور دائم جبکہ عروج کی دو بیٹیاں تھیں سامعہ اور ندا۔ شہلا نے تو اپنی بیٹی کی شادی بھی کر دی تھی اور قسمت اسے دور بھی بہت لے گئی تھی۔ وہ کینیڈا میں رہتی تھی۔ گھر میں بس اب رمیز تھا۔ شہلا کو لگتا رمیز بالکل انصر پر پڑا ہے۔ صورت شکل ہو کہ عادات و اطوار یا مزاج و اخلاق کوئی بھی چیز اسے الگ نہیں لگتی۔

انصر کی جاب ختم ہوئے ہوئے دس سال گزر چکے تھے جبکہ ابھی وہ پچپن سال کا ہی تھا جب اس کی کمپنی نے ڈاؤن سائزنگ کا اعلان کر دیا۔ اسے قبل از ریٹائرمنٹ کے کوئی ایسے خاص فائدے بھی نہیں ہوئے جب ہی اس کے ساتھی کہتے تھے کہ "یہ گولڈن شیک ہینڈ نہیں تھا یار! آئرن کک تھی۔" عجیب بات یہ ہوئی کہ جب اس کی سروس ختم ہوئی تو گھر پر اطلاع دی گئی شہلا نے ہی اسے وصول کیا مگر وہ دن ایسا تھا کہ اس کی ہمت ہی نہیں ہوئی انصر کو کچھ بھی بتانے کی انصر کی والدہ کا پندرہ دن قبل انتقال ہوا تھا اور پندرہ دن بعد اس کے والد بھی یہ دنیا چھوڑ گئے۔ وہ سب لوگ ان کی تدفین کے بعد گھر آئے تھے۔ انصر بڑا بیٹا تھا۔ والدین کی یوں اچانک موت کا صدمہ گہرا تھا۔ وہ چپ چاپ آنکھیں بند کیے لیٹا تھا۔ شہلا نے یہ تکلیف دہ خبر اس سے چھپا لی، پھر سوئم کے بعد بہت رسان سے سمجھا بجھا کر کمپنی کا خط اسے دیا۔

وہ دیر تک سمجھاتی رہی۔ "پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ میری جاب تو ہے۔ آپ کو ٹینشن لینے کی کوئی ضرورت نہیں وغیرہ وغیرہ۔"

شہلا گھر کی کفالت کر رہی تھی۔ سوجھ بوجھ والی عورت تھی انصر کو ہمیشہ صائب مشورے دیے تھے اس نے۔ اس کے باوجود انصر نے اپنے دوست کے کاروبار میں پیسے لگا دیے اور بیوی سے ذکر کرنا بھی مناسب نہیں سمجھا۔ وہ تو جب وہ دوست ملنے سے کترانے لگا تب شہلا کو بتایا کہ ہوا کیا ہے۔ وہ کیا کہہ سکتی تھی بس منہ دیکھ کر رہ گئی۔

اس کے بعد وہ لوگ سنتے رہے کہ اس کی طرح نکالے جانے والے لوگوں نے جس میں انصر کے قریبی دوست بھی تھے۔ کہاں کہاں جاب کی یا کیا کاروبار کیا مگر انصر خاموش لیٹا ٹی وی کے چینل گھماتا رہا۔ اگر کسی نے پوچھ لیا تو یک دم ناراض ہو گیا۔

"میں کوئی ہاتھ پر ہاتھ دھرے نہیں بیٹھا ہوں۔ ہاتھ پاؤں مار رہا ہوں۔ جب کوئی ڈھنگ کی نوکری ملی تو کرلوں گا۔ کسی کا دیا نہیں کھاتا۔ کسی پر بوجھ نہیں ہوں میں۔ اپنا کماتا اپنا کھاتا ہوں۔ کسی کو بولنے کا کوئی حق نہیں۔"

پوچھنے والا بغلیں جھانکنے لگتا اور شاید دل ہی دل میں توبہ بھی کہ پوچھا کیوں۔ کبھی دماغ اور الٹ جاتا تو شہلا پر برس پڑتا۔

"ہر ایک کے سامنے رونے بیٹھ جاتی ہو۔ فاقے کر رہی ہو کیا؟"

"میں نے کیا کہا؟" وہ حیران رہ جاتی۔

"پھر وہ کیوں پوچھ رہا تھا۔" سسرالی رشتہ فوراً" آگے پیچھے لگ جاتا۔ چھوٹی موٹی گالی تو یوں بھی وردزبانی رہتی تھی۔

وہ کیا جواب دیتی۔ خاموشی میں ہی عافیت تھی سو ہونٹوں پر قفل ڈالے بیٹھی رہتی۔ وقت گزر رہا تھا۔ گزر چکا تھا زندگی کے کون سے کام تھے جو رکے تھے۔

پہلے جب دونوں جاب کرتے تھے تو انصر ایک مخصوص رقم شہلا کے ہاتھ پر رکھ دیتا تھا۔ شہلا جانے گھر جانے۔ ان دنوں شہلا کو گھر میں کچھ کام کروانا پڑا۔ اس کا ہاتھ تنگ ہوا تو انصر سے کہنا پڑا۔

وہ شانے اچکا کر رہ گیا۔ "میں کیا کر سکتا ہوں۔ اپنا خرچ نکال کر سب تمہیں دے دیتا ہوں، اب اور کہاں سے لاؤں۔ ڈکیتی ماروں؟" وہ بات کو کھینچتا چلا جاتا۔

پھر جب وقت نے کروٹ لی اور گھر بار کا پورا بوجھ شہلا کے ناتواں کندھوں پر آگیا تو وہ چپ چاپ گھر کے خرچ کے پیسے انصر کے ہاتھ میں دینے لگی۔ وہ حکمرانی کرتا رہتا ہے کہ اسی پر حکمرانی زیبا ہے۔ کہیں اس کو کوئی احساس نہ ہو۔

یہ شہلا کی سوچ تھی مگر انصر کی وہ تقریباً" روز ہی کچھ نہ کچھ ایسا ضرور کہہ دیتا اس کے دل پر لگتی۔

"گھر میں رہو تو جانو! صبح سے شام تک قیدی بننا پڑے تب سمجھ میں آئے۔"

کبھی کبھی شہلا تقابل شروع کر دیتی۔ تینوں بھائی بالکل الگ الگ تھے۔ صفدر شاید اپنے والد پر پڑا تھا۔ ویسے ہی بیوی کا ہمدم، دم ساز۔ گو دفتر سے بڑی دیر میں آتا مگر پھر بھی شاکرہ کے ساتھ ساتھ رہتا۔

افسر کا تو قصہ ہی عجیب تھا۔ جب شہلا کی شادی ہوئی تو ان دنوں افسر دوبئی میں ایک اچھی جاب پر تھا اور تینوں بھائیوں میں سب سے زیادہ کمائی اسی کی نظر آتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ جب اس کی ساس نے شہلا سے کسی اچھی لڑکی کے بارے میں پوچھا تو شہلا نے فوراً" اپنی کزن عروج کا نام لے دیا۔ نمکین نمکین نین نقش والی عروج، افسر کے دل کو بھی بھا گئی اور اس کی ساس کو بھی بہت اچھی لگی۔ بہت اچھی طرح شادی ہوئی۔ عروج شادی سے پہلے ہی سے جاب کر رہی تھی۔ شادی کے وقت تذبذب میں تھی کہ کیا کروں چھوڑ دوں؟ کیونکہ اسے تو میاں کے ساتھ دوبئی جانا تھا۔ اس نے شہلا سے مشورہ کیا اور شہلا نے کہا کہ مت چھوڑو پتا نہیں کتنے دن پروسس میں لگیں تو جاب چلتی رہے گی۔ تب اس نے چھٹی لے لی اور وہ آج تک اپنی عقل مندی کو سراہتی تھی کہ افسر جو شادی کرنے آیا تو پھر واپس گیا ہی نہیں۔

یہاں بھی نوکری ڈھونڈنے میں کوئی خاص دوڑ بھاگ نہیں دکھائی گئی۔ البتہ وہ مزے سے کچن کے کام نمٹا دیتا۔ بچوں کی آمد پر ان کے کاموں میں دلچسپی لینے لگا۔ عروج ان سب کاموں سے دور بھاگتی۔ دفتر جاتی اور

پھر آرام سے لیٹی رہتی' افسر اس کا بہت خیال رکھتا۔ حتی کہ گرم پانی اور نمک لا کر دیتا کہ بس پاؤں ڈال کر بیٹھی رہو۔ عروج ہی غصہ کرتی رہتی تھی۔ اس کی ہزاروں شکایتیں تھیں افسر سے مگر افسر کو کوئی شکایت نہیں تھی اس سے۔ وہ تو اس کے غصے پر بھی جوابی کارروائی سے گریز کرتا تھا۔

انصر کو یہ سب بہت برا لگتا۔ وہ بار بار کہتا ہمارے تو پورے خاندان میں ایسا زن مرید پیدا ہی نہیں ہوا۔ یہ جانے کس پر پڑ گیا ہے۔

وہ کوئی لحاظ رکھنے والا تو تھا نہیں۔ جب جہاں جو دل چاہتا' دھڑ سے بول دیتا اور عروج سن لیتی تو بہت کڑھتی۔

"یقین کرو شہلا باجی! تمہارا لحاظ کرتی ہوں ورنہ تمہارے تلقین شاہ کو تو یوں ٹھیک کروں۔" وہ چٹکی بجا کر اعلان کرتی۔

اور تو اور جب انصر چھوٹے بھائی کو بیوی کی کمائی کھانے کا طعنہ دیتا تو افسر تو چپ رہتا البتہ عروج کی برداشت جواب دے جاتی۔

"حد ہوتی ہے۔ انسان کو اپنے گریبان میں بھی جھانک لینا چاہیے۔" کبھی کبھی وہ اپنے غصے کا اظہار چیزوں کو پھینک پھینک کر کرتی مگر انصر پر اس کے غصے کا کیا اثر ہوتا تھا۔ وہ اپنی دنیا میں گم۔ نصیحت پر نصیحت اور پھر اس کا سرا کسی اور نصیحت سے جوڑتا چلا جاتا۔

شہلا ایسے میں گھبرا جاتی۔ جانے کیا ہوگا مگر کچھ بھی نہ ہوتا۔ انصر بھی سمجھتا تھا کہ ہر کوئی شہلا کی طرح نہیں اور عروج تو غصے کے اظہار کے لیے زبان کی محتاج نہیں تھی وہ اتنی اٹھا پٹخ شروع کر دیتی کہ انصر کو بات "مختصرا" کر کے واپس آنا پڑتا یہ الگ بات کہ وہ اپنے گھر آ کر تلخ جملے ضرور شہلا کے کان میں انڈیلتا جاتا۔

"بڑی بد قسمت ہے تمہاری بہن۔ پیسہ تو ہوتا ہی عورت کی قسمت سے ہے اور یہ بد نصیب ایسی سبز قدم تھی کہ قدم رکھتے ہی میاں پر روزی کے دروازے بند کر دیے۔ اس پر مزاج دیکھو۔ پتا نہیں سمجھتی کیا ہے خود کو۔"

شہلا کے پاس اس کی کسی بھی بات کا جواب نہیں ہوتا تھا' سو وہ چپ رہتی۔

"کیا گونگے کا گڑ کھا کر بیٹھی ہو۔ بولتی کیوں نہیں کیا میں غلط کہہ رہا ہوں۔ بولو جواب دو۔"

جانے کیسے اس کی گردن ہل جاتی۔

"کیا نہیں۔ مطلب کیا ہے تمہارا۔ یہ بات نہیں ہے۔ اب اگر تم جاہل ہو تو میں کیا کروں۔ پیسہ عورت کے نصیب کا ہوتا ہے۔ اب عورتیں ہی ایسی ہوں گھروں میں' جو اپنے نصیب کی تاریکی سے روشن گھروں کو اندھیرے کے سپرد کر دیں تو کوئی کیا کرے۔"

وہ بڑبڑاتا رہتا اور شہلا کے دماغ میں ایک اور سوچ جگہ بنانے لگتی۔

"ٹھیک ہی تو کہا ہے انصر نے۔ میں ہی تو ہوں نصیب کی کھوٹی۔ اچھا بھلا انصر کام کرتا تھا۔" مگر وہ سوچتی تو دیر تک سوچتی چلی جاتی اور کام جاری رہتے مگر غائب دماغی کا نتیجہ کبھی ہاتھ کٹنے اور کبھی جلنے کی صورت میں نکلتا اور کبھی دیر ہو جاتی اور انصر کڑوے کسیلے کریلے سے نیم بھی چڑھ جاتا۔

"یہ تمہارے تلقین شاہ بھی کیا ہیں شہلا باجی! ایمان کی کہوں تو ان کو اتنا بگاڑنے میں تمہارا ہاتھ بھی ہے۔ حد ہوتی ہے عورت کی کمائی کھاتے ہو' اس لیے بے غیرت ہو گئے ہو۔ یہ کس منہ سے طعنہ دیا ہے انہوں نے افسر کو اور اگر وہ بے غیرت ہے تو یہ کیا ہیں۔"

دوسرے دن وہ سارا راستہ عروج کی جلی کٹی سنتی گئی۔

☼ ☼ ☼
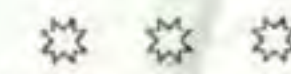
چھٹی کا دن تھا۔ وہ حسب معمول کچن میں کام کر رہی تھی ناشتا دیر سے ہوا تھا اور اب دونوں باپ بیٹے سامنے لاؤنج میں بیٹھے تھے۔ ٹی وی بھی چل رہا تھا اور انصر اخبار بھی پڑھ رہا تھا۔ "ایک آج کے دن کے سوا پورا ہفتہ ہمارے گھر میں کتابیں لوٹا کرتے ہیں۔" انصر نے کہا تو ہنس کر تھا مگر شہلا کو پھر بھی چوٹ لگی۔

"میں تو یوں سمجھو چوکیداری کے لیے ہوں۔ تم ماں بیٹے جان ہی نہیں سکتے کہ اکیلے گھر میں چوکیداری کرتے ہوئے انسان خود کو بس گدھا محسوس کرتا ہے اور کچھ نہیں۔"

"بابا! گدھے کہیں چوکیداری نہیں کرتے۔" رمیز ہنسا۔

"تم خود سوچو انسان کتنا ٹی وی دیکھ سکتا ہے' کتنا اخبار پڑھ سکتا ہے۔"

"تو بابا! میں کیا کروں۔ آخری سمسٹر کو چھوڑ کر گھر بیٹھ جاؤں۔ بس یہ آخری سمسٹر ہے اور اس کے بعد...."

"اس کے بعد ایسا کرتے ہیں تمہاری شادی کر دیتے ہیں۔" خلاف معمول انصر چہک رہا تھا۔

"ابھی نہیں بابا! ابھی تو مجھے آگے پڑھنا ہے۔" رمیز کا لہجہ نیم راضی والا ہی تھا۔

"ارے یار! پڑھتے رہنا۔ پڑھائی تو اب عمر بھر چلتی ہے۔ تم کچھ نہیں بول رہیں حالانکہ ماؤں کو ہی ارمان ہوتا ہے بہو لانے کا۔"

"نہیں میں بس ادھر مصروف تھی۔ اچھی تجویز ہے۔ بس ذرا رمیز کوئی جواب واب شروع کر دے تو...."

"جاب بھی ہو جائے گی بس اب مجھ سے تنہا نہیں رہا جاتا۔ تم لڑکیاں دیکھو بھئی بس خیال رکھنا کھانا اچھا پکانا جانتی ہے کب تک پڑوس سے آتی ہوئی خوشبوؤں پر گزارہ کریں بے ناپارٹنر!" وہ بیٹے سے مخاطب تھا۔

"آج کل لڑکیوں کے پاس کہاں وقت ہے وہ خود اپنی جاب...."

"جاب کرنے والی لڑکی نہیں چاہیے۔" یہ رمیز تھا' جو زور سے چلایا تھا۔

"ہاں بالکل کوئی جاب واب کی ضرورت نہیں۔ خوامخواہ میں چوکیداری ہی کرواتی ہیں زندگی بھر۔ پہلے ماں بیٹے کی اور اب بہو کی بھی۔ نا بابا نا اب کسی جاب کرنے والی عورت کی ہمارے گھر میں گنجائش نہیں۔"

"امی! آپ تو بس شاکرہ چچی کی طرح کی بہو لائیے گا

صبح کا ناشتا مزے دار گرما گرم پراٹھے آملیٹ' پھر دوپہر میں جو تڑکا لگاتی ہیں دال پر تو یہاں بیٹھے مزا آنے لگتا ہے۔ کبھی کبھی تو میرا جی چاہتا ہے "فورا" چچا کے گھر چلا جاؤں مگر بس جا نہیں پاتا حالانکہ جاؤں تو وہ نکال تھوڑی دیں گی ہیں ناں!"

"ہاں ہاں' وہ بڑے اخلاق والی عورت ہے۔ بارہا مجھ سے کہہ چکی ہے کہ بھائی جان یہاں آجایا کیجئے مگر روز روز کون جائے۔ خود ہی حجاب آجاتا ہے۔"

وہ دونوں جانے کیا کیا بول رہے تھے مگر وہ سن کہاں رہی تھی۔ اس کی ساری زندگی کی محنت کا صلہ یہ تھا کہ توبہ کی جا رہی تھی کہ آئندہ گھر میں کوئی جاب کرنے والی عورت نہیں آنی چاہیے۔

انصر کی طرف کھلنے والی توقعات کی کھڑکی تو کب سے بند کر کے اس پر صبر کا قفل ڈال چکی تھی مگر یہ رمیز بھی نوکری کر کر اپنے آپ کو مٹا دینے والی عورت کو اتنا حقیر اتنا بے مایہ' ایسا بے مول سمجھتا ہے۔ اسے لگ رہا تھا کہ وہ اندر سے زخم زخم ہو رہی ہے۔

اس نے بارہا اپنے دفتر کے ساتھیوں سے ان کی ماؤں کی تعریفیں سنیں تھیں۔ وہ اپنی ماؤں کی تعریفوں میں زمین آسمان کے قلابے ملا رہے ہوتے تھے۔ کھانا اچھا پکاتی ہیں۔ ہماری اماں سے زیادہ سلیقہ مند اور خوش مزاج کوئی نہیں ہماری امی عظیم ہیں۔ انہوں نے محنت کی اور بیوگی میں ہمیں پالا وغیرہ وغیرہ مگر رمیز کو اس کی ذات کو لے کر کوئی فخر کوئی خوشی حاصل نہیں۔ یہ کیسا احساس تاسف تھا جس کی گرفت میں اس کی پوری ذات آ گئی۔

سارا دن اسے یہی خیال پریشان کرتا رہا۔ رات میں بیٹی سے فون پر بات ہوئی۔ اس کی بیٹی "فورا" پہچان گئی کہ وہ ڈپریسڈ ہے۔ شاید عورت کا دکھ صرف عورت جان سکتی ہے یا پھر اس کی بیٹی اسے چاہتی تھی۔ بہر حال وہ "فورا" بولی۔

"کیا بات ہے امی! آپ روئی ہیں آج؟ کیا ہوا ہے؟"

"کچھ نہیں وہ بس ایسے ہی۔"

"ایسے ہی کیا؟ بابا نے کچھ کہا ہو گا۔ آپ اب ان کی باتوں پر دکھی ہونا چھوڑ دیں۔"

"نہیں۔ انہوں نے کچھ نہیں کہا۔"

"پھر کیا دفتر میں کوئی بات ہو گئی؟"

"نہیں' وہاں بھی سب ٹھیک ہے۔"

"کوئی بات تو ہے امی! جو آپ کو پریشان کر رہی ہے۔" وہ جیسے اس کا چہرہ پڑھ رہی تھی۔ "جو بات بھی ہے اسے کھرچ کر پھینک دیں اپنے دل و دماغ سے۔ دیکھیے گا آپ کی طبیعت اچھی ہو جائے گی۔"

"اچھا دادی اماں!" وہ بھی مسکرانے لگی۔

"اچھا۔ مجھے وہ بات تو بتائیں۔" اس نے اصرار کیا۔

اور اس کے اصرار پر شہلا نے رمیز کی کہی ہوئی بات دہرا دی۔

"ارے میری امی! میری پیاری امی! اس نے کچھ غلط نہیں کہا۔ بچپن سے ہم لوگ آپ کو اتنی محنت کرتے دیکھتے آئے ہیں۔ ایسے میں اس کا مطلب یہ ہو گا کہ جو لڑکی جاب کے ساتھ گھر سنبھالتی ہے' تھک جاتی ہے' نڈھال ہو جاتی ہے' بیمار ہو جاتی ہے وغیرہ وغیرہ۔ آپ کسی اور وقت پوچھ کر دیکھ لیجیے گا وہ یہی بتائے گا آپ کو۔"

پورا ہفتہ شہلا کے دل میں کھد بد ہوتی رہی۔ آخر اتوار آ ہی گیا۔ جب وہ کچن میں مصروف تھی اور رمیز سامنے ہی اخبار سامنے پھیلائے ٹی وی دیکھ رہا تھا۔ انصر صبح ہی سے کہیں کسی دوست کے پاس گیا ہوا تھا۔

اس نے رمیز سے پوچھا۔ "تم نے تو پچھلے اتوار کو ورکنگ لیڈی کی یوں مخالفت کی کہ میرا دل ہی ٹوٹ گیا۔"

"کیوں ایسا کیا کہا تھا میں نے؟" اس کا دھیان ٹی وی میں ہی تھا۔

"وہ تو اچھا ہوا کہ رات میری کنزیٰ سے بات ہو گئی تو اس نے سمجھایا کہ رمیز کا یہ مطلب تھوڑی تھا تو تسلی ہوئی میری کچھ۔"

"اچھا کنزیٰ نے کیا کہا۔"

"وہ سمجھانے لگی کہ امی! آپ نے اتنی مشکلیں جھیلیں' اتنی محنت کی تو ہم لوگوں نے دیکھا نہیں کیا۔ یہ ہی رمیز کے دماغ میں ہی ہو گا۔"

"اور کیا؟" وہ تھوڑا سا متوجہ ہوا۔ "میں ایک عورت پر اتنا بار ڈالنے کے بالکل خلاف ہوں اور امی! اگر کسی بھی وجہ سے میری بیوی کو جاب کرنی ہی پڑی تو میں اس پر گھر کے سب کام نہیں ڈالوں گا۔ صفدر چچا کی طرح شانہ بہ شانہ کاموں میں حصہ لوں گا۔"

"ارے!" اسے لگا۔ ایک اور گھونسا اس کے دل پر پڑا تھا۔ بیوی جو ابھی آئی نہیں' اس کے تھک جانے کا احساس اور ماں جو اب عمر کی منازل طے کرتے ہوئے تھک چکی ہے۔ چھٹی کا پورا دن کچن میں گزار کر شام کو گھر کے دوسرے بکھراوں کو سمیٹتے سمیٹتے رات ہو جاتی ہے۔ اس کا ذرا بھی خیال نہیں۔

اس کا جی چاہ رہا تھا' وہ ہسٹریا کی مریضہ کی طرح خوب چیخیں مارے۔ زور زور سے روئے۔ وہ کتنی تنہا تھی کتنی اکیلی تھی وہ۔

دن بھر وہ جلتی رہی' کڑھتی رہی اور اتنی تیز گرمی میں کچن میں کام بھی کرتی رہی حالانکہ سر کے ساتھ ساتھ جسم بھی دہائیاں دیتا رہا۔ شام تک طبیعت اتنی خراب ہو گئی کہ وہ گرنے کے قریب ہو گئی' تب جلدی جلدی کام سمیٹا۔ حالانکہ ابھی فریج کی صفائی جیسا اہم کام باقی تھا مگر وہ بمشکل شاور لے سکی اور کپڑے بدل کر بستر پر پڑ گئی۔ اس کے منہ سے کراہیں نکل رہی تھیں۔

اسے تیز بخار نے آدبوچا اور وہ بس ہائے امی! اف امی! پکارتی رہی' آنسو اس کا چہرہ بھگوتے رہے۔ مشکل میں ماں کی یاد ہر ایک کو ستاتی ہے۔

رمیز اتوار کی شام کھیلنے ضرور جاتا تھا' وہ چلا گیا اور انصر تو صبح سے ہی گھر میں نہیں تھا۔

وہ تڑپ رہی تھی۔ اس کے دل پر جو کاری وار ہوا تھا۔ وہ اسے کسی پل چین نہیں لینے دے رہا تھا۔ کاش! رمیز نے یہ نہ کہا ہوتا۔ میری چاہتوں' میری خدمتوں کا کچھ تو احساس اسے ہوتا۔ کاش! یہ سب کوئی برا خواب ہوتا۔ کاش! میں مر گئی ہوتی اور یہ سب کچھ نہ سنا ہوتا' نہ محسوس کیا ہوتا۔

انصر دیر سے گھر آیا مگر کمرے میں دروازہ کھلنے' باہر آنے' لائٹ جلنے سے اس کی آنکھ کھل گئی۔ مگر وہ دانستہ آنکھیں بند کیے پڑی رہی۔

"ارے اتنی جلدی سونا شروع ہو گیا۔ حد ہو گئی۔ یار رمیز! یہ تمہاری ماں ابھی سے سو کیوں رہی ہے۔" اس نے وہیں سے آواز دی۔

"پتا نہیں بابا! میں تو ابھی کھیل کر واپس آیا ہوں۔ تھک گئی ہوں گی شاید۔"

"کیوں تھک کیوں گئی ہوں گی۔" کیا غضب کا تجاہل عارفانہ کا مظاہرہ تھا مگر آج تو دل ایسا کرچی کرچی ہوا تھا کہ یہ معمول کی باتیں نہ چڑا رہی تھیں نہ جلا رہی تھیں۔

"چلو یار رمیز! چلیں آج چھٹی کے دن بھی اپنی ڈیوٹی پر چلیں۔ دست خود دہان خود۔"

"بابا! آپ کھا لیں کھانا۔ بہت تھک گیا ہوں میں۔" رمیز نے بھی زور سے جواب دیا۔

"ارے ان لوگوں کو تو اپنے ہی غم ہیں بہت۔ ان کے پاس وقت کہاں جو یہ دوسرے کی اذیت کو محسوس کریں۔ مسئلہ تو یہی ہے کہ اگر آئینہ درمیان میں رکھا ہو تو وہ عکس بھی منعکس ہونے لگتے ہیں' جو بظاہر پس منظر بھی نہیں لگتے۔"

دوسرے دن بھی بدن ٹوٹتا رہا۔ وہ صبح دفتر کے لیے بھی نہیں اٹھ پائی۔ ٹھیک ہی تو کہتی ہے کنزیٰ۔ "امی آپ کی طبیعت کبھی خراب نہ ہو۔ آپ بڑی باہمت ہیں۔ بس یہ جو آپ یہاں....." وہ اپنے سر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتی ہے۔ "کچھ پھنسا لیتی ہیں تو پھر آپ کی طبیعت سنبھلنے میں نہیں آتی۔ امی آپ ایسا ویسا کچھ سنا ہی نہ کریں۔"

وہ دن بھر ایسے ہی پڑی رہی حالانکہ اب بخار کم ہو چکا تھا مگر شام کو اسے اٹھنا ہی پڑا۔ بات ہی ایسی ہو گئی تھی۔ عروج کا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا۔

وہ انصر کے ساتھ جلدی جلدی اسپتال پہنچی تو عروج کی تکلیف اس سے دیکھی نہیں جا رہی تھی' عروج سڑک پار کر رہی تھی کہ ایک کار سے بچتے ہوئے موٹر سائیکل کی لپیٹ میں آ گئی اور اس کی ٹانگ کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ سر میں بھی چوٹ آئی تھی اور چہرے پر بھی۔ اس کو دیکھ کر شہلا کے ہاتھ پاؤں پھولنے لگے۔ عروج اور شہلا کا ہر وقت کا ساتھ رہا تھا۔

ٹانگ کا آپریشن ہونا تھا۔ شہلا مسلسل اس کا سر سہلا رہی تھی۔ عروج کراہ رہی تھی۔

"اب تو میں شاید لنگڑی ہو جاؤں گی۔ ہے نا شہلا باجی!"

"توبہ کرو! کیوں اتنی مایوسی کی باتیں کرتی ہو۔" شہلا اس کی باتوں سے پریشان ہو رہی تھی۔

عروج پورے ڈیڑھ مہینے اسپتال میں رہی۔ اتنی دیکھ بھال کے باوجود اس کی ٹانگوں میں پس پڑ گیا پھر اسے بخار نے پکڑ لیا۔

وہ تو غفلت میں دنوں پڑی رہی اور شہلا گھر' دفتر اور اسپتال کے درمیان گھن چکر بن گئی دفتر سے زیادہ چھٹی نہیں مل سکتی تھی مگر مجبوری یہ تھی کہ عروج کے ساتھ کون رہتا۔ سو وہ دفتر میں لڑ جھگڑ کر چھٹیاں کرتی رہی۔ گھر کو بھی دیکھنا ضروری تھا۔ وہ بھی دیکھتی رہی اور عروج کو بھی ایک بہن' ایک ماں کی طرح تسلیاں دیتی اس کی خدمت کرتی رہی۔ افسر نے بھرپور ساتھ دیا اور تو اور انصر بھی عروج کو دیکھنے آتا رہا۔

ہاں مگر شاکرہ اور صفدر صرف ایک بار اسپتال آئے اور تقریباً" پندرہ بیس منٹ بیٹھے۔ اس میں بھی شاکرہ مسلسل دہائیاں دیتی رہی۔

"بڑی گرمی ہے۔ گھر کے کام فرصت ہی نہیں دیتے۔ کتنے ہی دن سے ان سے کہہ رہی تھی' عروج کو دیکھنے جانا ہے مگر گھر چھوڑے بھی تو گرمی بہت ہے

عروج! زخم جلدی خراب ہو جاتے ہیں۔ تمہیں تو یوں نہیں رہنا چاہیے۔ پرائیویٹ وارڈ لے لیتیں وغیرہ وغیرہ۔"

شہلا تو جانتی تھی۔ جتنا جمع جتھا تھا۔ وہ سب خرچ ہو چکا تھا۔ شہلا نے بھی دل کھول کر اپنی ساری بچتیں اسپتال میں لگا دی تھیں۔ علاج آسان نہیں تھا۔ اسی لیے تو ہمیشہ لوگ کہتے ہیں کہ خدا کسی کو اسپتال نہ لے جائے۔

عروج کی بیماری نے طول کھینچا اور شہلا اس چکر میں دنیا بھول گئی۔ وہ اس دن اپنے دکھ سے کیسی نڈھال تھی۔ رو رو کر مرنے کی دعائیں مانگ رہی تھیں۔ دل میں ٹیسیں اٹھ رہی تھی اور کراہ رہی تھی مگر اب اسپتال میں گھنٹوں بیٹھی عروج سے پر امید باتیں کرتی رہتی۔

"خوش رہا کرو۔ شکر ادا کیا کرو۔ حادثے تو زندگی کا حصہ ہیں۔ تم بچ گئیں۔ سوچو فٹ پاتھ پر سر ٹکرایا تھا۔ خدانخواستہ سر میں چوٹ آجاتی۔"

"مگر میں اب کیسے چلوں گی؟"

"سب ٹھیک ہو جائے گا۔ سب ٹھیک ہو جاتا ہے۔"

عروج ٹھیک ہو کر گھر آئی تو کئی باتیں ہوئیں۔ ایک تو اس کی جاب ختم ہو گئی مگر افسر کو اس کے ایک پرانے دوست نے اپنے کاروبار میں شریک کر لیا۔

عروج بار بار یہی کہتی تھی۔ "مجھے تو شہلا باجی نے بچایا ہے۔ میں اتنی ڈپریس تھی اتنی مایوس.... مجھے نہیں لگتا تھا کہ میں دوبارہ نارمل ہو سکوں گی۔ وہ کہتی تھیں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ہو ہی جاتا ہے۔"

اور شہلا جس نے اسے سمجھایا تھا۔ سب ٹھیک ہو جائے گا اس کے مسائل چٹکی بجاتے ہی ٹھیک ہونے والے کہاں تھے فلموں ڈراموں والا اینڈ اور پھر ابھی زندگی چل رہی تھی۔ اینڈ تھا ہی کہاں۔ البتہ انصر نے عروج کے حادثے سے یہ سبق لیا کہ کبھی کبھی دو ایک باتیں شہلا سے کرنے لگا۔ کوئی گھر کا مسئلہ یا پھر عروج کی خیریت۔ اس سے وہ خوش تو کیا ہوتی البتہ گھر کی کھنچی ہوئی فضا کے نرم ہونے سے تھکن کا احساس کم ہونے لگا۔ رمیز کے احوال وہی تھے۔

ہاں مگر شہلا اب سمجھ چکی تھی کہ وقت کے پہیے کو اپنی مرضی سے گھمانا ممکن نہیں۔ سینے میں درد چھپا کر جینے کی صلاحیت اور ہمت پیدا کرنی ہے تو خود کو دوسروں کے دکھ درد میں الجھا دو۔ انسان کو درد دل کے واسطے ہی تو پیدا کیا گیا ہے۔ دوسروں کے درد کو اپنے اندر سمو کر انسان اندر سے طمانیت پاتا ہے۔ اس کے دل کی وہ تکلیف جس میں وہ حقیقتاً "ماہی بے آب کی طرح تڑپی تھی۔ اسے یاد ہی نہیں رہی تھی عروج کی جسمانی اور ذہنی اذیت میں وہ شکر کرنے والوں میں شامل ہوئی تو نعمتیں خود اس کے دروازے کھٹکھٹانے لگیں۔ اس کی ترقی ہو گئی اور اسے آفس کی طرف سے گاڑی بھی مل گئی۔ بسوں سے جان چھوٹی تو زندگی کافی آسانی ہو گئی۔ آسانی ملی تو اس نے اپنی محنت سے حاصل کیے ہوئے گر کو آزمایا۔ اب وہ وقت نکال کر معذوروں مجبوروں اور اسپیشل بچوں کے اداروں میں بھی چلی جاتی ہے۔ خود اپنے دکھوں کو کریدتے رہنے کی اذیت کے بجائے اب وہ دوسروں کے دکھ درد بانٹتی ہے تو اسے اپنی مشکلیں کم لگتی ہیں۔ وہ اب اپنے آپ کو تھپکی دینا بھی سیکھ گئی ہے۔ خود کو پہچان کر اپنی محنت کی کمائی کا کچھ حصہ خود پر بھی صرف کرنا بھی آگیا ہے۔ اسے اپنی ہمت کو جوان رکھنا ہے کہ چلتے رہنا ہے جب تک زندگی چلتی ہے۔

نایاب جیلانی

کوئی چاند رکھ مری شام پر

اسپتال کے کمرے میں ہمیشہ جیسی خاموشی کا راج تھا۔ گویا کسی جنگل کا پیال ہو، بیابان اور اجاڑ ویران سا۔ قریب المرگ جیسا سناٹا محورقص تھا جبکہ وجود کے اندر نوحوں اور دوگوں کا اژدحام تھا۔ اتنی بھیڑ بھاڑ اور ہجوم کہ حد نہیں۔

اس کے سامنے ایک حسین عمارت کھڑی تھی۔ جو

مکمل ناول

لمحہ بھر بعد زمین بوس ہونے کے قریب تھی۔ اس کی بے قراری، تڑپ، بے چینی، تپش، آگ اس کے چہرے سے ظاہر تھی۔ وہ کس قدر اذیت میں مبتلا تھا۔
کیا اسے درد، اذیت، پشیمانی اور ندامت کی دلدل میں دھنسے دیکھ کر اس کی روح کو تسکین پہنچ رہی تھی؟ وہ جیسے خود سے سوال کر رہی تھی، مگر وجود کے اندر پہلے کی طرح سناٹا اور "تسار" پھیلا ہوا تھا۔ عجیب سی دھند، کہر اور دھول کے علاوہ کچھ نہ تھا۔
اس کے سامنے ایک متکبر شخص بیٹھا تھا۔ اپنے حسن اور خوبروئی پہ مان کرنے والا۔ ایک مکار، عیار، خود غرض مرد۔
آج اس کے سامنے ٹوٹا، بکھرا ویران، بدحال، پشیمان ــ تھا۔ کبھی اس کے لیے "جانچک" بنا ہوا تھا اس کی زندگی کا ممتحن..... جانچ کرنے والا، امتحان لینے والا۔
پھر کئی ساعتیں چپکے سے کھسک گئیں۔ لمحے بیتتے رہے، سمے گزرتا رہا۔
اس بھیانک خاموشی نے اسے بے قرار سا کر دیا تھا۔ ویسے بھی چین اور سکون تو اس کے اندر بھی کہیں نہیں تھا۔
اس کے اٹھتے ہی وہ تڑپ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے سامنے موجود مرد کو دیکھا۔ اس کی آنکھیں شدت گریہ سے نڈھال تھیں۔ نیلگوں کانچ جیسے ٹوٹ رہے تھے۔ سرخ و سفید رنگت میں زردیاں گھلی تھیں۔ اس کی عزت اور غیرت کا جنازہ اٹھ رہا تھا۔ وہ کیسے نہ بدحال اور بے حال ہوتا۔ کیا وہ اسے اسی "حالت" میں دیکھنا چاہتی تھی؟
شاید نہیں، ہرگز نہیں..... وہ اسے بھسم اور بھوبھل ہوئے نہیں دیکھ سکتی تھی۔ یہ اس کی فطرت کا تقاضا ہی نہیں تھا۔
"وہ کیسی ہے.....؟" آنکھیں دباتا، الجھے بالوں میں ہاتھ پھیرتا وہ کتنی آس سے پوچھ رہا تھا۔
"مجھ راندہ ہوئے کو، مردود اور نکالے گئے کو کوئی خوشی کی خبر نہیں مل سکتی؟" اس کی بجھتی آنکھوں سے آس ٹوٹ ٹوٹ کر بکھر رہی تھی۔
"میرے جیسوں کو "راہ بر" نہیں ملا کرتے..... پھر بھی میں..... میں کیسا نصیب والا ہوں جو مجھے تم سر راہ مل گئیں۔ مجھے اب بھی اپنے نصیب پہ حیرت ہے۔ میں اقبال مند تو کبھی نہیں تھا۔" وہ جیسے خود کلامی کر رہا تھا۔ خود سے بول رہا تھا۔
وہ خود کو "گالی" دے رہا تھا۔ وہ خود سے نفرت کر رہا تھا۔ وہ اپنی ذات کو حقیر کر رہا تھا۔ رابیل اسے تاسف سے دیکھتی رہ گئی تھی۔
"ایف آئی آر کس کے خلاف درج کرواؤ گے؟"
رابیل کا سر جھک گیا تھا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا، وہ سامنے کھڑے مرد کی طرح دھاڑیں مار مار کر روتی رہے، آخر اس کا نقصان کم تو نہیں ہوا تھا۔
"مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آرہا۔ میرا دماغ بند ہو رہا ہے۔ میرا دل بند ہو رہا ہے۔ کوئی بھی "جرم" ماننے کو تیار نہیں۔ سب مکر گئے، سب ریاکار، مکار نکلے۔ سب "سچ" بن گئے۔ سب پاک صاف ستھرے ہو گئے۔ پھر کوئی بتائے، آخر نقب کس نے لگائی.....؟" وہ اپنے بال نوچ رہا تھا۔ وہ اپنی پوری زندگی میں ایسے "کرب" اور درد سے نہیں گزرا تھا۔ بتانے والی بنا بتائے اس سے دور چلی گئی تھی۔ اسے ہوش کہاں تھا۔
"تم جانتی ہو نا..... میرے ساتھ ایسا ہونا ہی تھا۔ اسے قدرت کا انصاف کہتے ہیں۔"

☆ ☆ ☆

بائیس جون کا گرم ترین دن تھا۔ باہر لو کے تھپیڑے اور تپش سے درخت تک کملا رہے تھے۔ پھولوں کی پتیاں جھلس چکی تھیں۔ شاخیں سوکھ رہی تھیں۔ زمین پیاس سے نڈھال تھی۔ امرود کی گھنی شاخوں کی اوٹ میں سجے گھونسلے ویران ہو رہے تھے۔
کوئل نجانے کہاں تھی؟ کوئل کہاں چلی گئی تھی؟ کوئل واپس کیوں نہیں لوٹی تھی؟

کوئل کے بچے روزانہ کوئل کی "کوک" کا انتظار کرتے، پیاس سے نڈھال اور بھوک سے مرتے ہوئے۔ مگر ان کا انتظار لاحاصل ہی رہا۔
کوئل نے نہ لوٹنا تھا نہ لوٹی۔ دن پر دن گزرتے چلے گئے۔ پھر ہر روز ایک بچہ بھوک، گرمی، تپش اور پیاس سے نڈھال زمین پر گرتا اور مرجاتا..... یوں دھیرے دھیرے کوئل کے آنے تک اس کا آشیانہ ویران ہو گیا۔
پھر ایک اداس سہ پہر اپنے گھونسلے کی پہچان کرتی وہ پلٹ ہی آئی۔ نڈھال اور ویران سی۔ نجانے کس کس "تجربے" سے گزر کر آئی تھی؟ جانے کس مصیبت میں پھنس گئی تھی؟ یا اسے گھونسلے کی راہ بھول گئی تھی؟ مگر یہ ممکن کہاں تھا؟ بھلا "ماں" بھی رستہ بھولتی ہے؟ خصوصاً" وہ راہ جس کے آخری کنارے پہ اس کے بلکتے بچے آنکھوں میں انتظار کے دیپ جلائے بیٹھے ہوں۔ پھر بھلا کوئل کو کیا ہوا؟ یا وہ کسی "شکاری" کے جال میں پھنس گئی اور پیچھے اس کا گھونسلہ ویران قبرستان ہو گیا۔
جس سہ پہر کوئل کی واپسی ہوئی..... وہ بڑا دردناک منظر تھا۔ کوئل امرود کی شاخوں سے لپٹ لپٹ کر بین کرتی رہی۔ روئی، چیخی اور نوحے گائے..... کوئل اپنے نغمے بھول گئی، گیت بھول گئی، زندگی گزارنے کا رسم اور قرینہ بھی بھول گئی اور وہ ویران گھونسلے میں چھپا کر سوگ مناتی رہی۔
کوئل کی کوک اس کی اونچی لمبی گوری چٹی حسین ساس کو بہت بری لگتی تھی۔ اور اب تو وہ گریہ کر رہی تھی۔
"یہ منحوس پھر آگئی۔ نامراد کو کھلا چھوڑا ہوا ہے پھر بھی کہیں اور نہیں جاتی۔" اس کی ساس گلشن تیوری چڑھا کر بھناتی رہتی تھیں۔ انہیں کوئل کی پرسوز آواز میں بچوں کے بچھڑنے اور گھونسلہ اجڑنے کا درد سنائی نہیں دیتا تھا۔ وہ انہیں کبھی پسند نہیں آئی تھی۔ کبھی پسند آ ہی نہیں سکتی تھی۔
"ہونہہ۔ کالی جلی ہوئی..... بدصورت، نری آواز کو چاٹنا ہے کیا؟" وہ پچھلے سولہ دن سے گلشن کے ایسے تبصرے سنتی آرہی تھی بلکہ وہ تو بہت سے تبصرے سنتی آئی تھی۔
زین اس کی نرم فر کو چھوتا، پیار کرتا، چومتا..... اس کوئل کے وہ دن میں سو سو مرتبہ ناز اٹھاتا تھا۔ پر جب اس کے بچوں کی باری آئی۔ زین کو کراہیت آنے لگی۔ نرم لجلجے سے، چھلے ہوئے ماس جیسے بچے..... تب وہ کوئل سے بھی کترانے لگا تھا۔ نادرن ایریا کے کسی جنگل سے پکڑ کر لایا تھا۔ اس کے پاس پالتو کتے، بلیاں طوطے اور ایک گھوڑے کا بچہ بھی تھا۔ سفید براق سا بچہ..... ریشم جیسی فر والا..... جانے اتنا حسین گھوڑے کا بچہ اس نے کہاں سے چرایا تھا؟ پھر یہ کالی سیاہ کوئل..... جس میں زین کے علاوہ کسی اور کو کشش محسوس نہیں ہوتی تھی۔
"گوری ہوتی تو تب نا....." اس کی سرخ و سفید خوب صورت ساس کی مغرور ناک اوپر کو کھنچ جاتی تھی یوں اس لمحے وہ کچھ اور مغرور نظر آتیں۔ لوگوں کو بھی نجانے کس کس بات پہ ناحق تکبر ہو جاتا ہے، کبھی اچھی صورت پر اور کبھی دولت پہ، دونوں ہی آنے اور جانے والی چیزیں، ڈھلنے اور فنا ہونے والی چیزیں..... بھلا ان پر غرور کیسا؟
"یہ میرے نصیب کی سیاہی ہے۔" زین ابرار کا احساس زیاں بڑھ جاتا تھا۔ اول تو وہ شادی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اب شادی باپ کے مجبور کرنے سے تو ہو چکی تھی۔ کالی سیاہ سریلی آواز والی کوئل کو تو وہ پسند کر کے گھر لا سکتا تھا، مگر کالی بیوی کو برداشت کرنا ممکن نہیں تھا؟ اسے اس منحوس کوئل پہ بھی غصہ آنے لگتا تھا۔ اسے اپنے مقدر پہ تو غصہ اور شکوہ تھا ہی، باپ پہ بھی سخت تاؤ چڑھتا تھا۔
اس کی شادی کے دوسرے ہی دن باپ اور بیٹے میں زبردست قسم کی تکرار ہوئی تھی۔ یوں کہ رانی پتھر کی مورت بن گئی۔ جھٹکے پہ جھٹکا ہی لگ رہا تھا۔ رات سے

لے کر صبح تک مسلسل ایک ہی کیفیت سے گزرنا پڑ رہا تھا۔

جس طرح محبت کبھی نہیں بھلائی جا سکتی' اسی طرح "ذلت" کو بھلانا بھی ممکن کہاں تھا؟

اس کے مقدر کی سیاہی یا زندگی کا "امتحان" اسے ذلت کی دہلیز پر کھینچ لایا تھا۔ وہ نہ آگے بڑھ سکتی تھی۔ نہ پیچھے ہٹ سکتی تھی۔

آخر اس کے ساتھ ہی ایسا کیوں ہوا تھا؟

وہ رات بھر روتی رہی تھی' کبھی چپ کر جاتی تھی' کبھی سوچ میں پڑ جاتی۔ کبھی شکوہ کرنے لگتی' کبھی خود سے بھی ناراض ہو جاتی' کبھی متحیر ہو جاتی' کبھی گم صم رہ جاتی' کبھی پتھر ہوتی۔ آخر اسی کے ساتھ ہی کیوں؟ آخر زندگی نے اسی کے ساتھ اتنا بھیانک مذاق کیوں کیا تھا؟

جس روز وہ دلہن بنی' لوگ اس پر رشک کر رہے تھے۔ کسی کی آنکھ میں حسد بھی ہو گا۔ کسی دل میں نفرت بھی ابھری ہو گی؟ کسی زبان نے زہر بھی اگلا ہو گا؟ شاید ایسا ہوا ہو۔ مگر وہ جان نہیں پائی۔ یہاں تو کئی آنکھوں نے رنگ بدل لیے تھے۔ کئی دلوں نے دھڑکنوں کے سر بدل لیے تھے۔ وہ یہاں ہوتی تو جانتی؟ وہ تو یہاں تھی ہی نہیں... محبت کی دنیا میں ٹہل رہی تھی۔ کبھی بادلوں میں تیرتی' کبھی ستاروں کو چھوتی' کبھی نرم ہوا کے دوش پہ محو رقص ہو جاتی۔ اس کا دل آج اس کا کہاں تھا؟ حالانکہ پرایا تو وہ کب سے ہو گیا تھا' پر وہ نشال کے سامنے مانتی کہاں تھی؟ نشی اس کا ریکارڈ لگا دیتی۔

"ڈاکٹری کی کتابیں پڑھ پڑھ کر تم کیا سمجھتی تھیں؟ کبھی محبت نہ کر سکو گی؟ آج بتاؤ ذرا؟ ہو گئی نا تمہیں محبت... ایک اپالو جیسے شہزادے سے... لگتا ہے پاپا نے تمہارے لیے دل سے چنا ہے۔ آخر انہیں تم سے محبت بھی تو بہت تھی۔" نشال تڑ تڑ بولتی چلی جاتی۔

"رالی محبت کرنے کے لائق ہے... تب ہی پاپا' امی سب اسے چاہتے ہیں... محبت کروانے کے لیے' محبت کرنا ضروری ہوتا ہے۔ کوئی ایسے ہی آپ کے نام کی مالا نہیں جپ سکتا۔ اس کے لیے ریاضتیں کرنا پڑتی ہیں۔ خود کو مٹانا ہوتا ہے۔" یہ مشال تھی' نشال سے ایک سال چھوٹی۔ پر عقلی لحاظ سے نشی اور رالی سے بھی آگے۔ رالی کو مشی سے بھی پیار تھا۔ پر سہیلی اس کی نشال ہی تھی۔ نشال اس کی ذہانت کے سامنے گھٹنے ٹیکے ہوئے تھی اور رالی' نشال کے حسن پر نثار ہو جاتی۔ ان دونوں میں مشال الگ تھی جسے نہ کسی کی ذہانت سے سروکار تھا نہ حسن کے جلوے متاثر کرتے تھے۔ وہ اپنے حال میں مست رہتی اور رالی کو "گر" کی باتیں سکھاتی وہ باتیں جو اسے میڈیکل کی پڑھائی' علم' ذہانت' ڈگریوں اور بے پناہ کامیابیوں نے بھی نہیں بتائی اور سکھائی تھیں۔ اس کی باتیں سوچ کے جہان کھولتی تھیں جب وہ دلہن بن رہی تھی تب مشال ہی اس کے ہمراہ تھی۔ مشال چاہتی تھی' آج وہ دنیا کی ہر لڑکی سے زیادہ خوب صورت لگے۔ نشال ابھی گھنٹہ بھر پہلے دوبئی سے پاکستان پہنچی تھی۔ آتے ہی سو گئی۔ وہ اپنی خوب صورت آنکھوں کو آرام پہنچا کر بارات کے ٹائم ہوٹل پہنچنا چاہتی تھی۔ پھوپھو کی جھاڑ اور انکل کی تنبیہہ کو اس نے ہمیشہ کی طرح نظر انداز کر دیا تھا۔ وہ ایسی ہی تھی اپنے اصولوں اور دل کی مرضی پہ چلنے والی۔ کسی کو خاطر میں نہ لاتی' اپنی مرضی چلاتی' اپنی ذات سے محبت کرتی۔ پھر بھی رالی کو اس سے بڑا پیار تھا۔

جب وہ دلہن بن رہی تھی تب مسلسل نشال کو سوچ رہی تھی۔ اس دن پارلر میں نو دلہنیں تیار ہوئیں۔ اس کا نمبر دسواں تھا۔ حسن و جمال میں شاید وہ رالی سے بڑھ کے تھیں' مگر جب وہ دلہن بن گئی تب مشال نے بے ساختہ چیخ کر کہا۔

"اللہ! میری رالی کتنی پیاری لگ رہی ہے..." وہ اس سے لپٹ گئی تھی۔ "آج تو زین بھائی کی خیر نہیں... بڑا اپنے حسن پہ اتراتے ہیں... دیکھنا کیسے آج شاکڈ رہ جائیں گے۔" یہ تو مشال کی محبت تھی جو

رالی اسے پوری دنیا سے بڑھ کے حسین لگ رہی تھی۔ حالانکہ گندمی سے کچھ کم ذرا سانولی کھلی کھلی رنگت' براؤن چمکیلی آنکھوں اور براؤن حسین لمبے گھنے بالوں کے علاوہ اس میں کچھ نہیں تھا۔ وہ جانتی تھی' اسی لیے کسی خوش فہمی کا شکار نہیں تھی... پھر بھی... پھر بھی' مشی کی محبت' تعریف اور جذباتیت نے رالی کو کچھ نہیں' بہت خوش فہم کر دیا تھا۔

رات آنے تک' ہوٹل جانے تک' زین کے پہلو میں بیٹھنے تک' نکاح ہونے تک' رخصتی کے بعد زین کے گھر آ جانے' اس کی دو نخریلی بھابھیوں اور ایک مغرور ماں کی خود پسندانہ گفتگو سننے کے بعد اس حسین' خوابناک' دلنشین رات کے دوسرے پہر تک رالی' مشال کی دلفریب باتوں کے زیر اثر خوش فہمی کے ہنڈولوں میں جھولتی رہی تھی اور پھر جیسے جگنو' ستاروں اور جھلملاہٹوں کی بنت' مالا موتی جیسے خواب ایک ایک کرکے چھناکے سے ٹوٹتے چلے گئے تھے۔ دھڑ' دھڑ دھڑ... خوابوں کا شیش محل گر گیا' خواب بکھر گئے' ارمان منہ کے بل گرے' عزت نفس تہہ خاک ہوئی' انا کو تار تار کیا گیا اور رالی کی پوری ہستی جیسے فنا ہو گئی۔ اس کے شوہر نے شادی کی پہلی رات اسے دھتکار دیا۔

عموماً" ایسے کیس کم کم ہوتے ہیں... سہاگ رات میں بدصورت سے بدصورت بیوی بھی الہامی اور آفاقی جذبات' محبت اور فطرت کی ضرورت کے تحت شوہر کی کچھ "توجہ" تھوڑی سی محبت یا پھر "قرب" پا لیتی ہے۔ وہ وقت' لمحات یا جذبات ہی کچھ اور ہوتے ہیں۔

کوئی شوہر اپنی نئی نویلی بدصورت ترین بیوی کو بھی اس انداز میں ہرگز ریجیکٹ نہیں کرتا' جس طرح زین ابرار نے رالی کو کیا۔

وہ اڑھائی بجے تک تو دوستوں کے ساتھ محفل سجائے بیٹھا رہا تھا پھر آدھا گھنٹہ ماں کے حضور سلامی پیش کرتا رہا... بھابھیوں کی کھلی ڈھلی باتیں اور کھلے ڈھلے تبصرے سنے۔ تعلیم نے ان لوگوں کا کچھ نہیں سنوارا تھا۔ ابا سے لے کر زین تک۔ جو کچھ منہ میں آتا' اسے اگل دیتے۔ کبھی یہ نہیں سوچا تھا' سامنے بیوی' بہو' بیٹا یا کوئی بھی رشتہ ہے' مگر یہ قانون بھی ان ہی لوگوں پہ لاگو تھا' جو گلشن (ساس) کے پسندیدہ لوگ تھے۔ باقی مجال تھی جو کوئی منہ سے کچھ نکال پاتا۔ زبان درازی' تیز مزاجی۔ شادی کی پہلی رات ہی رالی پہ بہت سی حقیقتیں منکشف ہو گئی تھیں۔ خصوصاً" زین نے جب اپنی زبان کے جوہر دکھائے تھے۔ اس کے سرخ ہونٹوں سے تیزابی لفظ گرتے رہے اور رالی پتھر کی مورت بنی سنتی رہی تھی سوچتی رہی تھی۔ خوب صورت چہروں کے پیچھے ایسے کریہہ چہرے بھی ہوتے ہیں؟ شاید اس میں زین کا بھی اتنا قصور نہیں تھا۔ وہ خود پرست اور حسن پرست آدمی تھی۔ ماں اور بھابھیوں کے تبصرے سن کر آ رہا تھا۔ ان ہی کے لہجے میں اس کی "تعریف" کر رہا تھا۔

"دشمن بھابھی نے سچ کہا... میرے لیے ابا کو کوئلے کی کان ہی ملی تھی۔ ہیروں کی کانیں میرے بھائی جو لوٹ لائے۔" وہ ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کرتا' کوٹ صوفے پر پھینکتا' جوتے اتار کر کارپٹ پہ پٹختا عجیب روکھے اور ہتک آمیز لہجے میں بولا تھا۔ یوں کہ اپنی دھڑکنوں کے سر گنتی رالی گویا سن ہو کر رہ گئی تھی۔

پر اس نے رالی کو دیکھا ہی کہاں تھا؟

"توبیہ بھابھی نے کہا۔ اب "اسی" پر صبر کر لو۔" وہ بالوں میں انگلیاں چلاتا بڑے مغرور انداز میں بول رہا تھا۔ ہونٹوں پر ابھی تک استہزائیہ مسکراہٹ پھیلی تھی۔

وہ اس کی زندگی میں کس حیثیت پر ہو گی یقیناً" اس کے پالتو جانوروں جتنی بھی رالی کی "اوقات" نہیں تھی۔

وہ ڈاکٹر رائیل جس کی ایک دنیا پرستار تھی' جس کی ذہانت اور سریلی آواز کے چرچے میڈیکل کالج میں بکھرے تھے۔ کلاس فیلو اس کی دوستی کے طلب گار تھے اور جونیئر اسے اپنا آئیڈیل تسلیم کرتے۔ پروفیسر اس کی ذہانت' فہم اور شاندار شخصیت کے مداح تھے۔

وہ یقیناً" بہت حسین نہیں تھی۔ مگر بدصورت تو ہرگز

نہیں تھی۔ خوبصورت سانچے میں ڈھلا سراپا' سبک نقوش اور گہری جھیل سی آنکھوں کے ساتھ ایک جہاں کو لوٹ سکتی تھی۔ ذہانت اسے خدا تعالیٰ کی طرف سے تحفے میں ملی تھی۔

دوران تعلیم بہت سے ہاتھ اس کی طرف بڑھے تھے کچھ محبت سے' کچھ عقیدت سے مگر اس کا ایک انکار اور مخصوص سرزنش بھرا رویہ کبھی نہ بدلا۔

زندگی میں کچھ اصول اس کے خود ساختہ تھے۔ جو کبھی نہ بدلے نہ تبدیل ہوئے اور نہ ان میں کوئی فرق آیا۔ اس نے خود کو سنیت سنیت کر اور بچا بچا کر رکھا۔ آخر کس کے لیے؟ کیا زین ابرار جیسے شوہر کے لیے!۔

آخر اسے کس خوبصورتی کی تمنا تھی؟۔

کیا اچھے کردار سے بڑھ کر بھی کوئی خوبصورتی تھی! کیا اعلا اخلاق سے بڑھ کر بھی کوئی خوبصورتی تھی؟ کیا نیکی' حلم' اور "حیا" سے بڑھ کر بھی کوئی خوبصورتی تھی؟

وہ اس کے دل میں اترنے والا پہلا مرد تھا۔ اس کی پہلی محبت' اس کی پہلی چاہت' اور دل کی واحد تمنا۔

وہ زین نہ ہوتا' کوئی بھی شخص ہوتا' جس سے پھوپھو اور انکل اس کا رشتہ طے کر دیتے۔ رابیل کو اسی شخص سے محبت ہو جاتی۔ وہ تابعداری' فرمانبرداری' اور انکساری کا مرقع تھی۔ اس نے عمر بھر کسی کا دل نہیں دکھایا تھا۔ کسی سے جھوٹے وعدے نہیں کیے۔ کسی مرد سے دوستی کی آڑ میں تعلقات نہیں بنائے تھے۔ نیکی' شرافت اور کردار کو سنیت سنیت کر رکھتی رہی تھی۔ پھر بھی اسے زین ابرار جیسا شوہر ہی ملا۔ غلطی کہاں سرزد ہوئی تھی؟

"اللہ! میری رابی کتنی پیاری لگ رہی ہے۔ آج تو زین بھائی کی خیر نہیں۔ بڑا اپنے حسن پر اتراتے ہیں۔" نشی کی آواز اس کے کانوں میں زہر بن کر اتر رہی تھی۔

"جانے میرے باپ کے سر پہ کیسا بھوت سوار ہو گیا تھا۔ ایک کلائنٹ کے توسط سے تمہیں دریافت کرلائے۔ آخر تم میں دیکھا کیا تھا۔ محض ایم بی بی ایس کی ڈگری ؟" جیسے ایم بی بی ایس کرنا بہت معمولی بات تھی۔

بظاہر "باعلم" اور پڑھے لکھے لوگ تھے۔ خوشحال' ماڈرن اور لبرل ازم کا شکار۔ ہر بات بے باکی اور دلیری سے منہ پر مار دیتے۔ پھر خود کو صاف گو بھی کہلواتے۔ دل توڑتے' جذبات توڑتے' احساسات توڑتے۔ باعلم لوگ تھے پر سوز دل سے خالی۔

"تم مجھے بالکل بھی پسند نہیں آئیں۔ تصویر میں تو بہتر تھیں مگر اب۔ مجھے سخت مایوسی ہوئی ہے۔" وہ اٹھارہ فٹ دور بیٹھ کر تیزاب پھینک رہا تھا۔ گھونگھٹ الٹے بغیر۔ رابیل کے دل میں ایک اور بھالا گڑ گیا تھا۔ کیا وہ اسے ذلیل و خوار کرنے آیا تھا؟ اس سے بہتر تھا۔ وہ کمرے میں آتا ہی نا۔ کم از کم وہ زین ابرار کا اتنا کریہہ روپ تو نہ دیکھ پاتی۔

گھونگھٹ کی اوٹ نے اس کا بھرم رکھ لیا تھا۔

آنکھیں تھک رہی تھیں۔ ہونٹ کپکپا رہے تھے۔ جسم تھرتھرا رہا تھا۔ اور وہ اس کی کیفیات سے بے نیاز گنگناتا ہوا ایک مرتبہ پھر کمرے سے باہر نکل گیا تھا۔

☼ ☼ ☼
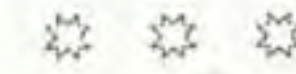
شادی کی دوسری صبح پہلی سے بھی عجیب تر تھی۔ سورج کی پر تپش کرنیں سب سے پہلے اس کے کمرے میں سلامی پیش کرتیں۔ کھڑکی کا رخ پچھلے صحن کی طرف تھا۔ جہاں سے اکثر زین کے پالتو جانوروں کی آوازیں بھی آتی رہتیں۔

پہلے پہل اسے گھر کی لوکیشن سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ پھر آہستہ آہستہ "ابرار منزل" کی راہداریاں' گلیارے اور غلام گردشیں اس کے حافظے میں محفوظ ہونے لگیں۔ اسے لوکیشن کے اعتبار سے ایسا کمرہ دیا گیا تھا۔ جس کی بڑی سی کھڑکی پچھلے صحن میں کھلتی تھی۔ سردیوں میں کمال کی دھوپ آتی' نرم گرم' پر تپش' پر حدت۔ مگر گرمیوں میں پورا کمرہ "اوون" کی مانند تپ جاتا۔

سردیاں تو بہت دور تھیں۔ ابھی تو گرمیوں کی تپش اور حدت جھلسا رہی تھی۔ آگ باہر زیادہ تھی یا اندر۔ کچھ سمجھ میں نہ آتا۔ شادی کی یہ دوسری "صبح" جیسے آئندہ آنے والی پوری زندگی کا ٹریلر دکھا گئی تھی۔ اس کے ساتھ آئندہ کیا ہونے والا تھا؟ اس کی حیثیت اور اہمیت کیا تھی؟

زین نے اپنا جو روپ دکھانا تھا' دکھا چکا تھا؟ اب تو محض گھر والوں کے رویے کو جانچنا تھا اور پھر شاید وہ پلٹ جانے کا پر اذیت فیصلہ کر ہی لیتی۔ حالانکہ اس "منزل" پر پہنچ کر پلٹ جانا اور لوٹ جانا آسان نہیں تھا۔

حالانکہ پوری رات وہ اس معاملے پر غور و فکر کرتی رہی تھی۔ پھوپھو کی آسودہ مسکراہٹ' انکل کا شفیق' مہربان مگر مطمئن چہرہ۔ وہ اپنا فرض ادا کر چکنے کے بعد کتنے خوش اور مطمئن تھے؟ جیسے ایک عہد کی تکمیل ہوئی ہو۔ ایسا عہد جو پھوپھو نے اپنے مرتے ہوئے بھائی کے ساتھ کیا تھا۔ اس کی تین سالہ بیٹی کو سینے سے لگا کر پھر کبھی خود سے الگ نہ کیا۔

حالانکہ چاہتے تو سب سے پہلے اپنی بیٹی نشال کی شادی کرتے' جو رابیل کی ہم عمر تھی۔ مگر انہوں نے نشال اور مشال پہ رابی کو فوقیت دی تھی۔ پہلے اسے گھر بار کا کیا تھا۔

اپنے تئیں انہوں نے رابیل کے لیے بہت بہترین سوچا تھا۔ ایک خوبرو' تعلیم یافتہ' برسر روزگار نوجوان کو منتخب کرنا۔ تعلیم یافتہ پڑھی لکھی سسرال' اس کے سسر ہائی کورٹ کے وکیل اپنے عہد کے سب سے مہنگے ترین وکیل تھے۔ انکل کی ایک دوست کے توسط سے پہچان نکل آئی۔ ابرار کریم بھی اسد انکل کی شخصیت اور عہدے سے متاثر ہوئے۔ پھر جو انہوں نے گھر کی دہلیز پکڑی تو رابیل کا رشتہ زین کے لیے لے کر ہی دم لیا تھا۔ اس دوران گلشن ایک آدھ مرتبہ آئی تھیں۔ ان کا انداز لیا دیا سا تھا۔ جیسے وہ رابیل کا رشتہ اپنے بیٹے کے لیے لے کر بڑا احسان کر رہی تھیں۔ پھوپھو کو ان کا رویہ کھٹکتا رہا تھا مگر اسد انکل کے سامنے ایک نہیں چل سکی تھی۔ انہیں زین ہر لحاظ سے پسند آیا تھا۔ گھر بار اچھا تھا۔ تعلیم' شکل' خوش حالی کہیں بھی کمی نہیں تھی۔ پھر بھلا کفران نعمت کیوں کرتے؟ یوں جھٹ منگنی اور پٹ بیاہ والا معاملہ ہوا تھا۔ رابیل کو اتنی جلد بازی اور عجلت "وہم" کا شکار کر رہی تھی۔ مگر وہ ڈر کے مارے مشال سے بھی ذکر نہیں کرتی تھی۔ یوں پھوپھو کے گھر سے وہ زین ابرار کے گھر تک سفر کر آئی۔

پھوپھو کے دبے دبے خدشات کھل کر سانس لینے لگے تھے۔ وہ پھوپھو نہیں' ماں بن کر سوچتی تھیں۔

"لڑکا مغرور سا ہے۔ ماں اس سے بڑھ کر مغرور۔ بھابھیاں نخریلی' بہن موڈی سی۔ میری رابی کس طرح ایسے ماحول میں گزارا کرے گی۔" وہ متفکر نظر آتیں' اسد انکل سے الجھ پڑتیں۔ کبھی دل بھر آتا تو رونے لگتیں۔

"جانے ہمارا فیصلہ ٹھیک ہے یا نہیں؟ بن ماں باپ کی بچی ہے۔ کہیں زیادتی نہ ہو جائے۔ کچھ غلط نہ ہو جائے۔" اس کی شادی کے دن تک پریشان ہی رہیں۔

پھوپھو نے فون کیا تھا۔ وہ پوچھ رہی تھیں' دبی دبی آواز میں نرم نرم سوال۔

"زین کیسا ہے؟ ساس کا رویہ کیسا رہا؟ بھابھیاں کس طرح سے پیش آئیں؟ دل لگا یا نہیں؟" وہ بے تابی سے پوچھتی رہی تھیں۔ اور رابیل جو انہیں زین اور ساس کے "رویے" انداز اور زہر خند باتوں کے متعلق بتانا چاہتی تھی لمحہ بھر کے لیے چپ سی رہ گئی۔ پھر بہت ضبط اور صبر کا مظاہرہ کرتے ہوئے پھوپھو کو صرف اتنا بتایا۔

"سب بہت اچھے ہیں پھوپھو! میری توقع سے بھی بڑھ کر۔" ضبط کے پل صراط سے گزرتے ہوئے اس نے پہلی مرتبہ روتی آنکھوں کے ساتھ جھوٹ بولا تھا۔ پھوپھو کو جھوٹی تسلیاں دیتی رہی۔ پھوپھو کی جگہ اس کی اپنی سگی ماں بھی ہوتی تب بھی رابیل جھوٹ ہی بولتی۔ ماں کو کبھی "سچ" بتا کر دکھی نہ کرتی۔ سب کچھ چپ چاپ اپنی ذات پہ سہہ جاتی۔ وہ ایسی ہی تھی۔ انتہائی

اس نے کہیں پڑھا تھا' آدمی جب تک ٹوٹتا نہیں' اسے پتا نہیں چلتا۔ وہ کتنا مضبوط ہے۔

بارش کا قطرہ سیپ اور سانپ دونوں کے منہ میں گرتا ہے۔ سیپ اسے موتی جبکہ سانپ اس سے زہر بنادیتا ہے۔ وہ سیپ کا موتی تھی اور دیکھنا یہ تھا کہ زین کب تک سانپ کا زہر اگلتا ہے؟ زین کے علم نے اسے گھمنڈی کردیا تھا تو رابیل کے "علم" نے اسے اعلا ظرف بنادیا۔ چاہے کوئی ڈاکٹر ہو یا انجینئر' وزیر بن جائے یا سفیر۔ رہتی تو مشرق کی بیٹی ہے۔ اپنے حسب نسب' عزت' وقار' انا اور والدین کی شرافت' ان کی تربیت کو بلند کرنے والی۔ ان کے سامنے ڈھال بننے والی۔ اپنے والدین اور عزیزوں کا سر اونچا کرنے والی۔

اور اسد انکل نے تو جانے کس کس کو چیلنج کرکے اسے بیاہا تھا۔ وہ ماضی پہ نظر نہیں ڈالنا چاہتی تھی۔ حال بُرا تھا یا اچھا؟ بس "حال" ہی میں جینا چاہتی تھی۔ وہ پچھلے ابواب بند کرکے آئی تھی۔ مگر اس کا ذہن کہیں پیچھے محو پرواز ہونے لگا تھا۔ کوئی بڑی بے بسی اور اذیت بھرے لہجے میں چیخ رہا تھا۔

"بیاہ تو رہے ہیں نا۔ بسا کر دکھایئے گا۔" چیلنج کرتی صدمے کی شدت سے چور آواز تھی۔ اس کا رشتہ کا ہوجانے کے دوسرے ہی دن وہ آدھمکا تھا۔

"دکھادوں گا۔ دکھادوں گا۔ تمہارا منہ میں نہیں میری بیٹی رابیل بند کرے گی۔ تمہیں "بس" کر آباد ہوکر دکھائے گی۔" وہ جو یک ٹک آگ اگلتے حسن کو دیکھ رہی تھی۔ ایک دم چونک سی گئی۔ کتنے مان' یقین اور چیلنج بھرے لہجے میں وہ اسے جتا رہے تھے۔ اتنی بھاری ذمہ داری' اتنا بڑا چیلنج' وقت اور حالات کے دھارے بدلنے کا کیا پتا تھا؟ پھر اسد انکل کا ایسا مستحکم دعوا قبول کرنا تھا۔ اسے پل صراط سے گزر کر بھی اسد انکل کے یقین' مان اور چیلنج کو کامیاب کرنا تھا۔ جیسے وہ درپردہ رابیل کو بھی سمجھا چکے تھے۔

"تمہیں جینا مرنا وہیں ہے۔ اسی گھر میں۔ دیکھو' میرے سر میں خاک دھول مت اڑادینا۔ میری عزت کا خیال رکھنا اور کم از کم اس ذلیل' خبیث حسن کے سامنے مجھے ہرگز نہ جھکانا۔"

یعنی ایک بات تو طے تھی۔ اسے واپس پلٹنا نہیں تھا۔ ایک عہد کو بچانے کے لیے' ایک یقین کو بچانے کے لیے' ایک چیلنج کو بچانے کے لیے اور ایک دعوے کو جھٹلانے کے لیے۔ وہ جیسے اپنے اکھڑ تاثرات سمیت آگ بگولا ہوتا کہہ رہا تھا۔

"پلٹ آئے گی یہ وہ وہاں نہ رہ سکے گی۔ استاد ہے میری' اس کی رگ رگ سے واقف ہوں۔ اسے بے حسوں کے جنگل میں بھیج رہے ہیں۔ بھٹک بھٹک کر اور جھک جھک کر تھک جائے گی۔ آپ سمجھتے ہی نہیں۔" وہ جیسے خود بھی تھک گیا تھا۔ زندگی عجب موڑ کھینچ کرلے آئی تھی۔ نہ آگے بڑھنے دیا جاتا نہ پیچھے ہٹنے۔

"تم اپنے فلسفے اپنے پاس رکھو' انگلیوں پہ حساب کرو' عمر کتنی ہے تمہاری؟ میں باپ ہوں تمہارا یا تم میرے باپ ہو۔ تم ہوتے کون ہو مجھے غلط صحیح کی پہچان کروانے والے؟ میں کیا اندھا ہوں' آنکھیں نہیں رکھتا۔"

اسد انکل جیسے بھڑک اٹھے تھے۔ ان کا بس چلتا تو حسن کی گردن مروڑ دیتے یا ڈنڈا اٹھا کر اس کی دھنائی کرڈالتے۔ پر یہ ممکن کہاں تھا؟ وہ قد کاٹھ میں ان سے بھی کچھ اونچا ہوگیا تھا۔ مضبوط' لمبا' چوڑا۔ جم اور ایکسرسائز کے کمالات کا کرشمہ۔ اپنی عمر سے کچھ بڑا ہی لگتا تھا۔ اٹھان غضب کی تھی۔ گورا رنگ' کالی گھور آنکھیں۔ بھرے بھرے ہونٹ' ٹھوڑی پہ سجا تل۔ ان کا اپنا دل ڈول سا جاتا تھا۔ ان کے تینوں بچے بلا کے خوبصورت تھے۔ دونوں بیٹیوں کے بعد پیدا ہونے والا یہ اکلوتا بیٹا کچھ زیادہ ہی من موہنا لگتا۔ ان کی اپنے بیٹے میں جان تھی۔ پورا عالم گواہ تھا' انہوں نے اس کے کیسے کیسے ناز نہ اٹھائے تھے۔ منہ سے نکلی ہر فرمائش کو پورا کیا۔ اس کی ذرا ذرا سی تکلیف پر تڑپ اٹھتے تھے۔ وہ بھی ماں سے بڑھ کر باپ کے قریب تھا۔ دل کی ہر بات باپ کو بتانا' چھوٹی سے چھوٹی اور بڑی سے بڑی۔

مگر اس کی آخری ضد' فرمائش یا خواہش نے انہیں بھی ضد دلادی تھی۔

"یہ نہیں ہوسکتا' تو بس نہیں ہوسکتا۔" ان کا فیصلہ اٹل تھا۔ تو وہ بھی ضد میں ان سے دو ہاتھ آگے۔

"کرکے دکھاؤں گا۔" وہ دھمکیوں پر اتر آتا۔

"اتنی جرات ہے تمہاری۔" اسد انکل دھاڑتے۔

"آپ دیکھ لیجیے گا۔" حسن بلا کا ضدی اور اکھڑ تھا۔ جس خواہش کے لیے ضد کرتا' پوری کروا کے دم لیتا تھا۔ پر یہاں اس کی ایک نہ چلی۔ وہ اس کے باپ تھے انہوں نے اپنے اختیار کا استعمال کرکے جیسے اسے نیچا دکھادیا تھا۔ اسے گویا یقین ہی نہ آتا۔

"آپ ایسے۔ آپ ایسے کس طرح کرسکتے ہیں؟۔" وہ بے یقین سا بے یقین تھا۔ اتنا اچانک اس قدر عجلت' جلد بازی' اسے رونا ہی آگیا۔

"جیسے کرچکا ہوں۔" ان کا اطمینان قابل دید تھا۔ وہ ٹوٹ سا گیا' بکھر سا گیا' گم صم سا ہوگیا۔ ماں کو خبر ہوئی تو دل تھام لیا۔ کیسے بالا ہی بالا باپ بیٹا جنگ لڑتے رہے' ایک جیتا' دوسرا ہارا۔ ماں کو خبر ہی نہ ہوسکی۔ جب انہیں پتا چلا تب وقت ریت کی مانند پھسل چکا تھا۔ یوں ہی نہیں کہتے' ماں کو بیٹیوں کا ہی نہیں' بیٹوں کا بھی سایہ ہونا چاہیے۔ بھلا یہ کوئی عمر تھی روگ لگانے والی۔

ماں کی باز پرس اسے اور غصہ دلاتی۔ اس نے سارے عالم سے ناراضی کا اعلان کیا اور واپس ہاسٹل چلا گیا۔ پیچھے ماں اداس' ویران' غمگین رہ گئی۔ ہر روز کال پہ کال کرتیں۔ کبھی وہ فون اٹھالیتا' کبھی اٹھا کر دیوار سے دے مارتا۔ جانے اتنی سی مدت میں اس نے کتنے سیل فون توڑ ڈالے تھے۔

پھر جب حواس ٹھکانے آتے تو اور سیل منگوالیتا۔ ان کی پھر سے کال آجاتی۔ بے قرار سی' مضطرب سی ماں۔

"تو آتا کیوں نہیں؟۔" وہ تڑپ تڑپ کر پوچھتیں۔ اکلوتا تھا نا۔ واحد آسرا اور سہارا۔

"رشتے جب اذیت کے سوا کچھ نہ دیں تو ان سے کنارہ کشی ہی بہتر ہے۔ خواہ وقتی ہی سہی۔" وہ بھرے دل سے کہتا تھا۔ ماں کا دل دھک سے رہ جاتا تھا۔ آخر ان کا بیٹا کس رہگزر کا مسافر بن رہا تھا۔

"وحشت چین نہیں لینے دیتی ماں!" وہ رو پڑتا۔ اور ماں اسے ذرا سی تسلی بھی نہ دے پاتی تھیں۔

"آپ کو میری باتیں سمجھ میں نہ آتی ہوں گی۔ ہر چیز انسان کی سمجھ میں آ ہی نہیں سکتی۔ انسان زندہ ہونے کے باوجود "زندگی" کو نہیں سمجھ سکا۔ پھر مرے بغیر موت کو کیسے سمجھ سکتا ہے؟"

تب چھتیس گھنٹے کی ڈیوٹی کرکے آئی رابیل کی تھکن پھوپھو کے کرب کو دیکھ کر اور بھی بڑھ جاتی۔ اوپر سے اسد انکل کا جوش و جذبہ۔ وہ اس کے جہیز کے لیے اعلا سے اعلا چیز خرید رہے تھے۔ امپورٹڈ فرنیچر سے لے کر اعلا ترین کراکری تک۔ انہوں نے کسی بھی چیز پہ سمجھوتہ نہیں کیا تھا۔ ایک ایک چیز انتہائی قیمتی اور نفیس خریدی۔ لوگوں نے انگلیاں دانتوں تلے داب لیں۔ قرابت داروں نے باتیں بھی بنائیں پر انہیں پروا کہاں تھی۔ بس وہ تو ایک ہی فکر میں ہلکان ہوتے تھے۔

"بیٹی! سر نہ جھکانا میرا۔ سسرال بنا خوشبو کا پھول ہے۔ اس کی سجاوٹ اور بناوٹ اور۔ بہت کچھ سہنا پڑتا ہے۔ ہر لڑکی کو سسرال میکے جیسا نہیں ملتا۔ نئے لوگ' نئے رشتے' نئے بندھن۔ سب کا مزاج الگ۔ فطرت الگ' موڈ الگ۔ بڑے ضبط اور صبر سے کام لینا ہوگا۔ اور ایک بات غور سے سن لو' کبھی اپنے علم کی بڑائی شوہر پہ ثابت کرنے کی کوشش نہ کرنا۔ تم ڈاکٹر ہو تو اس کا یہ مطلب نہیں' باقی لوگ کچھ بھی نہیں۔ دیکھو' جھکنے والے ہی کامیابی پاتے ہیں۔ علم ظرف کو وسیع کرنا سکھاتا ہے۔"

پھوپھو کی سمجھانے والی بہت سی باتیں اسد انکل نے بہت پہلے اسے سمجھادیں۔ وہ حقیقت میں اس کے باپ بن گئے تھے۔ ایک باپ کی طرح بڑی شان و شوکت کے ساتھ رخصت کیا۔ پورے خاندان میں

دھوم مچ گئی تھی۔ لوگ حیران ہوتے کچھ رشک کرتے کچھ حسد کرتے۔

اب ایسے باپ جیسے پھوپھا کے سر میں خاک ڈال کر وہ شادی کی دوسری ہی صبح کیسے لوٹ جاتی!؟ اسے اسد انکل کی عزت، مرتبہ، وقار اور شان عزیز تھی۔ وہ کس طرح انہیں پورے خاندان میں رسوا کردیتی؟ پھر جو حسن کے دعوے اسے حسن کے یقین کو بھی جھٹلاتا تھا۔ اس پر کیسے پہاڑ کیوں نہ ٹوٹتے۔ انا بکھرتی یا عزت نفس۔ ہر حال میں سہنا تھا۔

زندگی میں کچھ بھی ناممکن نہیں ہوتا۔ پھر کسی کے دل تک پہنچنا کیسے ناممکن تھا؟ زین ابرار ایک انسان ہی تھا نا؟ کوئی پتھر تو نہیں۔ اور انسان مٹی سے تشکیل پایا ہے۔ توڑ مروڑ کر دوبارہ گوندھا جاسکتا ہے۔ تو پھر شادی کے جوئے میں کچھ اور "تجربے" کرلینے میں حرج کیا تھا؟ ایک تجربہ یہاں آنے میں اور دوسرا خود غرض، کٹھور اور سنگدل لوگوں کے درمیان رہ کر، ان کے مزاج کو سمجھنے پرکھنے جانچنے میں۔ آخر زندگی "تجربات" سے ہی تو عبارت ہے۔ زندگی حقیقت ہے، کہانی نہیں خوابوں کا سفر، سپنوں کا شیش محل، ایک شہزادہ ایک شہزادی۔ جو شادی کے بعد عمر بھر کے لیے ہر دکھ سے آزاد ہوجاتے ہیں۔ پھر انہیں کوئی صدمہ دکھ کرب اور درد نہیں گھیرتا۔ ماورائی لوگ، ماورائی کہانیاں۔ اصل زندگی سے الگ، مختلف۔

اسے ذہنوں اور دلوں تک کا سفر خود طے کرنا تھا۔ دلوں میں جگہ بنانا تھی۔

کیا تھا اگر جو اس کی ساس کا مزاج تند تھا، جیٹھانیاں نخریلی تھیں، نند موڈی تھی، سسر اور شوہر دونوں غصے کے تیز تھے۔ مغرور نخریلے اکھڑ مزاج لوگ، وہ ان لوگوں کے درمیان رہ سکتی تھی۔ اس کی قوت برداشت شکست کھانے والی نہیں تھی۔

فیصلہ ہوچکا تھا۔ مگر وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ ہزار مختلف فطرت کے لوگوں کے ساتھ جنگ لڑنا، مقابلہ کرنا آسان ہرگز نہیں تھا۔

☆☆☆

رات تو جیسے تیسے گزر گئی تھی۔ یہ ولیمہ کی صبح تھی۔ انتہائی پھیکی اور بدوضع۔ پھوپھو کی کال آنے سے جیسے وہ سنبھل گئی تھی۔ اب گریہ کرنے، رونے اور ماتم کرنے کے لیے مزید طاقت بھی نہیں بچی تھی خالی معدہ، بھوک، نیند کی کمی، تھکن دکھ کرب، اذیت، شکستگی۔ جانے کون سا احساس سب پہ بھاری تھا۔

وہ تھکی تھکی آنکھوں سے پورے کمرے کا جائزہ لے رہی تھی۔ روایتی سجاوٹ مفقود تھی۔ نہ گلاب، نہ موتیا نہ چنبیلی کی خوشبو، نہ کوئی خاص چمک دمک تھی۔ اس کے باوجود اعلا ترین خوبصورت فرنیچر کی بدولت پورا کمرہ جگمگا رہا تھا۔

بیڈ ڈریسنگ صوفہ کاؤچ ٹیلی ویژن سیٹ۔ باقی سامان۔

رات سے گھر کا کوئی فرد اس کے کمرے میں نہیں آیا تھا۔ گویا وہ اسے یہاں لاکر بھول چکے تھے۔ چلو، اور کوئی نہ سہی، کم از کم اس کے سسر تو حال احوال پوچھ لیتے۔ آیا وہ کل سے بھوکی پیاسی زندہ بھی ہے یا مرچکی؟ مگر وہ بھی ایسے بے حس تھے کہ پلٹ کر دکھائی ہی نہ دیے۔ گویا بیٹا بیاہنے تک ہی ان کی ذمہ داری تھی۔ اب وہ مرے یا جیے۔

کیا وہ خود گھر سے بھاگ کر آئی تھی؟ یا اس نے زین کے ساتھ لو میرج کی تھی؟ آخر یہ لوگ اسے پسند کر کے ہی تو لائے تھے اتنی سنگدلی، کمینگی۔ رات کو بھی اسے گاڑی سے سیدھا کمرے میں پہنچا دیا گیا تھا۔ اس دوران وہ ثوبیہ اور ثمن کی بڑبڑاہٹیں سن سن کر حیران ہوتی رہی تھی۔

"لوگوں کے بھی کیسے اعلا نصیب ہوتے ہیں۔ بن مانگے جھولی میں سب کچھ آگرتا ہے۔" یہ ثمن تھی چھوٹی جیٹھانی۔ اس کے خاک بھی پلے نہ پڑا۔

"فکر نہ کرو۔ دوسری طرف کھوٹے پیسے جتنی امید نہیں۔ پورے میں ہی رکھے گا۔" اس نے گلشن (ساس) کی آواز سنی تھی۔ اب کے وہ گھبرا ہی تو گئی تھی۔ ایسا سرد زہریلا اور تند لہجہ تھا۔ جانے وہ کسے

سنا رہی تھیں۔

یعنی سسر کے علاوہ گھر کا کوئی فرد اس شادی پہ خوش نہیں تھا۔ اتنے قریب کی بات اب سمجھ میں آئی تھی۔ اتنی نفرت اتنی حقارت کیسے۔ برداشت کرے گی۔

جانے کتنا وقت بیت گیا تھا جب اچانک باہر سے اونچی اونچی آوازیں آنے لگی تھیں۔ وہ سہم کر بستر سے اٹھ گئی تھی۔ پھر اس نے دل کڑا کرکے پردے کو اٹھا کر باہر جھانکا تھا۔ یہاں سے تکون قسم کے لاؤنج کا منظر واضح تھا۔ گھر کے مختلف افراد ڈائننگ میز پر ناشتہ کررہے تھے۔ کچھ مہمان بھی موجود تھے۔ ثوبیہ کے تین بچے تھے۔ ایک بیٹی دو بیٹے۔ ثمن کے تین بیٹے تھے۔ دونوں اپنے اپنے بچوں کو کھلا پلا رہی تھیں۔ ایک جدید قسم کے تخت پر گلشن بیٹھی تھیں۔ ان کی ٹانگوں کے پاس اس کی اکلوتی نند ماہم نیم دراز تھی۔ زین سے بڑے زرافت اخبار پڑھ رہے تھے۔ اور ان سے بڑے زوار ان دنوں اردن میں پوسٹڈ تھے۔

کچھ فاصلے پر ایک اسٹول پہ زین بیٹھا تھا۔ بلیک پینٹ اور سرخ ٹی شرٹ پہنے ہوئے۔ اس کی سفید رنگت گویا سرخ رنگ میں دہک رہی تھی۔ نیلی آنکھیں، گچھے دار چاکلیٹی بال۔

رابی نے دھک دھک کرتے دل کے ساتھ دیکھا تھا۔ زین اور ابرار کریم۔ وہ دونوں پاگلوں کی طرح ایک دوسرے سے لڑ رہے تھے۔ باپ سیر تھا تو بیٹا سوا سیر۔

"تو کس نے کہا تھا، شادی کریں؟ مجھے نہیں پسند تو بس نہیں پسند۔" وہ شاید باپ کے سمجھانے پر بھڑک اٹھا تھا۔

"تمہیں کیا پسند ہے؟ آخر شادی سے پہلے کیوں نہیں انکار کیا؟ اسے گھر لاکر یہ تماشا لگانا تھا؟" زین کے الفاظ انہیں آگ لگا گئے تھے۔ شاید اسی لیے وہ موقع کی نزاکت بھول گئے تھے۔ ورنہ مہمانوں کے سامنے اتنا تماشا نہ لگتا۔

"میں نے انکار کیا تھا۔ آپ ہی نہیں سمجھے۔ میں نے کہا تھا، مجھے کوئی ڈاکٹر، انجینئر بیوی نہیں چاہیے۔" زین نے بودا سا جواز پیش کیا تھا۔ اس کی بکواس نے ابرار کریم کو اور بھی بھڑکا دیا تھا۔

"بکومت، تمہیں کوئی اعتراض نہیں تھا۔ کم از کم کل تک تو ہرگز نہیں۔" اور یہ حقیقت بھی تھی۔ کل تک اس نے اعتراض کا کوئی نکتہ نہیں اٹھایا تھا۔ اگرچہ ماں کی رضامندی شامل نہیں تھی۔ وہ ثمن کی چھوٹی بہن یعنی اپنی دوسری بھانجی ثانیہ کو بہو بنانا چاہتی تھیں۔ ماہم بھی ثمن اور ماں کی ہم نوا تھی۔

اس کے باوجود ابرار کریم نے اپنی مرضی کرلی۔ وہ ضدی اور ہٹ دھرم تھے۔ اپنی مانی کرنے والے۔ ان کا بیٹا زین بھی ان ہی کے جیسا تھا۔

انہیں زین کی "بکواس" مشتعل کررہی تھی۔ کل تک وہ اپنے رشتے پہ اگرچہ بہت خوش نہیں تھا مگر اس طرح ناخوش بھی نہیں تھا۔ بارات جانے تک سب کچھ ٹھیک رہا۔ وہ زین کو گن پوائنٹ پر ہرگز نہیں لے گئے تھے۔ وہ اپنی مرضی سے تیار ہوا تھا۔ دوستوں کے ساتھ خوش گپیاں بھی کرتا رہا۔ پالتو جانوروں کے ناز بھی اٹھاتا رہا تھا۔ یعنی بارات جانے تک وہ بالکل ٹھیک تھا۔

وہ جو بڑے زیرک اور جہاندیدہ وکیل تھے پہلی نظر میں ہی جانچ گئے۔ وجہ صرف یہ نہیں تھی کہ رابیل ڈاکٹر کیوں تھی؟ وجہ کچھ اور تھی کیا؟ انہیں اسی کی کھوج کرنا تھی۔ اس تمام لڑائی، جھگڑے، تکرار میں گلشن بے نیاز بیٹھی رہی تھیں۔ ابرار کریم کو بیوی کی بے نیازی پہ بھی تاؤ چڑھ رہا تھا۔

"تم اسے سمجھاتیں کیوں نہیں، آخر یہ اب چاہتا کیا ہے۔ میری عزت ناموس کو مٹی میں رولنا ہے کیا؟" وہ بیوی سے الجھ پڑے تھے۔

"خود ہی کیا ہے۔ اب خود ہی بھگتو۔" ان کے انداز میں واضح ناگواری اور غصہ تھا۔ ان کی بہن عمر بھر کے لیے خفا ہونے والی تھی۔ گر جو ثمن ان کی بہو نہ ہوتی تو اب تک آپا بائیکاٹ بھی کرچکی ہوتیں۔ آخر دونوں بہنوں نے کئی سالوں سے اندر ہی اندر کھچڑی پکا رکھی تھی۔ زین کی بھی ثانیہ سے خوب بنتی تھی مگر اس نے شادی کے لیے ثانیہ کا نام نہیں لیا تھا۔ ورنہ وہ کوئی

اسٹینڈ لے ہی لیتیں۔ اسی بات پہ ثمن کو بھی غصہ تھا اور زرافت کا بھی موڈ آف تھا۔ ویسے بھی اس کا موڈ تو بیوی کے موڈ کا تابع تھا۔

"مجھے اس کی ڈاکٹری واکٹری سے دلچسپی نہیں۔ آخر یہی عجوبہ آپ کو میرے لیے ملا تھا؟" وہ کس سفاکی کے ساتھ ایک خوش شکل نفیس مزاج باوقار باکردار لڑکی سے بیزاری کا اظہار کر رہا تھا۔

"یہ بات تمہیں پہلے سوچنی چاہیے تھی۔" ابرار کریم نے انتہائی تنفر سے کہا۔ گلشن بھی ہکا بکا رہ گئی تھیں۔

اگر اس کے دل میں کچھ تھا بھی تو نکاح سے پہلے پھوٹ دیتا۔ کم از کم ابرار کریم نئی بہو کے سامنے تو شرمسار نہ ہوتے۔

ابرار کریم زین کو خاموش پا کر پھر سے چلّا رہے تھے۔

"تم نے یہ بات پہلے سوچنا تھی۔ نکاح سے پہلے۔ تاکہ میں اس عزت دار ڈی ایس پی کے سامنے ہاتھ جوڑ کر معذرت کر لیتا۔" وہ اسد انکل کا حوالہ دیتے سخت پریشان تھے۔

"تب آنکھ پہ پٹی بندھ گئی تھی۔" زین ان سے بھی زیادہ جھلاہٹ کا شکار تھا۔ اپنے گولڈی (کتے کے پلے) کو تھپکیاں دیتا سخت بھنّا رہا تھا۔ کوئی بڑی، ٹھوس اور مستحکم "وجہ" ضرور تھی۔

کیونکہ زین ابرار کبھی بغیر "وجہ" کے کوئی قدم نہیں اٹھا سکتا تھا۔ کوئی ایسا قدم جو خود اس کے لیے سوال بن جائے۔

ابرار کریم کے جاتے ہی محفل کا رنگ بدل گیا تھا۔ خواتین دبے دبے تبصروں میں مصروف ہو چکی تھیں۔ ان میں سے "کچھ" کو دلہن کا دیدار کرنے کی بے چینی تھی۔ آخر دلہن کا "رویہ" بھی تو دیکھنا تھا یہی حال ثوبیہ اور ثمن کا تھا۔ وہ جلد از جلد رابیل سے ملنا چاہتی تھیں۔ آخر زین کے اس کھلے ذلت آمیز انکار کے بعد وہ کون سا فیصلہ کرنے والی تھی؟۔ کیا اسے اتنی ذلت سہہ کر اس گھر میں رکنا چاہیے تھا۔

"ہرگز نہیں۔" ثوبیہ اور ثمن جیسے خود ہی مطمئن ہو گئیں۔ مگر یہ اطمینان دو گھڑی کا تھا۔ ابرار کریم کے جاتے ہی گلشن پھر سے اٹھ کر بیٹھ گئی تھیں۔ انہوں نے زین کے شانے پر بہت زور کا کشن مارا تھا جو گولڈی کے منہ پر جا لگا۔ انہیں شدید کراہت سی آئی تھی۔

"ان غلیظوں کو کیوں اندر اٹھا لائے ہو۔ پیچھے صحن میں باندھ کر رکھو۔"

"یہ معصوم آپ کو کیا کہہ رہا ہے؟ صبح سے بھوکا بلبلا رہا تھا۔ اس کی خواہش ہے۔ ولیمہ پہ میرے ساتھ ہوٹل چلے۔ جان شان بنانا چاہتا ہے۔" حاضرین محفل گلشن سمیت ایک مرتبہ پھر ہکا بکا ہو چکے تھے۔ یہ زین انہیں پل پل کیسے جھٹکے لگا رہا تھا۔

"تم ولیمہ کرو گے؟۔" زرافت نے انتہائی احمقانہ انداز میں بڑی سنجیدگی کے ساتھ پوچھا تھا۔ زین نے مسکین سا منہ بنا کر اثبات میں سر ہلایا۔

"آپ تو سال پہلے اپنا ولیمہ کر سکتے ہیں تو میں کیوں نہیں؟ کیا میں ولیمہ افورڈ نہیں کر سکتا؟" اب وہ زچ کر دینے والی نظروں سے حاضرین محفل کو دیکھ رہا تھا۔ وہ سب کے سب جیسے متحیر رہ گئے تھے، پھر جھنجھلانے لگے اور انہیں غصہ آگیا تھا۔

"کچھ دیر پہلے تمہاری بکواس؟"

"وہ رابیل کو ناپسند کرنا؟۔"

"ابو کے ساتھ تکرار؟۔"

"تمہارا انکار۔" آگے پیچھے، دائیں بائیں سے اتنے سوالوں کی یلغار آئی کہ وہ لحہ بھر میں بوکھلا گیا تھا۔ پھر جیسے کچھ سوچ سوچ کر بولنے لگا تھا۔ گویا یہ تمام گفتگو طے شدہ پلاننگ کے تحت تھی۔

"وہ تو محض ابو کی وجہ سے۔ میں رابیل کو بھی اتنی باتیں سنا آیا ہوں۔ ابو، ہم پر تھانے دار لگے ہیں۔ مرضی سے رشتے کرتے ہیں۔ مرضی کے فیصلے ٹھونستے ہیں۔ آخر ہم بھی تو جیتے جاگتے انسان ہیں۔" وہ کچھ سچ کہہ رہا تھا۔ اور کچھ جھوٹ کی ملاوٹ کر رہا تھا۔ دراصل وہ رات سے خود بھی اپنی کیفیات کو سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ آخر اسے ہوا کیا تھا؟ وہ تو اچھا بھلا دلہن لینے گیا

تھا۔ پھر یہ بے سکونی، اضطراب اور چبھن کہاں سے لے آیا؟ رات سے ایک جنگ سی چھڑی تھی۔

وہ رابیل کے سر پر آسمان گرا کر خود بھی مطمئن نہیں تھا۔ جانے اسے کیا ہو رہا تھا؟ آخر اس نے رابیل سے ایسی توہین آمیز باتیں کیوں کیں؟

ثوبیہ اور ثمن کے چہرے بگڑ گئے تھے۔ ماہم کا منہ بھی اتر گیا۔ گلشن کے تاثرات کیا تھے؟ وہ جان نہیں پایا تھا مگر اسے اتنی خبر ضرور تھی کہ کوئی بھی اس کے اچانک پینترا بدلنے پر خوش نہیں تھا۔ یہ پینترا بدلنا اس کی مجبوری تھی۔ کیونکہ ولیمہ کے بعد اسے ابو کی طرف سے کسی سخت رد عمل کا خطرہ تھا۔ وہ اسے عاق کر سکتے تھے؟ گھر سے بے دخل کر سکتے تھے؟ اور سب سے بڑی بات اپنا رسوخ استعمال کر کے اسے نوکری سے نکلوا سکتے تھے۔ آخر ابو نے اپنے شان دار کیریئر کے دوران بڑے بڑے وزیروں، سفیروں سے تعلقات جو بنا رکھے تھے۔ وہ اپنی جلد بازی پہ ایک دم تاؤ سا آگیا تھا۔ کیا ضرورت تھی اسے اتنی جلدی "اوقات" دکھانے کی؟ وہ کچھ انتظار تو کر سکتا تھا۔ جب تک ابو اپنی پراپرٹی ان تینوں بھائیوں میں تقسیم کر دیتے۔ اتنا پیسہ جمع کر رکھا تھا اور زین کبھی بھی اپنی بے عقلی، جلد بازی کے باعث اپنے حصے سے محروم رہنا نہیں چاہتا تھا۔

ابرار کریم بڑے نامی گرامی وکیلوں میں شمار ہوتے تھے۔ انہوں نے اپنے کیریئر کے دوران بڑا پیسہ کمایا تھا۔ جائز ناجائز، کچھ بھی نہیں سوچا... بے گناہوں کو سولی پہ چڑھا آتے اور گناہ گاروں کو پھانسی کے پھندے سے بھی بچا لیتے۔ انہوں نے زندگی میں صرف ایک کام ڈھنگ سے کیا تھا۔ ڈھیروں ڈھیر پیسہ کمانے کا۔ گھر میں وہ ایک سخت گیر سربراہ تھے۔ بچوں کو بلا وجہ مارنا، پابندیاں لگانا، جیب خرچ بند کر دینا اور یہ ان کی خوش نصیبی تھی جو بڑے دو بیٹے زوار اور زرافت ان سختیوں سے کچھ سیکھ گئے۔ زوار فارن سروس میں چلا گیا اور زرافت سول جج بن گیا تب ابرار کریم کی گردن میں کچھ اور سریا فٹ ہو گیا تھا۔ اس غرور کا سر تب جھکا

جب انہیں زین کی طرف سے پے در پے ناکامیاں دیکھنے کو ملیں۔ آئے دن ایک نئی شکایت۔ آئے دن کی لڑائیاں فساد جھگڑے... ابرار کریم جیسے تنگ آچکے تھے۔ پھر جو انہوں نے بچپن میں بارنے والا ڈنڈا اٹھایا تو زین کی ہڈی پسلی ایک کر دی تھی۔ یوں زین کی مار کھانے اور ابو کی مارنے کوٹنے گالیاں دینے کی روٹین بن گئی تھی۔ ان ہی حالات نے زین کو کچھ اور باغی کر دیا تھا۔ کئی کئی ہفتے دوستوں کے ساتھ سیر سپاٹوں میں گم رہتا۔ واپسی پہ ہر دفعہ کبھی کتا، کبھی بلی، کبھی طوطے، کبھی گھوڑے کا بچہ اور آخری دفعہ کوئل پکڑ لایا تھا۔ جانوروں سے اسے بہت انسیت تھی اور جانوروں کے ساتھ زیادہ وقت گزارتے گزارتے وہ بقول اپنے دوستوں کے "جانور" ہی بن چکا تھا۔

گھر میں اسے ماں سے خصوصی لگاؤ تھا۔ باقی بڑے دونوں بھائی اسے زہر سے بھی برے لگتے تھے۔ وجہ صرف اتنی تھی کہ وہ ابو کے منظور نظر تھے۔ ابو ہر محفل میں ان کی ذہانت، قابلیت اور عہدوں کا ذکر کرتے۔ باپ نے اسے ہمیشہ نظر انداز کیے رکھا تھا اس لیے وہ خود بھی باپ سے دور ہو گیا تھا۔ باپ اور بھائیوں سے متنفر ہو کر اس نے باہر دلچسپیاں ڈھونڈ لی تھیں۔

وہ زین کو ہی قصور وار ٹھہراتے تھے۔ اپنی غلطی تسلیم ہی نہ کرتے تھے حالانکہ جتنی توجہ بڑے دو بیٹوں پہ دی گئی تھی اس کے پاسنگ ——— بھی زین کو قابل اعتنا نہ جانا گیا تھا جو توجہ زوار، زرافت اور ماہم کو ملی تھی وہ زین کو نہ مل سکی۔

ان ہی دنوں ابرار کریم نے ایک بریگیڈیئر کی بیٹی سے زوار کا رشتہ طے کر دیا تھا۔ گلشن یہاں پر بھی دل مسوس کر رہ گئی تھیں۔ اپنی بھتیجی لانے کا خواب ادھورا رہ گیا تھا۔ پھر انہوں نے زرافت کی دفعہ دیر کا نہیں کی تھی۔ ثوبیہ کے گھر آتے ہی ثمن کو بیاہ لائیں۔ اس دفعہ بھانجی پہ نگاہ رکھی ہوئی تھی۔ میٹرک پاس ثمن اور گریجویٹ ثوبیہ... دونوں کے شوہر اعلا عہدوں پر فائز تھے۔ ایک لاکھوں کا جہیز لائی اور ساتھ اپنے باپ

کے عہدے کا غرور، مان اور تکبر بھی لائی۔ دوسری کے پاس نہ تو تعلیم تھی اور نہ ہی باپ کی طرف سے کوئی عہدے کا مان۔۔۔ موٹر مکینک کی بیٹی تھی جو جدہ میں بیس سال گزار کراب بے کار ہو کر پاکستان آیا تھا۔

ثوبیہ کا نخرہ آسمان کو چھوتا تھا۔ اپنے سامنے سب کو حقیر سمجھتی تھی۔ فوجی باپ کا بنگلہ، نوکر چاکر، شان و شوکت بار بار ۔۔۔ جتاتی، پرانے قصے سناتی، اس پل ثمن کا کلس کلس کر برا حال ہو جاتا تھا۔ ساس کا رجحان فطری طور پر ثمن کی طرف تھا۔ وہ بھانجی جو تھی مگر ثوبیہ کے سامنے بھی دبکی رہتیں۔ اس کے باپ کا عہدہ پھر اپنے بیٹے کی بھیجی گئی کمائی۔ ثوبیہ شادی کے پہلے سات سال ملکوں ملکوں شوہر کے ساتھ گھومتی رہی تھی پھر بچوں کی اسکولنگ، تعلیم و تربیت نے آنکھیں کھولیں تو واپس لوٹ آئی۔ زوار چاہتے تھے، بچے سکون کے ساتھ ایک ہی جگہ پر رہ کر تعلیم کے مدارج طے کریں۔ سو ثوبیہ کو دل مسوس کر ابرار منزل آنا ہی پڑا۔ ورنہ اتنے آزادانہ لائف اسٹائل کو چھوڑنا اسے کہاں گوارا تھا؟

زندگی اپنی ڈگر پر رواں دواں تھی جب اچانک لاڈلے دیور کی شادی کا شور اٹھا تھا۔ دو سال پہلے زین نے ایم بی اے کر ہی لیا تھا اور اب ابو کی "مہربانی" سے بڑی اچھی کمپنی میں جاب کر رہا تھا۔ تاہم وہ اب پہلے سے بھی زیادہ اکھڑ اور لاپرواہ ہو چکا تھا۔ اب بھی گھر کم کم آتا تھا۔ زیادہ وقت دوستوں کے ساتھ گزارتا تھا۔

گلشن کی خواہش تھی، ثمن کی بہن کو بہو بنانے کی۔ ثمن کی بھی دلی تمنا یہی تھی۔ آخر تانیہ نے زین کے لیے ہی تو اتنا پڑھا تھا ورنہ کب سے ابا اسے بیاہ چکے ہوتے۔ مگر یہاں کسی کی ایک نہیں چلی تھی۔ ابرار کریم، زین کا رشتہ طے کر آئے تھے۔ گلشن نے سنا تو بہت واویلا کیا۔ ثمن الگ سوگ مناتی رہی تھی۔ ماہم نے بھوک ہڑتال تک کردی۔ پر ابرار کریم کا فیصلہ نہ بدلا تھا۔ ان میں صرف ثوبیہ پر سکون تھی۔ زین کی شادی جہاں بھی ہو جاتی، اسے کوئی پرواہ نہیں تھی۔ ویسے بھی زین ثمن کے قریب تھا ثوبیہ کے نہیں۔ وہ کزن بھی تھی اور دوست بھی۔۔۔ دونوں میں بلا کی بے تکلفی بھی تھی۔ انتہائی بے باک قسم کی گفتگو آرام سے کر لیتے۔ ثمن، زین کی ہم عمر ہی تھی۔ دونوں بچہ بنے پھرتے تھے۔ لڑتے، جھگڑتے، روٹھتے، مانتے، سیرو تفریح کرتے۔۔۔ اس دوستی میں دراڑ تب پڑی جب زین کا رشتہ بالا ہی بالا طے پا گیا تھا۔ ثمن روتی جھگڑتی رہی۔ گلشن نے الگ شور مچایا۔

رابیل کی تصویر آگئی۔ بڑی دل نشین سی لڑکی تھی۔ گلشن کو ابرار کریم زبردستی لے گئے۔ رابیل کو دیکھ کر گلشن کا تفکر بڑھ گیا تھا۔ کامنی سی، من موہنی صورت والی، ٹھہر ٹھہر کر نرم نرم سا بولتی۔ انتہائی خوب صورت آواز، باوقار چال، خوش گفتار، کوئی ساحرہ سی لگتی تھی۔ گلشن کے اندر خطرات بڑھ گئے "ثوبیہ جیسی نہ ہو تو۔۔۔ اپنی "میں" اور "ذات" کے خمار میں قید ایک اور ثوبیہ۔۔۔ نہیں۔۔۔ نہیں، ہرگز نہیں۔۔۔ اپنے زین سے ہرگز نہیں بیاہی جائے گی۔ اتنی قابل ڈاکٹر۔۔۔ ہمیں تو دیوار سے چپکا دے گی۔۔۔ پہلے کیا ثوبیہ کم ہے۔ غرور، نخرہ توبہ توبہ۔۔۔ اس کے نخرے کون اٹھائے گا۔ صبح جائے گی رات کو آئے گی بہو گھر لانے کا فائدہ؟" گلشن نے جیسے رابیل کو دیکھ کر ہی ریجیکٹ کر دیا تھا۔ وہ ایک اور "ساحر" کو گھر لانا نہیں چاہتی تھیں۔ کم رو سی تانیہ بہتر تھی۔ "ثوبیہ اور ثمن کو اپنے حسن پہ بہت ناز تھا۔ ابھی تک اتراتی پھرتی تھیں۔

انہوں نے فیصلہ کر لیا تھا۔ زین کا رشتہ یہاں نہیں کرنا۔ تانیہ سے کرنا ہے۔ عمر بھر دب کے رہے گی۔

وہ جانتی تھیں زین کو کون سی چیز اس رشتے سے متنفر کر سکتی ہے؟

"بدصورتی، صرف اور صرف بدصورتی۔" انہوں نے جھوٹی سچی کئی قسم کی لگا کر سنائیں۔ "کالی سی ہے۔ معمولی سی۔۔۔ تمہارے ساتھ ہرگز نہ سجے گی۔ صرف ڈاکٹری کو چاٹنا ہے۔" پھر ان کے مسلسل رابیل کی شان میں قصیدہ پڑھنے پر آخر وہ بے زار اور متنفر ہو ہی گیا تھا۔

"مجھے تعلیم یافتہ نہیں، خوب صورت بیوی چاہیے۔ ساتھ چلتی ہوئی اچھی تو لگے۔ پورے جہان میں اپنا مذاق نہیں بنوانا۔"

وہ اکھڑ گیا۔ تصویر میں تو بہت اچھی لگ رہی تھی۔ حقیقت اس سے برعکس ہی ہوگی تب ہی تو امی نے اتنا شور مچا رکھا تھا۔ مگر ان ماں بیٹے کا شور کسی کام نہیں آسکا تھا۔ گلشن کی بھول ہی تھی۔ وہ رابیل جیسی لڑکی کو ناپسند کر رہا تھا۔ تانیہ کو تو کسی خاطر میں ہی نہ لاتا مگر شاید انہیں اپنی جذباتی بلیک میلنگ پر کافی بھروسہ تھا۔

زین ابرار آئیڈیلزم کا شکار تھا۔ اس کے ذہن میں شریک حیات کا ایک مخصوص خاکہ تھا۔ خوب صورت، شوخ، زندہ دل، ہنس مکھ، ہنگامہ پرور، ایڈونچرز کی شوقین۔۔۔ اسے خاموش، کم گو، سنجیدہ ٹائپ بیویاں پسند نہیں تھیں۔ اور ڈاکٹر رابیل یقیناً "ایک کم گو، خاموش طبع اور فلسفی ٹائپ لڑکی تھی۔ یہاں تک بھی ٹھیک تھا، مگر ایک ڈاکٹر۔۔۔ ذہین، فطین، افلاطون ٹائپ کی۔۔۔ وہ اس پر بلاوجہ کا رعب جمائے گی؟ اپنی ذہانت قابلیت کو "جتائے" گی۔ مگر اس نے سوچ لیا تھا۔ وہ اسے ۔۔۔ "ملاقات" میں ہی اوقات یاد دلا دے گا تاکہ عمر بھر وہ احساس کمتری کا شکار رہے۔ اپنے علم، حلم کو بھول جائے۔ مگر وہ اسے اس طرح ٹھکرائے گا یہ زین ابرار نے خود بھی نہیں سوچا تھا۔ اگرچہ وہ ابو کی دھونس اور زبردستی کے فیصلے پہ دل میں انتقامی جذبات بھی رکھتا تھا مگر جو کچھ شادی کی رات اس نے بولا تھا، وہ کسی انتقامی جذبے کے تحت نہیں تھا۔ اگر اس نے ایسا کرنا ہوتا تو شادی ہی نہ کرتا۔ ابو اسے دھمکا تو سکتے تھے، مگر مجبور نہیں کر سکتے تھے نہ تانیہ کے عشق میں مبتلا تھا۔ بلکہ تانیہ جیسی لڑکیاں اس کی سیکنڈ تو کیا تھرڈ چوائس بھی نہیں تھیں۔ اور نہ ہی ثوبیہ بھابھی جیسی مغرور، نخریلی ذات کو منفرد رکھنے والی۔ اسے ثمن جیسی بیوی چاہیے تھی زندہ دل، ہنس مکھ، شرارتی اور زندگی سے لمحہ لمحہ خوشی کشید کرنے والی۔ شوخ، چنچل، باعتماد۔ کیا تھا اگر اس کے پاس تعلیم نہیں تھی بھلا تعلیم زین ابرار کی ترجیح کب تھی۔

اس کے باوجود زین نے شادی کے لیے ناک بھوں چڑھا کر اور نہ نہ کرنے کے بعد رضامندی دے دی تھی۔ ویسے بھی اسے اتنا تو یقین تھا ابو کسی معمولی جگہ پر رشتہ نہیں جوڑیں گے۔ اس کی زندگی میں بہت ساری لڑکیاں آئیں، ٹھہریں گئیں۔ کوئی دل میں جم کر نہ دی تھی۔ اس نے آئیڈیل پہ لعنت بھیج دی تھی۔ یوں دلی خواہش نہ رکھنے کے باوجود اس کی شادی طے پاگئی تھی۔ پھر نہ اس نے ڈاکٹر رابیل سے ملنے کی کوشش کی اور نہ ہی گھر والوں نے ملاقات کرائی۔ یوں شادی کا دن بنا کسی خاص ہلچل کے آگیا تھا۔

زین بھی فطری طور پر تھوڑا پرجوش ہو گیا تھا۔ دوستوں کی چھیڑ چھاڑ، شرارتیں اور شوخیاں اسے زندگی میں اک نئے موڑ کا احساس دلا گئی تھیں۔ کچھ قدرتی فطری جذبے تھے۔ وہ اپنی زندگی میں شامل ہونے والی اس اجنبی لڑکی کے بارے میں سوچنے لگا تھا۔

کچھ خوشگوار سوچوں کے دوران بارات پی سی ہوٹل پہنچ چکی تھی۔۔۔ ایک دم شاندار انتظامات، شائستہ اطوار لوگ، بہترین کھانا۔۔۔ ایک دم زین کا موڈ بھی خوش گوار ہو گیا تھا۔ کھانے کے بعد طویل رسمیں شروع ہو گئیں۔ رابیل کی کزنز، فرینڈز، ہنستی مسکراتی اسٹیج پہ چڑھی خوش گپیاں کر رہی تھیں۔ رسموں کو اس نے بھرپور طریقے سے انجوائے کیا تھا۔ اس کی کزنز نما بہنوں سے چھیڑ چھاڑ کرتا رہا۔ ان کی باتوں کے برجستہ جواب دیتا رہا۔ مشال ایک دم مطمئن ہو گئی تھی۔ وہ پہلے کی طرح نک چڑھا نہیں لگ رہا تھا۔ یہی بات اس نے رابیل کو بھی جا کر بتا دی تھی۔ رابیل کی آنکھوں میں کچھ اور خوش رنگ خواب سج گئے تھے۔

رسمیں ختم ہوئیں۔ دلہن کو اس کے پہلو میں بٹھایا جاتا تھا۔ وہ بھی کچھ تجسس، جوش اور فطری سا اشتیاق لیے منتظر بیٹھا تھا۔ کچھ دیر بعد رابیل آنے والی تھی۔ جو کل تک اس کے لیے اجنبی تھی اور ابھی کچھ دیر پہلے بہت قریب ہو گئی تھی۔ اور پھر اچانک وہ ہو گیا جس کا زین ابرار کو گمان بھی نہیں تھا۔

اسے اچانک بالکل غیر متوقع اپنی ہی شادی میں اپنا

بھولا بسرا آئیڈیل نظر آگیا تھا۔ وہ جیسے سرتاپا منجمد ہوگیا تھا۔ آخر یہ اس کے ساتھ ہوا کیا تھا؟ کیا زندگی کے اس موڑ پہ ہی اس کے آئیڈیل نے ٹکرانا تھا؟

جب پیروں میں زنجیریں پڑگئی تھیں نہ وہ آگے بڑھ سکتا تھا نہ پیچھے ہٹ سکتا تھا۔ ایسا کیوں ہوا تھا؟ وہ اسے اب نظر کیوں آئی تھی؟

کم از کم آج کے دن تو وہ نظر نہ آتی.... پھر کبھی، کسی اور موڑ پہ دکھائی دے جاتی، ٹکرا جاتی.... مل جاتی۔ مگر آج کے دن تو ہرگز نہیں....

وہ آنکھیں کھولے جیسے اس کے ایک ایک نقش کو حفظ کر رہا تھا۔ وہ کیسے چل رہی تھی؟ وہ کیسے بول رہی تھی۔ وہ ہاتھ ہلا ہلا کر باتیں کرتی تھی۔ اس کا حسن کمال کا تھا۔ ایک سانچے میں ڈھلا ہوا۔ وہ دودھ اور گلاب کی گوندھ تھی۔ سراپا گلاب، حسین، شوخ، چنچل، پرجوش، بے تکلف، نٹ کھٹ.... وہ جیسے تراشا ہوا اس کا آئیڈیل تھی۔ جی چاہتا اسے دیکھتا ہی رہے۔ نہ آنکھیں تھکیں اور نہ وقت گزرے۔

وہ نظر کا زاویہ تک نہ بدل رہا تھا۔ جیسے آنکھ بھٹکے گی، نظر ہٹے گی تو سارا طلسم ٹوٹ جائے گا۔ وہ جیسے ایک جادو نگری میں پہنچ گیا تھا۔ ایک ایسا طلسم کدہ جس میں تراشا ہوا ایک ہی بت تھا.... زین ابرار کا پسندیدہ.... اس کا من چاہا۔ دل میں فٹ سے جمتا ہوا۔ دل میں اترتا ہوا۔ وہ اسے لفظ لفظ پڑھنا چاہتا تھا.... وہ اسے دل کھول کر حفظ کرنا چاہتا تھا۔

آس پاس کیا ہو رہا تھا؟ اسے کچھ خبر نہیں تھی۔ اس کی دنیا بدل چکی تھی۔ دل کی نگری میں جس نے بسیرا کرنا تھا۔ وہ آچکی تھی.... پھر کوئی رانیل کہاں جگہ بنا پاتی؟ یہ تو تقدیر نے ان کا ملاپ کر دیا تھا۔ گر جو نکاح سے پہلے وہ زین کو نظر آجاتی تو کیا یہ نکاح ہو پاتا؟ ہرگز نہیں.... کبھی نہیں....

وہ اتنی دیر سے کیوں آئی تھی؟ کاش کہ کچھ جلدی آتی، زین کا احساس زیاں بڑھنے لگا تھا۔ اس کے اندر گھٹن بھرتی چلی گئی تھی۔

پھر آس پاس کے منظر بدلتے رہے۔ رانیل کو کب لایا گیا؟ کیا کیا اور رسمیں ہوئیں.... اسے کچھ خبر نہیں تھی۔

وہ اسٹیج پہ آئی اور اتر گئی۔ جانے وہ کہاں چلی گئی تھی؟ کچھ کہے بغیر، کچھ سنے بغیر۔ وہ تو اس کا نام تک نہیں جانتا تھا۔ آخر وہ اتنی کم مدت کے لیے آئی ہی کیوں تھی؟

اس کے اندر آگ سی بھڑک اٹھی۔ زین کو لگا، وہ اندر لگی آگ سے سرتاپا جھلس جائے گا۔ تب وہ بے قرار سا اٹھ کر باہر نکل آیا.... اور پھر رخصتی کی رسم سے جان چھڑا کر بھاگ نکلا۔ جیسے خود سے بھی فرار حاصل کر رہا تھا۔

اور اس وقت پردے کو انگلیوں میں تھامے کھڑی رانیل زین کو کھڑکی میں سے دیکھتے ہوئے اس کی الگ سی منطق سن رہی تھی۔ پڑھی لکھی نادان اور احمق لڑکی۔ پھر سے خوش گمان ہونے لگی تھی۔ رات کا درد، کرب، اذیت بھول گئی۔ یہ بھی بھول گئی کہ اسے ہوا کیا تھا؟ وہ رات کو اتنا کٹھور، بے رحم کیوں ہو رہا تھا۔ اسے خبر ہی کیا تھی؟ اس کے شوہر پر کل رات آئیڈیل کا نشہ چڑھا ہوا تھا اگر جان جاتی تو یہاں ٹھہر پاتی؟

☆ ☆ ☆

تو گویا کل رات جو کچھ بھی ہوا تھا، محض باپ کے ساتھ چپقلش یا کسی رنجش کے تحت ہوا تھا؟ وہ غصہ میں اسی پر الٹ پڑا۔

زین اسے ناپسند نہیں کرتا.... وہ اسے ریجیکٹ نہیں کرتا۔ اگر ایسی بات ہوتی تو شادی ہی نہ کرتا۔ یقیناً "گھر والوں پہ آیا غصہ اس پر اتار بیٹھا اور اب.... شاید اسے احساس ہو رہا تھا۔ تب ہی تو گھر والوں کے سامنے اس نے وہ الفاظ کہے تھے.... ہلکے پھلکے نرم الفاظ....

دل میں سکون کی لہر اتری تو آنکھیں نیند سے بوجھل ہونے لگیں۔ پھر جیسے کھٹکے کی آواز پر ایک دم ہڑبڑا گئی۔ وہ آنکھیں مسلتی اٹھ گئی۔ گردن اور منہ سے چپکے بال پیچھے ہٹاتی وہ دوپٹا درست کرنے لگی تھی۔ آخر

کیسے اس غریب کی یاد آگئی؟ اس نے آنکھیں مسل کر دیکھنا چاہا تھا اور کوئی بہت عجلت میں اس کے قریب ڈھے گیا۔ آس پاس کسی مہنگے پرفیوم کی خوشبو چکرانے لگی تھی۔ اس کے حواس معطل ہونے لگے۔

"آپ...." وہ ہکلا کر رہ گئی۔ ایک پروفیشنل ڈگری ہولڈر۔ کامیاب ڈاکٹر، بہترین مقررہ ہوا کرتی تھی بولتی تو مقابل کو لاجواب کر دیتی اور اس وقت ایک مرد کے سامنے ہکلا رہی تھی۔ مرد عام جو نہیں تھا۔ شوہر بن چکا تھا۔ اور شوہر بھی ایسا جو پل پل حیران کر رہا تھا۔

"میں نے سوچا، اپنا ٹھیک سے دیدار کروا آؤں.... رات کو تو مجھے تپ چڑھی تھی.... نہیں، شاید نشہ چڑھا تھا۔ اپنی بک بک ہی کرتا رہا.... خیر، رات کو گولی مارو.... ابھی تم کھڑکی میں جھانک کر دیکھ رہی تھیں سو خود ہی اپنا حسین چہرہ دکھانے آگیا ہوں۔" زین نے جس شگفتہ انداز میں گفتگو کا آغاز کیا تھا۔ وہ ہکابکا ہی رہ گئی۔ کہاں تو یہی لب کل انگارے برسا رہے تھے اور آج؟ یہ زین کا کوئی اور ہی روپ تھا۔ اگرچہ اس نے رانی سے اپنے گزشتہ رویے کی کوئی معذرت نہیں کی تھی وضاحت یا دلیل نہیں دی تھی۔ کل رات کا ذکر ہی نہ کیا۔ یہ بھی نہ پوچھا کہ رانی کس کرب درد اور اذیت سے گزری ہے۔ اس نے رانی کی تعریف کی تھی آنکھیں رکھتا تھا پھر سامنے بیٹھی لڑکی کے سحر انگیز سراپے کو کیسے نہ جانچ لیتا۔

"اس ثمن کی تو میں ہڈی پسلی ایک کرتا ہوں۔ ایک نمبر کی جھوٹی ہے۔ کہہ رہی تھی ہم تو تانیہ سے بھی گئی گزری ہو۔ کہاں تانیہ کہاں تم۔" وہ اپنے ہی انداز میں تعریف کرتا تھا۔ یقیناً "یہ تعریف ہی تھی، مگر رانی کو اچھی نہیں لگی تھی۔

کچھ دیر بعد ثمن ٹرے اٹھا کر ناشتا لائی تھی۔ یقیناً" زین کے لیے ناشتا تھا مگر دو افراد کے لیے کافی ہوتا۔ ثمن نے ٹرے میز پہ رکھی تو زین نے آؤ دیکھا نہ تاؤ.... اٹھا کر پہلے اسے کشن مارا پھر تسلی نہ ہوئی تو زوردار دھموکا اس کی کمر میں جڑ دیا تھا۔ ثمن درد سے بلبلاتی رہ گئی تھی۔

"ذلیل کمینے! اب اپنی بیوی سے یہ مذاق کرو۔" جواباً" وہ بہت زور سے چلائی تھی۔

"یہ تمہارے جھوٹ کے بدلے میں۔" اس نے مسکرا کر ثمن کو اور بھی تپایا تھا۔

"اور تم کہاں کے سچے ہو؟ ایک نمبر کے فراڈیے جھوٹے۔" ثمن نے بھی ایک دھموکا اس کے بازو پہ جڑا تھا تب زین نے اس کا بازو دبوچ لیا۔

"اتنے "ٹبل" کیوں کھا رہی ہو....؟" وہ پھر سے چہکا تھا۔ دونوں کے درمیان زبردست تکرار ہوئی تھی اور یہ محض ٹریلر تھا۔ آئندہ آنے والے دنوں میں رانی نے دیکھ لیا تھا کہ زین اور ثمن کی بے تکلفی کہاں تک ہے؟ وہ ایک دوسرے سے لڑتے تھے اور پھر مرنے مارنے پہ اتر آتے۔ کچھ دیر تک لڑائی رہتی پھر بول چال بند اور اگلے ہی دن پھر سے صلح....

زین کو سمجھنا اتنا آسان نہیں تھا۔ پورا دن وہ بے انتہائی خوش رہا۔ رانی سے باتیں کرتا رہا۔ کبھی تعریف بھی کر دیتا۔ کھانا بھی اکٹھے کھایا تھا۔ پھر رات کو ولیمے کا فنکشن تھا۔ رات تک ٹھیک رہا۔ فنکشن کے دوران پھر سے موڈ آف ہوگیا۔ آخر اسے ہوا کیا تھا؟ اتنا بے چین، مضطرب اور بے قرار کیوں نظر آرہا تھا۔ جیسے اسے کسی کا انتظار تھا۔

۔ وہ بار بار داخلی دروازے تک جاتا۔ کبھی اندر کبھی باہر۔ اسٹیج پر بیٹھی رانی کا سارا دھیان زین کی طرف تھا۔ اور اس کے دل میں رات والے وسوسے پھر سے جڑ پکڑنے لگے تھے۔

رات کو فنکشن کے اختتام پر زین کا موڈ پھر سے بگڑ گیا تھا۔ وہ شعوری یا لاشعوری طور پر جتنا بھی چھپاتا، رانی کو اندازہ ہو رہا تھا وہ کسی کے انتظار میں تھا اور یہ انتظار چونکہ لاحاصل رہا تھا سو زین پہ جھنجلاہٹ سوار ہوگئی ہے۔

پھوپھو اور انکل اسے رسم کے مطابق گھر لے جانا چاہتے تھے، مگر ابرار کریم نے انکار کر دیا تھا۔ انہوں نے کہا۔ "رانی، زین کے ساتھ چکر لگا لے گی۔" دلیل معقول تھی۔ پھوپھو مطمئن ہوگئیں۔ نشال کی طبیعت

خراب تھی سو مشال بھی آ نہیں سکی تھی۔ اور حسن وہ تو کل کے فنکشن میں بھی نظر نہیں آیا تھا۔ اس نے دبی آواز میں پھوپھو کے کان میں پوچھا تھا۔

"حسن کہاں ہے؟ آیا نہیں؟" بولتے ہوئے اس کی آواز لڑکھڑا رہی تھی اور نگاہیں خود بخود ادھر ادھر بھٹکنے لگیں پھر اس کی نگاہیں ایک چہرے پر جم گئیں۔

"اسے آنا چاہیے تھا کیا؟" پھوپھو نے الٹا سوال کیا تھا۔ نظر چرا کر... اداس سا لہجہ، اداس آنکھیں۔ ایک ماں کی آنکھوں کو ایسا ہی ہونا چاہیے تھا۔

"میرا کیا قصور؟" وہ بجھی ہوئی آواز میں بولی تھیں۔ نگاہیں اب بھی اسی چہرے پر جمی تھیں۔ خوب صورت، بلا کا خوب صورت چہرہ تھا۔ نیلی نشیلی آنکھیں ایک رشتہ میں بندھنے کے بعد وہ زین کی محبت کی اسیر ہو گئی تھی۔

وہ جیسا بھی تھا، جس طرح سے بھی تھا... رابی نے دل و جان سے اسے قبول کر لیا تھا۔ وہ اس کی محبت میں پور پور ڈوب چکی تھی۔

کسی نے سچ ہی کہا ہے۔ محبت طویل قربتوں کا نتیجہ نہیں... بلکہ یہ وحی کی طرح کسی لمحے میں ہمارے دلوں میں اتر جاتی ہے۔ اس کے دل پہ بھی محبت وحی کی طرح اتر گئی تھی۔ کسی الہامی کیفیت میں، زین ابرار کبھی دھوپ بنتا، کبھی چھاؤں بنتا، پل میں تولہ ہوتا، پل میں ماشہ ہوتا، کبھی آگ۔ وہ جس طرح بھی اس کے ساتھ پیش آتا، وہ پھر بھی نرم اور جھکی رہتی۔ محبت انسان کو جھکنا سکھاتی ہے۔ نرم مٹی سے گوندھ دیتی ہے اور ظرف کو وسیع کر دیتی ہے۔

ویسے بھی بعض رشتے ایسے ہوتے ہیں۔ جنہیں برتتے ہوئے پل صراط پر سے گزرنے کا گمان ہوتا ہے۔ شاید زین ابرار کا رشتہ اور رابی کا اس کے ساتھ تعلق کچھ ایسا ہی تھا۔ وہ جیسے پل پل لمحہ لمحہ پگھلتی، سلگتی، تڑپتی پل صراط پر سے گزر رہی تھی۔ پھر بھی بہت خوش رہتی۔ یہ محبت اسے کبھی مایوس نہیں ہونے دیتی تھی۔ کبھی ناخوش نہیں ہونے دیتی تھی۔

حالانکہ ولیمہ والی رات بھی جیسے زین ابرار اس کے لیے امتحان بن گیا تھا۔ وہ ہوٹل سے جلدی گھر آ گیا۔ سرخ آنکھیں، بگڑے تیور لیے اور وہ دن بھر کی ساری نرمی، حلاوت اور قربت کو بھلا کر ایک مرتبہ پھر رابی کے وجود کی دھجیاں بکھیرنے لگا تھا۔

شادی کی دوسری رات بھی وہ اس پر چیخ رہا تھا۔

"تم میری زندگی میں عذاب بن کر داخل ہوئی ہو۔ کون سی منحوس گھڑی تھی جب میں نے تم سے نکاح کیا تھا۔"

وہ اپنا غصہ، ناکامی اور انتظار کا زہر نکال رہا تھا۔ رابی ایک مرتبہ پھر ششدر رہ گئی تھی۔ آخر اسے رات کو ہو تا کیا تھا؟

اس کے لیے زین ابرار کے رویے کو سمجھنا بہت مشکل تھا۔ وہ دھوپ، چھاؤں، نرم گرم، بارش، بادل کا روپ لیے ہوئے تھا۔ بلاوجہ اور بے سبب جھگڑتا تھا۔ سب کے سامنے بے عزت کر دیتا۔ ذرا ذرا سی بات پہ بھڑک اٹھتا تھا۔ بغیر وجہ کے طوفان اٹھا دیتا۔ جواباً" رابی خاموش ہو جاتی۔ اس کی خاموشی سے وہ کچھ اور شیر ہو جاتا تھا۔ وہ اسے رابی کی کمزوری سمجھتا تھا۔

وہ جذباتی یا فطری تقاضوں سے مغلوب ضرور ہوتا تھا، مگر یہ کیفیات عموماً" لمحاتی ہوتی تھیں۔ انہی گنے چنے لمحوں میں وہ رابی کو کبھی کبھار سراہ بھی دیتا تھا۔ کبھی قربت کے لمحوں میں وہ اس سے سوال ضرور کرتی تھی۔

"آخر آپ کو ہوتا کیا ہے؟ کوئی پرابلم ہے تو شیئر کر لیں۔" تب جواباً" وہ خود بھی الجھ جاتا، کبھی گم صم ہو جاتا اور کبھی جھڑک دیتا۔

"کچھ نہیں... پتا نہیں... میں ایسا ہی ہوں۔ اسی حال میں قبول کر لو۔" وہ اس پہ جھک جاتا، ہونٹوں پہ ہاتھ رکھ دیتا گویا مزید سوالوں کی اجازت نہیں ہے تب وہ خاموش ہو جاتی تھی، مگر اس کے اندر ان گنت سوالوں کا شور تھا۔ اور یہ شور ہر گزرتے دن کے ساتھ

بڑھتا جا رہا تھا۔ پھر بھی وہ مہر بہ لب تھی۔ زیادہ سوال کرتی تو وہ "آپے" میں نہیں رہتا تھا۔ فوراً" اوقات دکھا دیتا۔

شادی کو سولہ دن گزر چکے تھے۔ اس دوران وہ اب تک گھر والوں سے گھل مل نہیں سکی تھی۔ نہ زین نے کوئی کوشش کی اور نہ گھر والوں کے موڈ ٹھیک ہوئے تھے۔ وہ پورا دن کمرے میں رہتی تھی اور پچھلی کھڑکی کو کھول کر زین کے پالتو جانوروں کو دیکھتی رہتی۔ اسے گولڈی، کرسٹی اور ڈینی میں سے صرف کوئل پسند تھی۔ امرود کی شاخوں سے جھولتی ہوئی۔ کبھی اپنے بچوں کے لیے دانہ چن کر لاتی، کبھی انہیں گھونسلے میں لے کر بیٹھ جاتی۔ اپنے پروں میں چھپا کر، کبھی چونچ اس کے سروں میں مار کے لاڈ جتاتی۔ اسے کوئل کی کوک بہت پسند تھی۔ اس کی ساس کو نہ کوئل بھاتی نہ رابیل۔ اسے دیکھ کر کچھ نہ کچھ ضرور بڑبڑاتی تھیں۔ کوئی تلخ جملہ، کوئی کڑوی بات، جسے سن کر رابیل خفیف سی ہو جاتی تھی، مگر اس کی جیٹھانیاں بہت حظ اٹھاتی تھیں۔ ثمن، ساس کا پورا پورا ساتھ دیتی تھی جبکہ ثوبیہ محض طنزیہ انداز میں مسکراتی رہتی تب وہ اپنے آپ میں کٹ کر رہ جاتی تھی۔

ان سولہ دن میں زین نے کوئی سولہ ہزار رنگ دکھائے تھے اس کا موڈ بہتر ہوتا مگر جب گلشن رابیل کے بارے میں کوئی فتویٰ دیتیں تب اسے بارات کا دن یاد آ جاتا۔ وہ جادو نگری سے آئی لڑکی، کسی شہزادی کی چال چلتی، ہرنی جیسی، کبھی قلانچیں بھرتی، مسکراتی، کھلکھلاتی۔ پھر اسٹیج پہ آئی اور یک دم کسی بت کی مانند ساکت ہو کر پلٹ جاتی اور کبھی دوبارہ نظر نہ آتی۔

☆ ☆ ☆
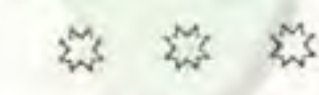
اس نے شریک حیات کے روپ میں ایسی ہی لڑکی کے خواب دیکھے تھے۔ بولڈ، لبرل، شوخ، چنچل، ہنگامہ پرور... زندگی سے بھرپور... جیسے زندگی اسے دیکھ کر ہی دھڑکتی تھی۔

جب وہ ہوٹل میں داخل ہو رہی تھی اور ملنے ملانے والوں سے حال احوال پوچھ رہی تھی تب زین اسے حفظ کر رہا تھا۔ دنیا سے بیگانہ ہو کر اسے دیکھ رہا تھا۔ جنونی انداز میں، پاگل پن کی حد تک... اگر اس کے اندر آگ لگی تھی تو وہ لڑکی بھی انجان نہیں رہ سکتی تھی۔

عورت تو اپنی طرف اٹھتی مرد کی ہر "نگاہ" کو جان لیتی ہے۔ پھر وہ کیسے بے خبر رہ جاتی؟ وہ بے خبر تھی ہی نہیں۔ جب وہ اسٹیج پہ آئی تب سراپا حیرت بن گئی تھی۔ اس نے نیلی آنکھوں کے شعلوں کا ایک ایک رنگ پہچان لیا تھا۔ وہاں کیا کچھ نہیں تھا؟ ایک آگ لگاتا احساس، ایک جنونی جذبہ... ایک انہونا عشق... ایک لپک سی تھی جو سامنے کھڑی لڑکی کے اندر تک اتر گئی۔ تب وہ وہاں ٹھہر نہیں پائی تھی۔ نیلی آنکھوں کے سحر سامنے ٹھہرتی بھی کیسے؟ وہ الٹے قدموں لوٹ گئی تھی۔ جانے اسے کس کس نے پکارا تھا؟ مگر وہ رکی نہیں... بھاگ گئی۔ نیلی آنکھوں کی تپش سے گھبرا کر بھاگ گئی اور جب وہ نظر سے اوجھل ہو گئی تب ہر رنگ زین ابرار کی آنکھوں سے مٹ گیا تھا۔ وہ جیسے بجھ گیا۔ راکھ کا ڈھیر ہو گیا جیسے زندگی سے ہر خوشی کا کیف آور لمحہ پھسل کر کھائی میں جا گرا تھا۔

اسے پہلو میں بیٹھی بیوی بھول گئی۔ اپنا منصب، وقار، رشتہ سب کچھ بھول گیا۔ اب بھی وہ کیف آگیں، سرور انگیز، پر لطیف، دل کے تاروں کو چھیڑتا "لمحہ" یاد کرتا تو وہ سب کچھ بھول جاتا تھا۔ دنیا، لوگ، رشتے اور رشتوں کا تقدس بھی۔ اسے پہلو میں چپکے چپکے بے آواز روتی بیوی تک بھول جاتی تھی۔ یاد رہتا تو بس اتنا... وہ ایک ساحرہ کی ہرنی جیسی آنکھوں میں ہمیشہ کے لیے ڈوب گیا تھا۔

اور جب اندر کی گھٹن، حبس، آگ اور تپش سے گھبرا جاتا تھا تب بے سبب رابیل سے الجھ پڑتا۔ جھگڑتا، لڑتا۔ طوفان برپا کر دیتا تھا۔

اکثر اسے اپنے رویے پہ پشیمانی بھی ہوتی تھی۔ تب وہ معذرت تو نہیں کرتا تھا۔ تاہم ازالہ ضرور کر دیتا تھا۔ کبھی اسے باہر لے جاتا، ہلکی پھلکی سی تفریح، تھوڑا باہر

کا ہنگامہ خیز ماحول اور زین کی سنگت اور کبھی کمرے کو ہی خوابناک بنا دیتا۔ نرم اور گرم ماحول' اپنائیت اور محبت سے لبریز... وہ جانتا بھی تھا کہ غلط کر رہا ہے۔ پھر بھی کرتا تھا' اسے خبر تھی وہ رابیل سے زیادتی کر رہا ہے پھر بھی رکتا نہیں تھا۔ سنبھلتا نہیں تھا۔ یہ سراب قسم کا خواب اسے سنبھلنے دیتا ہی نہیں تھا۔

ان دنوں رابیل پہ یاسیت کی دھند چھائی رہتی تھی۔ کوئل کے سارے بچے ایک ایک کرکے مر گئے تھے اور پھر ایک شب بہت تیز آندھی آئی تھی۔ بچوں کے غم میں روتی' تڑپتی کوئل اگلی صبح امرود کے پیڑ نیچے مردہ حالت میں پائی گئی تھی۔ رابیل کو کوئل کے مر جانے کا بہت دکھ تھا۔ اب پچھلے صحن میں کوئل کی کوک نہیں سنائی دیتی تھی۔ بس بلی اور کتے کی ناپسندیدہ غراہٹیں سنائی دیتی تھیں۔

ایک آدھ دن مزید گزرا تو رابیل نے خود ہی ڈھیٹ بن کر میکے جانے کی اجازت چاہی تھی۔ اس نے زین سے پوچھا تو وہ لاپروائی سے بولا۔

"امی سے پوچھ لینا۔"

وہ دل مسوس کر رہ گئی تھی۔ اب امی سے اجازت لینے کا پہاڑ کون سر کرتا؟ مگر اسی رات ساس صاحبہ نے اسے اپنے کمرے میں طلب کر لیا تھا۔

"بیٹھو یہاں۔" وہ جو صوفے پر بیٹھنے لگی تھی' ان کا حکم نامہ سن کر پلنگ کی طرف آ گئی۔ خاموش اور سر جھکائے ہوئے۔ کافی وقت اسی خاموشی کی نذر ہو گیا تھا۔ جانے گلشن کس قسم کی سوچ بچار میں گم تھیں۔

"آپ نے بلایا تھا۔" رابی کو خود ہی پہل کرنا پڑی تھی۔ یہ معنی خیز قسم کی خاموشی اسے الجھن میں مبتلا کر رہی تھی۔

"ہاں۔" انہوں نے لب کشائی کی۔ پھر سائیڈ ٹیبل پہ رکھا اخبار اور عینک اٹھا کر بولیں۔

"کب تک دولہنا پار کھنا ہے؟" ان کا سوال چبھتا ہوا اور لہجہ عام سا تھا۔ جبکہ رابی تو بھونچکا سی رہ گئی تھی۔

"سارا دن کمرے میں بند رہنا دولہناپے میں ہی شمار ہوتا ہے۔" گلشن کا انداز خاصا برہم تھا۔ مگر انہوں نے کب اسے بلوایا تھا باہر؟ وہ خود سے جھجک کے باعث نہیں آتی تھی۔ ان جیسے منہ پھٹ لوگوں سے کوئی امید نہیں تھی کہ اسے باہر نکلنے کے جرم میں "بے شرم" کہہ دیتے۔

"بہر حال بہت دن ہو گئے چونچلے کرتے... اب روٹین لائف کو شروع کرو۔ ثمن اور ثوبیہ کب تک زین کی ذمہ داری اٹھائیں گی؟ گھر کے کام کاج میں حصہ لو' ناشتا اپنی باری پہ بنایا کرو۔ اور ہاں تمہارا اسپتال کب سے شروع ہو رہا ہے؟ رات کو بھی ابرار پوچھ رہے تھے۔" وہ تیز لہجے میں بولتی لمحہ بھر کے لیے رک گئی تھیں۔ تب رابی نے گہرا سانس کھینچ کر اعصاب ڈھیلے چھوڑ دیے تھے۔ تو گویا اسے گھر کا فرد تسلیم کر ہی لیا گیا تھا۔ وہ محض اتنی سی بات پہ ہی خوش ہو چکی تھی۔ کم از کم اندر کے گھٹن زدہ ماحول سے باہر نکلنے کی آج آزادی تو مل گئی تھی۔

"منڈے کو جوائن کرنا ہے۔" رابی نے سر جھکا کر نرم آواز میں بتایا۔

"یعنی پرسوں سے؟ بیچ میں دو دن ہیں... تم اپنی پھوپھو کی طرف چکر لگا آنا... فون آ رہے تھے ان کے... میں نے تو کہا بیٹی کا دل سسرال میں لگنے دیں۔ خیر' ایک دفعہ مل آؤ۔ پھر فرصت کہاں ملے گی؟ اسپتال' گھر' کام کاج... زین کے اپنے ہی بے شمار کام ہوتے ہیں۔ اب تم آ گئی ہو تو سنبھال لینا۔ ثمن نے تو بہت خدمت کر لی۔ بے چاری کے اپنے بھی بچے ہیں۔ ثمن بتا دے گی تمہیں جو بھی تمہارے حصے کے کام ہوئے۔ ناشتا تم بناؤ گی۔ دوپہر کا ثمن اور ثوبیہ کر لیں گی جبکہ رات کا بھی تمہیں کرنا ہو گا۔ وہ چائے پہ اہتمام کرتی ہیں چار بجے۔ الگ الگ سب کی فرمائشیں... پھر برتن وغیرہ' کچن کی صفائی ستھرائی۔ مل جل کر ہی کرنا ہوتا ہے۔ جوائنٹ فیملی سسٹم کے فائدے تو بہت ہیں۔ اب باہر نکلا کرو' اپنی الگ سے ڈیڑھ انچ کی مسجد بناؤ گی تو کیسے

گھل مل سکو گی...."

وہ ایک ہی سانس میں جیسے اس کا حلق خشک کرتی اخبار کی طرف متوجہ ہو گئی تھیں۔ گویا اسے اب چلے جانے کی اجازت یا اشارہ دے دیا گیا تھا۔ اس کے اعصاب پہ تھکن سی سوار ہو گئی۔ یہی باتیں اگر وہ نرمی اور اپنائیت سے کر لیتیں تو کیا فرق پڑ جاتا۔ اتنے کٹھور اور خشک لہجے میں حکم... سنا رہی تھیں جیسے وہ ان کی بہو نہیں' زر خرید غلام تھی۔

وہ بوجھل دل لیے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

زین آفس سے آ کر دوستوں سے ملنے ملانے نکل جاتا تھا۔ رات گئے اس کی واپسی ہوتی تھی۔ تب تک رابیل اس کا انتظار کر کر کے تھک چکی ہوتی۔ آج بھی معمول سے کچھ ہٹ کر نہیں ہوا تھا۔ زین رات گئے تھکا ہارا گھر آیا۔ وہ آج سونا نہیں چاہتی تھی۔ وہ اسے کل کے پروگرام کا بتانا چاہتی تھی۔ کیا وہ اس کے ساتھ پھوپھو کی طرف جائے گا؟ وہ گھر آ ہی گیا تھا۔ رابیل کو جاگتا پا کر وہ کچھ چونک گیا تھا۔ پھر شرٹ کھینچ کے اتارتا حیرت سے بولا۔

"ابھی تک سوئیں نہیں؟" پھر ٹراؤزر اٹھا کر واش روم میں گھس گیا۔

"آپ سے بات کرنا تھی۔" وہ باہر آیا تو رابیل نے سنجیدگی سے کہا تھا۔ وہ بغیر چونکے تولیے سے منہ خشک کرتا بیڈ پہ ڈھے گیا۔

"کیسی بات؟" اب وہ ریموٹ ڈھونڈتا ٹی وی آن کر رہا تھا۔

"کل مجھے پھوپھو کی طرف لے جائیں گے کیا؟" رابیل نے بغیر تمہید باندھے ذرا چڑ کر کہا تھا۔ وہ اس کے بجائے ٹی وی کی طرف جو متوجہ تھا۔

"ہرگز نہیں... ادھر سے کسی کو بلوا لینا یا خود چلی جانا اور یقیناً" تم نے یہی بات کرنا تھی۔ اب بات ہو چکی سو تم بھی سونے کی تیاری پکڑو... میں بھی سوتا ہوں۔ صبح پنڈی کے لیے نکلنا ہے۔" وہ آن کی آن میں ٹی وی بند کرتا سختی سے بولتا اسے ہکا بکا چھوڑے کروٹ بدل کر سونے کی کوشش کرنے لگا تھا جبکہ رابیل محض اپنا

سامنے لے کر رہ گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

وہ شادی کے بعد پورے انیس دن سسرال میں گزار کر آئی تھی۔ زین صبح سویرے نکل گیا تھا۔ صبح اسے زرافت بھائی پھوپھو کی طرف ڈراپ کر گئے تھے۔ وہ بغیر اطلاع دیے آئی تھی۔ سو گھر میں کسی کو خبر نہیں تھی۔ فی الوقت سب آرام کر رہے تھے۔ پورا گھر بھاں بھاں کر رہا تھا۔ اتنی خاموشی اور سناٹا تھا کہ حد نہیں۔ حالانکہ نشال کے گھر ہوتے خاموشی اور سناٹا ہو یہ الگ ہی دو باتیں تھیں۔ وہ بہت ہنگامہ پرور تھی۔ پھوپھو کی ڈانٹ' غصے' جھڑکیوں کے باوجود صبح سویرے فل والیوم میں میوزک لگا لیتی تھی۔ اٹھتی بہت سویرے تھی۔ جاگنگ کرتی' ایکسر سائز کرتی' جوس پیتی اور میوزک سنتی تھی۔

دراصل وہ اسد انکل کی بہت لاڈلی تھی۔ ان ہی کے لاڈ پیار نے اسے بہت بگاڑ ڈالا تھا۔ سال کے چھ مہینے وہ بھی اپنی پھوپھی کے پاس رہتی تھی۔

وہ شیشے جیسے چمکتے گھر کی دیواروں سے لپٹی اپنائیت محسوس کرتی بہت ہلکی پھلکی ہو رہی تھی۔

وہ بہت کم سنی میں پھوپھو کی شفیق گود میں منتقل ہو گئی تھی۔ امی بابا کے بعد اس کا بھری دنیا میں پھوپھو کے علاوہ کوئی رشتہ نہیں تھا۔ سو پھوپھو اسے ہمیشہ کے لیے اپنے گھر لے آئی تھیں۔ یہ وہ گھر تھا جہاں رابی نے اپنی زندگی کا بڑا سنہرا دور گزارا تھا۔ پھوپھو اور باپ جیسی محبت کرنے والے اسد انکل کے شفیق سائے تلے۔

انکل نے کبھی اسے اپنی اولاد سے الگ نہیں سمجھا تھا۔ اسے بے انتہا محبت' توجہ اور اعتماد دیا تھا۔ اس کی تعلیم پہ پیسہ پانی کی طرح بہایا تھا۔ اور پیسہ تو انہوں نے اپنے تینوں بچوں پہ بھی بہایا تھا مگر۔

اگرچہ انہیں اپنے تینوں بچوں سے بھی بے انتہا محبت تھی مگر نشال اور حسن میں ان کی جان بند تھی۔ دو بیٹیوں کے بعد بہت منتوں مرادوں سے پیدا ہونے والا

حسن عمر اپنی ماں اور باپ کی آنکھوں کا تارا تھا۔ کچھ اس کی شکل اتنی پیاری تھی کہ راہ چلتے لوگ بھی اسے مڑ مڑ کر پیار کرتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ حسن کو سب سے زیادہ پھوپھو اور انکل کے بعد رانی اور مشال نے چاہا تھا۔ اس منے سے گورے گورے گڈے میں ان کی جان بند ہونے لگی تھی۔

حسن تھوڑا اور بڑا ہوا تو رانی اور مشی نے اسے اپنے کمرے میں سلانے کی ضد کرنا شروع کردی تھی۔ پھر حسن درمیان میں سوتا اور سائیڈوں پہ وہ دونوں۔ اسے دیکھ دیکھ کر جب تھک جاتیں تو سوجاتیں۔ جس قسم کا انہیں حسن سے جنونی پیار تھا۔ ایسا پیار نشال نہیں کرسکتی تھی۔ اسے تو خود محبت وصولنے کی عادت تھی، وہ کسی سے محبت کر نہیں سکتی تھی۔ یوں حسن بہت کم عمری میں ہی رانی اور مشی کے وجود کا عادی ہوگیا تھا بلکہ مشی سے بھی زیادہ رانی کے ساتھ چپکا رہتا تھا۔

وہ پڑھائی میں بہت آگے تھی۔ اللہ نے اسے ذہانت کی دولت سے مالا مال کر رکھا تھا۔ کچھ وہ محنتی بھی بہت تھی۔ دل لگا کر پڑھتی اور ہر سال انعامات کا ڈھیر لے کر آتی۔ اور تب اسد انکل کا سینہ پھول جاتا۔ جو کچھ وہ اپنے بچوں سے چاہتے تھے۔ وہ رانی پورا کررہی تھی، ہر خواب ہر تمنا۔

انکل کی خواہش تھی ان کے بچے بہت سا پڑھیں اور بڑی بڑی پروفیشنل ڈگریاں لیں۔ مگر ان کے تینوں بچوں نے اس معاملے میں خاصا مایوس کیا تھا۔

نشال نے اولیول کے بعد پڑھائی کو خیرباد کردیا۔ پڑھنے سے اس کے سر میں درد ہوتا تھا۔ آنکھیں پانی سے بھر جاتیں۔ کتابوں پر لکھے لفظ نظر ہی نہیں آتے تھے۔ پڑھنا اس کے لیے کسی عذاب سے کم نہیں تھا۔ البتہ کانونٹ سے پڑھ کر آئی تھی۔ فر فر انگریزی بولتی، نخرے آسمان کو چھوتے تھے۔ اسپورٹس کی اچھی کھلاڑی تھی۔ جینز شرٹ پہن کر کلب بھاگ جاتی۔ بیڈمنٹن کی پریکٹس کرتی تھی۔ سائیکلنگ کرتی، فٹبال کھیلتی۔ حسن، نخرے اور نزاکت میں بے مثال تھی۔ پھر مشی تھی، شکل وصورت میں نشی سے بہت کم اور تعلیم میں بھی کم۔ اس نے روپیٹ کر میٹرک کیا تھا اور پھر نشی کے نقش قدم پر چل کر آگے پڑھنے سے توبہ کرلی تھی۔ تاہم وہ بلا کی سگھڑ تھی۔ اور اس نے بے شمار کورسز کر رکھے تھے۔ فلاور میکنگ، کوکنگ، بیکنگ اور بھی بے شمار۔ اسد انکل مشی سے بھی مایوس ہوچکے تھے۔ بچوں پہ زور زبردستی کے قائل نہیں تھے۔ اسی لیے بیٹیوں کی تعلیم پر صبر کرچکے تھے۔ ویسے بھی فر فر انگریزی بولتی، ہر ٹاپک پہ لاجواب معلومات رکھنے والی نشی اور مشی کہیں سے بھی کم تعلیم یافتہ نہیں لگتی تھیں۔ اصل دھچکا انکل کو حسن نے پہنچایا تھا۔ وہ دونوں بہنوں سے بڑھ کے پڑھائی چور تھا۔ گیمز کا شوقین، اسپورٹس کا دیوانہ، مگر کتابوں کو دیکھ کر اس پر وحشت سوار ہوجاتی تھی۔ انکل ٹیوٹر بدل بدل کر اور اسکول بدل بدل کر تھک گئے تھے۔

اور ان تینوں بھائی بہنوں سے رانی بہت آگے نکل گئی تھی۔ اس نے میٹرک میں ٹاپ کیا تھا۔ ایف ایس سی میں بھی ٹاپ پہ رہی تھی۔ اور انٹری ٹیسٹ کلیئر کر کے وہ اسد انکل کے دل میں بہت اونچا مقام پاگئی تھی۔

میڈیکل کی ٹف پڑھائی شروع ہوتے ہی وہ دنیا سے بیگانہ ہوگئی تھی مگر اسی دوران حسن نے نیا شوشا چھوڑ دیا تھا۔ وہ سیکنڈری کلاسز میں تھا اور ابھی تک کوئی ٹیوٹر اسے جم کر پڑھا نہیں سکتا تھا۔ اور بالآخر اس نے اسد انکل کو بتادیا کہ اگر وہ چاہتے ہیں پہلی دفعہ میں ہی حسن میٹرک کلیئر کرجائے تو رانی سے کہیں وہ اسے پڑھائے۔ اسد انکل اس کی ضد کو مان گئے اور انہوں نے رانی سے بات بھی کرلی۔

وہ اسد انکل کو کبھی انکار کر ہی نہیں سکتی تھی۔ وہ اس سے زندگی بھی مانگ لیتے وہ تب بھی حاضر کردیتی۔ اسد انکل سے کچھ ایسی ہی عقیدت بھری محبت تھی اسے۔ ان کے احسان، محبت، پیار اور خلوص کا اس کے پاس کوئی بدل نہیں تھا۔ یوں حسن اس کی ایک مرتبہ پھر ذمہ داری بن گیا تھا۔

اس کا بہتر رزلٹ رانی کی اپنی کامیابی تھی۔ اسے اسد انکل اور پھوپھو کے سامنے جوابدہ ہونا تھا اور حسن پڑھتا کم جبکہ شکوے زیادہ کرتا تھا۔ ہر روز رات سات بجے سے لے کر نو بجے تک رانی کے پاس پڑھتا تھا۔ ایک گھنٹہ پڑھائی اور باقی کا وقت مختلف قسم کے شکووں میں گزرتا تھا۔

”تم مجھ سے دور ہوگئیں رانی! پہلے کی طرح مجھے وقت نہیں دیتیں۔“ ہر دو منٹ بعد نیا شکوہ تیار ہوجاتا تھا۔

”پہلے میرے ساتھ بیڈمنٹن کھیلتی تھیں، گیمز کھیلتی تھیں۔ اتنا خیال رکھتی تھیں میرا۔ مگر اب۔“ وہ اداس نظر آتا تھا۔ اگرچہ وہ ٹھیک ہی تو کہتا تھا۔ ایک سال پہلے تک وہ اس کے ناز اٹھاتی تھکتی نہیں تھی۔ مشی اس کے لیے پراٹھے بناتی اور رانی گیٹ تک اس کے پیچھے پیچھے بھاگ بھاگ کر نوالے منہ میں دیتی تھی۔ اس کے ناشتے کھانے سے لے کر کپڑوں تک۔

وہ اس کے ہاتھوں سے نوالے کھا کھا کر 9th اسٹینڈرڈ تک پہنچا تھا۔ اس دوران رانی کا میڈیکل کالج میں ایڈمیشن ہوگیا تھا۔ وہ پڑھائی میں مصروف ہوگئی تھی تاہم اس کے اندر سے حسن کی محبت کم نہیں ہوئی تھی۔ مگر اس کے پاس وقت نہیں ہوتا تھا۔

رانی نے تین سال حسن کو پڑھایا تھا۔ رانی اسے ایف ایس سی کے بعد میڈیکل میں جانے سے منع کرتی رہی تھی۔ اس کا خیال تھا حسن میڈیکل کی ٹف پڑھائی نہیں کرسکے گا۔ مگر حسن پہ ضد سوار تھی، وہ رانی کی طرح ڈاکٹر ہی بننا چاہتا تھا۔ وہ ایسا کیوں کررہا تھا؟ کسی نے پھر بھی توجہ نہیں دی تھی۔ وہ ایک لاپروا، غیر ذمہ دار اور بہت پڑھائی چور قسم کا اسٹوڈنٹ تھا۔ جس نے بھی اس کے انٹری ٹیسٹ کلیئر کرنے کی خبر سنی، حیران رہ گیا۔ بالآخر رانی کی ان تھک محنت رنگ لے آئی تھی۔ اس بہت بڑی خوشی کے ساتھ ایک بھیانک سا واقعہ بھی رونما ہوا تھا۔ ہاں اسے واقعہ ہی کہا جاسکتا تھا۔ رانی کی زندگی کا سب سے مشکل ترین وقت۔ ڈپریشن، ٹینشن، بڑے عذاب ناک دن تھے۔ بڑی اذیت ناک راتیں تھیں۔ وہ جیسے گھر کے ہر فرد سے نظریں چراتی پھرتی تھی۔ حسن عمر نے اس کے لاڈلے دلارے شہزادے نے اسے مجرم نہ ہوتے ہوئے بھی ہر ایک کی نگاہ میں مجرم بنادیا تھا۔

وہ سوچتی تو اندر بھانبھڑ جلنے لگتے تھے۔ آخر حسن کی اتنی جرات کیسے ہوئی؟ پھر اسے خیال آتا، حسن کو خود سے بے تکلف بھی تو رانی نے ہی کیا تھا۔ رانی نے حسن کو بگاڑا بھی تو خود ہی تھا۔ اگر وہ کتاب زندگی کے پچھلے ابواب کھولتی تو ہر ہر صفحے پر اس کی حسن کے ساتھ والہانہ محبت کے قصے بکھرے ہوئے نظر آتے۔

اتنی محبت، توجہ، لگاؤ کا کوئی تو نتیجہ آخر نکلنا ہی تھا۔ اور شاید اس کا ذہن ماضی کی طرف پلٹنے ہی لگتا جو کچن سے آتی گنگناتی خوبصورت بھاری مردانہ آواز اسے اپنی طرف متوجہ نہ کرلیتی۔ وہ لمحہ بھر کے لیے ساکت ہوگئی تھی۔

مجھ سے مانگے گا تیرے عہد محبت کا حساب
تیرے ہجر کا دہکتا ہوا محشر جاناں
یوں تیرے غم سے شکستہ ہے دل کا مزاج
جیسے ٹکرائے کسی شیشے سے پتھر جاناں

وہ ننگے پیر کچن میں کھڑا شیک بنا رہا تھا۔ ٹراؤزر اور سلیولیس شرٹ پہنے۔ اس کا سارا دھیان کٹے ہوئے آموں کی طرف تھا۔ پھر بھی۔ پھر بھی جیسے ہوا کے دوش پہ لہراتی ایک خوشبو نے اس کے گرد حصار باندھ کر چونکا دیا تھا۔ کیا یہ خوشبو کوئی خواب تھی؟ وہ پلٹ کر اپنا سپنا نہیں توڑنا چاہتا تھا۔ اسی لیے سر جھٹک کر پھر سے گنگنانے لگا۔

کوئی رات یاد نہیں رہی
کوئی شام پاس نہیں رہی
کوئی دن اداس نہیں رہا
تیرے عشق میں
میرے دل کی ساری ریاضتیں
کتنی گہری دھند میں کھو گئیں
مجھے میرے دکھ میں ڈبو گئیں

آواز کا سوز اور درد دل کو چیر دینے والا تھا۔ روح میں اتر جانے والا۔ پھر بھی رانیل بڑے ضبط، صبر اور حوصلے کے ساتھ اپنی جگہ پر جمی کھڑی تھی۔ بڑا ضبط اور صبر پایا

تھا اس نے۔

وہ جیسے پتھر ہوتی آنکھوں کے ساتھ اس کی پشت کو دیکھ رہی تھی۔ نگاہ تھی کہ ہٹنے کا نام نہیں لے رہی تھی اور دل کہتا تھا کہ ان رستوں کی طرف مت دیکھ' جہاں دھول اور مٹی کے علاوہ کچھ نہیں۔

اور شاید وہ بہت ہمت کے ساتھ پلٹ ہی جاتی۔ مگر اس کی آواز نے اسے قدم قدم پر ٹھٹکا ٹھٹکا کے روکا تھا۔

برسوں وہ مجھ سے دور' مجھ سے خفا رہا
لیکن میرے وجود کی دیمک بنا رہا
وہ شخص اجنبی تو نہیں' دوست بھی نہیں
آج جب ملا تو دیر تک دیکھتا رہا

وہ بنا آہٹ کے بھی اس کی خوشبو سے چونکتا اچانک پلٹ کر دیکھنے لگا تھا اور پھر جیسے لمحہ بھر کے لیے بھونچکا رہ گیا۔

شفق کے رنگ سے برگ و ثمر گلابی ہیں
سنہری شام ہے' سارے شجر گلابی ہیں
یہ کس کا دست حنائی ہے میری آنکھوں پر
کہ میرے خوابوں کے سارے نگر گلابی ہیں

اس کے ہونٹوں پہ نغمہ سا گنگنایا تھا جو پھیلتا ہوا کچن کی پوری فضا کو مہکا گیا۔ وہ کسی خواب کے سفر میں چلتا ہوا رابیل کے سامنے آرکا تھا۔ وہ جیسے خواب سے حقیقت تک کا سفر کر آیا تھا۔

"یقین نہیں آتا۔ سامنے دیکھ کر بھی یقین نہیں آتا۔ تو میں ہاتھ لگا کر دیکھ لیتا ہوں۔" وہ مسکرایا تھا۔ رابیل جو اس کے سحر میں جکڑی تھی۔ لمحہ بھر میں ہی سنبھل گئی۔

"خبردار۔ ہاتھ لگایا تو۔ میں تمہارے ہاتھ توڑ دوں گی۔" وہ چونک کر سیدھی ہوئی تھی۔ اس کی پیشانی پر بل پڑ گئے تھے۔

"ہاتھ توڑ دو گی؟ یوں مت کہو' ہاتھ توڑ کر دکھاؤ۔ میں ایف ایس سی پارٹ ٹو میں تھا تب سے یہی ایک دھمکی سن رہا ہوں۔ اب تو میڈیکل کا تیسرا سال بھی شروع ہو گیا۔" حسن تو جیسے اس کے غصے سے لطف اندوز ہوتا مسکرا رہا تھا۔ کتنے دنوں بعد اسے دیکھ رہا تھا؟

پورے بیس دن بعد۔ اس کی شادی سے پہلے مہندی والی رات جو طوفان اٹھا کر گھر سے گیا تھا۔ بالآخر امی کے بے انتہا مجبور کرنے اور مرجانے کی دھمکیوں سے خوف زدہ ہو کر ایک دن پہلے وہ گھر لوٹ ہی آیا تھا۔ حالانکہ اس گھر میں لمحہ بھر کے لیے بھی دل لگنا' اب محال تھا۔

اس وقت بجی سنوری رابیل کو دیکھنا' اس کے لیے قیامت تھا۔ پورے چار سال بڑی تھی اس سے۔ پر چار سال چھوٹی ہی لگتی تھی۔ مگر محبت چھوٹائی' بڑائی دیکھ کر کہاں ہوتی ہے؟ کاش کہ اتنی سی بات رابیل اور اس کے پاپا سمجھ لیتے۔

"اپنا منہ بند رکھو حسن! ورنہ میں بھول جاؤں گی کہ تم اب میرے اسٹوڈنٹ نہیں رہے۔" وہ جو اسے چیلنج کرتی نگاہ سے دیکھ رہا تھا اس کی کسیلی بات کو سن کر بھنا اٹھا۔

"تمہیں پہلے کہاں "کچھ" یاد رہا ہے؟ سب کچھ بھول کر میرے منہ پر جوتا مار گئی ہو۔ تم نے اچھا نہیں کیا رابی! تمہیں میری آہ لگے گی۔" وہ ایک مرتبہ پھر پچھلی باتیں دوہرا رہا تھا۔

"اور تم ہم سب کے ساتھ بہت اچھا کر رہے ہو؟ پھوپھو کو پریشان کر رکھا ہے۔ مجھے پریشان کر رہے ہو۔" رابی نے تنگ آکر کہا تھا۔ "اب بددعاؤں پہ اتر آؤ۔ یہی اوقات ہے ہماری۔" وہ غضب ناک ہو گئی' حسن سینے پہ ہاتھ باندھے خاموش کھڑا تھا۔

"میری بات سنو رابی! یوں چیخ چلا کر کیا ثابت کرنا چاہتی ہو؟ جو دھوکا تم نے اور پاپا نے مل کر مجھے دیا ہے۔ میں اسے معاف نہیں کروں گا۔ یاد رکھنا۔ یہ صرف دھمکی نہیں۔ میں بے وفا کو تو معاف کر سکتا ہوں۔ بدعہد کو نہیں۔"

وہ کالی گھور آنکھوں میں غیض بھرا الٹ پڑا تھا۔ کبھی وہ بہت حلیم طبع ہوتا تھا۔ نرم مزاج' خوش اخلاق۔ اس پل رابی کو زین اور حسن میں کوئی فرق نہیں لگ رہا تھا۔ ایک اسے دھتکارتے ہوا چیختا تھا اور ایک پانے کے لیے چیختا تھا۔ وہ ان دو مردوں کے درمیان آخر حیثیت کیا رکھتی تھی؟

"تمہاری یہ دھمکی انکل تک پہنچا دوں گی۔ وہ تم سے خود ہی نمٹ لیں گے۔" وہ تو سسرال سے جلتی ہوئی آئی تھی۔ یہاں آکر بھی جلنا ہی پڑ رہا تھا۔

"اونہہ۔ نمٹ لیں گے۔ نمٹوں گا تو میں ان سے۔ آخر وہ سمجھتے کیا ہیں؟ میں تمہارے اس ذلیل شوہر کو چھوڑوں گا نہیں۔" حسن کی آنکھوں میں خون اتر آیا تھا۔ پل بھر کے لیے رابیل سہم گئی تھی۔

"میں تمہارے ہاتھ توڑ دوں گی۔ تم زین کی طرف ہاتھ اٹھا کر تو دیکھنا۔" رابیل نے زہر خند لہجے میں کہا تھا۔ حالانکہ دل تو سوکھے پتے کی مانند لرز رہا تھا۔

"اتنی۔ اتنی۔ اتنی محبت؟ اس ذلیل آدمی سے تم اتنی محبت کرتی ہو؟" حسن لمحہ بھر کے لیے بھونچکا رہ گیا تھا۔ اسے رابی کے الفاظ پہ یقین ہی نہ آیا۔ جن ہاتھوں کو وہ ہزاروں مرتبہ بچپن میں چوما کرتی تھی۔ جن ہاتھوں پہ اگر چوٹ آجاتی تو رابی کے آنسو ہی نہ رکتے تھے۔

وہ ان کو توڑنے کی بات کرتی تھی۔ صرف ایک غیر آدمی کے لیے؟ مگر وہ آدمی اب غیر کہاں تھا؟ حقیقت کا سامنا کرنا۔ وہ تسلیم ہی نہیں کرتا تھا کہ رابی کا نکاح ہو چکا ہے۔ وہ ابھی تک ماضی میں جیتا تھا۔ جہاں رابی اور وہ تھا۔

"تم بار بار زین کو ذلیل کیوں کہتے ہو؟ ذلیل تو تم ہو۔ جو بہن کے شوہر کی عزت نہیں کر سکتے۔" رابی کے تیور بگڑ گئے تھے۔ زین کے بارے میں کوئی برے الفاظ استعمال کرکے تو دیکھتا۔ وہ اس کی جان نہ نکال لیتی۔ مگر یہاں معاملہ کچھ اور تھا۔ سامنے حسن کھڑا تھا۔ وہ اس کی جان نہیں نکال سکتی تھی۔ کیونکہ بہت سال وہ رابی کی "جان" بنا رہا تھا۔ اور حسن عمر نے رابی کو اسی وقت اپنا "جہان" مان لیا تھا۔ اب بھلا دل کی لوح پہ لکھے لفظوں کو مٹایا جا سکتا تھا؟ کوئی انگلیوں پہ گن کے حساب لگاتا تھا تو سہی۔ وہ تو پالنے میں ہی رابی کے عشق میں فنا ہو گیا تھا۔ اتنے سال۔ اتنے بے شمار سال بیچ میں آئے تھے۔ پندرہ سال تک وہ نوالے بنا بنا کر اس کے منہ میں ٹھونستی رہی تھی۔ ساتھ جوتا اتار کر کندھے پہ مارتی۔

"اتنے تاڑ سے لمبے ہو رہے ہو۔ پر ہاتھ ٹوٹ جاتے ہیں روٹی کھاتے ہوئے۔" وہ روٹی سے بھاگتا تھا۔ سی فوڈ' جنک فوڈ' اٹالین فوڈ کا دلدادہ تھا۔ بھاگتے دوڑتے برگر کھایا۔ سینڈوچ کھایا' جوس پیا اور بس۔ پھوپھو دیسی گھی کے حلوے بنا بنا کر تڑپتی رہ جاتی تھیں مگر وہ چکھ کے نہ دیتا تھا تب پھوپھو کی حالت پر رابی کو ترس آجاتا۔ وہ پلیٹ بھرتی اور حسن کے سر پر سوار ہو جاتی۔ پھر مجال تھی حسن کی جو ناک بھوں چڑھا کر نخرے دکھاتا؟ بنا آواز نکالے منہ کھولے جاتا اور رابی چمچے بھر بھر کے اسے ٹھنساتی جاتی۔ پھوپھو جیسے نہال ہو جاتیں۔ رابی کا سر منہ چومتیں۔

انداز تو اس کے اوائل عمری میں ہی بدلنے لگے تھے۔ وہ اپنی نادانی اور کم فہمی میں جان نہیں پائی تھی۔

"بہن۔ یہ۔ بہن کسے کہا؟" وہ اتنی بلند آواز میں چیخا تھا کہ رابی کے کان سن سے ہو گئے تھے۔

"منہ توڑ دوں گا تمہارا۔ اب جو بہن کا لفظ کہا۔ تم میرے لیے کیا ہو؟ یہ ساری دنیا جانتی ہے۔ ورنہ میڈیکل کی فیلڈ اور میڈیسن کی کتابیں کون کافر پڑھتا؟ آگ لگا دوں گا ان کتابوں کو' جو بچی رہ گئی ہیں میرے عتاب سے۔ جب تم نہیں ملیں تو پھر یہ ڈگریاں' عہدے' منصب میرے کس کام کے؟" حسن غیض کا طوفان بن گیا تھا۔ اس کا اتنا غصہ نہیں دیکھا تھا۔ وہ پلٹ کر کچن کی طرف گیا۔ بلینڈر کو بغیر آف کیے جگ سمیت اٹھایا اور پوری قوت سے —— فرش پہ دے مارا۔ جانے وہ کیا کچھ توڑنے کا ارادہ رکھتا تھا رابی لمحے کے ہزارویں حصے میں حسن تک پہنچ گئی تھی —— وہ جو شیلف پہ رکھے مائیکرو ویو کو اٹھانے لگا تھا رابی کو سامنے آتا دیکھ کر رک گیا۔ بھیگا چہرہ' لال آنکھیں' بھینچے ہوئے ہونٹ۔ چہرے پہ کھردرا سا ہلکا ہلکا رواں۔ نیند سے ناراض آنکھیں لیے وہ ضبط اور غیض کی ملی جلی تصویر بنا ہوا تھا۔

"رک جاؤ حسن!" اس نے دونوں ہاتھ حسن کے سامنے جوڑ دیے تھے۔ وہ بے بسی کی تصویر بن گئی تھی۔ پھوپھو، نشی، مشی نجانے کہاں تھیں؟ اتنا ہنگامہ سن کر بھی باہر نہ آسکیں۔

"رکا ہوا تو ہوں جس مقام پر کھڑا چھوڑ کر گئی ہو۔ اللہ کی قسم! عمر بھر وہیں کھڑا رہوں گا۔ جب تک لوٹ نہ آؤ۔" حسن بھی جیسے بے بس ہو گیا تھا۔ رابی کی آنکھ میں آنسو دیکھنے کا حوصلہ کہاں تھا؟ اس کے اشٹینڈ کی طرف بڑھتے ہاتھ رک گئے تھے۔ تب رابی کا ضبط جیسے جواب دے گیا۔ ہاتھ نجانے کیسے اٹھ گیا؟ بس تڑاخ کی آواز آئی تھی پھر ہر شے پر سکوت طاری ہو گیا۔

"بے شرم، بے غیرت۔ میری بربادی کے منتظر ہو؟ تمہاری بددعائیں زین کو میری طرف پلٹنے نہیں دیتیں۔ میں تو سجدے میں گر گر کے تھک گئی۔" رابی پہ جنون طاری ہو گیا تھا۔ سسرال والوں کی بے رخی سے لے کر، زین کی سنگ دلی بے رحمی اور کٹھور رویے کی بھڑاس آج اس نے حسن پہ نکال لی تھی۔

"بددعا دی ہوتی تو تمہارا زین ایک سانس بھی زمین کے اوپر نہ لے پاتا۔ یہ تو میری محبت ہے جو مجھے ممنوع رستوں پہ جانے نہیں دیتی۔" وہ دہاڑتا ہوا اماں کی طرف بڑھا جو آوازیں سن کر بیڈ روم سے نکل آئی تھیں۔

"کیوں اس کے لیے امتحان بن جاتے ہو؟ کیوں اس کی زندگی کو مشکل کرتے ہو؟ تم سمجھتے کیوں نہیں۔ یہ سب نصیب کے کھیل ہیں۔ رابی تمہارے نصیب میں ہی نہیں تھی۔" پھوپھو کی نم آواز اور گڑگڑاہٹ بھی بے اثر رہی تھی۔ وہ ابھی تک لہو رنگ آنکھوں سے رابی کو دیکھ رہا تھا۔

"میں اس کے لیے امتحان نہیں۔ یہ میری آزمائش ہے۔ جھوٹی ہے، مکرتی ہے۔ فریبی، ڈھونگی۔ اس کے ایک اقرار نے مجھے اتنا آگے جانے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس نے خود مجھے "آئی لو یو ٹو" کہا تھا۔ دل پہ نقش ہے۔ میرے پاس ثبوت کوئی نہیں۔ پر میرے دل سے بڑا ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے؟ اور یہ ڈھونگی، جھوٹی، فریبی، بدعہد، اب کہے گی میں نے اس انداز میں نہیں کہا تھا۔ اس لہجے یا سینس میں نہیں کہا تھا۔ حسن پاگل ہے۔ مجھے آج صرف اتنا یہ بتا دے کہ محبت کے بھی انداز ہوتے ہیں؟ میں نے یوں نہیں یوں کہا، تم نے یوں نہیں، یوں سمجھا؟" حسن کسی زخمی شیر کی طرف غرا رہا تھا۔ پھوپھو اور رابی جیسے بے دم ہو گئی تھیں۔

وہ غضب کی دھمک قدموں میں پیدا کر کے باہر نکل گیا تھا۔

"رابی! اسے کیا ہو گیا ہے؟ یہ میرا حسن تو نہیں، یہ کس قدر بدل گیا ہے۔" پھوپھو اس کے کندھے سے لگی اونچی آواز میں رو رہی تھیں۔ اور رابی محض پھوپھو کو دلاسا دیتی رہ گئی۔ پہلے سے بجھا دل کچھ اور بجھ گیا تھا۔

وہ تو یہاں دل بہلانے کے لیے آئی تھی۔ نشی اور مشی کی ہنسی مسکراہٹیں اور باتیں سننے۔ مگر ہر طرف بکھرے سناٹے اس کے اندر اور بھی ویرانی بھر رہے تھے۔ مشی نے رابی کے اچانک آنے کی خوشی کا بھرپور طریقے سے اظہار کیا تھا۔ پھر اس کے لیے پر تکلف سا ناشتا بنانے کچن میں گھس گئی تھی۔ مگر دھچکا تو اسے نشال کے رویے نے پہنچایا تھا۔ اسے کیا ہوا تھا۔ انتہا کا روکھا رویہ، انداز، برتاؤ بلکہ اسے دیکھ کر تو وہ چپ سی رہ گئی تھی۔ ایک دم شاکڈ سی۔ جیسے اسے امید نہیں تھی کہ رابیل واپس بھی آئے گی۔ اس کا رویہ الجھا دینے والا تھا۔ رابیل سمجھ ہی نہ پائی۔ نشی کی آنکھیں متورم، سرخ اور سوجی ہوئی تھیں۔ چہرہ اداس، ویران، بے چین۔ آخر اسے ہوا کیا تھا؟ کیا کسی کے ساتھ جھگڑا لڑائی؟ یا پھر پھوپھو کے ساتھ بحث؟ یقیناً" وہ پھوپھو سے خفا تھی، اور خفگی کی وجہ رابیل کو پہلے سے ہی معلوم تھی۔ رابی کی شادی کے بعد نشال تھی واپس دوبئی جانے کی ضد۔

نشی اس کی شادی کے لیے پاکستان آئی تھی اور اب یقینی طور پر دوبئی واپس جانے کے لیے ضد کر رہی تھی۔ ہمیشہ ایسے ہی ہوتا تھا۔ نشی کا غصہ، بھوک ہڑتال، بائیکاٹ پھوپھو اور اسد انکل کو ہار ماننے پر مجبور کر دیتا تھا۔ یہ رابیل ہی تھی جو اسے لاڈ پیار اور منتوں سے منا کر کمرے سے باہر نکال لاتی۔ کھانا کھلاتی، اس کا موڈ ٹھیک کرتی اور پھر پھوپھو کی منت سماجت شروع ہو جاتی۔ تنگ آ کر پھوپھو کو یہ کہنا ہی پڑتا۔

"اپنے باپ سے اجازت لے لو۔" پھوپھو کے یہ الفاظ نیم رضامندی ثابت ہوتے تھے پھر اسد انکل کو منانا کہاں مشکل ہوتا تھا۔ اور وہ رابیل کو سیلوٹ کرتی، منہ چومتی، کورنش بجالاتی تھی۔ مگر اب؟ مگر اب ایسا نہیں تھا۔ وہ اسے دیکھ کر ہمیشہ کی طرح ٹھنکتی ہوئی اس کے کندھے سے نہیں لگی تھی۔ اس نے چیخ چیخ کر پھوپھو اور اسد انکل کی شکایتیں بھی نہیں کی تھیں۔ مشی کو برا بھلا بھی نہیں کہا تھا کہ وہ اس کی بہن ہو کر بھی حمایت نہیں کرتی تھی۔ ساتھ نہیں دیتی تھی۔ اس نے یہ بھی نہیں کہا تھا کہ وہ رابیل کو مس کر رہی تھی۔ حالانکہ پہلے ایسا نہیں ہوتا تھا۔ نشی دوبئی جا کر بھی اسے ہزار ہزار دفعہ فون کھڑکاتی۔

"میں تمہیں مس کر رہی ہوں۔ بہت یاد کرتی ہوں، تم میری اکلوتی دوست ہو۔ کاش، تم بھی ادھر آجاؤ۔" یہ تو کوئی اور ہی نشی تھی، بے رخ، سنگدل اور کٹھور۔ رابیل کو دیکھ کر اس نے محاورتاً" نہیں، حقیقتاً" منہ موڑ لیا تھا۔ حالانکہ رابیل اسے ولیمہ پر نہ آنے اور ایک فون کال تک نہ کرنے پر بہت کچھ سنانا چاہتی تھی۔ مگر اس کے ہونٹ جیسے سل کر رہ گئے۔

"تمہیں کیا ہوا ہے نشی! اتنی خونخوار نظروں سے کیوں دیکھ رہی ہو۔" معاً رابیل نے اپنے لہجے کو ہلکا پھلکا کر لیا تھا۔ وہ دو قدم چل کر اس کے قریب آگئی تھی۔

"تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ مجھ سے ناراض ہو؟۔ تمہیں اتنا تو معلوم ہونا چاہیے کہ نئے گھر اور نئے لوگوں میں جا کر اتنی جلدی ایڈجسٹ کرنا آسان نہیں ہوتا۔ پھر ایسی بے شرمی تو مجھ میں نہیں تھی جو زین سے کہتی موبائل میں کریڈٹ نہیں۔ بیلنس کروادو۔ خالی پڑا ہے۔"

رابیل نے اسے منانے کی کوشش کی یہ کام رابیل ہی اب تک کرتی آئی تھی۔ اسے ہی کرنا تھا۔ جھکنے والوں کو کچھ لوگ عمر بھر کے لیے جھکائے ہی رکھتے ہیں۔

"کچھ نہیں ہوا ہے۔ نہ ہو سکتا ہے، مجھے کیا ہو گا؟ اور تمہیں کیا ہوا ہے؟ منہ اٹھا کر آگئی ہو۔ رہتیں اپنی سسرال میں۔ ادھر دل لگاتیں۔ ادھر والوں کے دل تو جہنم بنا چکی ہو۔" نشی جیسے پھٹ پڑی تھی۔ اس کی باتیں، غصہ، اشتعال اور الفاظ۔ رابیل بھونچکی رہ گئی تھی۔ منہ پھٹ، غصیلی، جنونی اور جذباتی تو وہ عمر بھر کی تھی۔ مگر رابیل کے ساتھ ایسی تلخی اور بدزبانی؟ وہ بھی اس صورت میں، جب وہ اپنی سسرال سے پہلی مرتبہ یہاں آئی تھی۔

کیا اس کا اشارہ حسن کی طرف تھا؟ رابی کا سر جھک سا گیا۔ حسن کا حوالہ رابی کا سر اسی طرح جھکا دیتا تھا۔ اور کیا اب نشی، حسن کے حوالے سے اسے "طعنے" دے گی؟ رابی کے اندر پھانس سی چبھی تھی۔ کیا نشی نہیں جانتی تھی۔

"حسن میرا بھائی ہے نشی! تم حسن سے میری محبت کو جانتی ہو، اس لیے غلط معنوں میں سوچو گی تو مجھے بہت تکلیف ہو گی۔"

رابی کا دل بھر آیا تھا۔

"محبت کے کوئی انداز، معنی نہیں ہوتے۔ تم حسن کو بہلا سکتی ہو، مجھے نہیں۔ اگر حسن کو آس دلائی تھی تو یہ شادی کا کھٹ راگ کیوں پالا؟" وہ کتنی غلط بات کتنے غلط انداز میں کر رہی تھی۔ یوں کہ رابیل کی آنکھیں پھٹ گئیں۔

"یہ کیا بکواس ہے نشی!" شدت غم سے اس کی

آواز پھٹ پڑی تھی۔ اسے نشی کے الفاظ پہ یقین نہیں آرہا تھا۔ پہلے تو اسے حسن کے قصے سے کبھی غرض نہیں ہوئی تھی۔ جب حسن نے رابیل سے شادی کا شوشا چھوڑا تھا تب بھی نشی لاتعلق رہی تھی۔ البتہ مشی نے حسن کے لیے حمایت کی تھی۔ اور اب وہ حسن کی ہمدرد عظیم بنی کھڑی تھی۔ اتنا بدلاؤ؟ اتنی تبدیلی؟

"بکواس نہیں حقیقت ہے۔ تم نے حسن کا دل توڑ کے اچھا نہیں کیا۔ تم عیش و عشرت کی زندگی گزارو اور وہ عمر بھر جلتا رہے۔ ایک ہی تو بھائی ہے میرا۔ میں اسے برباد ہوتا نہیں دیکھ سکتی۔" نشی نے شعلے برساتی آنکھوں سے اسے گھورا تھا۔ نشی کے الفاظ نہیں' انگارے تھے۔ وہ تو لمحہ لمحہ سلگ رہی تھی۔ راکھ کا ڈھیر بن رہی تھی۔

"میں نے کسی کا دل بچانے اور آباد کرنے کا ٹھیکہ نہیں لیا۔ میں اپنی زندگی میں خوش اور مگن ہوں۔ اور ویسے بھی میں نے کورٹ میرج نہیں کی۔ انکل نے میرا رشتہ طے کیا تھا اور مجھے اس رشتے پر کوئی اعتراض بھی نہیں تھا۔" رابیل نے بمشکل اپنے روکھے لہجے پر قابو پایا تھا۔ ورنہ دل تو چاہ رہا تھا۔ نشی کا منہ توڑ کر رکھ دے۔

ناشتے کی میز پر پہلا سامنا اسد انکل سے ہوا تھا۔ وہ اسے دیکھ کر بے انتہا خوش اور پرجوش ہوگئے تھے۔ وہ بہت شفقت اور محبت سے اس کا حال احوال پوچھ رہے تھے۔ ایک مشفق اور مہربان باپ کی طرح میز سے ایک ایک چیز اٹھا کر اس کی پلیٹ میں بھرتے اور چھوٹی چھوٹی باتیں پوچھتے تھے۔ وہ اس کے حقیقی باپ نہیں تھے پھر بھی حقیقی باپ سے بڑھ کے محبت دیتے تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ رابی آج ادھر ہی رک جائے۔ شاید وہ مشی اور اسد انکل کے اصرار پہ رک ہی جاتی اگر حسن اور نشی سے اتنی تکلیف دہ ملاقات نہ ہوتی۔ حسن کی بکواس کو تو وہ کسی گنتی میں شمار نہیں کرتی تھی۔ اصل دھچکا تو اسے نشی کی باتوں اور رویے نے پہنچایا تھا۔ وہ چاہ کر بھی پھوپھو سے شیئر نہیں کرسکتی تھی تاہم تنہائی ملتے ہی مشی نے خود ہی اسے دھر لیا تھا۔ وہ اس کی خاموشی' بے چینی' اضطراب کی وجہ جاننا چاہتی تھی تب رابیل سے جھوٹ نہیں بولا گیا تھا۔ اس نے نشی اور اپنی تمام گفتگو مشی کے گوش گزار کردی تھی جسے سن کر وہ لمحہ بھر کے لیے بھونچکی رہ گئی۔

"کمال ہے نشی کو حسن سے اتنی ہمدردی ہوگئی؟ اور ہمیں پتا ہی نہیں چل سکا۔ کل تک تو حسن کے مسئلوں سے اسے کوئی غرض نہیں تھی۔ اور آج حسن کے لیے اتنی ہمدردی' احساس۔ یاحیرت!" وہ زیر لب متحیر سی بڑبڑا رہی تھی۔

"میں تو خود حیران ہوں۔ کاٹ کھانے کو دوڑتی ہے۔ سارا وقت کمرہ بند کیے پڑی رہتی ہے۔ نہ کھانے کی ہوش نہ پینے کی۔ اور آج کل تو اپنی ڈریسنگ' پارلر کے چکر' جاگنگ' شاپنگ ہر ایکٹویٹی سے بے نیاز ہے۔" مشی خود نشی کے رویے کی وجہ سے متوحش تھی۔

"تم نے پوچھا نہیں۔" اس نے بے خیالی سے بے تکا سوال کیا۔

"میری ایسی مجال کہاں؟ یہ کام تم کرسکتی ہو؟" مشی نے بڑے آس بھرے لہجے میں کہا تھا۔ وہ نشی کے لیے بہت متفکر تھی۔

وہ جب مشی کے ساتھ کچن سمیٹ کر باہر نکلی تب پھوپھو نے اسے اشارے سے بلا کر اپنے کمرے میں بٹھا لیا تھا۔ مشی کی طرح پھوپھو بھی بہت پریشان تھیں اور انہوں نے بہت الگ بات کی تھی۔ ان کے نزدیک نشی کے غصہ کی وجہ کچھ اور تھی۔

"دبئی میں اس کے لیے ایک پرپوزل آیا تھا۔ نگینہ (پھوپھو) کو پسند تھا۔ اور شاید نشی کو بھی۔ اس کے پاپا نے انکار کردیا ہے۔ مجھے لگتا ہے نشی کو اسی بات پر غصہ ہے۔ کٹ کھنی بلی بنی ہوئی ہے۔ اسے سمجھ ہی نہیں۔ ماں باپ غلط فیصلہ تو نہیں کرتے۔"

پھوپھو نے اس کی سوچوں کے دھارے کو ایک اور سمت بدل دیا تھا۔

☼ ☼ ☼
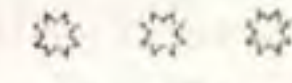
اس نے کہیں پڑھا تھا کہ دنیا کی سب رونق اور ترقی "حسن عمل" پر موقوف ہے۔ حسن عمل یعنی اچھا اور بہترین عمل' اعلا ترین برتاؤ۔ بہترین رویہ' تہذیب و تمدن کی برکات و ثمرات اس کے مرہون منت ہیں۔

ابھی کچھ دیر پہلے زین کی کال آئی تھی۔ وہ اس کو پنڈی جا کر مس ہرگز نہیں کررہا تھا۔ بلکہ اس نے رابیل کو یاددہانی کروائی تھی کہ اسے شام سے پہلے گھر جانا ہے۔ یہاں تک بھی ٹھیک تھا۔ مگر جو کچھ اس نے تلخ الفاظ اور فضول گوئی کی تھی۔ رابیل کے دل میں جیسے وہ الفاظ گڑ کر رہ گئے تھے۔ اس کا پہلے سے بھرا دل کچھ اور بھی بھر آیا تھا۔ وہ آرام سے نرمی سے بھی تو بات کرسکتا تھا۔ مگر نرمی تو اسے خاص خاص وقتوں میں چھوتی تھی۔

رابیل کا دل بجھ گیا تھا۔ اس گھر میں کم از کم کسی بھی فرد سے اسے حسن عمل کی امید نہیں رکھنی چاہیے تھی۔ ساس سے لے کر شوہر تک۔

رابیل اگرچہ شام تک رکنا چاہتی تھی مگر زین کی فون کال نے اس کے اندر اس خواہش کو ایک دم بجھا دیا تھا۔ وہ اسے جلد از جلد گھر پہنچنے کے لیے کہہ رہا تھا۔ کیونکہ بہت سے ضروری کام رابیل کے لیے رکھے تھے۔ خصوصاً" پچھلے صحن میں بندھے زین کے پالتو جانور۔ جن کو چارہ' روٹی' دودھ دینے کی ذمہ داری اس کی ساس نے رابیل کے سر ڈال دی تھی۔ ان کا کہنا تھا کہ وہ جانوروں کی سیوا کرکر کے تنگ آچکی ہیں۔ چونکہ زین رابیل کا شوہر تھا۔ سو اپنے شوہر کے تمام شوق' مشاغل' دلچسپیاں بھی خود بخود اس کی ذمہ داری بن چکی تھیں۔ اور گھر کی واحد ملازمہ جو کبھی پورا دن اسی گھر میں رہا کرتی تھی' اب دوپہر سے پہلے دم دبا کر بھاگ جاتی۔ کیونکہ رابیل کی صورت میں گھر والوں کو کل وقتی ملازمہ مل چکی تھی۔

اس نے سوچا وہ پھوپھو کو بتا کر ٹیکسی سے گھر چلی جاتی ہے۔ وہ پھوپھو کے کمرے کی طرف آنا چاہ رہی تھی جب سب سے اوپر والی سیڑھی پہ اس کی نگاہ پڑی تھی۔ وہاں نشی کھڑی تھی اور جوس کی بوتل کو منہ لگائے گھونٹ گھونٹ جوس پی رہی تھی۔ مگر اس کی نگاہیں رابیل کے وجود میں گڑتی جارہی تھیں۔ یوں کہ رابیل کی ریڑھ کی ہڈی تک میں سنسناہٹ ہونے لگی تھی۔

اسے پہلی مرتبہ احساس ہوا تھا کہ نشی کی آنکھیں نہ صرف حسین بلکہ خطرناک حد تک تمسخر اڑانے کا فن بھی رکھتی ہیں۔ رابیل جیسے منجمد ہوگئی۔

"تم کہاں چلیں۔" اپنی آنکھوں کے تمسخر اڑاتے تاثرات کے برعکس اس کا لہجہ اور الفاظ بہت مختلف تھے۔

"گھر۔" رابیل نے سنبھل کر جواب دیا تھا' تب لمحہ بھر میں ہی نشی کی آنکھوں کا رنگ بدل گیا تھا۔ اسے لگا جیسے نشی کی آنکھوں میں جیسے نمکین پانی جمع ہونے لگا تھا۔

"گھر؟ کون سے گھر؟" نشی کا انداز کھوسا گیا تھا۔

"اپنے گھر' زین کی ابھی کال آئی تھی۔ وہ مجھے گھر آنے کا کہہ رہے ہیں۔" رابی نے گہرا سانس کھینچ کر جواب دیا تھا۔ تب نشی کے ہاتھ میں موجود بوتل کپکپا کر رہ گئی تھی اس نے بے یقینی سے رابی کی طرف دیکھا تھا جیسے اسے دھچکا سا لگا تھا۔

"زین کی کال؟" نشی جیسے بڑبڑا کر رہ گئی تھی۔ پھر جیسے اس کا انداز ہی بدل گیا تھا۔ وہ لمحہ بھر میں بپھر گئی تھی۔

"جمعہ جمعہ چار دن نہیں ہوئے شادی کو اور تم زین کے آرڈر پہ چلنے لگیں۔ غلام بنا لیا ہے تم کو اس بونانی پتلے نے۔" وہ بپھرے بپھرے لہجے میں بھڑک کر کہہ رہی تھی۔ وہ ایسی ہی تھی۔ جس بات پر غصہ آتا' پھر رکتا ہی نا۔ تو کیا اسے رابیل کے اتنی جلدی گھر چلے

جانے پر غصہ آرہا تھا؟ رابیل کی خوش فہمیاں انگڑائی لے کر جاگ اٹھیں۔

"کہیں تم اس کے "اثر" میں تو نہیں چلی گئیں؟ ارے حسین ہے تو کیا ہوا؟ اور تم اس کے مقابلے میں کم رُو ہو تو کیا ہوا؟ اتنا جھکنے کی کیا ضرورت ہے؟ ایک دفعہ جھک جاؤ گی تو عمر بھر کے لیے جھکائے رکھے گا۔"

نشی ایک ایک اسٹیپ پر پیر رکھتی نیچے آرہی تھی۔ اس کا لہجہ' انداز' تاثرات ناقابل فہم تھے۔ رابیل سمجھ ہی نہ پائی تھی۔ وہ اس کی ہمدردی یا محبت میں بات کررہی تھی یا پھر "جتا" رہی تھی کہ وہ اپنے شوہر کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں.... پہلی مرتبہ ڈاکٹر رابیل کے اندر احساس کم تری ابھر آیا تھا۔

"جھکنے سے تمہاری کیا مراد ہے؟ میں زین کی کال پہ گھر جانا چاہ رہی ہوں۔ اس میں جھک جانے کی بات کہاں سے آگئی۔"

اس کی چلتی زبان کو رابیل نے بے ساختہ ہاتھ اٹھا کر روک دیا تھا۔ نشی لمحہ بھر کے لیے چپ ہوگئی تھی۔

"گھر میں کچھ کام ہے۔ اسی لیے زین نے بلایا ہے۔" اسے خاموش دیکھ کر رابی نے نرمی سے کہا۔ وہ زین کے پالتو جانوروں کی "سیوا" کے لیے طلب کی جارہی تھی مگر یہ بات وہ نشی کے سامنے نہیں کرنا چاہتی تھی۔ وہ اس کی بات سن کر پھر سے بھڑک اٹھی۔

"تمہیں کام کے لیے بلایا ہے؟ تم اس نواب زادے کی نوکر ہو؟ مجھے پتا تھا' پہلے دن سے ہی زین کی غلامی میں چلی جاؤ گی' آخر اس میں کون سے سرخاب کے پر لگے ہیں؟ تم کیوں اس کے سامنے اتنی کمزور ہوگئیں؟" نشی بات کو کون سا رنگ دے رہی تھی؟ رابیل سمجھ کر بھی جھٹلاتی رہی۔ وہ بار بار اسے زین کے خلاف اکسا رہی تھی۔ آخر کیوں؟

"تم اس سے کہو' آج تم نہیں آرہیں۔ اپنے میکے میں آئی ہو' ایک رات تو ضرور رکو گی۔ ابھی کرو فون اسے۔" نشی نے چٹکی بجاتے ہی پینترا بدل لیا تھا۔ جیسے وہ پہلے والی نشی بن گئی تھی۔ محبت کرنے والی' احساس کرنے والی' زبردستی ٹھنک ٹھنک کر کچھ بھی منوا لینے والی۔

"تم نہیں جاؤ گی.... بس میں نے کہہ دیا ہے۔ اتنے دنوں بعد آئی ہو۔ رات کو ڈھیروں باتیں کریں گے۔ میوزک سنیں گے۔ لمبی واک اور پھر کچھ ہلا گلا۔" وہ پل بھر میں قلانچیں بھرتی اس کے قریب آگئی تھی۔

"نشی! تمہیں آخر ہوا کیا ہے؟"

رابیل اس افتاد پر گھبرا گئی تھی۔ تب نشی نے اپنے ازلی بے ساختہ' بے باک اور کچھ کچھ معصوم انداز میں جتا جتا کر کہا۔

"تمہاری نئی نئی جدائی ہے۔ مجھ سے برداشت نہیں ہورہی۔" اس نے لپک کر اس کا منہ چوم لیا۔

رابیل پہلے کی طرح ہونق ہی رہی تھی۔

آخر کار مشال کی مداخلت نے رابیل کی خلاصی کروائی تھی۔ اس نے اپنے ہی انداز میں نشی کو جھاڑتے ہوئے سمجھایا۔

"رابی کی اب شادی ہوچکی ہے۔ وہ کچھ رشتوں کی پابند ہے۔ نہیں رک سکتی۔ ویسے بھی یہاں ٹینشن کے علاوہ ہے ہی کیا؟"

مشی کا انداز قدرے تلخ اور مدبرانہ قسم کا تھا۔ رابیل کو ایک مرتبہ پھر مشی کی سمجھداری پر ٹوٹ کے پیار آگیا۔

"تو پھر تم نہیں رکو گی؟" اسے جانے کے لیے پر تولتے دیکھ کر نشی نے کھردرے لہجے میں پوچھا تھا۔ وہ جو پلٹ کر گیلری کی طرف مڑ رہی تھی رک گئی۔

"جب تمہاری شادی ہوگی تو پوچھوں گی۔ کہاں تک اپنی مرضی چلاتی ہو۔" رابیل نے تھکی تھکی سانس لے کر کہا اور آگے بڑھ گئی۔ جبکہ نشی کا مارے غصے کے برا حال ہوگیا تھا۔

رابیل بھی نشی کے رویے پر غور کرتی شدید ڈپریشن کا شکار ہورہی تھی۔ پہلے حسن اور اب نشی.... یہ دونوں بہن بھائی رابیل کے لیے وبال بنتے جارہے تھے۔ وہ کس "کفا" سے گزر رہی تھی۔ اس کے پیروں

کے تلوے کتنے انگاروں کی تپش اور جلن کو محسوس کررہے تھے۔ یہ کوئی نہیں جانتا تھا۔ نہ نشی نہ حسن۔۔۔۔

وہ جو اپنے ہی خیالوں میں گم پھوپھو کو الوداع کہہ کر کوریڈور کے آخری کونے سے گزر رہی تھی۔ ایک دم کسی غیر مرئی قوت کے زیر اثر رک گئی۔ یہ حسن کے کمرے کا دروازہ تھا جو پورا کھلا ہوا تھا اور اندر کا منظر بھی صاف دکھائی دے رہا تھا۔ ہر چیز بے ترتیب اور الٹ پلٹ۔ وہ کچن کے سامان پہ غصہ اتار کر بھی شانت نہیں ہوا تھا تب ہی تو بیڈ روم کی حالت ''قابل رحم'' تھی۔ پورا کمرہ ''عیاں راچہ بیاں'' (ظاہریات کو جتانے کی ضرورت نہیں) کی عملی تعبیر بنا ہوا تھا۔

وہ جو آتی جاتی ہواؤں کی سبک رفتاری سے اس کی آہٹوں کا پتا جان جاتا تھا ایک دم چوکنا ہو گیا۔ بیگ میں آخری چمکتی سی بھاری چیز ٹھونستا اس کا ہاتھ لحظہ بھر کے لیے رک سا گیا تھا۔

''چالاک' پاکھنڈی' فریبی' ہوشیار چال باز آگئیں تماشا دیکھنے۔۔۔۔ دیکھو۔۔۔۔ دیکھو تماشا۔ سب تمہاری کرامات ہیں۔'' وہ اپنے ہاتھوں سے پھاڑے گئے نوٹس' فائلز اور کتابوں کی طرف اشارہ کرتا اسے مختلف غیر مہذب ناموں سے بلاتا غصہ دلا گیا تھا۔ مارے اہانت کے رابیل کا چہرہ لال پڑ گیا۔

''اپنی لمبی زبان کو کنٹرول میں رکھو۔ ورنہ کاٹ کے ہاتھ پر رکھ دوں گی۔ تم منہ لگانے کے قابل نہیں ہو۔ پھر بھی پھوپھو کے آنسو زیر کرکے مجھے اس چوکھٹ پر لا کھڑا کرتے ہیں۔ رحم کھاؤ اپنی ماں کی حالت پہ۔'' اس نے دونوں ہاتھ جوڑ کر گویا التجا کی تھی۔

''مجھ پر کسی نے رحم نہیں کیا۔ تو میں کیوں کروں کسی پہ رحم۔'' اس نے رکھائی کی انتہا کرتے ہوئے اپنی بات جاری رکھی تھی۔

''بس خیر مانگو سرتاج کی۔ میرے سامنے آنے سے بچتا رہے۔''

حسن کے ہونٹوں پہ ننھی ننھی چمکیلی بوندیں ابھر آئیں۔ پیشانی بھی تر بتر تھی۔ رابیل پوری جان سے کانپ گئی تھی۔

وہ کسی جنگلی بپھری شیرنی کی طرح حسن پہ جھپٹ پڑی تھی۔ وہ حسن پہ چلاتے ہوئے یہی کہہ رہی تھی۔

''کیا سمجھتے ہو تم۔ بہت باتیں کرنا آگئی ہیں تمہیں۔ کچھ نہیں بگاڑ سکتے تم میرا۔'' اس نے حسن کو زور کا جھٹکا دینا چاہا۔ ''جو ابا'' اس نے بڑے آرام سے رابی کے دونوں ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں دبالیا تھا۔ وہ چلاتے چلاتے ایک دم رک گئی تھی۔ حسن کے چہرے پر کچھ عجیب سے تاثرات ابھرے تھے نرم گرم سے جیسے پگھلی ہوئی چاندی بکھر رہی تھی جیسے نقرئی دھوپ پھیل رہی تھی۔ جیسے اس کی گھور سیاہ آنکھوں سے نراہٹ کا ''مدوہ'' بہنے لگا تھا۔

''میں کب تمہارا کچھ بگاڑنا چاہتا ہوں۔ میں تو تمہارا سب کچھ سنوارنا چاہتا ہوں۔'' وہ لہجے میں امرت گھولتا مسکرایا تھا۔ کیسا دھوپ چھاؤں جیسا مزاج تھا۔ بھلا حسن' نشی اور زین میں فرق کیا تھا؟ تینوں ایک ہی جیسے۔ پل میں تولہ پل میں ماشہ۔ وہ خون کے گھونٹ بھر کے رہ گئی تھی۔

پھر بمشکل ضبط کا مظاہرہ کرتی اس پہ تین حرف بھیج کر باہر نکل گئی تھی۔

☆ ☆ ☆

ابرار منزل میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ نہ رویوں میں' نہ لوگوں میں۔ اس کی سوختگی کا کوئی انت نہیں تھا اور ابرار منزل والوں کے تغافل کی بھی کوئی حد نہیں تھی۔

روٹین لائف کا اگر یہ مطلب تھا کہ دن رات کام' کام' کام اور صرف کام۔ تو یہ روٹین بہت تھکا دینے والی تھی۔ صبح سے لے کر پانچ بجے تک اسپتال' پھر گھر کے لاتعداد کام اور سب سے زیادہ تکلیف دہ صورت حال زین کے جانوروں کی سیوا تھی۔ ان کی غلاظت اٹھانا' انہیں وقت پہ چارہ دینا' دودھ' باجرے' دانے ۔۔۔۔ ان کی صفائی اور خوراک کی دیکھ بھال بھی ڈاکٹر رابیل کے ذمے تھی اور شاید یہی تھی ڈاکٹر رابیل کی قسمت۔

یہ سب اس نے دل سے قبول کیا تھا۔ کسی نے اسے مجبور ہرگز نہیں کیا تھا۔

یہ سب کرنا زین ابرار تک پہنچنے کے لیے ناگزیر تھا۔ اس کے گھر والوں کے دل سے ہو کر زین تک رسائی حاصل کرنا۔ زین ابھی تک اسے ادھورا ملا تھا۔ وہ اسے مکمل پانا چاہتی تھی اور اس کے لیے ضروری تھا کہ وہ اپنی ہستی کو مٹا کر ان لوگوں کے رنگ میں رنگ جاتی۔ سودا تلخ ضرور تھا مگر وہ دام لگانے اور شہد لٹانے کے لیے تیار تھی۔ کچھ پانے کے لیے کچھ کھونا تو ضروری ہوتا ہے۔ جبکہ وہ جانتی بھی تھی کہ پیچھے سب کشتیاں جل چکی ہیں اور کوئی ''حذر'' بھی نہیں۔ یہی آخری پناہ گاہ تھی۔ حالانکہ بعض رشتوں کو برقرار رکھنا ان کو توڑ دینے سے زیادہ اذیت ناک ہوتا ہے۔ پھر بھی کچھ بے رشتوں کو بچانے کے لیے تگ و دو میں لگ چکی تھی۔

حقیقت یہ تھی کہ اس گھر کی سربراہ عورت بلا کی گھمنڈی تھی۔ اسی طرح ثوبیہ میں بھی بلا کا غرور تھا۔ ثمن لومڑی صفت تھی۔ مکاری اور فریب کاری کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتی تھی۔ ماہم فطرتاً'' لاپرواہ تھی۔ اس کی بلا سے گھر میں کچھ بھی ہوتا رہتا۔ اسے موبائل فون اور تانیہ کے علاوہ کچھ بھاتا ہی نہیں تھا۔

اور تانیہ کیا تھی؟ پہلی مرتبہ رابیل تانیہ کو دیکھ کر بھونچکی رہ گئی تھی۔ یہ وہی لڑکی تھی جسے گلشن' رابی پر فوقیت دے رہی تھیں۔ کیا یہ تانیہ بھی زین کے دل میں جم سکتی تھی؟ اتنے مختصر وقت میں رابیل نے جتنا زین ابرار کو سمجھا تھا' وہ جان چکی تھی کہ سرکار حد سے بڑھ کے حسن پرست ہیں۔ زین نے کئی مرتبہ اپنی حسن پرستی کے کھلم کھلا مظاہرے دکھائے تھے۔

حسین عورت اس کے شوہر کو ''حسرت'' میں مبتلا کردیتی تھی۔ وہ رابیل سے اس کا موازنہ کرنے بیٹھ جاتا اور رابیل ہر دفعہ ذلت کا ایک پل صراط عبور کرنے پر مجبور ہو جاتی تھی۔ اس کے باوجود وہ خود کو زین سے بے تحاشا محبت کرنے' چاہنے اور عشق کرنے سے روک نہیں پاتی تھی۔

یہی اس کی زندگی کا سب سے بڑا سچ اور سب سے بڑی کمزوری تھی۔

''کمزوری کیسی ہی کیوں نہ ہو' بنیاد کو کبھی مضبوط ہونے نہیں دیتی۔'' اور یہ بات اسے خود غرضوں کی اس دوزخ میں اس لڑکی نے سمجھائی تھی جو اسے پہلی ملاقات میں ہی اس گھر کے ہر فرد سے مختلف لگی تھی۔

وہ حیران کن شخصیت کی مالک تھی۔ بظاہر عام سی معمولی اور اتنے خوب صورت لوگوں کے درمیان میلی میلی اور کچھ دبی دبی سی۔ اس کے باوجود اس لڑکی کی باتیں معمولی نہیں تھیں۔ وہ خاص باتیں بہت عام سے انداز میں کر جاتی تھی۔ اس کی باتیں قائل کرنے والی اور اثر رکھنے والی ہوا کرتی تھیں۔

وہ لڑکی ثمن کی بہن تانیہ تھی۔ ثمن سے بہت مختلف' بہت الگ۔ اسے رشتوں کا لحاظ اور پاس بھی تھا۔ وہ سب سے مروت برتنے کی قائل تھی۔ اس میں مضبوطی تھی' تب ہی تو خالہ' بہن اور کزن کے سامنے بھی جم جاتی تھی۔ تب ہی تو رابیل کو وہ حیران کرتی تھی۔

اس سہ پہر رابیل دس گھنٹے کی ڈیوٹی بھگتا کر تھکی ہاری گھر آئی تو آتے ساتھ گلشن نے اسے راکھ کر دیا تھا۔ اس نے اپنا پرس اور اوور آل اتار کر ابھی رکھا ہی تھا جب سیڑھیاں اترتی گلشن تیز تیز بولتی ہوئی اس کے سر پہ پہنچ گئی تھیں۔ عجیب بدلحاظ عورت تھیں۔ لمحوں میں مقابل کی پوری ہستی کو خارق کر ڈالتیں۔

''ڈاکٹر صاحبہ تشریف لے آئیں۔۔۔۔ محل سرا کے ''سیاپے'' منتظر ہیں آپ کے۔ ثوبیہ میکے چلی گئی۔

ثمن بخار میں پھنک رہی ہے۔ بچے الگ بھوک سے بلبلاتے پھر رہے ہیں۔ میں نے دلیہ گھول دیا۔ کام والی آج جھنڈی دکھا گئی ہے اور پچھلا صحن بھی بساند سے اٹا بھرا پڑا ہے۔ کل سے گندگی نہیں اٹھائی اتنی غلاظت ہے کہ حد نہیں۔ زین کو اللہ سمجھے۔ پورا گھر غلیظ کردیا تمہارے شوہر کے شوق سیاپے ہیں۔۔۔ ان کی دیکھ بھال اب تمہارے ذمے۔۔۔ ہماری ہڈیوں میں دم نہیں۔"

وہ تیز گام پہ سوار بولتی ہوئی تخت پر بیٹھ رہی تھیں جب اندر آتی تانیہ پہ نگاہ پڑی۔ وہ بڑی تہذیب یافتہ، شائستہ مزاج لڑکی تھی۔ نرم نرم الفاظ میں بھگو بھگو کر مارتی۔ اس لمحے جیسے رابیل کے لیے ڈھال بن کر آگئی تھی۔

"توبہ خالہ! آپ کی اتنی قابل لائق فائق ڈاکٹر بہو۔ زمانہ جس کے گیت گاتا ہے۔ اور آپ اسے مہتر، جوہڑوں اور خاکروبوں والے کام بتا رہی ہیں کسی جمعدار کو چار پیسے پکڑا کر گندگی اٹھوایا کریں۔ شوہر کے "ایسے" کام کم از کم بیوی کے ذمے نہیں ہیں۔" وہ دھیما دھیما بولتی ان کے قریب ہی تخت پر بیٹھ گئی تھی۔

"اور یہ ثمن کو آئے دن ایک سو تین بخار رہتا ہے۔۔۔ ابھی کمرے کا دروازہ چپکے سے کھول کر دیکھ لیں شرطیہ کہہ رہی ہوں۔ سر باندھ کے فلم دیکھ رہی ہوگی۔ سب بہانے ہیں۔ آپ سمجھ کر بھی انجان بن جاتی ہیں۔ یہ نرمی صرف بھانجی کے لیے کیوں؟ ناانصافیاں مت کیا کریں خالہ! اللہ کو جان دینی ہے۔۔۔"

وہ ہمدردی سے رابیل کے تھکے تھکے چہرے کو دیکھ کر کہہ رہی تھی۔ ایسا کڑا سچ؟ اللہ کی پناہ۔

بھلا اس پتھریلی عورت کے سامنے "سچ" بولنے کا کسی اور میں حوصلہ تھا؟

وہ سر جھکائے اخبار دیکھنے لگی تھی اور اس کے لبوں پر دھیمی مسکراہٹ بھی تھی جب وہ ہلکا سا مسکراتی تو اس کے ثغر (اگلے دانت) کچھ باہر نکل آتے تھے۔

اس کے باوجود وہ رابیل کو بہت اچھی لگتی تھی۔

"یہ میری اتنی ہمدرد کیوں ہے؟" وہ الجھنے لگی تھی۔ کام کے دوران بھی۔ برتنوں کا ڈھیر دھوتے ہوئے کچن صاف کرتے، سبزی کاٹتے، کھانا بناتے یہی سوچ اس کے ذہن پر سوار تھی۔ شاید اس لیے کہ اس کے کام کرنے کے دوران تانیہ برابر اس کے ساتھ رہی۔ رابی برتن دھوتی رہی۔ تانیہ خشک کرکے اسٹینڈ پہ رکھتی گئی۔ اس نے کچن صاف کیا۔ تانیہ نے پوچا لگایا۔ آٹا گوندھا۔ گوشت دھویا۔ غیر محسوس طریقے سے اس کا کام بٹ گیا تھا۔ ایسی کوئی کوشش ثوبیہ، ثمن یا ماہم میں سے کسی نے کبھی نہیں کی تھی۔ وہ الٹا اپنے کام بھی اس کے سپرد کرکے بھاگ جاتی تھیں۔ اتنے کم اور مختصر عرصے میں ہی رابی تھکنے لگی تھی۔ اتنے بے حس، خود غرض اور سرد لوگوں کے درمیان زندگی گزارنا آسان کہاں تھا؟۔

"مجھے تم سے ہمدردی نہیں۔۔۔ بلکہ تمہارا احساس کرتی ہوں۔" وہ جیسے اس کا چہرہ پڑھنے لگی تھی۔ اس کا دل پڑھنے لگی تھی۔ رابی کا دل دھک سے رہ گیا۔

"تم آزمائش میں پھنس گئیں۔ میں تمہارے لیے اپنے دل میں نرم گوشہ رکھتی ہوں۔" تانیہ نے ککر میں گوشت ڈال کے چڑھا دیا تھا۔

"زین سے محبت اور شادی ایک آزمائش ہی تو ہے۔" تانیہ زیر لب بڑبڑائی۔ رابی جیسے بھونچکی رہ گئی۔

"وہ اتنا خوش نصیب ہے۔ مگر اسے سمجھ نہیں ہے۔" اس نے سنک کی ٹونٹی کھول کے ہاتھ دھوتے ہوئے کہا۔

"جلد باز ہے۔ بعد میں پچھتاتا ہے۔۔۔ پھر بھلا کیا فائدہ ــ جب ہاتھ سے موتی پھسل پڑیں۔" وہ گویا خود سے ہم کلام تھی۔

"اس کی فطرت ہے۔ ہمیشہ بسینڈھ پہ گرتا ہے۔" تانیہ نے جیسے تابوت میں آخری کیل ٹھونک کر چہرہ اس کی طرف موڑ لیا تھا۔ رابیل گویا ہکا بکا رہ گئی تھی۔

"یہ اور نگر کے لوگ ہیں۔۔۔ بہت مشکل، سمجھ میں نہ آنے والے۔ تمہاری راہ بہت کٹھن ہے رابیل! بڑے لمبے صبر کی ضرورت ہے۔" تانیہ نے ہاتھ پونچھ کے اس کے کندھے کو نرمی سے تھام کر بازیا۔

"میں تمہارے لیے سب اچھا ہو جانے کی دعا کروں گی۔ تم بہت اچھی ہو مگر یہ آس پاس کے لوگ۔"

وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی تھی۔ شاید اس کی نظر اندر آتی ماہم پر پڑ گئی تھی۔ اپنے دھیان میں آتی ماہم کا منہ ہلکا سا کھل گیا تھا۔ شاید وہ تانیہ کو رابیل کے ساتھ کھڑا دیکھ کر حیران ہوئی تھی۔

"کیا بات ہے؟ ایسا دوستانہ؟ مان گئی میں تمہیں تانیہ! رقیبوں سے یاری بنانے کا جگرا بس تمہارا ہے۔"

منہ پھٹ خاندان کی اکلوتی صاحبزادی ورطہ حیرت میں گم تھی۔

"تم نے تو میرے اوسان خطا کردیے۔ کہاں ہم تمہارے لیے محاذ کھولے بیٹھے تھے اور یہاں تم نے ہتھیار پھینک دیے۔" ماہم کا ملال جانے والا تھا کیا؟

"میں نے ہتھیار اٹھائے ہی نہیں تھے۔ کیونکہ مجھے یہ جنگ لڑنا ہی نہیں تھی۔" تانیہ نے بڑے تحمل سے جواب دیا تھا۔

"خیر، تم نے چکر کیوں نہیں لگایا۔ آصف تمہارے فراق میں سارا ماحول غمگین بنائے ہوئے ہے۔" تانیہ نے بات بدلنے کے لیے آصف کا ذکر خیر نکالا تھا اور آصف کا ذکر ماہم کے لیے بہت اہم تھا۔ اس کا چہرہ گلال سا ہو گیا۔ تانیہ اور زین کو ایک کرنے کے پیچھے اسی محبت کا کمال تھا۔ خالہ وٹے سٹے کی خواہش مند تھیں۔ تانیہ دے کے ماہم لینا چاہتی تھیں۔ سو ماہم کی خاطر گلشن تانیہ کو قبول کرنے کے لیے تیار تھیں۔ مگر کہتے ہیں نا، غرض میں لپٹے سودے کبھی نفع نہیں دیتے۔

زین کی شادی کے بعد تانیہ کی اماں کے تیور بھی بدل گئے تھے۔ یوں ماہم کا معاملہ کھٹائی میں پڑ گیا تھا۔ تاہم اسے قوی یقین تھا، جلدی ہی زین اور رابیل کی ڈور ٹوٹ جائے گی تانیہ اس گھر میں آجائے گی اور ماہم کی نیا بھی پار لگے گی۔ ماہم ان لوگوں میں سے تھی جو اپنی چلم بھرنے کے لیے دوسروں کا جھونپڑا جلانے میں بھی تامل نہیں کرتے۔

"خالہ کا موڈ آف ہے۔۔۔ کیسے چکر لگاؤں؟" ماہم کچھ بولتے بولتے رابی کی موجودگی محسوس کرکے چپ ہوگئی تھی۔

"لوگوں کے نصیب تیز۔۔۔ سب کچھ بن مانگے جھولی میں آگرتا ہے۔" اسے آنکھیں دکھا کر وہ دکھی صورت بنا کر بولی تھی۔

"خیر، اتنا اترانا بھی نہیں چاہیے۔ بل نکلتے دیر نہیں لگتی۔" رابی کو کھا جانے والی نظر سے دیکھتے ہوئے وہ کچھ اور دکھی ہوگئی تھی۔

"آفت رسیدہ کے لیے "آفت جاں" نہیں بنتے۔ چلو، ہم نکلتے ہیں اور رابیل! تم بھی آرام کرلو۔ ہانڈی تو سمجھو چڑھ ہی گئی۔" تانیہ نے ماہم کو نرمی سے جھٹکا لگا کر رابیل سے کہا اور باہر نکل گئی تھی۔ ماہم بھی پیر پٹختی غصے کے عالم میں باہر نکل گئی تھی جبکہ رابیل کی نگاہیں ایک مرتبہ پھر کلینڈر کے ہندسوں میں اٹک گئیں۔

"زین آج بھی نہیں آیا۔" اس کا دل بھر بھر آنے لگا تھا۔

☼ ☼ ☼

اس صبح وہ بھرے پرے کنبے کا ناشتہ بنا کر جیسے تیسے بھاگتی ہوئی اسپتال جانے کے لیے تیار ہونے اپنے کمرے میں آئی تھی جب اچانک اس کا موبائل بجنے لگا تھا۔ اگرچہ وہ وقت کی قلت کے باعث کال ریسیو کرنا نہیں چاہتی تھی مگر اسکرین پہ چمکتا حسن کا نمبر دیکھ کر وہ ایک دم ٹھٹک گئی تھی۔

اس نے تین مرتبہ کال ڈسکنکٹ کی تھی مگر وہ بھی ڈھیٹوں کا سرخیل تھا۔ مجال ہے جو رکا ہو۔

تنگ آکر اسے کال پک کرنا پڑی تھی۔

"کتنے ذلیل ہو تم... ایک نمبر کے ڈھیٹ اور گھٹیا۔ تمہاری جرات کیسے ہوئی میرے نمبر پہ کال کرنے کی۔" اس نے سیل کان سے لگا کر غیض کے عالم میں کہا تھا۔ جواباً" وہ آہیں بھرتا رہ گیا تھا۔

"نہ سلام نہ دعا... نہار منہ سسرال سے گالیاں ملی ہیں کیا؟ آثار تو یہی لگتے ہیں۔" حسن نے اپنے سابقہ دل جلانے والے انداز میں کہا تھا۔ رابی کا دل جل کر راکھ ہو گیا۔

"بکو... کیوں فون کیا ہے؟ اس دن کچھ "کسر" باقی رہ گئی تھی کیا؟ میرے پاس فالتو وقت نہیں ہے۔" رابی جیسے زہر خند ہوئی۔

"میرے پاس بھی وقت نہیں۔ ابھی تمہارے سرتاج کی احوال پرسی کر کے اپنا قیمتی وقت برباد کرنے کے بعد تمہیں کال کر رہا ہوں۔" وہ جلے کٹے لہجے میں بولتا ہوا رابی کو بری طرح سے "چونکا" گیا تھا۔ اس کے ہاتھ سے موبائل گرتے گرتے بچا۔

"کیا بک رہے ہو؟" رابی جیسے چیخ کر بولی تھی۔ اس کا دل بہت تیز تیز دھڑکنے لگا تھا۔ پورا وجود لمحہ بھر میں پسینہ پسینہ ہو گیا تھا۔

"تمہیں میری بات سمجھ میں کہاں آتی ہے؟ چاہے جیسے بھی سمجھاؤں۔" صاف ظاہر تھا' وہ جان بوجھ کر بات کو طول دینا چاہ رہا تھا۔ رابی جھنجلا گئی۔

"تم زین کے بارے میں کیا بکواس کر رہے ہو؟ زین کہاں ہیں؟ اور تمہیں کہاں ملے؟" رابی نے بمشکل اپنی کپکپاتی آواز پہ قابو پا کر کہا تھا۔

پچھلے تین دن سے اس نے رابیل سے رابطہ نہیں کیا تھا اور اب یہ حسن نجانے کیا بک رہا تھا؟

"ہڈی پسلی تڑوا کر پڑا ہے۔" حسن نے بڑے لطف لینے والے انداز میں رابی کے سر پہ دھماکہ کیا تھا اور رابی کے پیروں تلے سے جیسے زمین کھسک گئی تھی۔ اس کے لبوں سے بے ساختہ چیخ نکل گئی۔

"کک کیا بکواس ہے؟ زین کو کیا ہوا؟ تم نے زین کے ساتھ کیا کیا؟" وہ بے ربط بولتی بے آواز رو رہی تھی۔ آنسو تھے کہ کسی قابو میں نہیں آرہے تھے۔ دوسری طرف حسن کا اطمینان قابل دید تھا۔

"تم نے اسے مارنے کی کوشش تو نہیں کی۔" وہ اپنے دھیان میں کہاں تھی۔ اونچی آواز میں روتے ہوئے خود سے بھی بیگانہ ہو رہی تھی۔

"مارنا ہوتا تو تمہاری بارات والے دن مار دیتا۔ ناکام عاشق تو نہ کہلواتا۔" اس نے اطمینان سے جواب دیا تھا۔

"تو پھر؟" وہ روتے روتے لمحہ بھر کے لیے چپ ہوئی۔

"تمہارے آنسو بڑی تکلیف دے رہے ہیں۔ اس لیے بتا رہا ہوں۔ میرا دوست جس اسپتال میں جاب کرتا ہے۔ اسی اسپتال میں زین ابرار سے ملاقات ہوئی۔ برا سیریس قسم کا ایکسیڈنٹ ہوا ہے۔"

رابی کے پیروں تلے سے زمین کھسک گئی تھی۔

"پہلے تو دل چاہ رہا تھا اسے زہر کا انجکشن لگا دوں۔ ریوالور کا تردد کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ پھر سوچا..."

رابی

نے کھٹاک سے فون بند کر دیا۔

رابیل کے پیروں میں پہیے لگ گئے تھے۔ اس نے منہ صاف کر کے' دوپٹا گھسیٹا اور تیزی سے باہر نکل آئی۔ ان ہی الجھنوں میں گم گرتی پڑتی ہال میں آئی تو اندر کا منظر پہلے سے زیادہ دل دھڑکانے والا تھا۔ ثمن کے آنسو' ساس کے واویلے اور ثوبیہ کی طنزیہ نگاہیں جیسے رابیل کے آر پار ہونے لگی تھیں۔

"ہائے... کیسے کم بخت' سبز قدم لوگ اس گھر میں چلے آئے۔ میرے ہنستے بستے گھر کو نظر لگ گئی۔ ہائے' میرا معصوم بچہ' پردیس میں جانے کس حال میں ہو گا... ہائے... کوئی پنڈی جانے کے لیے نکلا ہے یا نہیں؟"

گلشن اسے دیکھ کر نان اسٹاپ شروع ہو چکی تھیں ——— رابیل کے پیر من من بھر کے ہونے لگے تھے۔

"جانے اسے کہاں کہاں چوٹیں لگیں؟" ثمن سسکیاں بھر رہی تھی۔ آخر لاڈلا کزن اور دلارا دوست بھی تھا۔ دیور بھی' دوہرے رشتے۔ رابی کا سر جھک گیا۔ گیلی آنکھیں اور بھی گیلی ہونے لگی تھیں۔

"ابھی تک ہوش نہیں آیا۔" ثوبیہ نے بھی لب کشائی کی تھی۔ طنزیہ نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے جیسے زین کے ساتھ ہونے والے حادثے میں سارا قصور رابیل کا ہی تھا۔ یا وہ اتنی منحوس اور بدبخت تھی جو ان کے گھر تکلیفیں اور آزمائشیں لے آئی۔ وہ سب کی سوالیہ نگاہوں کے درمیان خود بھی سوال بنی کھڑی تھی۔ آخر اس کا قصور کیا تھا؟

"ہائے... میرے بچے کو تو شادی راس ہی نہیں آئی۔ اس کے نصیب ہی ٹھنڈے نکلے۔ خون میں خون ہوا پڑا ہے۔ تنہا' اکیلا اور لاچار..." گلشن پھپھک پھپھک کر رو رہی تھیں۔ ثمن ان کا برابر ساتھ دے رہی تھی۔ ثوبیہ البتہ چپ تھی تاہم اس کی نگاہیں... ظاہر ہے جب سب بول رہے تھے تو وہ اپنا حصہ کیوں نہ ڈالتی؟ چاہے نگاہوں کی ملامت کے ذریعے ہی سہی۔

یہاں کوئی بھی اس کی حمایت میں بولنے والا نہیں تھا۔ تانیہ بھی نہیں وہ ہوتی تو ضرور رابیل کی ڈھال بن جاتی۔ مگر رابیل کیا اتنی کمزور تھی جو سہاروں کی متلاشی رہنے لگی تھی؟

"شوہر پنڈی اسپتال میں پڑا ہے۔ اور تم تیار شیار ہو کر کہاں چل دیں۔ سچ کہا ہے کسی نے۔ نوکری پیشہ عورتیں گھر میں ٹکتی نہیں۔ دل ہی نہیں لگتا حد ہوتی ہے بے حسی کی۔" گلشن نے اسے دھیان سے دیکھا تو نئے صاف ستھرے استری شدہ کپڑوں پر نظر پڑی۔ رابیل کا دل سکڑ کر رہ گیا۔

"مجھے کچھ دیر پہلے پتا چلا ہے۔ میں اسپتال نہیں جا رہی۔" اپنی صفائی دیتے ہوئے وہ اتنی مرتبہ ہکلائی تھی کہ اسے خود پر ترس آنے لگا تھا۔ بھلا وہ ایسے لوگوں سے جنگ لڑ سکتی تھی؟ وہ جیسے خود ہی ٹوٹنے لگی۔

"آغا میر کی دائی' سب کچھ سیکھی سکھائی۔" وہ اتنی نازک صورت حال میں بھی طنز کرنے سے باز نہیں آئی تھیں کیا تھا' ہاتھ جھاڑتے ہوئے نخوت سے بول رہی تھیں۔ جیسے سارے زمانے کی چالاکیاں صرف رابیل کو آتی تھیں۔ ذرافت کے آتے ہی ماحول کچھ بدل گیا تھا۔ ابرار صاحب اور ذرافت کے ساتھ گلشن اور ثمن بھی پنڈی جانے کو تیار ہو گئی تھیں۔ رابیل کو کسی نے جھوٹے منہ نہیں پوچھا تھا۔ اور وہ دل پر پتھر رکھ کے محض زین کی راہ دیکھتی رہ گئی تھی۔

زین کا پنڈی اسپتال میں قیام کا عرصہ رابیل کے لیے کسی قیامت سے کم نہیں تھا۔ وہ اسے دیکھ نہیں سکتی تھی چھو نہیں سکتی تھی۔ بات نہیں کر سکتی تھی۔ وہ اتنی مجبور' لاچار اور بے بس تھی۔ بھلا محبت کا اس سے کڑا کوئی اور امتحان بھی ہو سکتا تھا؟

جیسے جیسے دن آگے گزرتے جا رہے تھے اس کے دل میں غم کی چوبیں گڑی جا رہی تھیں۔ وہ ثمن سے بڑھ کے زین کا خیال رکھ سکتی تھی مگر ان لوگوں کو سمجھاتا کون؟

ثمن اور گلشن کی واپسی زین کے ہمراہ ہی ہوئی تھی۔ تب ثمن نے ——— بڑی ہوشیاری سے کام لیتے ہوئے تانیہ کو یہاں بلانے اور رہنے پہ آمادہ کرنا چاہا تھا مگر تانیہ نے اپنی جاب کی وجہ سے انکار کر دیا تھا۔

یہاں وہ ساس بہو اس کے لیے راہیں ہموار کر رہی تھیں مگر تانیہ کے سرد انداز دیکھ کر لگتا نہیں تھا کہ بیل منڈھے چڑھے گی۔ تنگ آکر ثمن نے کہہ ہی دیا تھا۔ "جہنم میں جاؤ تم۔ کر لینا کسی کلرک سے شادی۔ اس سے بڑھ کے کوئی رشتہ نہیں ملے گا تمہیں۔ کم صورت' اکڑی بلا... نخرے دکھاتی ہے' دو ٹکے کی صورت پہ۔"

ایسے خیالات تھے اس کے اپنی سگی بہن کے بارے میں۔ بھلا رابیل کے لیے اس کے دل میں کہاں سے جگہ نکل آتی؟ ثمن کو اپنی صورت پر مان تھا اچھے گھرانے میں شادی ہونے کا مان تھا۔ سول جج کی بیوی ہونے کا مان تھا۔ بھلا وہ اتراتی کیوں نا۔

"دھپے چاٹتی رہنا..... یہی تمہارا نصیب ہے۔"
ثمن بلند آواز میں چلاتی فون رکھ کر باہر نکل گئی تھی۔

گھر میں مہمانوں کا میلہ لگا ہوا تھا۔ ہر کوئی زین کی عیادت کے لیے آرہا تھا۔ سو کام بھی بڑھتا گیا۔ رابیل نے اسپتال سے چھٹی لے رکھی تھی۔ گھر کے کام کاج نے اسے گھن چکر بنا دیا تھا۔ قریب قریب ساری ذمہ داریاں اسی کے کندھوں پہ تھیں۔ ظاہر ہے اس کے شوہر کی وجہ سے کاموں کا سلسلہ طویل ہوا تھا۔ کچن، صفائی ستھرائی اتنے بڑے کنبے کے کپڑوں کی دھلائی اور اوپر سے زین کی دہائیاں۔ وہ لمحہ بھر کے لیے بھی اسے اپنے پاس سے ہٹنے نہیں دیتا تھا۔ بستر پہ پڑے پڑے بور ہو چکا تھا۔ اپنے اردگرد چہل پہل دیکھنا چاہتا تھا۔ ثمن اور ثوبیہ کی کمپنی اسے بور کرتی تو وہ کاموں میں الجھی رابیل کو آوازیں دے کر بلا لیتا تھا۔ وہ سارے کام چھوڑ کر بھاگی بھاگی چلی آتی تھی۔

"کہاں فرار ہو رہی ہو..... میں دیواریں دیکھ دیکھ کے تنگ آچکا ہوں۔ چلو آؤ۔ کچھ باتیں کرو۔" وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر پاس بٹھا لیتا تھا۔ رنج و غم کے عالم میں ہی رابیل کی یاد ستاتی تھی۔ چلو یہ بھی اس کے قناعت پسند دل کے لیے کافی سہارا تھا۔

"اسپتال میں پڑے تمہاری بہت یاد آتی تھی۔" وہ بڑے دلار سے کہتا۔

"کسی بہانے یاد تو آئی۔" رابیل کے ہونٹ بھولی بسری مسکان سے سج جاتے تھے۔

"تمہارا رنگ (نشہ، خمار) بھی کم نہیں..... قسم سے یار!" وہ ایک آنکھ میچ لیتا تھا۔ ہنستا مسکراتا، بستر پہ پڑے ہوئے بھی بد معاشیوں سے باز نہیں آتا تھا۔

"آنکھیں کھول کے ڈرائیونگ کیا کریں۔ یہ نشہ، خمار ایک دن لے اڑے گا۔" وہ نرمی سے بات بدلنے کی کوشش کرتی۔

"تمہارے جیسی ڈاکٹر پلس نرس ملے تو آئے دن ہڈیاں تڑوانے کا ڈرامہ کروں۔" زین آہ بھر کے کہتا۔

اپنی بیماری کے دنوں میں وہ رابیل کے اتنا قریب آگیا تھا۔ رالی کو گزرے دن خواب و خیال لگتے۔ وہ لنگڑاتے لنگڑاتے اس کے آگے پیچھے پھرتا۔ آوازیں کستا۔ آوازیں لگاتا اور گلشن حیرانی میں مبتلا، ثمن کو سکتہ سا ہو گیا اور ثوبیہ حسرت سے رشک کیے جاتی۔ اپنے آوارہ اور عیاش دوستوں سے ان دنوں کوسوں دور تھا۔ موبائل آف پڑا تھا اسے رابیل کی قربت سے فرصت کہاں تھی۔

ان دنوں اسے "خوش خبری" نے بھی چونکا دیا تھا۔ اس کے آس پاس جیسے پھول ہی پھول کھل اٹھے۔ اگرچہ اس "خبر" نے باقی لوگوں کو اتنا خوش نہیں کیا تھا مگر زین ابرار کے جوش و جذبات کو دیکھ کر سب کو حیرت کے جھٹکے ضرور لگے تھے۔

"میرا بچہ، مجھ پہ ہوگا۔ گورا چٹا، حسین و جمیل۔"
ان دنوں زین کو "بچے" کے علاوہ کچھ سوجھتا ہی نہیں تھا۔ گھر میں رہنے کی وجہ سے اسے رابیل کی ذمہ داریوں کا بخوبی احساس اور ادراک ہو رہا تھا۔ رابیل پہ کاموں کا اضافی بوجھ تھا اور گلشن کام کے حوالے سے قطعاً" انصاف سے کام نہیں لیتی تھیں۔ ثوبیہ کو تو انہوں نے کبھی کچھ کہا ہی نہیں تھا۔ ثمن کو بھی ہر طرح کی آزادی تھی۔ زین چونکہ گھر میں آرام کر رہا تھا سو بہت سی باتیں اس کے علم میں آنے لگی تھیں۔ خصوصاً" ایسی کنڈیشن میں جبکہ رابیل جاب کے ساتھ ساتھ گھر کو بڑی مشکل سے دیکھ رہی تھی اوپر سے زین کی اضافی دیکھ بھال۔

اس دن بھی زین نے ماں سے با آواز بلند کہہ دیا۔
"یہ ثمن کی بچی بستر توڑ توڑ کے گوشت کا پہاڑ بنتی جا رہی ہے۔ اسے بھی کام سے لگائیں۔ رابیل پہ اتنی ذمہ داریاں ہیں۔ بے چاری کی طبیعت بھی ٹھیک نہیں۔" زین کے ہمدردانہ الفاظ رابیل کے بھی کان میں پڑے تھے۔ وہ بالکونی میں کپڑے دھو رہی تھی۔

ایک دم چونک سی گئی۔ دل میں خوش گوار سی ہلچل مچی تھی۔ زین کا احساس کرنا اسے سرشار کر دیتا تھا۔ مگر یہ خوشی محض گھڑی بھر کی تھی۔ گلشن کے کڑوے لہجے نے اس کے اندر تک کڑواہٹ بھر دی تھی۔

"نہ وہ کوئی دنیا کا انوکھا بچہ پیدا کر رہی ہے؟ آج سے پہلے کسی نے بچہ پیدا نہیں کیا۔" زین کا رابیل کی حمایت میں بولنا انہیں بھڑکا گیا تھا۔

"بچہ تو انوکھا ہے۔ میرا جو ہے۔" وہ بھی تو زین تھا بلا کا منہ پھٹ۔ ویسے بھی اس گھر کے لوگ بلا کے کھلے ڈھلے تھے۔ منہ پھٹ، ہر طرح کی گفتگو آرام سے کر لیتے۔ جھجک، شرم یا لحاظ نہیں تھا۔ گفتگو نجانے کون سا رخ اختیار کر لیتی مگر رابیل کو موبائل کی بیل نے اپنی طرف متوجہ کر لیا تھا۔ وہ گیلے ہاتھ پونچھتی موبائل تک آئی۔ اسکرین پہ پھوپھو کا نمبر تھا۔ آج تقریباً" بارہ دن بعد پھوپھو کی کال آئی تھی۔ اس دوران رالی تو کر نہیں سکی تھی۔ ایک لمحہ کی فرصت نصیب نہیں ہوتی تھی۔ اسے خیال آیا۔ پھوپھو کو زین کے ایکسیڈنٹ کا بھی نہیں بتایا تھا۔ ورنہ وہ عیادت کے لیے ضرور آتیں۔ اور اس وقت انہوں نے فون بھی اسی لیے کیا تھا وہ بہت ناراض ہو رہی تھیں کہ زین کے ساتھ ہونے والے حادثے کی اطلاع کیوں نہیں دی حالانکہ گلشن نے کئی مرتبہ جتایا بھی تھا۔ پھر بھی رابیل میکے والوں کو نہیں بلا سکی۔ شاید اندر کہیں سے وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کا بھرم ٹوٹ جائے۔ اب وہ آرہی تھیں۔

زین کو بتایا تو اس نے منہ بنا لیا۔ مہمانوں سے وہ سخت بے زار ہو چکا تھا۔

"اب پھر سے حادثے کی تفصیلات بتانا ہوں گی۔ میں کیسے گاڑی میں بیٹھا کس طرح اور کتنی اسپیڈ سے گاڑی چلائی۔ کیسے ٹکر ہوئی؟" وہ برا سا منہ بنا کر کہہ رہا تھا۔ پھر کمرے میں جاتے ہوئے بولا۔

"میں سونے کے لیے جا رہا ہوں۔ مہمانوں سے خود ہی نپٹ لینا۔" وہ جان چھڑا کر اندر چلا گیا تھا، رالی گہرا سانس کھینچ کر رہ گئی۔ حالانکہ وہ اسے کہنا چاہ رہی تھی کہ پھوپھو پہلی مرتبہ آرہی ہیں۔ وہ تھوڑا خیال کرے مگر دل مسوس کر رہ گئی تھی۔

پھر وہ پھوپھو کے آنے تک بڑبڑاتا ہی رہا تھا کیونکہ رابیل کچن میں مصروف تھی پھوپھو پہلی مرتبہ آرہی تھیں سو وہ ان کی مدارت میں کوئی کسر نہیں چھوڑنا چاہتی تھی۔ چاہے جس کے مرضی ماتھے پہ بل پڑتے۔

جب وہ جوس دینے زین کے بیڈ روم میں آئی تب وہ ایک مرتبہ پھر کلستے ہوئے بولا۔

"تم نے کہہ دینا تھا۔ میں اب ٹھیک ہو چکا ہوں۔ احوال پرسی کی ضرورت نہیں۔" جوس کا گلاس پکڑ کر وہ منہ بنائے کہہ رہا تھا۔ مہمانوں سے وہ ویسے ہی بھاگتا تھا۔ یہ تو پھر اس کے میکے والے تھے۔ جن سے شادی کے بعد زین نے کوئی ملاقات نہیں کی تھی۔ نہ وہ رابیل کے ہمراہ اس کے گھر گیا تھا۔ پھوپھو نے بہت دفعہ کہا بھی تھا مگر زین نے رکھائی سے منع کر دیا۔

شام کو پھوپھو لدی پھندی سی رابیل کے گھر آئی تھیں۔ مشی اور نشی بھی ان کے ہمراہ تھیں۔ مشی کا اتنا حیران کن نہیں تھا البتہ نشی کو دیکھ کر اسے جھٹکا لگا تھا۔

رابیل اسے دیکھ کر حیران رہ گئی تھی۔
اس کے گال قندھاری انار جیسے لگ رہے تھے جو گہرا سرخ رنگ کا ہوتا ہے۔ اس کے ہونٹ رسیلے تھے۔ آنکھوں کا خمار دیکھنے کے لائق تھا اس کے حسین چمکدار بال۔ گوری رنگت، دودھ اور گلاب سے دھلی ہوئی۔ وجود سے اٹھتی روح مہکا دینے والی خوشبو عنبر میں بسی ہوئی، شہد آگیں.....

وہ تو سراپا گلابوں سے بنی ہوئی تھی۔ نہایت قیمتی، نفیس اور ماڈرن لباس پہنے ہوئے۔ لمبا سا سیاہ فراک، پیروں کو چھوتا ہوا، چوڑی دار پاجامہ، چنری والا دوپٹا..... کھلے بال..... چلتی پھرتی چینی کی گڑیا۔ پہلی نگاہ میں اسے دیکھ کر گلشن، ثوبیہ اور ثمن کے منہ بھی کھل گئے تھے۔

"ارے..... رابیل کی کزن ایسی حسین؟ اس ہیرے کو کہاں چھپا رکھا تھا؟" گلشن کہے بنا نہیں رہ سکی تھیں۔ بہت حسن پرست خاندان تھا یہ، فوراً" متاثر

ہو جانے والا۔ اور ثمن تو جیسے نثی پہ ریجھ ہی گئی تھی۔ ثوبیہ کا انداز بھی پہلے جیسا مغرور نہ تھا۔ گلشن نے تو مذاق مذاق میں کہہ بھی دیا۔

"کاش کہ میرا ایک اور بیٹا ہوتا۔" وہ نشال پہ واری صدقے جارہی تھیں۔ رابیل کو جیسے رشک آیا۔ دوسری طرف وہ تھی۔ بکھرے الجھے بال، ملگجے کپڑے حال سے بے حال۔ جس پر دوسری نگاہ ڈالنے کو بھی جی نہیں چاہتا تھا۔

پھوپھو، زین کا پوچھ رہی تھیں۔ رابیل چپکے سے اندر چلی آئی۔ اپنے تئیں اس نے سارے جوکھم کر کے دیکھ لیے۔ زین کی طرف سے ایک ہی جواب۔

"انہیں کہہ دو..... میں دوائی کھا کے سوچکا ہوں۔"

وہ تکیہ منہ پہ رکھ کے انجان بن گیا تھا۔ اس نے نہیں ملنا تو بس نہیں ملنا۔ رابیل بھاری دل سے باہر نکل آئی۔ ثمن مہمانوں کے لیے ٹرالی سیٹ کر رہی تھی۔ رابیل خواہ مخواہ احسان مند ہو گئی۔ پھر چائے کا دور چلا۔ ساتھ ساتھ طویل گفتگو کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

ثوبیہ بچوں کو دیکھنے باہر نکلی تب زین اپنے کمرے کے دروازے میں کھڑا تھا۔ وہ رک کر اسے دیکھنے لگی۔ زین اشارے سے پوچھ رہا تھا۔ "وہ لوگ چلے گئے؟" اس کی آواز بھی ہلکی تھی۔ ثوبیہ نے نفی میں سر ہلایا۔ تب زین کا پھر سے منہ بن گیا تھا۔

"لگتا ہے آج کی شام، ہمارے نام کر کے ہی جائیں گے۔" اس کا موڈ آف ہو چکا تھا۔ ثوبیہ استہزائیہ مسکراہٹ لبوں پر سجا کے آگے بڑھ گئی۔ اپنے بچوں کے بارے میں وہ بہت حساس تھی۔ مہمانوں میں لگ کے انہیں نظر انداز نہیں کر سکتی تھی۔ اسے اپنی تربیت پر بڑا فخر اور مان تھا۔

زین واپس روم میں جانے کے بجائے دبے قدموں سے چلتا ہوا باہر نکل رہا تھا جب ڈرائنگ روم سے آتی آوازیں سن کر غیر ارادی طور پر رک گیا۔ جیسے کسی نے سحر پھونک کر اسے رک جانے پر مجبور کر دیا تھا۔

"یہ کیسا "سحر" تھا؟ یہ کیسا وقت کا "پھیر" تھا؟ زبانی ہو نکلی جیسے پھر سے گردش میں آچکے تھے۔

ایک اچٹتی سی نگاہ تھی جس نے اندر باہر آگ لگا دی۔ اک شعلہ سا لپکا تھا۔ اک تارہ سا بھڑکا تھا۔

آسمان سے کچھ ٹوٹ کر گرا تھا۔ کوئی ستارہ، کوئی خواب، کوئی جذبہ کوئی رنگ۔ اک اٹھی ہوئی نگاہ تھی جو پلٹنا بھول گئی، جھکنا بھول گئی۔

اک فرحت افزا، فرحت بخش، بھاگوان، خوش اقبال، خوش طالع احساس تھا۔ ایسا احساس جو اندر باہر بجلیاں سی بھر دے۔ روشنیاں سی بھر دے۔ خوشیاں سی بھر دے۔

وہ پلک جھپکے بغیر اسے دیکھ رہا تھا، کہیں پھر سے وہ ایک خواب کی طرح اوجھل نہ ہو جائے۔ بکھر نہ جائے ٹوٹ نہ جائے گم نہ ہو جائے۔

وہ جو خود چل کر اس کی دہلیز پہ اتر آئی۔

سیم بر، سیم تن سی ساحرہ۔

آنکھوں کے رستے دل میں اتر جانے والی۔ دل کی دھڑکنوں میں تلاطم برپا کر دینے والی۔ چمپا کی کلی جیسی مست خوشبودار۔ دل و روح کو معطر کر دینے والی۔

زین ابرار جانتا ہی نہیں تھا۔ وہ ساحرہ اسے اپنے سحر میں عمر بھر کے لیے گرفتار کرنے ہی تو آئی تھی۔ اور وہ ساحرہ ہاری ہوئی بازی کو جیت لینے کے فن سے بھی آشنا تھی۔

☼ ☼ ☼
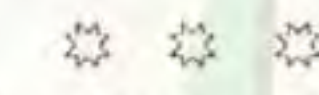
زین کے تندرست ہونے کے بعد روٹین لائف پھر سے شروع ہو گئی تھی۔ وہی بور سے دن اور بور سی راتیں۔ دن تو اسپتال میں گزر جاتا۔ پھر گھر آکر لاتعداد کاموں میں الجھا رہتا۔ ثمن اور ثوبیہ اب بھی گھر کے کاموں سے بے نیاز تھیں۔

اور رابیل آہستہ آہستہ ہی سہی، ان لوگوں میں ایڈجسٹ کرتی گئی تھی۔ ویسے بھی آنے والے بچے کا تصور اس کے اندر باہر پھول ہی پھول کھلا دیتا تھا۔ تازگی اور امنگ سی دل میں بھر جاتی تھی۔ اور سب سے بڑھ کر زین کا موڈ ان دنوں بے انتہا خوشگوار تھا۔ رابیل آنے والے بچے کو مبارک سمجھتی تھی۔ کبھی کبھار

اسے زین کے رویے پہ حیرت اور تعجب ہوتا۔ ان دنوں اس کا شوق، اشتیاق عروج پر تھا۔ بنا سنورا، ہنستا مسکراتا گنگناتا۔ غصہ تو جیسے اس کے قریب سے بھی نہ گزرتا تھا۔ وہ رابیل کو بھی خوش و خرم مسرور، شاداں رکھنے کی کوشش کرتا۔

ان کے پھوپھو کی طرف "پھیرے" بڑھ گئے تھے۔ وہ سمجھتا تھا، رابیل کو ان دنوں آرام کے لیے میکے میں زیادہ سے زیادہ قیام کرنا چاہیے۔ زین کی نگاہ میں وہ یہاں بہت بے آرام تھی۔ کاموں کا بوجھ، گھریلو رنجشیں، ٹینشن، تلخیاں۔ وہ چاہتا تھا۔ رابیل اپنی پھوپھو کی طرف رہے۔ وہ خود ہی سر شام ادھر کا چکر لگا لیتا تھا۔ اور جیسے یہ اس کی روٹین بن گئی تھی۔ وہ سب کچھ بھول سکتا تھا مگر پھوپھو کی طرف چکر لگانا نہیں بھولتا تھا۔

رابیل اسپتال سے گھر آتی تو زین پہلے سے موجود ہوتا۔ ایک گرما گرم محفل عروج پہ ہوتی۔ ہنسی، قہقہے، مسکراہٹیں جیسے پھوپھو کے گھر کا پرانا دور لوٹ آیا تھا۔ جب نشی، مشی اور حسن کے ساتھ طویل محفلیں جمتی تھیں۔

پھر پتا نہیں کیا ہوا کہ مشی نے برملا حیرت کا اظہار شروع کر دیا۔

"یہ مغرور بندہ بدل کیسے گیا؟ کہاں تو کسی سے کلام نہیں کرتا تھا اور اب؟" مشی کی حیرانی فطری تھی۔ بہت سے لوگ چونک سکتے تھے۔

کچھ عرصہ مزید گزر گیا۔ زین کی وہی روٹین تھی۔ پھوپھو کے گھر بلاناغہ آتا۔ پھر جیسے سارے رنگ ہی بدل جاتا۔ نشال اور زین شرط لگا کر بیڈمنٹن کھیلتے، کرکٹ کا میچ رکھتے، شطرنج کی بساط بچھاتے، کارڈ کے کھیل میں ایک دوسرے کو مات کر دیتے۔ جو شرط ہارتا، وہ آؤٹنگ کا پروگرام رکھتا۔ آئس کریم، ہوٹلنگ، لانگ ڈرائیو، شاپنگ مالز کے چکر۔ جیسے زندگی میں رنگ ہی رنگ بکھر گئے تھے۔ رابی ان کے پروگرامز کا حصہ نہیں بن سکتی تھی۔ اس کی طبیعت بیزار رہتی۔ اسپتال سے آکر وہ آرام کرنا چاہتی تھی۔ زین خود بھی

اس کے آرام کا خیال رکھتا۔ اسے پرسکون رہنے اور سفر نہ کرنے کی ہدایت کرتا۔ زین کی بھرپور توجہ، محبت کے باوجود پتا نہیں کیوں اس کا دل یہاں سے اوب گیا تھا۔ وہ اپنے گھر جانا چاہتی تھی۔ جب اس نے مشی کے سامنے ذکر کیا تو وہ جیسے نہال ہو گئی۔

"تمہاری پیکنگ کر دوں؟ تمہیں اب اپنے گھر چلے ہی جانا چاہیے۔" مشی کے الفاظ اگرچہ اسے اچھے نہیں لگے تھے مگر لہجے میں محبت ہی محبت تھی۔ رابیل کا الٹا اور برا ہوتا دل کچھ متعجب ہو گیا۔ تب مشی جیسے اس کا چہرہ پڑھتے ہوئے نرمی سے بولی تھی۔

"چین، آرام، سکون، راحت، آسودگی اپنے گھر میں ہی میسر آتی ہے۔ تمہیں نہیں لگتا، یہاں طویل قیام کچھ غیر مناسب ہو گا۔" وہ اسے کیا سمجھانا چاہ رہی تھی؟ رابیل جیسے ہونق ہو گئی۔

"حالات بگڑ جائیں تو پھر سنبھلتے نہیں۔ بہتر ہے انہیں وقت پہ کنٹرول کر لیا جائے۔" وہ اشارے کنایوں میں اسے کیا سمجھا رہی تھی؟ رابیل جیسے سمجھ کر بھی سمجھنا نہیں چاہتی تھی۔ مشی کی باتیں بھید بھری ہوتی تھیں۔ راز اور معمہ سی۔ عموماً" سمجھ میں نہ آتیں۔

"تمہیں نہیں لگتا؟ کچھ چیزیں تمہیں "انعام" میں اور کچھ امتحان کے طور پر ملی ہیں۔ ان ہی میں ایک تمہارا خوبرو شوہر ہے۔ کئی لوگوں کے ایمان ڈگمگا دینے والا۔"

اب تو کچھ بھی کہنے سننے کو نہیں بچا تھا۔ رابیل کے اندر بے چینیاں بھرنے لگیں۔ کہیں کوئی احساس چٹکیاں بھر رہا تھا۔ کچھ انہونا، عجیب، تکلیف دہ اذیت سے بھرپور۔

وہ گھر جانے کو تیار ہو گئی۔ پھر اسی سہ پہر حسن بھی آگیا تھا۔ گھر میں کچھ اور ہلچل سی مچ گئی۔ اب تو رابیل بالکل بھی رکنا نہیں چاہتی تھی۔ مگر زین کسی طور اسے گھر لے جانے کو تیار نہ تھا۔ اسے رابیل کی "صحت" ابھی اپنے گھر کے لیے موزوں نہیں لگ رہی تھی۔ زین کا خیال تھا۔ ابھی رابیل کو مزید یہیں رکنا

چاہیے۔

رابیل چپ سی ہوگئی۔ زین سے کبھی بحث میں تو پڑی ہی نہیں تھی۔ پھر ایک ہفتہ پل صراط بن گیا۔ حسن سے آتے جاتے سامنا ہونا معمول کی بات تھی۔ اس کے چبھتے انداز' طنزیہ باتیں۔ رابیل کا دماغ سن ہوجاتا تھا۔ جبکہ زین کی وہی روٹین تھی۔ اب بھی محفلوں کے وہی رنگ تھے۔ اور جان محفل نشال کی ذات تھی۔ وہ اپنے کھیل تماشوں میں زبردستی مشی اور رالی کو بھی گھسیٹ لیتے تھے۔

وہ بڑی اداس کردینے والی شام تھی۔ گھٹن اور حبس سے لبریز۔ دل کو دھڑکا لگا دینے والی۔ اس شام حسن کی پنڈی واپسی تھی۔ جانے سے پہلے وہ دندناتا ہوا رالی کے سر پہ سوار ہوگیا تھا۔ اتنے دن امن سے گزر گئے تھے۔ جاتے جاتے وہ اوقات دکھانے آگیا تھا۔

"یہ کیسا تماشا لگا رکھا ہے۔" وہ غیض سے بھرا ہوا تھا۔ رالی کا دل دھک سے رہ گیا۔

"کیا تماشا؟" رالی خوف زدہ ہوگئی۔ وہ حسن سے منہ ماری نہیں کرنا چاہتی تھی۔

"تم اپنے گھر کیوں نہیں جارہیں؟" اس کی آنکھوں میں شدید غصہ بھرا تھا۔ اور اس غصے کے پیچھے کوئی اور چبھتا ہوا احساس بھی تھا۔ رالی سمجھ نہ سکی۔

"یہ میرا بھی گھر ہے۔" رالی نے چبا چبا کر جیسے جتایا تھا۔

"ہے نہیں تھا۔ اب تمہارا گھر یہ نہیں' تمہارے شوہر کا گھر ہے۔ بوریا بستر باندھو اور جاؤ یہاں سے۔ مجھے تمہارا شوہر ایک آنکھ نہیں بھاتا۔" حسن نے سابقہ تیور دکھاتے ہوئے کہا تھا۔ رالی کا دل بجھ گیا۔ چہرہ اتر گیا۔

"تم مجھے یہاں سے نکالنا چاہتے ہو۔" رالی کی آنکھیں نم ہونے لگیں۔ پہلی مرتبہ پرائے گھر کا احساس ہوا تھا۔ یہ اس کا اپنا گھر نہیں۔ پھوپھی کا گھر تھا۔ جانے اس کے چہرے پر کیسی شکستگی پھیلی تھی۔ کہ حسن کے دل کو کچھ ہونے لگا تھا۔ اسے اپنے سخت الفاظ کا احساس بھی ہوا۔ تب ہی اس کا لہجہ اور انداز بھی بدل گیا۔

"یہ گھر اور اس کے مکین ہمیشہ سے تمہارے ہیں۔ بس وقت تمہارا نہیں۔ اپنے شوہر کے ساتھ خوش رہو۔ اور یہاں سے چلی جاؤ۔ مجھے وقت کے تیور اچھے نہیں لگ رہے۔"

حسن کے اگلے الفاظ رابیل کو منجمد کرگئے تھے۔ اس کا منہ حیرت سے کھل گیا تھا۔ اور حسن اس کی حیرت اور تعجب کو دیکھنے کے لیے رکا نہیں تھا۔ عجیب بکھرا بکھرا سا چلا گیا تھا۔ مگر جانے سے پہلے اس کی نشال کے ساتھ بہت طویل "جنگ" ہوئی تھی۔ یہ جنگ کیوں ہوئی؟ رابیل کو بعد میں مشی نے بتایا۔

"اسے نشی اور زین کی بے تکلفی پسند نہیں۔" یہ بہت مہذب الفاظ تھے جن کا مشی نے انتخاب کیا تھا۔ اور رابیل جیسے لمحہ بھر میں پتھر ہوکر رہ گئی تھی۔ اس کے اندر جو آندھیاں اٹھ رہی تھیں کیا ان کی چاپ سب کو سنائی دینے لگی تھی۔

اگلی شام اس نے سامان سمیٹ لیا تھا اور زین کی ہزار ناگواری اور دلیلوں کے باوجود اپنے گھر جاکر ہی دم لیا۔ اس شام زین کا موڈ بہت خراب تھا۔ وہ بات بے بات رالی سے الجھ رہا تھا۔ غصہ کررہا تھا۔ مگر رالی نے اپنے کان بند کرلیے تھے۔ وہ کچھ سننا نہیں چاہتی تھی۔ کچھ دیکھنا نہیں چاہتی تھی۔ اس کی واپسی نے گلشن کا موڈ بھی خراب کردیا تھا۔ انہیں مزید طعنے دینے کا موقع ہاتھ آگیا۔

"بس ہوگیا آرام؟" وہ طنز کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دینا چاہتی تھیں۔ رالی جانتے بوجھتے انجان بن گئی۔ وہ ویسے بھی ان کی ہر قسم کی باتیں اور رویے سہنے کی عادی ہوچکی تھی۔

اگلی صبح جب وہ اسپتال جانے لگی تو گلشن نے اسے روک لیا تھا۔

"اس مہینے تنخواہ نہیں دوگی کیا؟" ان کے الفاظ نرم لیکن لہجہ تلخ ہی تھا۔ نرمی' حلم' ملائمت اور برد باری تو انہیں چھو کر نہیں گزری تھی۔ ہر مہینے وہ رالی سے آدھی تنخواہ آرام سے لے لیتیں۔ رالی نے بھی

اس معاملے میں کبھی تنگ دلی نہیں دکھائی تھی۔ اس وقت بھی ڈھیروں نوٹ بنا گنے ان کے ہاتھ پہ رکھ دیے تھے۔

☆ ☆ ☆

پھر بہت سے دن گزر گئے تھے۔ زین کا موڈ پھر سے خوشگوار ہوگیا تھا۔ اور کبھی کبھار پھوپھو کی طرف چکر لگا لیتے۔ تب نشی انہیں زبردستی روک لیتی تھی۔ نشی کا مزاج بھی بدل گیا تھا۔ اب وہ دوبئی والے رشتے کے لیے اپ سیٹ نہیں تھی۔ بلکہ پہلے سے زیادہ نکھر چکی تھی۔ ہر وقت ہنستی مسکراتی رہتی۔ جیسے پہلے والی شوخیاں لوٹ آئی تھیں۔

نشی پر ان دنوں صبح بنارس کا سا وقت تھا۔ بہار جیسے جوبن پہ تھی۔ خوشبو' نکہت' مہک سے گوندھ رہی تھی۔ اس پہ نظر نہیں ٹھہرتی تھی۔ اس کی ہنسی خود مختار' آزاد' بے قید تھی۔ وہ گھنٹوں مسکراتی رہتی۔

خود کو فٹ رکھنے کے لیے کلب جاتی' جم جاتی' جاگنگ کرتی۔ اسکواش کھیلتی۔ اپنے حسن کو لشکارنے کا فن اسے آتا تھا۔

اس شام رابیل ڈنر کی تیاری کررہی تھی جب اچانک مشال کی کال آگئی۔

اسے مشی کے لہجے میں واضح سمی کھلی محسوس ہوئی تھی۔

"ہماری طرف آنا ہو تو تم دونوں ایک ساتھ آیا کرو۔ زین کو اکیلا کیوں بھیجتی ہو؟"

مشی نے ڈھکے چھپے لفظوں میں بات نہیں کی تھی۔ رالی کچھ دیر کے لیے سن ہوگئی تھی۔

اس کے پورے وجود پہ کپکپی طاری ہوگئی تھی۔ اس نے بغیر خدا حافظ کہے فون رکھ دیا تھا۔ پھر ایک دم اس کا بی پی شوٹ کر گیا۔ وہ کچن میں گرتے گرتے بچی تھی۔ مگر ثمن اور ثوبیہ میں سے کوئی آگے نہیں بڑھا تھا۔ وہ خود ہی گرتی پڑتی اپنے کمرے میں چلی گئی تھی۔

اس شب زین قریب قریب گیارہ بجے گھر آیا تھا۔

رالی تب تک جاگتی رہی تھی۔ اپنے ذہن میں بے شمار سوالوں کے درمیان وہ ایک عذاب سے گزر رہی تھی۔ کیا اسے کھل کر زین سے بات کرلینی چاہیے تھی؟ کیا اسے اپنے اور زین کے درمیان "بھرم" کی دیوار کو گرا دینا چاہیے۔

کیا اس کی متانت' سنجیدگی' پختگی اور تہذیب کسی جھگڑے یا بحث کی متحمل ہوسکتی تھی؟ ابھی بہت کچھ مبہم تھا۔ کچھ بھی کھلا' صاف' ظاہر یا آشکار نہیں ہوا تھا۔ اور وہ نہیں چاہتی تھی کہ بھرم کی دیوار گر جائے' جو ایک پردہ سا حائل تھا وہ گر جائے۔ ہٹ جائے۔ ابھی معاملے کو اخیر تک' انجام تک' آخری سرے تک پرکھنا اور کھوجنا تھا۔ شاید اس کے شبہات غلط نکل آئیں۔ پھر بھی اپنی سمجھ' بوجھ' فہمید کے تحت اس نے بہت نرم الفاظ میں زین سے بازپرس کرنے کی کوشش کرہی لی تھی۔ جواباً وہ پہلے کی طرح بھڑکا نہیں تھا اور نہ ہی اس نے غصہ کیا۔ بلکہ آرام سے کندھے اچکا کر بتایا۔

"نشی نے میرے والا کلب جوائن کر رکھا ہے نا۔ تو اسے پک اینڈ ڈراپ کردیتا ہوں۔"

زین نے جس لاپروائی سے جواب دیا تھا' رالی مزید سوال کر ہی نہیں سکی۔

پھر کچھ وقت مزید گزر گیا۔ اس کی ڈلیوری کے آخری مہینے تھے۔ اسپتال سے اس نے چھٹی لے رکھی تھی۔ اس دوران حسن نے اپنی فہم ناقص سے کچھ تخریب کاری نہیں کی تھی۔ وہ پہلے کی طرح اسے زک پہنچانا' فون کال کرنا یا پھوپھو کے گھر سامنا ہونے پر طنز کرنا چھوڑ چکا تھا۔ وہ اپنی گم گشتہ محبت کے راگ الاپنا بھی ترک کرچکا تھا۔ اس کا غضب' غصہ' قہر سب ختم ہوچکا تھا۔ یقینی طور پر وہ اپنی بچکانہ محبت پر پشیمان تھا۔ اور اپنے ہٹیلے پن' اڑیل انداز اور ضد پر ہنستا ہوگا۔ ویسے بھی رابیل کے علاوہ وہ جس نئی دنیا کو دریافت کررہا تھا۔ وہاں اسے بے تحاشا خوبصورت اور ذہین چہرے اٹریکٹ کرنے والے تھے۔ جو بھی تھا' حسن کی طرف

سے رابیل کو پوری تسلی ہو چکی تھی۔ وہ اس کی زندگی میں کبھی ہلچل نہیں مچائے گا۔

☼ ☼ ☼

ایسے ہی بے کیف دنوں میں تانیہ کی منگنی کا بلاوا آگیا تھا۔ یہاں تقریباً" سب ہی لوگ بہت پرجوش تھے۔ کیونکہ اب ماہم کے لیے حالات سازگار ہونے کے امکان واضح تھے۔

منگنی سے پہلے ایک صبح تانیہ کا ابرار منزل چکر لگا تھا۔ اس کو ثمن کے ساتھ شاپنگ کے لیے جانا تھا مگر اس سے پہلے وہ دبے قدموں رابیل کے کمرے میں آگئی تھی۔ اس کے انداز میں عجیب سی پراسراریت تھی۔ جیسے وہ کوئی بہت اہم بات کہنے کے لیے بے چین تھی۔

"زین کا کچھ پتا ہے تمہیں۔ بھنورے کو ڈال ڈال منڈلانے کی عادت ہے۔ وہ تو فطرتاً" ایسا ہی ہے۔ پر تمہاری اس حسینہ عالم کزن کو تو کچھ خیال رکھنا چاہیے۔ سڑکیں روندتی پھر رہی ہے اس کے ساتھ۔ یہ "یارانہ" کوئی چن نہ چڑھا دے۔ اپنے "آپ" کو بچالو کسی بھی طرح۔"

تانیہ کی نیت میں کھوٹ تھا نہ گفتگو میں۔ پھر بھی رابیل کو اس کی بات بہت بری لگی تھی اس نے سوچا۔ جب اپنی دال نہ گلی تو اس کے ذہن میں موجود "شک" کو گانٹھ لگانے آگئی۔ آخر ثمن کی بہن تھی۔ کیسے نہ منافقت دکھاتی۔

رابی نے اسے کچھ کہا تو نہیں۔ کہ یہ اس کی فطرت کے خلاف تھا تاہم اس کے اندر گرہ ضرور پڑ گئی تھی۔

بیٹی کی پیدائش تک جیسے وہ سولی پر ہی لٹکی رہی اور جیسے ہی "جگنو" نے اس دنیا میں آنکھیں کھولیں رابیل کے سارے خدشات اڑن چھو ہو گئے تھے۔

جگنو اس کی زندگی میں بہت سی روشنیاں اور خوشیاں لے کر آئی تھی۔ یہاں تک کہ جگنو کی موہنی صورت نے دادی کے پتھر دل کو بھی پسیج دیا تھا۔ اور زین کی تو جگنو میں جیسے جان تھی۔ وہ رابیل سے سچی محبت کرتا یا نہ کرتا البتہ بیٹی سے اسے عشق تھا۔ وہ ہو بہو زین کی کاپی تھی۔ بس آنکھوں کا رنگ مختلف تھا۔ زین اور زخام کے علاوہ اور کسی کی اس گھر میں نیلی آنکھیں نہیں تھیں۔ جگنو کی بھی نہیں..... تاہم جگنو باپ اور دادی کی راج دلاری ضرور بن چکی تھی۔

جگنو کے لیے زین بہت حساس تھا۔ کسی کو اسے چھونے نہ دیتا اٹھانے نہ دیتا اور چومنے تو ہرگز نہ دیتا۔

اس کا خیال تھا کہ چھوٹے بچوں کو بار بار چومنے سے جراثیم لگ جاتے ہیں، ثمن اور ثوبیہ کو زین کا جگنو کے لیے اتنا کانشس ہونا سخت گراں گزرتا تھا۔ وہ ننھی سی بچی ان کی چڑ بنتی جا رہی تھی۔

رابی کا ہسپتال شروع ہوا تو جگنو کی دیکھ بھال ایک مسئلہ بن گئی۔ گلشن اسے پیار کرتی تھیں گود میں بھی اٹھا لیتی تھیں۔ تاہم ہر وقت اسے ساتھ چپکائے نہیں رکھ سکتی تھیں۔ نہ اس کا ڈائپر چینج کرتیں نہ دودھ بنا کے دے سکتی تھیں۔

زین نے بچی کے لیے کل وقتی ملازمہ رکھ دی تھی۔ رابیل دل ہی دل میں اس کی احسان مند ہو گئی تھی۔ وہ بچی کے لیے اتنا ہی حساس تھا۔ اتنی محبت کرتا تھا کہ رابی کے سارے خدشات پانی کا بلبلہ ثابت ہو گئے تھے۔

ان ہی دنوں تانیہ اور ماہم کی منگنی کا دن مقرر ہو گیا تھا۔ ماہم اپنی محبت پانے کی خوشی میں سرشار تھی اور گلشن بیٹی کی خوشی میں مسرور..... ثمن کا موڈ بھی خوشگوار تھا۔

تانیہ سے پہلے ماہم کی منگنی کا فنکشن ہوا تھا۔ تانیہ کی منگنی جمعہ کے روز تھی۔ اس دن رابیل کی ڈبل ڈیوٹی تھی۔ اس نے تانیہ سے معذرت کر لی۔ گھر کے سب افراد صبح سے ثمن کے میکے چلے گئے تھے۔ صرف ثوبیہ گھر میں تھی۔ ایسے معمولی فنکشنز میں جانا وہ اپنی توہین سمجھتی تھی۔

صبح سے رابیل کے اندر گڑبڑ مچی تھی۔ طبیعت بے کل اور بےزار تھی۔ جیسے کچھ انہونا ہونے والا تھا۔ جیسے کچھ کھونے والا تھا۔

وہ طبیعت خرابی کے باعث جلدی گھر لوٹ آئی تھی۔ آتے ہی ثوبیہ سے سامنا ہو گیا۔ وہ عجیب طنزیہ اور استہزائیہ نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ ایسی مذاق اور تمسخر اڑاتی نگاہیں تھیں کہ رابی کے دل کو کچھ ہونے لگا تھا۔

وہ اس احساس سے جان چھڑا کر پہلے جگنو کو دیکھنے اس کے کمرے میں گئی تھی پھر اپنے بیڈ روم میں آئی۔

مگر اندر کا منظر اس کی آنکھوں میں مرچیں بھرنے کے لیے کافی تھا۔ وہ متحیر اور حیران رہ گئی۔ اس کے صاف ستھرے بیڈ روم میں کھانے کے جھوٹے برتن، چائے کے مگ، کھانے کی باقیات کے علاوہ ہر چیز میں بے ترتیبی کی جھلک واضح نظر آ رہی تھی۔ رابی کا دل جیسے دھک سے رہ گیا تھا۔

"زین تو دفتر گیا تھا، پھر یہاں کون آیا؟" اس کا دل بہت تیز دھڑک رہا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر واش روم میں دیکھا..... وہ استعمال شدہ لگ رہا تھا۔ ڈریسنگ پہ بھی کچھ چیزیں بکھری تھیں۔ ان میں دو چیزیں چونکا دینے والی تھیں۔ کیونکہ وہ دونوں چیزیں رابیل کی نہیں تھیں۔ ہیئر برش اور پرفیوم..... رابی کی آنکھیں ابل پڑیں۔ دونوں چیزیں امپورٹڈ تھیں۔ بہت قیمتی تھیں..... رابیل نے انہیں بار بار چھو کر دیکھا۔ پرفیوم لیڈیز تھا اور اس کے ساتھ چھوٹا سا لپ گلوز..... آخر یہ چیزیں کہاں سے آئی تھیں؟ رابی کا دماغ سنسنانے لگا تھا۔ اس نے بے ترتیب بیڈ شیٹ دیکھی تھی۔ کشن اور تکیے کارپٹ پر پڑے تھے۔ رابی نے تکیے اٹھائے۔ کشن سیدھے کیے۔ بیڈ شیٹ درست کی تو ڈائمنڈ کا ایئر رنگ اس کے ہاتھ آ لگا تھا۔ اب تو کسی شک و شبہ کی گنجائش باقی نہیں رہی تھی۔ یہ ڈائمنڈ کا ایئر رنگ، کہاں سے آیا تھا؟ کس طرح سے آیا تھا؟ کیوں آیا تھا رابی کے اندر باہر جیسے آگ بھڑک اٹھی۔

وہ الٹے قدموں باہر کی طرف آئی تھی۔ حواس باختہ سرخ آنکھیں لیے، سرخ چہرہ لیے غضب ناک تیور لیے..... بکھری بکھری اور بدحواس سی سامنے ہی کوریڈور میں ثوبیہ کھڑی تھی۔ سیل فون کان سے لگائے۔ شاید زوار کی کال تھی۔

رابی کی طرف اچٹتی استہزائیہ نگاہ سے دیکھتی وہ ذرا بھی ٹھٹکی نہیں تھی۔ جیسے وہ جانتی تھی کہ رابیل "بدحواس" کیوں ہے؟ رابیل نے لگی لپٹی رکھے بغیر پوچھ لیا۔

"میرے کمرے میں کون تھا؟" اس کی آنکھیں لہو رنگ ہو رہی تھیں۔ غصہ، غم اور کرب کی انتہا تھی۔

اس سے بولا نہیں جا رہا تھا۔ اپنے پیروں پہ کھڑا ہوا نہیں جا رہا تھا۔ اس کے پیروں تلے سے زمین نکل رہی تھی۔ وہ ٹیلی فون پہ گھنٹوں باتیں کرتا تھا۔ چھپ چھپ میسجنگ کرتا تھا۔ موبائل اس کے کان سے کبھی ہٹا نہیں تھا۔ پھر بھی رابیل اس پہ شک کو مضبوط نہیں کرتی تھی۔ وہ شاید بھرم کی دیوار نہیں توڑنا چاہتی تھی مگر آج شاید "سچ" کے سامنے آنے کا دن تھا۔

"تمہارے کمرے میں کون تھا، مجھے کیا پتا۔ اپنے شوہر سے پوچھو۔ وہ بہتر جواب دے گا۔" ثوبیہ کی آواز اسے سوچوں کے گرداب سے باہر نکال لائی تھی۔ جس طرح ثوبیہ انجان بن کر اس کا تمسخر اڑا رہی تھی۔ رابی کا سر جھک گیا۔

"مجھے کسی کی ٹوہ لینے کی عادت نہیں..... یہ شعبہ ثمن کے حوالے ہے۔" وہ نخوت اور بیزاری سے بولی تھی۔

"سارا قصور تربیت کا ہے۔ ماؤں کو بیٹوں کا اور بیویوں کو شوہر کا سایہ بنا رہنا چاہیے۔" وہ ہاتھ جھاڑ کر مغرور سا انداز لیے اندر چلی گئی تھی جبکہ رابیل کے

قدموں کے نیچے سے رہی سہی زمین کا ٹکڑا بھی نکل گیا تھا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر دیوار کا سہارا لیا۔ وہ جیسے چکر کھا کر گرنے والی تھی۔ تب ہی ایک نرم سی آواز ابھری۔ رابی نے پلٹ کر نہیں دیکھا تھا۔ وہ نرم آواز کوثر کی تھی۔ اس نے جگنو کو اٹھا رکھا تھا اور رابی کے لیے اس کے چہرے پہ تشویش پھیلی تھی۔

"باجی! آپ ٹھیک تو ہو۔" وہ بہت تفکر کے عالم میں پوچھ رہی تھی۔ رابی نے بمشکل اثبات میں سر ہلایا۔

"باجی! آپ پوچھ رہی تھیں۔ گھر میں کون آیا؟ صاحب کے ساتھ ایک لڑکی آئی تھی۔ بہت حسین اور ماڈرن' دو تین گھنٹے یہاں رہی تھی۔ ثوبیہ بی بی نے مجھے منع کر دیا تھا کہ زین صاحب کو ان کی موجودگی کا نہ بتاؤں زین صاحب نے مجھے جگنو کے ہمراہ سامنے والے پارک میں بھیج دیا تھا۔"

کوثر اپنی سادگی میں رابیل کے وجود کو ریزہ ریزہ کر رہی تھی۔ اب تو جیسے رابیل کے اندر ہمت کی آخری رمق کا خاتمہ بھی ہو چکا تھا۔ اور جیسے سارا بھرم بھی چکنا چور ہو گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

یہ بات اتنا معمولی نہیں تھی جو رابیل خاموش رہتی۔ آخر زین کی اتنی جرات کیسے ہوئی جو وہ ایک غیر لڑکی کو اٹھا کر گھر لے آیا تھا۔ پھر اس لڑکی کا سامان جان بوجھ کر چھوڑ کے جانا تاکہ رابیل کو چونکایا جائے۔ آخر زین ابرار اس کے ساتھ کون سا کھیل ــــــ کھیل رہا تھا۔

رات ہونے تک گھر میں آئی اس لڑکی کے بارے میں سب کو خبر ہو گئی تھی۔ رابیل کوئی کمزوری نہیں دکھانا چاہتی تھی۔ اسی لیے کمرے سے اٹھا کے ثبوت گلشن کی جھولی میں لا پھینکے تھے۔ پھر کوثر اور ثوبیہ بھی گواہ تھیں۔ زین کے مکرنے کا کوئی چانس نہیں تھا۔ اپنے تئیں اس نے زین کے گرد گھیرا تنگ کر دیا تھا مگر پھر ہوا کیا؟ زین صاف صاف مکر گیا۔ بلکہ اسے تو رابیل سے ایسی جرات کی توقع ہی نہیں تھی۔ وہ لمحہ بھر کے لیے دنگ سا رہ گیا تھا۔ پھر اپنی کمزوری اور عیب پہ پردہ ڈالنے کے لیے رابیل پہ چڑھ دوڑا..... اس نے رابیل کو غلیظ غلیظ گالیاں دیں۔ وہ غصے میں آؤٹ آف کنٹرول ہو رہا تھا۔

"اس بدصورت عورت کو سر پہ چڑھا کر یہ نتیجہ حاصل کیا ہے۔ ذرا منہ کیا لگا لیا۔ یہ تو گریبان تک آ گئی۔ مجھ پر بہتان لگاتی ہے۔ ہونہہ! میں تو اس سے شادی ہی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ نہ شکل نہ صورت۔

بلاؤ ثوبیہ بھابھی کو۔ پوچھو ان سے 'یہ سچ کہہ رہی ہے کہ جھوٹ؟ میرے ساتھ کوئی عورت آئی یا نہیں'۔"

وہ آگ بگولہ ہو رہا تھا۔

پھر ثوبیہ کو آنا ہی پڑا۔ رابیل کو پورا یقین تھا۔ ثوبیہ سچ اگل دے گی۔ اس نے نہ صرف زین کو بلکہ اس لڑکی کو بھی دیکھا تھا۔

"اگر یہ عورت جھوٹی نکلی تو کھڑے کھڑے طلاق دے دوں گا۔" وہ غیض و غضب کا مجسمہ بنا ہوا تھا۔ رابیل کی جان نکل گئی وہ بھول گئی کہ وہ اس کے بیڈ روم میں غیر لڑکی کو لے کر آیا تھا اسے سب کی نظروں میں ذلیل کر رہا تھا۔ وہ جیسے سب کچھ بھول گئی۔ یاد رہا تو بس اتنا کہ زین اسے طلاق دینے کی بات کر رہا ہے۔

"ثوبیہ بھابھی! بولیں' بتایئے؟" زین لہو رنگ آنکھیں لیے چلایا۔ رابی نے بجھی بجھی نگاہ سے ثوبیہ اور زین کو دیکھا تھا۔ اسے اپنی جلد بازی پہ غصہ آیا۔

"زین اکیلا تھا... اس کے ساتھ کوئی نہیں تھا۔" ثوبیہ نے جیسے رابیل کے وجود پہ بارود گرا دیا تھا۔ وہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے ثوبیہ کو دیکھتی رہ گئی تھی۔ یہ عورت کس قدر جھوٹی اور کمینی تھی۔ کتنی گھٹیا اور پتھر دل تھی۔ عورت ہو کر عورت کا گھر اجاڑ رہی تھی۔

ثوبیہ کے بیان نے محفل کا رنگ بدل دیا تھا۔ گلشن کے مردہ وجود میں جان پڑ گئی تھی۔ وہ جیسے آگ بگولہ ہو کر پھٹ پڑیں۔

"میرے بیٹے پہ الزام لگاتے حیا نہیں آئی؟ آخر تیرا شوہر ہے یہ۔" ان کا غیض سہنا آسان نہیں تھا۔ رابیل سب کے سامنے جھوٹی پڑ گئی تھی۔ زین چیختا چلاتا باہر نکل گیا۔

رابیل کو جیسے مات پہ مات ہوئی تھی۔ وہ نہ صرف جھوٹی پڑی بلکہ پورے گھر کی ملامت بھری نگاہوں کا نشانہ بھی بن گئی تھی۔

گھر والوں کے رویے اس کے ساتھ بدل گئے تھے۔ زین نے کلام کرنا چھوڑ دیا تھا۔ تب

رابیل ایک رات اس کے سامنے بری طرح گڑگڑا کر رو پڑی تھی۔

"میرے ساتھ ایسا مت کریں زین! میں مر جاؤں گی۔ مجھ سے آپ کی بے اعتنائی سہی نہیں جاتی۔" وہ چیخ چیخ کر رونے لگی تھی۔ وہ مجرم نہ ہوتے ہوئے بھی مجرم بن گئی تھی۔ مگر زین کے دل سے میل اتارنا آسان نہیں تھا۔ رابیل چاہے جتنی مرضی صفائی پیش کرتی۔ زین کے دل میں گرہ پڑ گئی تھی۔

"وہ ایئر رنگ' میرا مطلب ہے ایسا ایئر رنگ نشال کا تھا۔ میں دیکھ کر برداشت نہیں کر سکی۔ مجھے غلط فہمی ہو گئی۔" اس نے گڑگڑا کر زین سے معافی مانگی تھی۔ جانے زین نے اسے معاف کیا تھا یا نہیں..... تاہم اس نے مزید اس ٹاپک پہ بات نہیں کی تھی۔

"پلیز زین! مجھے چھوڑنے کی بات کبھی مت کرنا۔ میں یہ سب برداشت نہیں کر سکوں گی۔"

وہ ہر رات اس سے عہد لیتی تھی۔ جیسے وہ زین کی داسی بن گئی تھی۔ وہ پہلے بھی زین کے معاملات میں نہیں بولتی تھی۔ اب تو بالکل خاموش ہو گئی تھی۔ وہ رات بھر جس سے مرضی بات کرتا۔ جتنے مرضی میسج کرتا۔ اکثر راتوں کو غائب رہنے لگا تھا۔ جب وہ گھر میں ہوتی تب بھی ڈنکے کی چوٹ پہ چلا جاتا تھا۔ جو کام پہلے وہ چھپ کے کرتا تھا۔ اب سرعام کرنے لگا تھا۔

"اب کسی کا نام بھی تمہارے لبوں پر آیا تو طلاق دینے میں پہلے کی طرح وقت نہیں ضائع کروں گا۔" ایک رات جب رابیل نے پھر سے کشی کا ذکر چھیڑا تب زین نے آخری وارننگ دی تھی۔ تب وہ حقیقت میں خوف زدہ ہو گئی تھی۔ وہ رابیل کی کمزوری کو جانتا تھا۔ رابیل اسے چاہتی تھی۔ اسی ہتھیار سے وہ اسے زیر کر لیتا تھا۔

رابی کے لیے وقت بے رحم ہو چکا تھا۔ اگر جگنو کا سہارا نہ ہوتا تو شاید اب تک اس کا نروس بریک ڈاؤن ہو چکا ہوتا۔ گھر والے پہلے بھی اجنبی تھے اب کچھ اور اجنبی ہو چکے تھے۔ ثوبیہ سے وہ خود کلام نہیں کرتی تھی۔ حالانکہ ایک مرتبہ ثوبیہ نے اپنی صفائی بھی دی۔

"دیکھو' میں سسرال میں اپنی پوزیشن ڈاؤن کرنا نہیں چاہتی۔ اسی لیے بہت ساری باتوں میں چشم پوشی سے کام لیتی ہوں۔ میری ناک کے نیچے آصف اور ماہم کی لو اسٹوری چلی تھی۔ میں نے کسی کو نہیں بتایا۔ یہ میری مجبوری سمجھو۔" رابیل کو اس کی صفائی نہیں چاہیے تھی۔ وہ اس عورت سے کلام کرنا نہیں چاہتی تھی۔ اس کا بس چلتا تو وہ اس عورت کی شکل تک نہ دیکھتی۔

☼ ☼ ☼
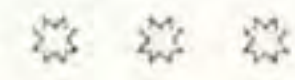
کچھ اور دن گزرے تو ایک قیامت کی خبر اسے مشال کے توسط سے ملی۔

"دنشی نے اسی دوبئی والے لڑکے کے ساتھ کورٹ میرج کر لی۔ جس کا رشتہ آیا تھا اسے گھر چھوڑے دو دن ہو چکے ہیں۔ وہ اس لڑکے کے ساتھ دوبئی بھاگ گئی۔ امی ہسپتال میں ہیں اور پاپا نے خود کو کمرے میں بند کر لیا ہے۔ ہمارے گھر پہ قیامت ٹوٹ پڑی ہے رابی! اگر اس نے شادی کرنا تھی تو اس طرح سے کیوں کی؟ پاپا کو بتاتی وہ اس کی خواہش کیا پوری نہ کرتے؟ ایسے خاک ڈال کر دھول اڑا کر بھاگ گئی ہے۔"

مشی گھٹ گھٹ کر رو رہی تھی۔ عزیز از جان بہن نے ایسی چوٹ لگائی تھی جس کا درد کبھی ختم نہیں ہو سکتا تھا۔

رابیل کے لیے بھی یہ شاکنگ نیوز تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اس کی پھوپھو کے لیے یہ پہاڑ سا صدمہ تھا۔ ان کی ہمت طاقت اور استطاعت سے بڑھ کے۔ اور اسد انکل کی تو عمر بھر کی کمائی لٹ گئی تھی۔ وہ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے تھے۔ انہیں اپنی عزت ناموس، خاندانی وقار، حشمت اور مرتبے کا کتنا مان تھا۔ رالی کا دل دکھ سے بھر گیا تھا۔ اسے اپنی پھوپھو کے غم کا احساس تھا۔ اسد انکل کی تکلیف اذیت میں مبتلا کر رہی تھی۔ حسن کی غیرت یہ دکھ ہو رہا تھا۔ پھر بھی اندر کہیں رابیل نے اطمینان کی آہٹیں اٹھتی محسوس کی تھیں۔ جیسے ایک بڑا بوجھ اور خطرہ ٹل گیا تھا۔

وہ چاہے جتنا مرضی خود کو جھٹلاتی تاہم وہ ہیئر برش، لیڈیز پرفیوم اور ایئر رنگ اس کی آنکھوں میں رات رات بھر نیند نہیں آنے دیتے تھے۔ وہ جب بھی آنکھیں موندتی، نشی کا چہرہ تصور میں اتر کر اس کے تن بدن میں آگ لگا دیتا تھا۔ اس کا شک نشی کے ارد گرد ہی گھومتا تھا۔ پچھلے چند مہینے وہ زین کے بے حد قریب رہی تھی۔ پھر ثانیہ کی باتیں اور مشی کی سرزنش، بھی جھٹلانے والی نہیں تھی۔

نشی کی کورٹ میرج اور گھر سے بھاگ جانے کا سن کر کہیں اندر اس نے سکون کی لہریں بھی اٹھتی محسوس کی تھیں۔ جیسے وہ ایک حسین بلا کے شر سے محفوظ ہو گئی تھی۔

نشی کی کورٹ میرج کے بعد رابیل کی زندگی میں ٹھہراؤ آ گیا تھا۔ زین کا رویہ بدل گیا تھا۔ وہ پھر سے پہلے والا زین بن گیا۔ ایکسی ڈنٹ کے بعد والا زین۔ وہ رابیل کا خیال رکھتا۔ رابیل کو لگتا تھا جیسے اس کے نصیب ہی پھر گئے ہیں۔

وہی آؤٹنگ، ہوٹلنگ، شاپنگ اور ملے گلے سے بھرپور دن لوٹ آئے تھے۔ جگنو کی ہمراہی میں زندگی جگنوؤں سے بھر چکی تھی۔ پھوپھو اسے خوش دیکھ کر پھر سے جینے لگی تھیں۔ حالانکہ نشی کے غم نے ان کی کمر توڑ کر رکھ دی تھی۔ حسن نے گھر آنا چھوڑ دیا تھا۔ اسد انکل نے گھر سے نکلنا ترک کر دیا تھا۔ وہ لوگ جیسے ایک قبر میں مقید ہو گئے تھے۔ نشی نے انہیں جیتے جی مار ڈالا تھا۔

پھر یوں ہی دو مہینے گزر گئے تھے۔ زندگی کی پرسکون ندی میں پھر سے اچانک بڑا بھاری پتھر آ گرا تھا۔

وہ لوگ ایک ہفتہ مری میں گزار کر آئے تھے۔ بڑے خوشگوار دن تھے۔ بڑی سبک خرام شامیں تھیں۔ زین کو گھومنے پھرنے کا شوق تھا۔ اس دفعہ زین نے رابیل کو جانے کہاں کہاں گھما ڈالا تھا۔ زین کی سنگت میں وہ تو دوسرے جہان بھی جانے کو تیار تھی۔

بڑے سرشار مست، مخمور اور مدہوشی کے دن گزار کر جب وہ واپس گھر آئے تب ثوبیہ اور ثمن رابیل کے نکھار کو دیکھ کر متحیر رہ گئی تھیں۔ اس پر روپ جیسے ٹوٹ کر برس رہا تھا۔

زین کی سالگرہ والی شام وہ لوگ آؤٹنگ کے لیے گئے تھے پھر ڈنر بھی باہر کیا۔ زین نے اسے بہت نفیس بریسلٹ گفٹ کیا تھا۔ رابیل کی آنکھیں جیسے ستاروں سے بھر گئیں۔ اسی شب رابیل نے زین سے محبت کا اقرار کرایا اس سے وعدے لیے۔

"آپ کبھی بدلیں گے تو نہیں زین! مجھ سے ہمیشہ محبت کرتے رہیں گے؟ مجھے چھوڑیں گے تو نہیں؟" وہ جانے کن خدشات کے زیر اثر کہہ رہی تھی۔

اور اس سنہری شب زین نے رابیل کو اقرار کے کئی رنگ پکڑائے۔ رابیل جیسے اتنے رنگوں میں نہا گئی۔ وہ کتنی نادان تھی، بعض رنگ کچے بھی تو ہوتے ہیں۔ جلد اتر جانے والے۔ مگر رابیل کو سمجھاتا کون؟

"تم اور جگنو میری زندگی کا سرمایہ ہو۔ تمہیں تو کھو بھی سکتا ہوں مگر جگنو کو کبھی نہیں۔" وہ جگنو کو چومتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ تب رالی باپ بیٹی کی محبت دیکھ کر مسکرا دی تھی۔ اس کے لیے زین کے یہ الفاظ بھی متاع حیات سے کم نہ تھے۔ وہ جانتی تھی زین بہت گھمنڈی، مغرور متکبر اور خود بین ہے۔ اتنی جلدی اقرار نہیں کرے گا، چاہے جتنا مرضی اسیر ہو جائے۔

یہ بھیگتی گلابی رات بالآخر اختتام پذیر ہو گئی۔ اگلی صبح کا سورج طلوع ہوا۔ بڑے جلال اور تپش کے ساتھ۔ جیسے دھرتی کو جھلسا جھلسا دے گا۔ جیسے سب کچھ آج تہس نہس کر دے گا۔

یہ سورج رابیل کے لیے کچھ ایسے جلالی تیور لے کر ہی طلوع ہوا تھا۔

ایک خاکی لفافہ آیا۔ اندر باہر سے پھولا ہوا۔ بہت سے دلوں کو دھڑکانے والا۔ خوف زدہ کرنے والا۔ تجسس ابھارنے والا۔

لفافہ زین نے وصول کیا۔ تب وہ دفتر جانے کے لیے تیار ہو رہا تھا۔ رابیل دہلیز پہ کھڑی تھی۔ گلشن کے قدم آخری زینے پہ تھے۔ زین کا پالتو پلا لاؤنج میں دندنا رہا تھا۔ گلشن کو کراہیت آنے لگی۔ رابیل کو بھی کراہیت آنے لگی۔ اور جب خاکی لفافہ کھلا تب زین کو بھی کراہیت آنے لگی۔

"ارے..... اس میں ہے کیا؟" ثوبیہ اور ثمن اپنے کام چھوڑ کر آ گئیں۔ گلشن جیسے ہکا بکا۔ لفافے میں سے کیا نکلا تھا؟ تصویروں کا ڈھیر بے شمار بھید کھولتا ہوا۔ بے شمار کارڈز، محبت نامے، الفت نامے، چاہت نامے۔ جانے کس کس موقع پر لکھے گئے تھے جو لکھنے والے نے دیے ہی نہیں کہ ایک چھوٹا سا ریکارڈ پلیئر۔

حاضرین کی آنکھوں میں حیرت اور تجسس اڈ اڈ آیا تھا۔ آخر اس میں کیا تھا؟ ہر کوئی جاننے کو بے تاب۔ پھر رابیل کی آنکھوں نے ایک اور منظر دیکھا۔ زین ریکارڈ پلیئر کو آن کر رہا تھا۔ رابیل کے پیر دہلیز سے اکھڑنے لگے تھے۔ اس کے اندر قیامت کا شور اٹھنے لگا۔

ریکارڈ پلیئر آن ہو چکا تھا اور زین کے چہرے کا رنگ بھی بدلنے لگا۔ پہلے سرخ پھر اور سرخ اور پھر آگ کی طرح تپنے لگا۔ اس کی آنکھوں کا رنگ بھی بدلنے لگا تھا۔ نیلی آنکھوں سے آگ کے شعلے لپکنے لگے۔ ہر طرف آگ ہی آگ۔ جسم و جاں کو جلاتی ہوئی۔ ہر شے کو بھسم کرتی۔ تباہ کرتی، راکھ کرتی خاک کرتی۔

"قول و قرار کر کے مکر جاتی ہو۔ بالکل مکرنے نہ دوں گا۔ آئی لو یو رابیل!" وہ ایک جذباتی لڑکے کی آواز تھی۔ کچھ عرصہ پہلے، جب وہ اس کا اسٹوڈنٹ تھا۔ تھوڑا پڑھتا، زیادہ باتیں کرتا۔ شکوہ، شکایات، غصہ، خفگی، ناراضی۔

"بولو نا..... مجھ سے کرتی ہو پیار!" بچوں جیسی ٹھنک لیے..... لاڈ، ناز لیے جیسے وہ اس کے منہ سے "اقرار" کروا کے ہی دم لینا چاہتا تھا۔ وہ ایسا ہی تو تھا اور رابیل نادان نہیں تھی۔ پھر بھی سمجھ نہ سکی۔ وہ اس کی محبت کو بچپنا سمجھتی رہی تھی۔ تب ہی لاپروائی سے بول دیا۔

"آئی لو یو ٹو حسن! میں تمہیں بہت پیار کرتی ہوں۔ جانے تمہیں یقین کیوں نہیں آتا۔" وہ بے بسی سے بولی تھی۔ یہ اقرار ایک عام سا اقرار تھا۔ مگر سننے والے اور سمجھنے والے کے لیے عام نہیں تھا۔ اسے جیسے دو جہان کی خوشیاں میسر آ گئی تھیں۔

"دیکھ لو مکر مت جانا۔ مکرنے نہیں دوں گا میں۔ ریکارڈ کر لیا میں نے۔ عمر بھر کے لیے کافی ہے۔" جواباً وہ کھلکھلاتا ہوا اٹھ گیا تھا۔ ننھا سا ریکارڈر ہاتھ میں لیے۔

رابیل نے سر تھام لیا۔ اس وقت بھلا ان دونوں کے پاس اور کون تھا؟ شاید نشال..... ہاں، ان کے قریب نشال ہی بیٹھی تھی۔ ناخنوں کو رنگتی ہوئی۔ حسن کے اٹھتے ہی ہنسنے لگی تھی۔

"پاگل ہے پورا..... تم نے بہلایا اور بہل گیا۔" وہ حسن کا مذاق اڑاتی رہی تھی۔ رابیل کندھے اچکا گئی۔ اسے "آئی لو یو ٹو" کہنے پر کوئی ندامت، ملال، شرمندگی

خجالت، تاسف، پچھتاوا یا بکی نہیں تھی۔ وہ حسن سے پیار کرتی تھی۔ چھوٹا بھائی اور کزن سمجھ کر۔ کوئی چاہے "کچھ" بھی سمجھ لیتا اور بہت سارے لوگوں نے بہت کچھ سمجھ لیا تھا۔ جیسے اس وقت سب لوگ بہت کچھ سمجھ رہے تھے۔ آنکھوں میں تحیر، تنفر، تمسخر لیے۔ رابیل کے وجود کو تہہ خاک کرتے ہوئے۔

پھر زین نے ایک لفافے میں سے ڈسک نکالی تھی۔ دیکھنے والے کچھ اور متجسس ہو رہے تھے۔ یہ سی ڈی، سی ڈی پلیئر میں جا لگی۔ اب اسکرین پہ کچھ منظر واضح ہو گئے تھے۔ کچھ چہرے واضح ہو گئے تھے۔

رابیل کا دل جیسے دھڑکنا بھول گیا۔

یہ اس کی مہندی کا فنکشن تھا۔ سجے ہوئے شامیانے، روشنیاں، رونقیں کچھ مہمان، کچھ گھر کے افراد اور ان کے درمیان چلاتا ہوا حسن چیختا ہوا۔ دہاڑتا ہوا۔ لڑتا، جھگڑتا ہوا۔

"آپ نے یہ ڈرامہ رچا کر اچھا نہیں کیا۔ آپ نے رابیل کو مجھ سے دور کر کے اچھا نہیں کیا۔ آگ لگا دوں گا۔ ہر چیز کو آگ لگا دوں گا۔" وہ زہر اگل رہا تھا۔ تب حسن نے سرعام اپنی میڈیکل کی کتابوں کو آگ لگا دی تھی۔ وہ بچوں کی طرح رو رہا تھا۔ جیسے اس کا من پسند کھلونا چھین لیا گیا تھا۔ حسن کے الفاظ آگ لگا دینے والے تھے۔ اور یہ آگ قریب قریب لگ ہی چکی تھی۔

اسکرین پہ تارے ناچنے لگے تھے۔ پھر سارے منظر دھندلا گئے تھے۔ پھر سارے منظر بکھر گئے تھے۔

پھر جیسے ایک عدالت سج گئی۔ مجرم کو کٹہرے میں کھڑا کر لیا گیا تھا۔ وہ محبت نامے، کارڈز، ٹیپ ریکارڈ اور سی ڈی اس کے منہ پر دے ماری گئی۔ اب سوال جواب اور حساب کتاب کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔

آج شاید حساب کا دن تھا۔ یوم حشر برپا ہو چکا تھا۔

زین چیختا ہوا اس کے سر پہ پہنچ گیا۔

"اپنی صفائی میں کچھ کہہ سکتی ہو؟ بے حیا، بے غیرت، بدکار عورت مجھ پہ بہتان باندھ کے مجھے میرے گھر والوں کے سامنے رسوا کیا تھا۔ اپنے عیب چھپانے کے لیے مجھ پر الزام لگایا۔ دیکھا، آج پنچ بالآخر سامنے آ گیا۔ تجھ جیسی غلیظ، بدکردار عورت کی میری زندگی میں کوئی گنجائش نہیں۔" زین دھاڑتا ہوا اس کے گریبان تک آیا۔ پھر اس نے بالوں سے پکڑ کر رابیل کو دھکا دیا تھا۔

"اپنے کزن کے ساتھ عاشقی اور محبت کا کھیل رچاتی رہی اور ادھر مجھے بے وقوف بناتی رہی۔" وہ اسے دھکے مار مار کے باہر نکال رہا تھا تب گلشن کے بے جان وجود میں جان پڑ گئی۔ وہ تیزی سے زین تک آئی تھیں۔

"زین! ہذیان نہ بک..... دیکھ، ٹھنڈے دل سے غور کر۔ کیا پتا، کچھ غلط ہو۔" گلشن نے جیسے التجا کی تھی۔ وہ پہلی مرتبہ ساس سے ماں کی جھلک میں آئیں۔ چاہے جو بھی تھا۔ وہ زین کا گھر اجڑتا نہیں دیکھ سکتی تھیں۔

"کچھ غلط نہیں..... سب کچھ "روشن" ہو گیا۔ سچائی سامنے آ چکی ہے۔ اب میں اس عورت سے تعلق جوڑے رکھوں تو مجھ سا بے غیرت کوئی نہیں۔ میں اسے طلاق دیتا ہوں..... طلاق دیتا ہوں۔ طلاق دیتا ہوں۔"

زین نے آخری وار کر کے اسے آخری ٹھڈا مارا اور چلا گیا۔ زین سے بہتر تو زین کا پلا تھا۔ جو روتی ہوئی رابیل کے پیروں سے لپٹ گیا۔ آخر چودہ مہینے اس عورت نے اس کی سیوا کی تھی۔ بے وفا مالک کا بڑا وفادار کتا تھا۔ مالک سے کہیں اچھا۔ ہمدرد..... اس کے پیروں میں لوٹیں لگا رہا تھا۔ اس کے پیروں پہ منہ مارتا رہا۔ رابیل کو پہلی مرتبہ اس سے کراہیت نہیں آئی تھی۔

گھر کا ہر فرد ششدر رہ گیا تھا۔ زین سے اتنے انتہائی اقدام کی کسی کو بھی امید نہیں تھی۔

"اپنا ناپاک وجود لے کر یہاں سے دفع ہو جاؤ..... تم میری بیٹی کے قابل نہیں۔ تم جیسی بدکردار عورت میری بیٹی کی تربیت نہیں کر سکتی۔ اس لیے یہاں سے تم اکیلی جاؤ گی۔ چاہے جتنے مرضی کورٹ کے دروازے کھٹکھٹا لینا۔ جگنو تمہیں کبھی نہیں ملے گی۔"

زین نے حقارت سے زمین پر تھوک دیا تھا۔ پھر وہ اپنے کمرے کی طرف بڑھتا گیا۔ اپنے قدموں کی دھمک پیدا کیے۔

رابیل اپنے دھجی دھجی وجود کو اٹھاتی کیسے اٹھی تھی؟ اس نے کیسے ابرار منزل کی دہلیز پار کی تھی؟ وہ کیسے بیرونی گیٹ تک آئی؟ اس نے کیسے چند قدموں کی مسافت طے کی تھی؟ یہ اس کا رب جانتا تھا۔

وہ بکھرے، الجھے بال لیے سڑک پہ چل رہی تھی..... دیوانہ وار، مجنوں سی پاگل سی..... وہ ڈاکٹر رابیل تھی۔ کیا وہ سچ میں ڈاکٹر رابیل تھی؟

کچھ دیر بعد اس کے پیچھے کوئی بھاگتا ہوا آیا۔ وہ دو عورتیں تھیں۔ دو خوب صورت عورتیں۔ وہ ثوبیہ اور ثمن تھیں۔ مگر رابیل انہیں پہچان ہی نہ سکی۔

"رابیل! گھر چلو، تمہیں گاڑی میں چھوڑ آئیں گے۔ ابو کو کال کی ہے۔ زرافت بھی آ رہے ہیں۔ اس طرح تم کیسے جا سکتی ہو۔" وہ دونوں اسے واپس لے جانا چاہتی تھیں مگر رابیل کچھ سمجھ ہی نہ پائی۔ اسے کسی کے لفظ سمجھ میں نہیں آ رہے تھے۔ کسی کے لہجے سمجھ میں نہیں آ رہے تھے۔ اس کے کان بند تھے۔ وہ کیسے کچھ سن پاتی؟

پھر کوئی رکشہ اس کے قریب رکا۔ رابیل اس میں سوار ہو گئی۔ وہ دو عورتیں پیچھے رہ گئیں۔ وہ ساری کہانیاں پیچھے رہ گئیں۔ جو رابیل کی ذات سے جڑی تھیں۔

رابیل کی زندگی کا قصہ اختتام کے قریب تھا۔ اس کی زندگی کی کہانی بدل گئی تھی۔ اپنی مرضی اور اپنی خوشی سے لوگ کہانیوں کے رخ ایسے بدل دیتے ہیں۔ لوگ دوسروں کی زندگیوں کے رخ ایسے بدل دیتے ہیں۔

کہانی کار بڑا شاطر ذہن کا مالک تھا۔ اس نے ایک اشارے سے سارے رنگ بدل دیے۔ سارے لفظ بدل دیے۔

آخر اس کی زندگی کو موڑ دینے والا، کہانی کو اپنے ڈھنگ سے بدلنے والا اور رابیل کو تباہی کے دہانے پہ لانے والا کون تھا؟

"حسن عمر یا زین ابرار؟"

☼ ☼ ☼

نشال کے بعد رابیل کی طرف سے ملنے والے اس دوسرے دھچکے نے اسد عمر اور رابیل کی پھوپھو کو توڑ پھوڑ کے رکھ دیا تھا۔ وہ دونوں شاید وقت کے ساتھ سنبھل ہی جاتے اگر حسن انہیں پھر سے پاتال میں گرانے نہ آ جاتا۔

حسن عمر جو اس کی زندگی کا سب سے تاریک باب تھا۔ جسے وہ عمر بھر کے لیے پھاڑ دینا چاہتی تھی۔ جس کے نام کو وہ تہہ خاک کر دینا چاہتی تھی۔ وہ ایک مرتبہ پھر کہانی کے نئے باب کھولنے اور لکھنے کے لیے آ گیا

تھا۔

زین کی محبت سے دست بردار ہونا' زین کو بھول جانا اتنا سہل نہیں تھا۔

زین ابرار رابیل کی نظر میں قصوروار تھا ہی کہاں؟ وہ تو ایک مرد تھا' جو بیوی کی بدکرداری اور اس کے سابقہ معاشقے برداشت نہیں کرپایا تھا۔ زین کی جگہ کوئی اور مرد ہوتا وہ بھی یہی کرتا۔

اصل مجرم تو حسن عمر تھا۔ جس نے رابیل کی زندگی کو مذاق بنادیا۔ اپنے ہاتھ سے لکھے محبت نامے' ٹیپ ریکارڈ اور دیگر تمام ثبوت زین تک پہنچانے والا حسن ہی تو تھا۔

اور وہ تھا کہ اس کے سامنے پھر سے تن کے کھڑا ہوگیا تھا۔ بڑا جری اور دلیر تھا۔ نڈر' بے باک اور بے خوف۔

"اپنی آنکھ سے پٹی اتار لو ڈاکٹر رابیل! پہلے کیا کم خسارے اٹھائے ہیں۔" وہ سنجیدہ تھا۔

رابیل نے تنفر سے منہ پھیرلیا۔ وہ اس کی صورت سے بھی نفرت کرتی تھی۔

دو مہینے ہسپتال میں ہوش و حواس سے بیگانہ رہی تھی۔ اس کھیل میں اس نے زین کی محبت اور بیٹی کے وجود کو کھو دیا تھا۔ اس کا دکھ بڑا تھا' نقصان بڑا تھا۔ وہ ساری رات روتی اور تڑپتی رہتی۔ اسے دورے پڑنے لگے تھے۔ اس کے آنسو رکتے ہی نہیں تھے۔

مشی' پھوپھو اور حسن جیسے اس کا سایہ بن گئے تھے۔ وہ جیسے ایک پاتال میں اتر گئی تھی۔

حسن نے اس کے لیے اچھے سے اچھے ڈاکٹر سے ٹائم لیا۔ مہنگی سے مہنگی دوائی لایا۔ ٹیسٹ' دوائیاں چیک اپ' بہترین ڈاکٹرز اور بہترین علاج کی بدولت اگلے تین ماہ تک کچھ اور بہتری کی طرف مائل نظر آنے لگی تھی۔

اور جب وہ گھر واپس آئی۔ تقریباً" چھ ماہ کا عرصہ گزر چکا تھا۔ وہ جگنو سے چھ ماہ دور رہی۔ چھ ماہ اس کی صورت نہیں دیکھ سکی۔ اس کی ننھی سی چھوٹی سی معصوم بیٹی۔۔۔ وہ کس حال میں تھی؟ رابیل کو کچھ خبر نہیں تھی۔ گھر آنے کے بعد رابیل نے زین سے رابطہ کرنا چاہا تھا۔ وہ جگنو کو اپنے پاس رکھنا چاہتی تھی۔ مگر حسن بیچ میں آگیا۔

"زین سے رابطہ کرنے کی ضرورت نہیں۔ وہ ملک سے بھاگ گیا۔" حسن کے الفاظ رابیل کے لیے پھر سے جھٹکا ثابت ہوئے تھے۔ اس کی مدہوشی کے دوران کیا کچھ اور بدل چکا تھا؟ زین اکیلا گیا تھا؟ جگنو اس کے ہمراہ تھی؟ رابیل کی جیسے ساری ہمت نچڑ گئی تھی۔

زین کے نمبر بدل چکے تھے۔ پھر گلشن سے رابطہ کیا۔ انہوں نے بتایا۔ جگنو کو زین اپنے ساتھ لے گیا ہے۔

رابیل کی جیسے ہر آس ٹوٹ گئی تھی۔ اس کی زندگی کا مقصد تہہ خاک ہوگیا۔ اب وہ کس کے سہارے زندگی کا سفر طے کرتی؟ وہ گھٹ گھٹ کر مرنے لگی تھی۔ مگر حسن اسے مرنے بھی کہاں دیتا تھا۔ وہ اس کی زندگی کے ہر موڑ پر آکھڑا ہوتا۔ کاسہ دل ہاتھ میں لیے۔ کبھی کشکول پکڑے۔ کبھی منت سماجت کرتے ہوئے۔ کبھی کبھی غصہ اور ضد لیے۔

وقت کچھ اور آگے بڑھا تو رابیل کے رستے زخم خشک ہونے لگے۔ ٹانکے سلنے لگے ادھڑے گھاؤ بھرنے لگے۔ زندگی کے نردبان پہ ایک ایک قدم رکھتی وہ آگے کے سفر کی تیاری پہ نکل ہی آئی۔ اگرچہ نڈھال تھکی ماندی' کسل مند' ناتواں اور مضمحل ہی سہی۔

وہ کوئل کی طرح نہ راہ بھولی نہ راہ بھٹکی' بس مجبور ہوگئی۔ مائیں بس مجبور ہوجاتی ہیں۔ وہ راہ کہاں بھولتی ہیں۔ وہ کوئل کی طرح ہجر اور مفارقت کے گیت نہیں گا سکتی تھی۔ بس ایک چپ نے اسے ہر شے سے بیگانہ کردیا تھا۔

☼ ☼ ☼

اور یہ چپ تب ٹوٹی جب حسن اس کی زندگی کے صحیفے پہ اپنا نام زبردستی لکھوانے پہ بضد ہوگیا۔ گویا اسد

عمر کے وجود کی عمارت میں بھونچال ہی آگیا۔

اسد عمر کے لیے تو رابیل پہلے بھی قابل قبول نہیں تھی۔ اب تو وہ ایک مطلقہ عورت تھی' ایک بچی کی ماں تھی اور مخبوط الحواس بھی تھی۔

"تو کیا یہ طے ہے' مجھے میری اولاد سے کوئی سکھ نہیں ملے گا؟" اسد عمر نے بہت غیض کے عالم میں بھرپور جوان بیٹے کے سامنے تن کر کہا تھا۔ رات کی تاریکی میں ان کی آواز بہت دور دور تک جارہی تھی۔ اسد انکل کی دہاڑ نے اسے سہما دیا تھا۔ وہ مرے مرے قدموں سے چلتی اسٹڈی روم کے دروازے سے دور جانا چاہتی تھی۔ مگر اسد انکل کی زہریلی آواز نے اس کے پیر باندھ دیے تھے۔

"آپ کا تکبر آپ کو سکھ کے قریب نہیں جانے دیتا۔ اب اور کتنا رسوا ہوں گے؟ آپ کو ابھی تک سمجھ نہیں آئی۔ اللہ نے آپ کے تکبر کو روند دیا۔ پھر بھی آپ کی "میں" برقرار ہے بابا!"

حسن کے لہجے میں پتھروں کی سی سختی تھی۔ آندھیوں جیسا جلال تھا۔ جیسے وہ کوئی فیصلہ کرکے ہی باپ کے سامنے تن کے کھڑا تھا۔ رابیل کو بڑے زور کا چکر آیا۔ وہ جانتی تھی' حسن کی واپسی کوئی دھماکا کرکے رہے گی۔

پچھلے چھ مہینے کی خاموشی کے بعد حسن کا پھر سے رابیل کے لیے اعلان جنگ کرنا کچھ معمولی بات نہیں تھی۔ ایک بات تو واضح ہو رہی تھی۔ رابیل کے لیے اس کی محبت وقتی یا جذباتی نہیں تھی۔

"بند کرو اپنی ہرزہ سرائی۔ کیسی لغو بکواس کرتے ہو۔ باپ سے بات کرنے کی تمیز نہیں۔ کیا یہی علم سیکھ کر آئے ہو؟" اسد عمر کا جلال بھی عود آیا تھا۔

"میں نے کاشمیرا سے تمہارا رشتہ پکا کردیا ہے۔ اگلے ہفتے نکاح ہے تم اس مطلقہ لڑکی کو بھول جاؤ۔ ارے احمق! وہ اپنے شوہر کا گھر نہیں بسا سکی' تمہارا کیسے بسائے گی۔"

اسد انکل کے زہریلے لہجے اور لفظوں نے رابیل کے پورے وجود کو زخم زخم کردیا تھا۔ کیا یہ اس کے باپ جیسا پھوپھا تھا؟ اس کے غموں پر دل جوئی کرتا' محبت جتاتا کیا یہ انکل کے اپنے الفاظ تھے۔

"اللہ کے غضب سے ڈریں بابا! نہ تکبر کے بڑے بول بولیں۔" حسن جیسے چیخ پڑا تھا۔

"مجھے مجبور نہ کریں کہ میں آئینہ لے کر آپ کے سامنے کھڑا ہوجاؤں۔ آپ کتنے بڑے کھلاڑی ہیں بابا۔"

حسن کی آواز غم و غصے سے بوجھل ہوگئی تھی۔ وہ کون سا سچ اگلنا چاہتا تھا؟

"میں نے اس لڑکی کے ساتھ جتنی ہمدردی کرنا تھی' کرلی۔ کل ہی اس کا بندوبست کرواتا ہوں۔ کیا یہ کم ہے۔ اس کو بیاہ دیا۔ لاکھوں کا جہیز دیا اور اس سے بھی پہلے اعلا تعلیم دلوائی۔ یہ لڑکی تو میرے لیے وبال بنتی جارہی ہے۔ ٹھکانے لگاتا ہوں اسے۔" وہ غصے کے عالم میں آؤٹ آف کنٹرول ہوگئے تھے۔ تب ہی اصل چہرہ سامنے آرہا تھا۔

"میں نہیں چاہتا تھا۔ آپ کے سامنے کھڑا ہوکر آپ کو شرمندہ کروں۔ پر بابا! آپ نے مجھے مجبور کردیا ہے۔ آپ نے اپنے آپ کو بچانے کے لیے سب کچھ کیا ہے۔ ایک قابل ترین لڑکی کو کنویں میں گرادیا۔ اس کے لیے خوش پوشاک' خوبرو لڑکا تلاش کیا۔ تاکہ زمانے کا منہ بند ہوجائے۔ آپ سب جانتے تھے۔ اس کی سوسائٹی اچھی نہیں۔ اس کی شہرت اچھی نہیں۔ وہ ایک شرابی' زانی اور بدکردار لڑکا تھا۔ اس کے کئی عورتوں کے ساتھ تعلقات تھے۔ وہ اکھڑ' مغرور' بد دماغ تھا۔ آپ کو سب کچھ پتا تھا۔ پھر بھی آپ نے رابی کو اس سے بیاہ دیا۔۔۔ تاکہ وہ میرے "شر" سے محفوظ رہے؟ اس لیے ہرگز نہیں۔۔۔ بلکہ اس لیے کہ میں اس سے دور چلا جاؤں۔ ایک یتیم لڑکی جو آپ کی بیوی کی بھتیجی تھی۔ جس کے باپ کا کوئی بڑا حسب نسب نہیں تھا۔ کوئی مرتبہ' مقام نہیں تھا۔ کوئی جائیداد نہیں

تھی۔ بھلا وہ لڑکی آپ کی بہو بننے کے قابل تھی؟ آپ نے بیٹے کی شادی نہیں، سوداگری کرنی تھی۔ اس کے لیے کروڑ پتی کا شمیر اکا انتخاب ہوا تھا۔ وہ جائیداد، دولت، سرمایہ، روپیہ اور اپنا خاندانی جلال اور حشمت لے کر آتی۔ ایک یتیم، غریب اور قابل لڑکی جس کا کردار کھرا سونا تھا۔ جس کی نیکی اور پاکیزگی کی گواہی میرا دل دیتا ہے۔ وہ لڑکی آپ کے معیار پہ پورا نہیں اتر سکتی تھی۔ وہ بے فائدہ اور بے نفع تھی۔"

حسن انتہائی دکھ اور کرب کے عالم میں بول رہا تھا۔ اس کے سامنے کھڑے اسد عمر جیسے دنگ رہ گئے تھے۔ جبکہ باہر کھڑی رابیل پہ بھی قیامت کا وقت گزر رہا تھا۔

"یہ تم کیا بکواس کر رہے ہو؟ اپنا منہ بند رکھو۔" اسد عمر بے ربط سے بول پڑے۔ ان کے چہرے پہ ایک رنگ آ رہا تھا۔ ایک جا رہا تھا۔

"آپ نے بہت کامیاب گیم کھیلی۔ آپ کامیاب رہے۔ کیونکہ وہ یتیم لڑکی اس بد کردار مرد کے ساتھ عمر بھر کے لیے بندھ گئی۔ وہ اپنی پوری زندگی آپ کا قول اور عہد نبھاتے ہوئے اس شخص کے ساتھ گزار دیتی۔ اس کی ہر برائی کے ساتھ سمجھوتا کیے رکھتی اگر بیچ میں آپ کی لاڈلی نشال عمر نہ آجاتی....."

حسن کے اندر جیسے صف ماتم بچھ رہی تھی۔ اس کے الفاظ بے ربط ہو گئے۔ ایک غیرت مند بھائی کس طرح اپنی بہن کا شرمناک قصہ بیان کرتا۔

"شرم آتی ہے مجھے یہ گندگی اور تعفن سے لپٹا ذکر چھیڑتے ہوئے۔ اگر آج چپ رہا تو عمر بھر نہ بول پاؤں گا۔" حسن کی آواز بھرا گئی تھی۔ وہ شاید رو رہا تھا۔

"نشال اس دوبئی والے لڑکے کے ساتھ نہیں بھاگی۔" حسن نے جیسے دھماکا کر دیا۔ جیسے ہر شے لمحہ بھر میں تہس نہس اور تباہ ہو گئی تھی۔ حسن اندر رو رہا تھا۔ رابیل باہر رو رہی تھی۔

وہ ایک ملبے کے ڈھیر پر رو رہی تھی۔ اس ملبے کے نیچے بھلا کیا تھا؟ زین سے کی گئی بے لوث محبت، چاہت، عشق، خلوص۔

"نشی نے رابیل کی طلاق سے دو ماہ پہلے زین ابرار سے نکاح کیا تھا۔ مجھے آپ کی بے خبری پہ حیرت ہے۔ کیسے ڈی ایس پی ہیں آپ؟ کیسا کھیل رچایا آپ کی نشال نے اور آپ کو کانوں کان خبر نہ ہو سکی۔ ڈی ایس پی صاحب! اس کے خلاف مقدمہ درج کریں گے؟ کسے مجرم کہیں گے؟ کسے مظلوم سمجھیں گے؟ آپ کی بیٹی نے رابیل کا گھر اجاڑا ہے۔ اس کے شوہر کو میرے حوالے سے بدظن کیا۔ رابیل کو طلاق دلوائی۔ اور پھر اس کے ساتھ ملک سے فرار ہو گئی۔ یہ سب آخر اس نے کیوں کیا؟ دراصل آپ کی زلیل، خود غرض اور بے غیرت بیٹی رابیل کے شوہر کے عشق میں مبتلا ہو گئی تھی۔ رابیل کے ولیمہ والے دن سے ہی..... اس نے زین ابرار کے عشق میں مبتلا ہو کر آپ کی عزت، مرتبے اور وقار کو بے دردی سے پیروں تلے روند دیا۔

رابیل کو نشی نے طلاق دلوائی، یہ رابیل کی بدقسمتی نہیں، نشال کی بدقسمتی ہے اور قدرت کا سب سے بڑا انصاف۔ آپ نے رابیل کے لیے ایک غلیظ اور ملکے کردار کا بدبخت بندہ چنا تھا، کیا آپ اپنی بیٹی کے لیے ایسے شخص کو منتخب کرتے؟ کبھی نہیں۔ آپ سب سے پہلے شرافت، نجابت، وقار اور کردار کو دیکھتے۔ مگر ہوا کیا؟ آپ نے رابیل کو کنویں میں پھینکا۔ قدرت نے اسے کنویں سے نکال باہر کیا اور اسی کنویں میں آپ کی بیٹی کو گرا دیا۔ اسے اللہ کا انصاف کہتے ہیں۔ آپ نے کسی کے لیے گڑھا کھودا، آپ کی اپنی بیٹی اپنی خوشی، اپنی چاہت کے ساتھ اس گڑھے میں جا گری۔ بڑا پرانا کھیل تھا جو اختتام کو پہنچا۔ افسوس مجھے خبر بہت دیر سے ہوئی۔ یہ رابیل کے حق میں برا تھا یا نہیں نشال کے حق میں بہت برا ہو گا۔ یہ نشال کا رجسٹرڈ نکاح نامہ، اس کے کمرے سے ملا۔ اب کسی وضاحت یا تصدیق کی ضرورت نہیں۔

اور رہی رابیل، تو وہ کل بھی میرے دل میں تھی، آج بھی ہے۔ امی اور مشی کو کوئی اعتراض نہیں۔

آپ کو بھی نہیں ہونا چاہیے۔ میں آج نہیں تو کل رابیل سے نکاح کرکے یہ گھر چھوڑ دوں گا۔ آپ اپنے نام، مرتبے وقار اور دولت کے تنہا رہیے، رہی سہی عزت کی دھجیاں سنبھالتے ہوئے۔" حسن نے اپنے آنسو پونچھے اور تھکے تھکے قدموں سے کمرے سے باہر نکل آیا تب اس کی نگاہ رابیل پہ پڑی تھی۔ سفید لٹھے کی مانند رنگت لیے وہ جیسے کھڑے کھڑے سن ہو چکی تھی۔ جیسے اسے یہاں کھڑے کھڑے کئی سال گزر گئے تھے یا کئی قرن۔

"تمہاری زندگی برباد کرنے میں میرا کوئی ہاتھ نہیں۔ میں مجرم، خطاوار، قصوروار نہیں.... پر اپنی بہن کی وجہ سے خود کو مجرم سمجھتا ہوں۔" وہ گھڑی بھر کے لیے رکا تھا۔ پھر عمر بھر کے لیے رک گیا۔ کیونکہ رابیل اس کا ہاتھ پکڑ کے کہہ رہی تھی۔

"مجھے تمہارا سہارا چاہیے حسن!" بات معمولی سی تھی مگر بات عمر بھر کی تھی۔

☼ ☼ ☼

اسد عمر جیسے لمحوں میں ڈھے گئے تھے۔

یہ حسن انہیں کیسا آئینہ دکھا گیا تھا؟ یہ کون سی حقیقت کا چہرہ انہیں دکھا گیا تھا؟ یہ کیسا کرب ناک "سچ" تھا؟ یہ تو ان کے گمان میں بھی نہیں تھا کہ نشی.... ان کی جان نشی اتنا گند سے بھرا جوتا ان کی منہ پر مار گئی تھی۔ اس نے کورٹ میرج کی مگر کس کے ساتھ؟ رابیل کے اوباش شوہر کے ساتھ؟ وہ اندر سے بھربھری ریت کی دیوار بن گئے تھے۔

کیا انہوں نے حقیقت میں رابیل کے ساتھ برا کیا تھا؟ حسن کی ضد اور نادان عشق کے خوف سے رابیل کو اس کے رستے سے ہٹا کر برا کیا تھا؟ ایک خوبرو مگر اوباش لڑکے کا انتخاب۔

رابیل کو اعلا تعلیم دلوا کر اچھے خاندان میں بیاہ دینے کے بعد انہوں نے خاندان کی بھرپور واہ واہ سمیٹ لی تھی۔ اور اس کے بعد بہت سلیقے سے اسے حسن کی پہنچ سے دور کر دیا۔ بڑی کمال کی چال چلی تھی۔ انہیں یقین تھا۔ رابیل کبھی بھی اس گھر میں واپس نہیں آئے گی۔ حسن کبھی بھی رابیل کو نہیں پا سکے گا۔ پھر وہ حسن کی شادی کاشمیر اسے کرکے اپنے خاندانی وقار کو چار چاند لگا دیں گے۔ ان کی تدبیر کو اللہ کی تقدیر نے کیسے الٹ دیا تھا۔ ان کی اپنی بیٹی کے ہاتھوں۔ کیسا زخم لگایا تھا نشال نے۔ آخر وہ اتنی دلیر کیسے ہو گئی؟ اپنے باپ کی آنکھوں میں دھول جھونک گئی۔

وہ کتنے شرمسار تھے۔ کتنے شرمندہ اور پشیمان تھے۔ کیا وہ کبھی رابیل کا سامنا کر سکتے تھے؟ اس کے سامنے سر اٹھا کر بات کر سکتے تھے۔

ان کی بیٹی عمر بھر کا "داغ" لگا گئی تھی۔ کیا یہ داغ کبھی دھل سکتا تھا؟

حسن کا رابیل کے لیے جنونی عشق اور ضد.... اس کا رابیل کے لیے تڑپنا، اسے چاہنا، اس کی شادی پہ ہنگامہ کرنا۔ انہوں نے سب کچھ نظر انداز کر دیا تھا۔ کچھ بھی نہیں دیکھا، سوچا، بس حسن کے لیے اعلا سے اعلا ترین کی تلاش میں متکبر ہوتے گئے۔ آخر ایک یتیم، مسکین لڑکی ان کی بہو بننے کے لائق کیسے ہو سکتی تھی؟ ان کا وقار، مرتبہ، دولت، حشمت یہ سب گوارا نہیں کر سکتی تھی۔ ان کا غرور، تکبر اور خود پسندی انہیں کس مقام پر لے آئی تھی؟ ان کی لاڈلی نازوں پلی بیٹی انہیں دغا دے گئی تھی۔ آج سے چند دن پہلے وہ اس بات پہ تڑپتے تھے۔

"کاش نشی ان سے ذکر تو کرتی۔ وہ خود اسے بیاہ دیتے۔ اپنے ہاتھ سے رخصت کرتے۔ مگر وہ بتاتی کیوں؟ کس طرح؟ جو ظلم وہ ڈھا رہی تھی اور جو گناہ کا کھیل اس نے رچایا تھا۔ بھلا اس کا ذکر باپ سے کیسے کرتی!

اس نے سیدھے رستے کو چھوڑ کر بھول بھلیوں کا انتخاب کیا تھا۔

وہ خود کو گڑھے میں گرا کر کیا "شاد" تھی؟ یا ان کے لیے سزا بن کر پشیمان تھی؟

وہ عمر بھر کی کمائی دونوں ہاتھوں سے لٹا کر سر پکڑ کے اونچی آواز میں رو رہے تھے۔ یہ تھا تکبر، خود پسندی اور

حسب نسب پہ مان کا انجام۔

☼ ☼ ☼

پھر وقت جیسے پر لگا کر اڑنے لگا تھا۔ بہت سے موسم آئے اور گزر گئے۔ بہاریں آئیں گئیں۔ پتے گرے، جھڑے، اگے۔ وقت پھسلتا رہا، گزرتا رہا، بہتا رہا۔

پھوپھو اور مشی کے مجبور کرنے پر رابیل نے حسن کے حق میں فیصلہ دے دیا تھا۔ بہت سادگی سے نکاح کی رسم ادا ہوئی تھی۔ جس میں اسد عمر نے بھی شرکت کی۔ یہ مقام حیرت تھا۔ رابیل ایک دفعہ پھر حیران ہو گئی۔ مگر اب وہ بہلنے والی نہیں تھی نہ ظاہری باتوں پہ ایمان لانے والی تھی۔ انہوں نے جو کچھ رابیل کے ساتھ کیا تھا۔ وہ انہیں معاف کر چکی تھی۔ مگر اس گھر میں رہنا اس کے لیے محال تھا۔ وہ ایک ظاہردار، نمودیے، منافق اور مکار شخص کے زیر سایہ اپنی زندگی کا ایک اور کٹھن سفر طے کرنا نہیں چاہتی تھی۔

وہ لوگ حسن کے آبائی گھر آ گئے تھے۔ یہ پرانے طرز کے مکانات سے سجا علاقہ تھا۔ بہت کھلا، شفاف اور صاف ستھرا۔ جیسے وہ زین ابرار اور نشال عمر کے باب کو ہمیشہ کے لیے اپنی زندگی سے پھاڑ کر یہاں آ گئی تھی۔ وہ اس دھوکے باز، اوباش، ذلیل اور کمینے شخص کا نام بھی سننا نہیں چاہتی تھی۔ جس نے بھرپور پلاننگ کے ساتھ اسے اپنی زندگی سے نکال باہر کیا تھا۔

وہ نشال کا ایئر رنگ، لیڈیز پرفیوم، ہیئر برش.... جیسے کڑی سے کڑی مل رہی تھی۔ نشی کا جان بوجھ کر وہ سب چیزیں کمرے میں چھوڑ جانا اور پھر حسن کے حوالے سے لکھے گئے تمام خطوط، کارڈز زین تک پہنچانا۔ سارا کھیل سمجھ میں آنے لگا تھا۔ اس کا رابیل سے اچانک متنفر ہو جانا، اکھڑے انداز، غصہ، غیض، نفرت اور سب سے بڑی بات، زین کی زندگی میں اچانک۔ آ جانا؟

وہ حسن کی ہمراہی میں اپنی زندگی کے سارے دکھ، درد، غم بھول گئی تھی۔ بس یاد رہا تو ایک ہی چہرہ۔ من موہنا سا، معصوم سا، اس کی پیاری بیٹی جگنو کا چہرہ۔ حنان جیسے بیٹے کو پا کر بھی وہ جگنو کو بھول نہیں پائی تھی۔ بھلا اولاد بھی کوئی بھلائی جانے والی چیز تھی۔ بیچ میں چند سال حسن نے امریکہ میں گزارے تھے۔ اسپیشلائزیشن کے لیے اسے بیرون ملک جانا پڑا تھا۔ اس دوران پھوپھو رابیل کے پاس آ گئی تھیں۔ مشی کی شادی ہو چکی تھی۔ وہ اپنے گھر میں شاد آباد تھی اور اسد انکل اپنی ہی "چال" میں گرفتار پشیمانی کے جال میں جکڑے ہوئے تھے۔

وہ دونوں ایک ہی ہسپتال میں جاب کرتے تھے۔ اور حسن کا جب بھی دل چاہتا، منہ اٹھا کر اس کے روم میں آ کر خمار آلود آواز میں کہتا۔

"خواب آلودہ سے یہ منظر ہیں.... یوں لگتا ہے، آنکھ کھولوں گا تو منظر بکھر جائیں گے۔" اس کی خوب صورت آنکھوں میں رنگ بھر جاتے تھے۔ تب رابیل دبی دبی آواز میں چیخ کر کہتی۔

"میں مریض دیکھ رہی ہوں حسن! کچھ تو شرم کر لیا کرو۔" اسے شعر و شاعری کے موڈ میں آتا دیکھ کر وہ دونوں ہاتھ جوڑ دیتی تھی۔ پھر حسن ہنستا مسکراتا، ڈانٹ سنتا، جھڑکیاں سہتا اس کے قریب آ جاتا۔

"ایک درخواست، خواہش اور التماس ہے؟" وہ آنے بہانے لمحات کو طویل کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ جواباً" رابیل اسے گھور کر دیکھتی۔

"اب محبت کا افسانہ مت چھیڑ دینا۔ قسم سے حسن! تمہیں ڈاکٹر نہیں ہونا چاہیے تھا۔" وہ سر ہلا کر کہتی تھی۔ مصنوعی خفگی اور غصے سے۔

"مجھے شاعر ہونا چاہیے تھا۔ مجھے خود احساس ہے۔ ایک غلط پروفیشن کا انتخاب کر بیٹھا ہوں۔" حسن سر تسلیم خم کر دیتا۔

"اوکے۔ کرو بات اپنی۔" رابیل سر تھام لیتی۔ وہ جانتی تھی کہ حسن کچھ سنائے بغیر ٹلنے والا نہیں۔

بڑی بے اماں ہے زندگی، اسے بن کے کوئی پناہ ملے
کوئی چاند رکھ میری شام پہ، میری شب کو مہکا گلاب کر
کوئی بدگماں سا وقت ہے، کوئی بدگماں سی دھوپ

ہے

"کسی سایہ دار لفظ کو میرے جلتے دل کا حجاب کر۔"
وہ جیسے منتظر سا کھڑا ہو جاتا۔ اقرار کے ایک لفظ کے لیے بات بوند برابر تھی۔ ایک قطرے کی پیاس تھی۔

رابیل سر جھٹک کر اپنے کام میں مصروف ہو جاتی۔ گویا حسن کو جانے کی اجازت تھی۔ تب وہ بوجھل دل کے ساتھ پلٹ جاتا تھا۔

یہ تو سالوں سے ہوتا آ رہا تھا۔ وہ رابیل کو چاہتا تھا' وہ اس کی چاہت کو قبول کرتی 'اسے اعزاز بخشتی مگر محبت کے اظہار سے کوسوں دور تھی۔ تب حسن کے اندر تشنگی بڑھ جاتی۔

مگر اس کے لیے یہ کیا کم تھا کہ رابیل اس کے قریب تھی۔ اس کے پاس تھی۔ اس کا قناعت پسند دل اسی پر راضی تھا۔ زندگی کا سفر بہت خوشگواری سے جاری تھا۔ حنان کے بعد منان کی آمد نے جیسے ان کی فیملی کو مکمل کر دیا تھا۔ اس دوران نشال کے دیے گئے گھاؤ کو نہ سہتے ہوئے اسد عمر اس جہان فانی کو چھوڑ گئے تھے۔ پھوپھو' رابیل اور حسن کے پاس آ گئی تھیں۔ اور ان کا آشیانہ جیسے مکمل ہو گیا تھا۔

پھر پندرہ سال پر لگا کر اڑ گئے تھے۔ وہ پرانے قصے خواب و خیال ہو گئے۔ لیکن جگنو کی یاد اب بھی اس کے دل میں کسک بن کر ابھرتی تھی۔

☼ ☼ ☼

وقت نے ایک بار پھر اس کے لیے ایک بہت بڑا امتحان لا کھڑا کیا تھا۔

کیا یہ اس کی معصوم اور کم سن بیٹی تھی؟

کس حال میں رابیل کے پاس لائی گئی تھی؟

اس کی بیٹی کے ساتھ یہ بھیانک "واردات" کس نے کی تھی؟ اس کا مجرم کون تھا؟

کیا باہر بیٹھا وہ حسین و جمیل مرد جسے ایک "آئیڈیل" کے عشق نے "گمراہ" کر دیا تھا۔ جس کے نزدیک جگنو کی حقیقی ماں بد کردار تھی اور وہ جگنو کی اچھی تربیت اور حفاظت نہیں کر سکتی تھی۔

وہ کیسا محافظ تھا جو اپنی بیٹی کو "درندگی" سے بچا نہیں پایا۔ وہ باکردار' باوقار' باعزت شخص اپنی بیٹی کو زمانے کی ٹھوکروں سے بچا نہیں پایا۔ مگر وہ جگنو کو کس "حال" میں اٹھا کر لایا تھا؟ ایک باپ ہونے کی حیثیت سے اس کے لیے مر جانے کا مقام تھا۔ اور شاید پندرہ سال گزر جانے کے بعد رابیل اپنے سامنے ایک مرے ہوئے شخص کو ہی دیکھ رہی تھی۔ وہ اپنی نیم مردہ بیٹی کو ہسپتال لاتے ہوئے ہی مر چکا تھا۔ اب تو محض ایک زندہ لاش تھی' ندامت کے بوجھ سے جھکی۔ وہ نہ سر اٹھانے کے قابل رہا تھا نہ آنکھ۔

اور یہ خدا کا عجیب ہی انصاف تھا۔

"میں نے تم پر بہتان باندھا تھا۔ میں نے تم پر الزام لگایا تھا۔ مجھے اس کی سزا ملی اور یہ بڑی بھیانک سزا ہے۔" وہ سسک سسک کر رو رہا تھا۔ اسے رونا ہی تھا ۔ عمر بھر رونا تھا۔ جو دوسروں کو ناحق رلاتے ہیں۔ انہیں عمر بھر خود بھی رونا پڑتا ہے۔

"آج میرا یوم حساب ہے۔ میں مجرم ہوں۔ میں گنہ گار ہوں۔ رابیل! تم جانتیں ہی نہیں۔ میں نے اور نشی نے تمہارے ساتھ کیا کیا؟ تم جان جاؤ..... تو مجھ پر تھو کو بھی نا۔"

وہ اس کے سامنے بکھر رہا تھا۔ ٹوٹ رہا تھا۔ رابی کچھ سننا نہیں چاہتی تھی۔ مگر وہ اپنے بوجھ ہٹانے کو بے تاب تھا' بے قرار تھا۔ بے چین تھا۔ اور رابی اس کے بوجھ "بانٹنے" کی ذرا بھر خواہش نہیں رکھتی تھی۔

"وہ ہماری شادی کی شب تھی۔" اس نے کہنا شروع کیا تھا۔ رابیل چیخ کر اسے خاموش کروانا چاہتی تھی مگر اس کی زبان تالو سے چپک گئی۔

"مجھے ایک آئیڈیل کے عشق نے برباد کر دیا۔ وہ آئی اور چھا گئی۔ آج اتنے برس بیت جانے کے بعد بھی مجھے لگتا ہے' وہ اس شب میرے سامنے نہ آتی تو میں عمر بھر کے خسارے اٹھانے سے بچ جاتا۔

میں خود کو بے قصور نہیں کہتا۔ مگر وہ بھی کم قصور وار نہیں تھی۔ میں اس کی سمت ایک قدم بڑھا' وہ چار قدم آگے ہوئی۔ جو آگ میرے اندر لگی تھی۔ وہ اس کے اندر مجھ سے پہلے ہی بھڑک اٹھی تھی۔

تم کو کچھ خبر نہیں رابیل! تمہاری کزن نشال نے خود مجھ سے رابطہ کیا تھا۔ ایکسی ڈنٹ کے بعد وہ میری عیادت کے لیے آئی تھی۔ تب میرا پہلی مرتبہ اس سے رابطہ ہوا۔ یہ ٹیلی فونک رابطہ بہت طریقوں سے آگے بڑھا تھا۔ وہ میرے نزدیک آتی چلی گئی۔

جس دن وہ میری عیادت کے لیے آئی۔ وہ سب ہتھیاروں سے لیس ہو کر آئی تھی۔ وہ مجھے جیتنے کے لیے آئی تھی۔ وہ عمر بھر کے لیے مجھے باندھنے کے لیے آئی تھی۔ اسے خبر تھی' وہ غلط کر رہی ہے۔ پھر بھی کرتی رہی اور میں جیسے عقل سے اندھا ہو گیا تھا۔ مجھے تب اس کے علاوہ کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ میں گناہ پہ گناہ کرتا گیا اور وہ برابر میرے ہمراہ تھی۔

ہماری ملاقاتوں کا سلسلہ بڑھتا گیا۔ ہوٹلنگ' آؤٹنگ' کلب' جمنازیم..... ہر جگہ ملاقات کا کوئی سبب بن جاتا تھا۔ خبر تو تب ہوئی' جب نشی اور تانیہ نے ہمیں دیکھ لیا۔ تب میں خوف زدہ ہو گیا۔ مگر نشال خوف زدہ نہیں تھی۔ وہ چاہتی تھی' تمہیں خبر ہو تاکہ تم خود ہی ہمارے رستے سے ہٹ جاؤ۔ وہ جان بوجھ کر ایسے مواقع پیدا کرتی۔ تانیہ کی منگنی والے دن پورے منصوبے سے وہ میرے ساتھ آئی تھی۔ اسے امید تھی' اس کی چیزوں کو دیکھ کر تم ٹھٹک جاؤ گی۔ اور تم حقیقت میں ٹھٹک گئیں۔ ایک کمرہ عدالت سج گیا۔ نشی کو امید تھی' تم اتنی بڑی حقیقت کو جان کر رکو گی نہیں۔ مگر ہمارا منصوبہ ناکام ہو گیا۔ ثوبیہ بھابھی کے صاف مکرنے نے مجھے بھی حیران کر دیا تھا۔ مگر ثوبیہ بھابھی سے ایسی ہی توقع تھی۔ وہ کسی کے معاملے میں نہیں گھستی تھیں۔

وقت کچھ اور آگے بڑھا۔ نشی نے پلاننگ بدل دی تھی۔ اب میرے لیے ضروری تھا' تمہیں وقت دینا' تمہارا خیال رکھنا تاکہ نشی پر شک نہ کیا جائے اور پھر ہماری طلاق سے دو ماہ پہلے نشی کی کورٹ میرج کی افواہ بھی ہماری پلاننگ کا حصہ تھی۔ اب قریب قریب ہر ایک کا "شک" نشی سے ہٹ چکا تھا۔ تمہارا دھیان بھی بٹ گیا۔ نشی کا خطرہ جیسے ٹل گیا۔ یہ سب نشی کے شاطر ذہن کا کمال تھا۔ میں اسے تب جان نہیں پایا تھا۔ وہ میری زندگی میں بربادی اور تباہی لے کر آئی۔ وہ میرے لیے خسارے لے کر آئی۔ وہ مجھے فنا کرنے کے لیے آئی۔ دو مہینے میں تمہارے ساتھ "سائے" کی طرح رہا۔ محبت جتاتا رہا' خود کو اچھا ثابت کرتا رہا۔ میں تمہارے ذہن سے شکوک کو کھرچ دینا چاہتا تھا۔

پھر دو مہینے کے مختصر عرصے کے بعد ایک جامع پلاننگ کے تحت نشی کا حسن کے "راز" چرا کر لانا۔ وہ کارڈز' خطوط' ٹیپ ریکارڈر اور ویڈیو..... یہ سب نشی کے کمالات تھے۔ یہ ایسے ثبوت تھے جو تمہیں میری زندگی سے نکال باہر کرتے۔ میں جانتا تھا' تمہارا حسن تو کیا کسی کے ساتھ کوئی افیئر نہیں۔ میں یہ بھی جانتا تھا کہ حسن کی یک طرفہ محبت محض اس کی اپنی ذات تک محدود تھی۔ مجھے یہ بھی خبر تھی کہ تم مجھ سے شدید محبت کرتی ہو..... پھر بھی میں نے تمہیں دھوکا دیا۔ تمہارا تماشا لگایا۔ تمہیں بدنام اور رسوا کیا۔ تمہیں گھر بدر کیا۔ اور آج خود بھی نشان عبرت بنا بیٹھا ہوں۔"

وہ دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر رو رہا تھا۔ اسے اپنے ہی کہے لفظ رلا رہے تھے۔ شاید اس کی کہانی ختم ہو گئی تھی۔ مگر کہانی ختم کہاں ہوئی تھی۔ ابھی تو بہت کچھ باقی تھا۔

"میری اور نشی کی شادی اور ہماری طلاق کا اصل موجب کسی سے چھپ نہیں سکا تھا۔ ثوبیہ بھابھی تو گواہ بھی تھیں۔ اس بات سے میں بھی ناواقف نہیں تھا۔ اور گھر میں سب سے زیادہ دکھ میری طلاق کا' میرا گھر برباد ہونے کا' میری ماں کو تھا۔ وہ تم سے جتنی مرضی بیزار رہتی تھیں مگر میرے اس انتہائی فعل نے انہیں مجھ سے متنفر کر دیا تھا۔ وہ نشی کو بطور بہو قبول کر ہی لیتیں اگر انہیں اس کی "چالوں" کا پتا نہ چلتا۔

ہم نے جس طرح چھپ کر مراسم رکھے تھے اور چھپ کر نکاح کیا تھا۔ سب گھر والوں پہ سچائی جیسے منکشف ہو گئی تھی۔ انہیں پتا چل گیا کہ رابیل پہ

بہتان باندھنے اور گھر سے بے گھر کرنے میں کس کا ہاتھ رہا ہے۔ تب نشی کے لیے گھر میں جگہ تنگ ہو گئی۔ وہ میرے گھر سے دور جانا چاہتی تھی۔ کچھ میں بھی حالات سے خوف زدہ تھا۔ مجھے قوی امید تھی۔ تم جگنو کے لیے کورٹ تک جاؤ گی۔ تب میں جگنو کو لے کر ملک سے فرار ہو گیا۔

دوبئی میں ہم نے اک نئی زندگی کا آغاز کیا تھا۔ مجھے لگا' میں ماضی کے سارے آسیب پاکستان میں چھوڑ آیا ہوں۔ میری زندگی میں چین' سکون اور محبت کے علاوہ کچھ نہ تھا۔ میں نے جسے چاہا پالیا۔ جس کی تمنا کی اسے جائز ناجائز طریقے سے حاصل کرلیا۔ اولاد کی نعمت بھی موجود تھی۔ اور مزید کی تمنا بھی نہیں تھی۔

نشی اور جگنو کی موجودگی نے میری زندگی کو مکمل کر دیا تھا۔ مگر میری زندگی مکمل کہاں تھی؟ میں تو ادھورا تھا اور مجھے ادھورا ہی رہنا تھا۔ کیونکہ تمہاری خاموش بد دعائیں اور قدرت کا انصاف میرے ساتھ ساتھ تھا۔

دس سال گزر گئے۔ مگر ان دس سالوں میں کیا کیا ہوا تھا؟ سوچوں تو ایک ایک دن عذاب لگتا ہے...... بے خواب لگتا ہے...... میرا چین سکون ختم ہو چکا تھا اور اسے ختم کرنے والی میری محبوبہ نشال تھی۔ وہ جگنو کے وجود کو برداشت نہیں کرتی تھی۔ وہ شاید کسی اس بندے کے وجود کو برداشت نہیں کر سکتی تھی جو میرے اور اس کے درمیان آجاتا تھا۔ اسے مجھ سے جنونی عشق تھا۔ وہی عشق جس پہ کبھی مجھے غصہ آجاتا اور کبھی تکبر۔ کبھی اس عشق پہ مجھے مان تھا۔ غرور تھا۔ فخر تھا۔ اب یہی عشق میرے لیے وبال بنتا جا رہا تھا۔ نشی کا عشق میرے لیے "سزا" بن گیا تھا۔ وہ میرے سائے کو بھی برداشت نہ کرتی۔ وہ میرا کسی کے ساتھ بولنا' اٹھنا' بیٹھنا' کلام کرنا کچھ بھی برداشت نہ کرتی تھی۔ اسی طرح جگنو بھی اس کی چڑ بن گئی۔ جگنو جو میرا دوسرا عشق تھی۔ وہ نشی کی نظر میں کانٹا بن گئی۔ ڈاکٹرز کہتے تھے اس عورت کی اپنی اولاد ہوتی تب بھی یہی کرتی۔ وہ اپنی اولاد کو بھی برداشت نہ کرتی۔ شاید اسی لیے اللہ نے اسے بے اولاد ہی رکھا تھا۔

دس سال میں نے اس کے عشق اور جنون کے ساتھ سمجھوتا کیا۔ جگنو کو چھپ چھپ کر پیار کرتا۔ چوری چوری اس کی فرمائشیں پوری کرتا۔ اسے راتوں کو اٹھ اٹھ کر چوری چھپے دیکھنے جاتا اور اگر اس دوران نشی دیکھ لیتی تو ہنگامہ کھڑا کر دیتی۔ وہ جگنو کو اپنا رقیب سمجھتی تھی۔ پھر اس کے رقیبوں میں اضافہ ہو گیا۔ دس سال بعد زوار بھائی کے توسط سے میری "سزا" کم ہوئی اور گھر والوں نے میرے ساتھ رابطہ بحال کیا۔

اب پاکستان سے آنے والی ہر فون کال اسے ڈپریشن میں مبتلا کر دیتی تھی۔ چاہے کال میری ماں کی ہوتی یا بہن کی۔ نشی کو دورہ سا پڑ جاتا۔ وہ دو دو دن بے ہوش رہتی۔ چیختی' چلاتی' روتی' میرے ساتھ لڑتی اور میری غیر موجودگی میں جگنو پہ تشدد کرتی۔

اسے میری محبت نے نفسیاتی مریضہ بنا دیا تھا۔ اسے ہر وقت وہم ستاتے۔

"تم رابیل کی طرح مجھے بھی چھوڑ دو گے۔ جب تم رابیل کو چھوڑ سکتے ہو تو مجھے بھی چھوڑ سکتے ہو۔"

وہ ایک ہنگامہ کیے رکھتی۔ دن بھر اسی بات کی گردان کرتی۔ ہر وقت روتی رہتی۔ میں اس کے لیے ڈاکٹر بدل بدل کر تھک چکا تھا۔ مگر کوئی افاقہ نہ ہوا۔ پھر زوار بھائی نے مجھے کینیڈا بلا لیا۔ ان دنوں وہ کینیڈا میں اوسٹڈ تھے۔ وہاں پر بھی میں ڈاکٹرز کے چکر لگا لگا کر تھکنے لگا تھا۔ مگر نہ تو نشی کے خوابوں نے رنگ بدلا تھا نہ اسے رابیل چلتی پھرتی نظر آنا بند ہوئی۔ کینیڈا آکر اس کی "سزا" کا دورانیہ طویل ہو گیا تھا۔ اب اسے ہر روپ میں رابیل دکھائی دیتی۔ وہ اسے ڈراتی' دھمکاتی اور خوف زدہ کرتی۔

وہ تمہیں اپنی نظر سے دور کرنے کے لیے جگنو پہ بلاوجہ تشدد کرتی۔ دو دفعہ اس کا گلا دبایا۔ ایک دفعہ اسے کمرے میں بند کر دیا۔ اور کئی مرتبہ اسے کھڑکی سے نیچے پھینک دیا۔

میری معصوم بیٹی ایسے ماحول اور حالات میں پلی بڑھی۔ اس نے ایک ایب نارمل ماحول دیکھا تھا۔ ایک ایب نارمل زندگی دیکھی تھی۔ وہ کیسے ایک نارمل بچی

رہتی؟ نشی نے میرے ساتھ ساتھ جگنو کی زندگی بھی جہنم بنا دی تھی اور ڈاکٹرز مجھے فی الفور مشورے دے رہے تھے کہ میں اپنی بچی کو اس عورت سے دور کر دوں۔ ورنہ بڑا نقصان اٹھاؤں گا۔

ان ہی دنوں نشی اور جگنو کی زندگی میں ایک نیا موڑ آیا اور یہ نیا موڑ زخام لایا تھا۔

زخام کی کینیڈا آمد سے پہلے نشی کے ساتھ ساتھ جگنو بھی آدھی پاگل ہو چکی تھی۔ وہ دونوں آپس میں جھگڑا کرتیں' ایک دوسرے کو گالیاں دیتیں اور ایک دوسرے کے بال تک نوچ لیتیں۔

ساڑھے پندرہ سالہ جگنو کی زبان کے جوہر دیکھنے سے تعلق رکھتے تھے۔ نشی سیر تھی تو جگنو سوا سیر۔

میری اصل "سزا" تو جیسے اب شروع ہوئی تھی۔ جگنو ایک انتہائی بد زبان' غصیلی' تنک چڑھی لڑکی تھی۔ وہ بات بے بات کاٹ کھانے کو دوڑتی تھی۔ اسے بہت غصہ آتا تھا۔ وہ نشی کو زچ کرتی' غصہ دلاتی' گالیاں دیتی یہاں تک کہ بات ہاتھا پائی پہ آجاتی۔ میں جانتا تھا' یہ محض عمل کا رد عمل تھا۔ جگنو نشی کی دی گئی اذیتیں اسے لوٹا رہی تھی۔ جو بھی تھا۔ یہ صورت حال بہت اذیت ناک تھی۔

ایک پاگل کم تھی جو ایک اور پاگل میرے لیے آزمائش بن گئی۔ نشی کے ساتھ ساتھ جگنو کا علاج بھی جاری تھا۔ میں جیسے چکی کے دو پاٹوں کے درمیان پسا جا رہا تھا۔

زخام کی کینیڈا آمد کے بعد جگنو بدلنے لگی۔ اس کا مزاج بدلنے لگا' غصہ کم ہونے لگا' جھگڑا کم ہونے لگا۔ گویا زخام کی آمد بہت مبارک ثابت ہوئی تھی۔

یہ دو ماہ میرے چین اور سکون سے گزرے تھے۔ اور ان ہی دو ماہ میں پہلی مرتبہ مجھے شہر سے باہر جانا پڑا۔ زخام کی وجہ سے میری فکر کچھ کم ہو گئی تھی۔ عجیب بات تو یہ تھی' وہ نشی اور جگنو دونوں کو کنٹرول کر لیتا تھا۔

میں یہ نہیں جانتا تھا کہ شہر سے باہر جانا میرے لیے ایک اور "عذاب" لے کر آئے گا۔ میری جھولی میں وہ تمام ذلت' غلاظت اور گندگی آگری جسے میں نے

تمہاری جھولی میں ڈال کر تمہیں اپنی زندگی سے نکالا تھا۔ میرے وہ مغرور الفاظ کہ "تم جیسی بدکار عورت میری بیٹی کی تربیت نہیں کر سکتی' میری بیٹی کی حفاظت نہیں کر سکتی۔" میرے ہی منہ پر کیچڑ ملتے گئے اور مجھے نشال نے بڑے نخوت بھرے انداز میں بتایا۔

"تمہاری بیٹی نے جانے کس کے ساتھ منہ کالا کر لیا۔ تمہارے پیچھے اسے کھلی چھوٹ مل گئی۔ ڈاکٹر کو دکھا لاؤ۔ حمل سے نہ ہوئی تو نام بدل دینا میرا۔ جیسی ماں ویسی بیٹی۔"

وہ تمہارے الوژن سے اتنی نفرت کرتی تھی کہ جگنو کے حوالے سے گندی باتیں کر کے اپنی روح کو تسکین پہنچاتی۔ اس کا احساس جرم اسے کسی پل چین لینے نہیں دیتا تھا اور وہ خود اذیتی کے نئے نئے داؤ سوچتی رہتی تھی۔ وہ مجھے بھی تکلیف دینے لگی تھی اور یہ بات تو مجھے بہت بعد میں سمجھ آئی تھی کہ وہ جگنو کو مجھ سے دور کرنے کے لیے کسی حد تک بھی جا سکتی تھی۔

اور جو الزام نشی نے جگنو پہ لگایا تھا' وہ کسی طور بھی جھوٹا نہیں تھا۔ میرے شہر سے باہر جاتے ہی میرے گھر میں کیا ہوا؟ مجھے کچھ خبر نہ تھی۔ بس زخام اچانک پاکستان واپس چلا آیا تھا اور جگنو نے خود کو کمرے میں بند کر لیا تھا۔ ان دنوں نشی بڑی مسرور اور مطمئن نظر آتی تھی۔

مجھے تب بھی پتا نہ چلا کہ میرے گھر ہوا کیا تھا؟ میں تو بس تنہائیوں سے گھبرا کر اپنے وطن لوٹ آیا۔"

زین کی آواز غم کی گہرائیوں میں ڈوب رہی تھی۔ وہ اچانک خاموش ہو گیا تھا۔ رابیل کے اندر بے چینیاں اٹھ آئی تھیں۔

اس کی پیاری بیٹی جو ہوش و خرد سے بیگانہ تھی۔ جانے اس پہ کیا کچھ بیت چکی تھی؟

معاً" دروازے پہ دستک ہوئی۔ ملگجے سے اندھیرے میں روشنی کی ہلکی سی لکیر پھیلی تھی۔ آنے والی ایک نرس تھی۔ جس کے چہرے پہ ہلکی سی پروفیشنل مسکراہٹ تھی۔

"ڈاکٹر صاحب! بیڈ نمبر 4 اور روم نمبر 6 کے پیشنٹ

کو ہوش آگیا۔ وہ لڑکی آپ کو بلا رہی ہے۔" نرس کے بتاتے ہی رابیل بجلی کی سی تیزی کے ساتھ اٹھ کر باہر کی طرف لپکی تھی۔ زین نے بھی اس کی تقلید کی۔

"جگنو کو ہوش آگیا؟" اسے دنیا جہان کی مسرتیں مل گئی تھیں۔ رابیل کے چلتے قدم لمحہ بھر کے لیے رک سے گئے۔

"نشال کو بھی ہوش آگیا۔" اس نے زین کی معلومات میں اضافہ کیا تھا۔ زین کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔

☼ ☼ ☼

"پولیس بیان لے گی۔" زین دروازے کے پاس کھڑا سخت گھبراہٹ کا شکار تھا۔ اس نے زین کو اشارے سے روک دیا۔

"تم یہیں رہو، حسن پولیس کو دیکھ لے گا۔ مجھے ابھی جگنو سے بات کرنا ہے۔" رابیل بغیر اس کی طرف دیکھے دروازہ کھول کر اندر چلی گئی تھی۔

وہ گردن تک چادر اوڑھے بیڈ پر لیٹی تھی۔

اس نے رابیل کو ایسی نظر سے دیکھا، جیسے صدیوں کا پیاسا صحرا ہو۔ وہ رابیل کو دیکھ کر چیخ پڑی اور اس کے وجود سے لپٹ گئی تھی۔

"تم ڈاکٹر رابیل! میری پیاری ماں ہو۔" جگنو کی سسکیاں اس کے کانوں میں گونجنے لگیں۔ اس نے رابیل سے ایک بھی سوال نہ کیا، وہ تو اپنی جان پہ گزرنے والی حکایات سنا رہی تھی۔ وہ جیسے رابیل کی صدیوں سے منتظر تھی۔

"میرے دل پہ بڑا بوجھ ہے..... یہ بوجھ کس کے حوالے کروں؟ میرا باپ تقسیم شدہ ہے۔ وہ نہ نشی کا ہوا نہ میرا اور رابیل کا تو وہ کبھی تھا ہی نہیں۔"

جگنو کی آواز میں سرسراہٹ تھی۔ وہ کم سن سی لڑکی وہ چھوٹی سی لڑکی۔ انگریزی لہجے میں اردو بولتی۔ وہ اجاڑ ویران لڑکی... رابیل کی جگنو تھی، جانے اتنی سی عمر میں کتنی صدیوں کا سفر طے کر آئی تھی۔ وہ پندرہ کی نہیں پچاس کی لگتی تھی۔ اس کم سن لڑکی نے زمانے دیکھ لیے تھے۔ حالات اور وقت نے اسے وقت سے پہلے بوڑھا کر دیا تھا۔

"میں نے ماں کو نہیں دیکھا، ماں کیا ہوتی ہے؟ ماں کسے کہتے ہیں! ماں کے وجود سے اٹھتی خوشبو کیسی ہوتی ہے؟ تم میری ماں ہو نا! تم کیسی ماں ہو! تمہیں مجھ پر بیتنے والی ایک بھی تکلیف کا نہیں پتا۔

میں نے ایک پاگل عورت کے ساتھ اتنے سال گزارے۔ جو نہ کھانے دیتی تھی، نہ سونے دیتی تھی، نہ پڑھنے دیتی تھی۔ وہ تو رونے بھی نہیں دیتی تھی۔ اس عورت نے میرے لیے برزخ سا گا رکھا تھا۔ شاید میں مر جاتی۔ شاید میں خودکشی کر لیتی، شاید میں کہیں بھاگ جاتی اگر زخام نہ آجاتا۔"

وہ ایک ہی سانس میں سب کچھ بتا دینا چاہتی تھی۔

"زوار تایا کا بیٹا..... اتنا پیارا، اتنا اچھا، اتنا نفیس..... وہ مجھے کتنا اچھا لگتا تھا۔ تمہیں کیا بتاؤں رابیل! وہ بہت اچھا تھا سب سے مختلف، سب سے الگ، جدا، منفرد..... وہ مجھ سے پیار کرنے لگا۔ مجھ پاگل سے۔ مجھ خبطی سے اور نشی کو کہاں گوارا تھا۔ اسے میرا خوش ہونا کہاں گوارا ہو سکتا تھا۔ وہ مجھے پاپا سے دور کر دینا چاہتی تھی، وہ مجھے ختم کر دینا چاہتی تھی۔

اس نے پاپا کی غیر موجودگی میں زخام کو ورغلا لیا۔ اسے باتوں میں لگا لیا۔ اس نے پاپا کی غیر موجودگی میں زخام کو ڈرنک کرائی اسے نشے سے بدحال کر دیا۔ اس نے کہا۔ میں شرابی لڑکی ہوں، نشہ کرتی ہوں، میرے کئی دوست ہیں میں راتوں کو گھر سے غائب ہو جاتی ہوں۔ اس نے زخام کو پاگل کر دیا تھا۔ اس کی سوچ ختم کر دی تھی اس کا شعور چھین لیا تھا اور زخام کو جانور بنا دیا تھا۔ اس نے چیخ چیخ کر زخام کو بتایا میں ایک بدکردار لڑکی ہوں..... پھر زخام کو غصہ آیا۔ اس نے مجھے بہت مارا، بہت مارا، بہت مارا..... مجھے ڈھونگی، فریبی، جھوٹی کہا۔ وہ غصے میں جانور بن گیا تھا اس نے میرے ساتھ بہت برا کیا۔

جب پاپا کو پتا چلا جب بہت دیر ہو چکی تھی۔ وہ ہم لوگوں کو پاکستان لے آئے، یہاں پہ سب نے مجھ پر ہی بہتان لگایا۔ الزام لگایا مگر زخام تو جانتا تھا۔ پھر بھی وہ خاموش رہا۔ آپ میرے باپ۔ جیسے رزیل انسان کا بھتیجا تھا۔ پھر رابیل کی بیٹی کے حق میں کیسے بولتا؟ سب گھر والوں کا رویہ میرے ساتھ بہت برا تھا۔ مجھے اچھوت سمجھا جا رہا تھا۔ تب تانیہ آنٹی نے مجھے وہ سب بتایا وہ سب کچھ جو نشال اور زین ابرار نے میری ماں کے ساتھ کیا۔ اسی لمحے میں نے فیصلہ کر لیا تھا۔ مارنے کا اور مر جانے کا۔"

وہ لمحہ بھر کے لیے چپ ہو گئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں وحشت ناچنے لگی تھی۔

"میں نے نشال کو زہر دے دیا اور اس کا بچا زہر میں نے خود پی لیا۔ وہ نہیں مری، میں بھی نہیں مری۔ مجھے بھی موت قبول نہیں کرتی۔ میں اور نشال ایک جیسی ہیں۔ بہت بری، بہت غلیظ۔ بس رابیل اچھی ہے۔" وہ اس کے ہاتھ چومنے لگی تھی۔ بہت عقیدت سے، محبت سے۔

"میں زین ابرار کی بیٹی تھی سو اس کی طرح ہی نکلی۔ اپنی پاک دامن ماں کے لیے گالی بن گئی۔" وہ پھر سے چیخ چیخ کر رونے لگی تھی۔ اپنا سر تکیے پر پٹختی۔

"میں ایسا نہیں بننا چاہتی تھی ماں! مگر ایک جنونی عورت نے مجھے پاگل کر دیا۔ تم مجھے اس جہنم میں کیوں چھوڑ آئیں ماں!"

وہ اس کے سینے سے لگی رو رہی تھی۔ برسوں کے حبس اور گھٹن کو نکال رہی تھی۔ اپنے اندر کے زہر کو نکال رہی تھی۔ اپنے من کو ہلکا کر رہی تھی۔ شفاف کر رہی تھی، پاک کر رہی تھی۔

"وہ ناگن ہے، جس نے تمہیں بھی ڈس لیا ماں! اور مجھے بھی۔"

رابیل نے اسے چوما، لپٹایا، پیار کیا۔ وہ اسے پرسکون کر رہی تھی۔

"جو دوسروں کے ساتھ برا کرتا ہے۔ اللہ اس کے ساتھ برا کرتا ہے۔ ہم جزا اور سزا دینے والے کون؟ میری بیٹی! نشال اپنی جلائی آگ میں جل رہی ہے۔" زین نے بھی اپنا بھگتان بھگت لیا۔ سکھ چین اسے بھی نصیب نہیں ہوا۔ بھلا اس سے بڑی سزا اور کیا ہو گی؟ جب تک زندہ رہے گا۔ نشال کے ساتھ رہے گا۔ اور تم تو جانتی ہو نا، نشال کے ساتھ رہنا کتنی بڑی سزا ہے۔

زین نے میرے ساتھ جو کیا، میں نے اسے معاف کر دیا۔ آج سے نہیں..... سالوں پہلے سے ہی۔ میں نے اس کے ساتھ نہ نفرت کا رشتہ رکھا نہ سزا جزا کا مگر جو کچھ زخام نے تمہارے ساتھ کیا۔ میں اسے کبھی معاف نہیں کروں گی۔ کل رابیل بہت کمزور تھی۔ رابیل آج کمزور نہیں..... میں تمہاری خاطر چھوڑے ہوئے رستوں پہ دوبارہ جاؤں گی۔ میں تمہارا "دل" بھی بچاؤں گی اور محبت بھی چاہے اس کے لیے مجھے کچھ بھی قربان کرنا پڑے۔ وہ تمہیں دھتکار کر "بے نیاز" نہیں ہو سکتا۔"

رابیل نے اس کے ماتھے پہ نرم بوسہ دے کر نرمی سے کہا تھا۔ جگنو کے جلتے بلتے دل کو جیسے قرار آگیا۔ وہ تو محبت کی ترسی ہوئی تھی۔ زخام سے ملی تو اس کے قدموں پہ ڈھیر ہو گئی۔ اپنا آپ نچھاور کر گئی۔

اندر خاموشی کا وقفہ طویل ہوا تو زین ابرار تھکے تھکے قدموں سے چلتا ہوا دروازے سے ہٹ گیا۔ بہت سی سچائیاں آج پھر اپنا چہرہ کرا گئی تھیں۔ جگنو کے ساتھ زخام نے برا نہیں کیا تھا۔ زین کی تقدیر نے کیا تھا۔ اس کے تکبر نے کیا تھا۔ اس کے تنفر نے کیا تھا۔ اس کے گناہ نے کیا تھا۔

رابیل جگنو سے کہتی یا نہ کہتی۔ زین ابرار جانتا تھا۔ جب اس نے ایک پاکیزہ رشتے کے موجود ہوتے ہوئے نشال سے ناجائز مراسم رکھے تھے۔ اس نے ایک برا فعل کیا، اس کی بیٹی کے ساتھ برا ہو گیا۔ باپ نے کیا اور بیٹی نے دیا۔ شاید اسی کو کہتے ہیں۔ جگنو نے خود زخام کو بری الذمہ کر دیا تھا۔ اس نے رابیل کو بتایا۔

"مجھے نہیں پتا ماں! پاک رشتے کیا ہوتے ہیں؟ پاکیزہ بندھن کیا ہوتے ہیں؟ گناہ اور ثواب کیا ہے؟ مجھے تو بس اتنا پتا تھا۔ زخام میرے ساتھ تعلق بنا کر مجھے نشال سے کہیں دور لے جائے۔ وہ مجرم نہیں، مجرم میری نیت تھی۔ نشال نے اسے شراب دی اور میں

نے مواقع۔" وہ اقرار جرم کر چکی تھی۔ اب بھلا اور کیا بتانے کو بچا تھا اس کا سر جھک گیا تھا۔ اس کی آنکھ جھک گئی تھی۔

وہ تھک کر نڈھال ہو چکی تھی۔ اس نے جگنو کے بکھرے بال سمیٹے اور پیار سے اس کا ماتھا چوما۔

وہ اسے سکون آور انجیکشن دے کر باہر آگئی۔ کوریڈور میں حسن کھڑا تھا۔ رابیل کا منتظر..... ہمیشہ کی طرح۔ اسے دیکھ کر آہستہ آہستہ چلتا ہوا قریب آگیا تھا۔ وہ اسے دن بھر کی صورت حال بتا رہا تھا۔ وقوعہ کی تفصیلات، پولیس کے ساتھ معاملات۔

"پولیس کا منہ بند کروا دیا ہے۔ معاملات کنٹرول میں ہیں۔ جگنو ایک آدھ دن میں ڈسچارج ہو جائے گی..... البتہ وہ۔" حسن سنجیدگی سے بتاتا ہوا نشال کے نام پہ چپ سا ہو گیا تھا۔ نشال اس کی بہن تھی، یہ اس کے لیے آج بھی باعث شرم تھا۔

"اس کی ذہنی حالت بہت شکستہ ہے..... وہ کسی کی جان لے بھی سکتی ہے اور دے بھی سکتی ہے۔ خیر، ہمیں کیا؟ ہم نے تو اس کا علاج کرنا تھا۔ جو ہمارا فرض تھا، وہ پورا کیا۔ تم گھر چل رہی ہو نا؟ بچے بہت ڈسٹرب ہیں۔"

وہ اس کا ہاتھ تھامے گاڑی تک لے آیا۔ جانتا تھا وہ بہت سے پل صراط پار کر کے آئی ہے۔ اس کا انگ انگ دکھا ہوا تھا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے دو دن پہلے والے منظر گھوم رہے تھے۔

دو دن پہلے ایک عجیب نوعیت کا کیس آیا تھا۔ رات کے تقریباً" دوسرے پہر، پورے ہسپتال میں بھگدڑ مچ گئی تھی۔

مریض ایک نہیں دو تھے۔ ایک کم عمر سی لڑکی اور ایک اجڑی پجڑی سی عورت۔ دونوں بے ہوش تھیں۔ دونوں کو زہر دیا گیا تھا۔ جانے یہ خود کشی کا کیس تھا یا قتل کا۔ وہ کم عمر لڑکی ابتدائی طبی معائنہ سے حاملہ ثابت ہوئی تھی۔ رپورٹ جب رابیل تک آئی۔ تب وہ دنگ رہ گئی تھی۔ دونوں مریض عورتوں کے ساتھ ایک مرد اور ایک عورت آئی تھی۔

اس مرد اور عورت کو دیکھ کر رابیل کے قدموں تلے سے زمین نکل گئی تھی۔ وہ ٹوٹا بکھرا، خوار ہوا مرد زین ابرار تھا۔ جبکہ اس کے ساتھ ثوبیہ زوار تھی جو کبھی غرور تکبر کا مجسمہ ہوا کرتی تھی۔ وہ اب ایک شکستہ حال عورت کے روپ میں تھی۔ اس کا سر جھکا ہوا تھا، وہ بہت بکھری بکھری لگ رہی تھی۔ نادم، پشیمان، بے حال جبکہ وہ مرد اس عورت پہ چلا رہا تھا۔

"یہ سب زخام کی وجہ سے ہوا۔ وہ میری بیٹی کو برباد نہیں کر سکتا، میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ اگر جگنو کو کچھ ہو گیا تو ہر طرف آگ لگا دوں گا۔ مجھے کمزور مت سمجھنا۔"

وہ چیخ رہا تھا جبکہ وہ عورت سر جھکائے ہونٹ کچل رہی تھی۔ ندامت اور خوف کے بوجھ تلے دبی تھی۔ ایک گناہ کی پکڑ میں تھی۔ جھوٹ چھپانے کے اثر میں تھی۔

"کینیڈا میں کیا ہوا؟ ہمیں کیا خبر۔" وہ جگنو کے ساتھ ہونے والی "واردات" سے مکرنا چاہتی تھی۔

"تمہیں نشال سے پوچھنا چاہیے تھا۔ آخر کیا ہوا تھا جو اس نے نشی کو زہر دیا اور خود بھی کھا لیا۔"

ثوبیہ آنکھیں مسلتی شکست خوردہ لگ رہی تھی۔ جگنو کی خود کشی اور نشال کو قتل کرنے کے اقدام نے بہت سے لوگوں کی آنکھیں کھول دی تھیں۔ ثوبیہ کہہ رہی تھی۔ زخام نے جو کچھ بھی کیا اس میں جگنو کی مرضی شامل تھی۔ زخام نشے میں تھا مگر جگنو نشے میں نہیں تھی۔ ثوبیہ اور زین کی تکرار کا موضوع جگنو کی ذات تھی۔

رابیل کے پیروں میں پہیے لگ گئے تھے، ڈاکٹرز کی پوری ٹیم بلوائی گئی تھی۔ فوراً" طبی امداد ملنے کی وجہ سے دونوں کی جان بچ گئی تھی تاہم یہ کیس پولیس کا تھا۔ جگنو کا جرم ثابت ہو جاتا تو اسے پولیس کی حراست میں جانا پڑتا۔ حسن کی کوششوں اور رسوخ کی بدولت پولیس کا معاملہ سیٹ ہو گیا تھا۔

رابیل کا چین سکون ایک بار پھر کھو گیا تھا۔ جگنو کی شکستگی اسے خون کے آنسو رلا رہی تھی۔

زین نے جو کیا، اس کا پھل پایا..... مگر جگنو کی زندگی کے تلخ ایام رابیل عمر بھر نہیں بھول سکتی تھی۔ نشی کے دیے گئے گھاؤ، مار، اذیتیں، رابیل کا انگ انگ ٹوٹنے لگا تھا۔ اس کی بیٹی کا بچپن، لڑکپن، سب دھول مٹی ہو گیا۔ وہ نہ گڑیا سے کھیلی، نہ بچوں والے شوق پورے کیے۔ اسے وقت نے ایک ہی جست میں باشعور کر دیا تھا۔

وہ نشال سے کم از کم اپنی بیٹی کی عمر کے قیمتی سالوں کو رولنے کا حساب ضرور لیتی اگر وہ نارمل ہوتی لیکن وہ تو رابیل کو دیکھ کر چیخنے لگی تھی۔ ڈرنے لگی تھی۔ وہ اتنی بدحال اور لاچار تھی کہ رابیل کو اس پہ ترس آیا۔

دوسروں کے خواب، خواہشیں، دل اور گھر اجاڑنے والی خود بھی کھنڈر ویران لگ رہی تھی۔

ایسی ناپاک عورت جس کے سگے بھائی نے اسے دیکھ کر منہ پھیر لیا تھا۔ جس کی ماں نے اس کا نام سننا گوارا نہیں کیا تھا۔ جس کا باپ اس کے غم میں دنیا چھوڑ گیا تھا۔ کیا نشال کے لیے اس سے بڑی بھی کوئی سزا موجود تھی۔

☆ ☆ ☆

"مجھے ابرار منزل جانا ہے حسن! کیا تم مجھے وہاں لے جا سکتے ہو؟" اس نے حسن سے کہا تھا۔

حسن لمحہ بھر کے لیے چپ سا ہو گیا تھا۔ پھر اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ اس کا محرم راز تھا، کیسے نہ اس کے دل کی حکایتوں کو سمجھتا۔ وہ اس کے ساتھ ایک بار پھر ان ہی راستوں پر سفر کر رہی تھی جنہیں پیچھے چھوڑ آئی تھی۔

رابیل کو کیا کچھ نہیں یاد آ رہا تھا۔ کبھی ان ہی گلیوں اور ان ہی رستوں پہ وہ بے اماں سی لٹی پٹی کے چلتی رہی تھی۔

ایک ہی جھٹکے میں زین نے اسے بے اماں، بے سائبان کر دیا تھا۔ طلاق کا داغ سجایا، دھتکارا اور اولاد ہوتے ہوئے بے اولاد کر دیا۔

حسن کی گاڑی ابرار منزل کے قریب آ رکی۔

"میں انتظار کر رہا ہوں..... تم یہ آخری کام بھی نمٹا آؤ..... اور دیکھو، خود کو اکیلا مت سمجھنا۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔ زندگی کی آخری سانس تک۔"

حسن نے بہت محبت کے ساتھ بڑے مستحکم لہجے میں کہا تھا۔ رابیل کی آنکھوں میں تشکر کے آنسو آگئے تھے۔ وہ حسن کی محبت کے سامنے کچھ اور جھک گئی تھی۔ کیسا عظیم، خالص اور بے کھوٹ نیت کا بندہ اللہ نے اس کے نصیب میں لکھ دیا تھا۔ رابیل کو اپنے نصیب پہ رشک آیا۔

"مجھے یقین ہے۔ تم پر بھی اور تمہاری محبت پر بھی۔" وہ دھیمے مضبوط لہجے میں کہتی باہر نکل آئی تھی۔

یہاں پر کچھ بھی نہیں بدلا تھا۔ کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ سب کچھ ویسے کا ویسا تھا۔ بس وقت بدل گیا، حالات بدل گئے۔

وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی ہال تک آگئی تھی۔ تب پہلا ٹکراؤ ثمن سے ہوا تھا۔ وہی ثمن..... تیز تیز بولتی، شوخ، چنچل، زین کی پسندیدہ ہستی۔

"ثوبیہ کہاں ہے؟" رابیل نے اپنے ازلی سنجیدہ اور باوقار لہجے میں دو ٹوک انداز میں پوچھا تھا۔

"وہ اپنے کمرے میں ہیں۔" ثمن بمشکل ہکلا کر بولی تھی۔ رابیل سر جھٹک کر ثوبیہ کے کمرے کی طرف آگئی۔ ثوبیہ کے تاثرات بھی کم و بیش ثمن جیسے تھے۔ اسے بھی رابیل کو دیکھ کر جھٹکا لگا تھا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

"تم یہاں۔" اس نے حیرت کے جھٹکے سے سنبھل کر پوچھا۔ یہ وہی ثوبیہ تھی، غرور کا پیکر، اپنے حسب نسب اور باپ کے عہدوں پہ مان کرتی ہوئی۔ اپنے بچوں کی ذہانت اور اعلا تربیت پہ اکڑتی ہوئی۔ آج جیسے اس کے سارے "بل" نکلے ہوئے تھے۔ وہ جیسے ایک ٹوٹی بکھری عمارت لگ رہی تھی۔ چاہے جگنو کے حوالے سے "کچھ" تسلیم نہ بھی کرتی تب بھی زخام کا نام تو آ رہا تھا اور ثوبیہ کے غرور کو ٹھوکر لگنے کے لیے زخام کے کردار پہ آنے والا حرف ہی کافی تھا۔

اللہ بھی کیسے کیسے طریقوں اور جھٹکوں سے لوگوں کے "بل" نکال دیتا ہے۔ اگر وہ زین اور نشی کے تعلق کو اس دن سب کے سامنے لے آتی تو آج "پکڑ" سے بچ جاتی۔

"سارا قصور ماں کی تربیت کا ہے۔ ماؤں کو بیٹوں کا سایہ بن کے رہنا چاہیے۔" ثوبیہ نے ایک مرتبہ بڑی نخوت سے کہا تھا اور آج اپنے بڑے بولوں کی پکڑ میں آ چکی تھی۔

"سچ" کو اس کے صحیح وقت پہ سب کے سامنے لانا چاہیے۔ ثوبیہ نے اس وقت رابیل کو سب کے سامنے جھوٹا کر دیا تھا۔

"تم یہاں کیوں آئی ہو؟" ثوبیہ نے بمشکل ہکلاتے ہوئے کہا تھا۔

"مجھے آپ کو کچھ بتانا ہے..... کیا بتانا ہے؟ یہ تو آپ جانتی ہی ہیں۔ اگر چاہتی ہیں تو سب کچھ دوہرا دیتی ہوں۔ آپ کے بیٹے نے میری بیٹی کو محبت کے خواب دکھائے۔ میری بیٹی اس سے محبت کرنے لگی۔ کینیڈا میں جو کچھ بھی ہوا۔ زخام ہی اس کا ذمہ دار ہے۔ وہ اس سے کبھی مکر نہیں سکتا۔ نہ میں مکرنے دوں گی۔ آپ جانتی تو ہیں 'میڈیکل سائنس نے کہاں تک ترقی کر رکھی ہے۔ میں اس آنے والے بچے کو زخام کا بچہ ثابت کر دوں گی۔ میں ڈی این اے ٹیسٹ کرواؤں گی' توارث کے قوانین سامنے لاؤں گی۔ اس کے لیے کچھ مہینے انتظار تو کرنا پڑے گا مگر بالآخر "سچائی" کھل کر سامنے آجائے گی۔ تب آپ اپنا خاندانی وقار 'رتبہ' نجابت اور شرافت کا لبادہ اٹھا کر کہاں جائیں گی؟"

اس نے ثوبیہ کے رنگ بدلتے چہرے کو دیکھا۔

"ہر آپشن پہ غور کر لیجیے گا۔ میری صرف اتنی سی خواہش ہے۔ بہت عزت آبرو کے ساتھ میری بیٹی کو نکاح جیسے مقدس بندھن میں باندھ لائیے۔ اسی میں سب کی بہتری ہے۔"

وہ اپنی بات مکمل کر کے پلٹی تھی جب سامنے زخام کو کھڑا دیکھ کر لمحہ بھر کے لیے رک گئی۔ جانے وہ کب سے کھڑا تھا۔

"انسانی زندگی اور ذہن بہت پیچیدہ ہے۔ انسان خطا کا پتلا ہے اور اپنی غلطیوں کی معافی' تلافی بہترین زندگی کا بہترین لائحہ عمل ہے۔ جو روح تمہارے وسیلے سے اس دنیا میں آرہی ہے۔ اسے دھتکار کر اس معاشرے کے لیے ایک بوجھ بنا دینا چاہتے ہو؟ کیا تم ایک اور جگنو کو آزمائش کی بھٹی میں جھونک دو گے؟ کیا تم ایک اور نسل کو تباہی کے دہانے پہ کھڑا کر دو گے۔ میرے بیٹے! اپنے بڑوں کی ناکام' بے سکون اور بے چین زندگیوں سے سبق حاصل کرو اور خود کو آنے والے وقت کی ذلتوں سے بچالو۔"

رابیل نے نرمی سے زخام کے کندھے پہ ہاتھ رکھا تھا۔ وہ جیسے سرتاپا ہل گیا۔

"غلطی تمہاری نہیں ..... تمہارے بڑوں کی غلطیاں ہیں' جو سامنے آرہی ہیں۔ کسی کو تکبر کی سزا ملی تو کسی کو تنفر اور خود پسندی کی۔ کوئی آئیڈیل کے پیچھے گمراہ ہوا اور کوئی محبت کے پیچھے۔ تم میری پاگل' نادان اور جذباتی بیٹی کو اس برزخ سے نکالنے آئے تھے۔ پھر کیسے جہنم میں دھکیل سکتے ہو۔"

وہ بے آواز رو رہی تھی۔ وہ پہلے بھی اس گھر سے روتی ہوئی گئی تھی۔ وہ اب بھی اس گھر سے روتی ہوئی جارہی تھی۔

مگر اس بار اس کے آنسو زخام نے پونچھ دیے تھے یہ مقام حیرت تھا۔ وہ رابیل کے قدموں میں جھک گیا تھا۔

"مجھے اب بھی جگنو سے بہت محبت ہے۔ وہ تو بس نشال آنٹی کی وجہ سے ..... مجھ سے قصور ہوا' غلطی ہوئی۔ میں اپنی غلطی کی تلافی ضرور کروں گا۔ میں اپنے بچے کو اور بچے کی ماں کو کبھی تنہا نہیں چھوڑوں گا۔" وہ بہت مضبوط لہجے میں بولتا رابیل کو دو جہانوں کی خوشیاں عطا کر گیا تھا۔ رابیل کی آنکھوں میں تشکر کے آنسو آگئے۔

"رابیل! تم بے فکر ہو جاؤ۔ میں خود اپنی پوتی کو اپنے گھر پورے مان اور ارمان سے لاؤں گی۔" رابیل کی آنکھوں اور کانوں نے زین کی ماں کا جلالی انداز

دیکھا تھا۔ آج وہ سر اس کے سامنے جھکا ہوا تھا۔ جو مقام رابیل کو اس گھر میں اتنی ریاضت کے بعد بھی نہیں ملا تھا۔ وہ اس کی بیٹی کو عنقریب ملنے والا تھا۔

رابیل نے آنے والی کئی نسلوں کو ذلت کی بھٹی میں جلنے سے بچالیا تھا۔ اس نے اپنی جگنو کو زمانے کی ٹھوکروں کے حوالے کرنے سے بچالیا تھا۔

پھر وقت نے بڑے بڑے سورماؤں کو جھکتے ہوئے دیکھا۔ گلشن اور ثوبیہ پورے جلال اور شان و شوکت سے جگنو کو بیاہ کر لے گئیں۔ اس کی بیٹی کی زندگی سے اندھیرے چھٹ گئے تھے۔ اس کی معصوم اور چھوٹی سی بیٹی اپنے باپ اور دادی کے گھر بڑی خوشگوار زندگی گزار رہی تھی۔ وقت نے اس کی جھولی میں جگنو ہی جگنو بھر دیے تھے۔ وہ تو خود سراپا روشنی تھی پھر بھلا اندھیروں میں کیسے کھوتی؟

رابیل کے دونوں بیٹے اپنی "آپا" کے رخصت ہو جانے پر بہت ناراض تھے۔ مگر چونکہ آپا ہر ہفتے ان سے ملنے آدھمکتی تھی سو وہ اپنی ناراضی کو فوراً" بھلا دیتے تھے۔

بالآخر دل میں چبھا آخری کانٹا بھی نکل گیا تھا۔ زین اور نشال کی زندگی کے "عذابوں" نے رابیل کو سارے عذاب بھلا دیے تھے۔ زین کے لیے کیا یہ سزا کم تھی کہ وہ عمر بھر نشال کے ساتھ ہی بندھا رہتا اور کبھی ایسی زندگی سے جان نہ چھڑا پاتا۔

زندگی کو آگے بڑھاتے ہوئے ہر موڑ پر رک رک کر اور ٹھہر کر اسے ایک عورت ضرور یاد آتی تھی۔ وہ جب جب جگنو کو دیکھتا' رابیل مجسم کھڑی نظر آتی۔ ایک مضبوط' باکردار' باوقار اور خوشحال عورت کے روپ میں۔

پھر احساس جرم اسے کوڑے لگاتا۔ اپنا گناہ یاد آتا۔ اگر وہ زندگی میں آنے والے اس کمزور لمحے کی زد میں نہ آتا تو اس کا گھر' اس کا آشیانہ' کبھی نہ ٹوٹتا۔ اس کی بیٹی ایک پراذیت ایب نارمل زندگی نہ گزارتی۔

کم از کم ایک باپ کو اپنا گھر توڑتے ہوئے لمحہ بھر کے لیے آنگن میں کھیلتی بیٹیوں کی طرف ضرور دیکھنا چاہیے..... وہ بیٹیاں جنہیں ماں کی ہر منزل اور ہر موڑ پہ ضرورت ہوتی ہے۔

جگنو کی ماں کو اس سے دور کر کے زین ابرار نے اپنی بیٹی کے ساتھ عظیم ظلم کیا تھا۔ وہ کبھی بھی خود کو اس ظلم پہ معاف نہیں کر سکتا تھا۔

ادھر وقت کے بہتے سمے نے رابیل کو کامران و کامیاب ہوتے دیکھا تھا۔ اس کی زندگی میں کسی چیز کی کمی نہیں تھی' سکون' دولت' آرام' چین اور بھرپور محبت۔

بہت ذہین اور فرماں بردار بیٹے' بے حد چاہنے والا شوہر..... اس کی زندگی جیسے مکمل تھی۔ مگر حسن کی زندگی میں کہیں ادھورا پن آج بھی موجود تھا۔ وہی ایک بوند برابر بات تھی۔ وہ اظہار کا تمنائی تھا اور رابیل آج بھی بے نیاز.....

وہ آج بھی آتے جاتے' بڑے درد بھرے انداز میں شعروں کی روح کو تڑپاتا تھا۔

بڑی بے اماں ہے زندگی' اسے بن کے کوئی پناہ ملے کوئی چاند رکھ میرے شام پر' میری شب کو مہکا گلاب کر کوئی بدگماں سا وقت ہے' کوئی بدگماں سی دھوپ ہے کسی سایہ دار سے لفظ کو' میرے جلتے دل کا حجاب کر

رابیل جیسے عاجز آجاتی۔ اس کی محبت کے سامنے گھٹنے ٹیک دیتی۔ تاہم اظہار کے معاملے میں کنجوسی دکھا جاتی۔

مگر ایک بناری صبح وہ گلاس ونڈو سے پردے ہٹا کر حسن کے قریب آتے ہوئے بڑی محبت' چاہت اور الفت سے بولی تھی۔

ملنا تمہارا مجھ سے محض حادثہ نہ تھا
یہ کارنامہ دل کا کرشمہ دعا کا تھا
ہم مبتلائے عشق تھے' ہرگز نہ کہہ سکے
خاموش ہی رہے کہ تقاضا حیا کا تھا

رابیل کے لفظوں نے حسن کو جیسے عمر بھر کے لیے سرشار کر دیا تھا۔ اسے دو جہاں کی خوشیاں میسر آگئی تھیں۔

★

رخسانہ نگار عدنان

ایک مٹھی مسالہ

عدیل اور فوزیہ نسیم بیگم کے بچے ہیں۔ بشریٰ ان کی بہو ہے اور ذکیہ بیگم کی بیٹی ہے۔ عمران بشریٰ کا بھائی ہے۔ مثال ذکیہ بیگم کی نواسی اور نسیم بیگم کی پوتی ہے۔ بشریٰ اور نسیم بیگم میں روایتی ساس بہو کا تعلق ہے۔ نسیم بیگم مصلحتاً "بیٹا بہو سے لگاوٹ دکھاتی ہیں۔ دوسری طرف ذکیہ بیگم کا کہنا ہے۔ ان کی بیٹی بشریٰ کو سسرال میں بہت کچھ برداشت کرنا پڑتا ہے۔ پانچ سال کی مسلسل کوششوں کے بعد بشریٰ کی نند فوزیہ کا بالآخر ایک جگہ رشتہ طے پاجاتا ہے۔ نکاح والے روز بشریٰ دولہا ظہیر کو دیکھ کر چونک جاتی ہے۔

عدیل سے شادی سے قبل ظہیر کا بشریٰ کے لیے بھی رشتہ آیا تھا مگر بات نہ بن سکی تھی۔ نکاح والے دن زاہدہ اور ذکیہ بیگم بھی ایک دوسرے کو پہچان لیتی ہیں۔ بشریٰ اپنی ماں سے یہ بات چھپانے کے لیے کہتی ہے مگر عدیل کو پتا چل جاتا ہے۔ وہ ناراض ہوتا ہے مگر فوزیہ اور نسیم بیگم کو بتانے سے منع کردیتا ہے۔ بشریٰ اور عدیل ایک ہفتے کے لیے اسلام آباد جاتے ہیں۔ وہاں انہیں پتا چلتا ہے کہ بشریٰ کے ہاں سات سال بعد پھر خوش خبری ہے۔

عفان اور عاصمہ اپنے تین بچوں اور والد کے ساتھ کرائے کے گھر میں رہتے ہیں۔ عفان کے والد فاروق صاحب سرکاری نوکری سے ریٹائر ہوئے ہیں۔ گریجویٹی اور گاؤں کی زمین فروخت کرکے وہ اپنا گھر خریدنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ ڈیڑھ کروڑ میں زمین کا سودا کرکے وہ عفان کے ساتھ خوشی خوشی شہر آرہے ہیں۔

فون پر پتا چلتا ہے کہ شہر آتے ہوئے عفان اور فاروق صاحب ڈکیتی کی واردات میں قتل ہوگئے۔ عفان کے قریبی دوست زبیر کی مدد سے عاصمہ، عفان کے آفس سے تین لاکھ روپے اور فاروق صاحب کی گریجویٹی سے سات لاکھ روپے وصول کرپاتی ہے۔ زبیر گھر خریدنے میں بھی عاصمہ کی مدد کررہا ہے۔

اسلام آباد سے واپسی پر عدیل دونوں مقتولین کو دیکھتا ہے۔ زاہدہ، نسیم بیگم سے بیس لاکھ روپے سے مشروط فوزیہ کی رخصتی کی بات کرتی ہیں۔ وہ سب پریشان ہو جاتے ہیں۔ عدیل بشریٰ سے ذکیہ بیگم سے تین لاکھ روپے لانے کو کہتا ہے۔

حمیدہ خالہ، عاصمہ کو سمجھاتی ہیں کہ عدت میں زبیر کا اکیلے اس کے گھر آنا مناسب نہیں ہے۔ لوگ باتیں بنا رہے ہیں جبکہ عاصمہ کی مجبوری ہے کہ گھر میں کوئی مرد نہیں۔ اس کا بیٹا ابھی چھوٹا ہے اور سارے کام اس نے خود کرنے ہیں۔ وہ جلد از جلد اپنا گھر خریدنا چاہتی ہے۔ عاصمہ کے کہنے پر زبیر کسی مفتی سے فتویٰ لے کر آجاتا ہے کہ وہ انتہائی ضرورت کے پیش نظر گھر سے نکل سکتی ہے، بشرطیکہ مغرب سے پہلے واپس گھر آجائے، سو وہ عاصمہ کو مکان دکھانے لے جاتا ہے۔

رقم مہیا نہ ہونے کی صورت میں فوزیہ کو طلاق ہو جاتی ہے۔ نسیم بیگم جذباتی ہو کر بشریٰ اور اس کے گھر والوں کو موردِ الزام ٹھہرانے لگتی ہیں۔ اسی بات پر عدیل اور بشریٰ کے درمیان خوب جھگڑا ہوتا ہے۔ عدیل طیش میں بشریٰ کو دھکا دیتا ہے۔ اس کا آپریشن ہو جاتا ہے۔ عدیل شرمندہ ہو کر معافی مانگتا ہے مگر وہ ہنوز ناراض رہتی ہے اور اسپتال سے اپنی ماں کے گھر چلی جاتی ہے۔

اسی اسپتال میں عدیل عاصمہ کو دیکھتا ہے جسے بے ہوشی کی حالت میں لایا گیا ہوتا ہے۔ عاصمہ زبیر کے ہاتھوں لٹ جانے پر خودکشی کی کوشش کرتی ہے تاہم بچ جاتی ہے۔ نو سال بعد عاصمہ کا بھائی ہاشم پریشان ہو کر پاکستان آجاتا ہے۔ عاصمہ کے سارے معاملات دیکھتے ہوئے ہاشم کو پتا چلتا ہے کہ زبیر نے ہر جگہ فراڈ کر کے اس کے سارے راستے بند کر دیے ہیں اور اب مفرور ہے۔ بہت کوششوں کے بعد ہاشم، عاصمہ کو ایک مکان دلاپاتا ہے۔ بشریٰ اپنی واپسی الگ گھر سے مشروط کر دیتی ہے۔ دوسری صورت میں وہ علیحدگی کے لیے تیار ہے۔ عدیل سخت پریشان ہے۔

عدیل مکان کا اوپر والا پورشن بشریٰ کے لیے سیٹ کروا دیتا ہے اور کچھ دنوں بعد بشریٰ کو مجبور کرتا ہے کہ وہ فوزیہ کے لیے عمران کا رشتہ لائے۔ نسیم بیگم اور عمران کسی طور نہیں مانتے۔ عدیل اپنی بات نہ مانے جانے پر بشریٰ سے جھگڑتا ہے۔ بشریٰ بھی ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کرتی ہے۔ عدیل طیش میں بشریٰ کو طلاق دے دیتا ہے اور مثال کو چھین لیتا ہے۔ مثال بیمار پڑ جاتی ہے۔ بشریٰ بھی حواس کھو دیتی ہے۔ عمران بہن کی حالت دیکھ کر مثال کو عدیل سے چھین کر لے آتا ہے۔ عدیل عمران پر اغوا کا پرچا کٹوا دیتا ہے۔

۱۳
تیرہویں قسط

بشریٰ سامنے کھڑے اونچے لمبے احسن کمال کو دیکھ کر بے یقین سی ہوئی جا رہی تھی اس کے لمبے قد کے سائے میں اس کا اپنا وجود اور بھی اندھیرے میں آگیا تھا۔

"تھینک یو گاڈ! تم نے مجھے پہچانا تو۔" وہ پہلے کی طرح بے وجہ قہقہہ لگا کر بولا۔ وہی قہقہہ جس سے بشریٰ کبھی بہت چڑا کرتی تھی۔

بشریٰ کا کچھ بھی بڑے سے بڑا نقصان ہو جاتا، احسن کمال یونہی منہ پھاڑ کر جب قہقہہ لگاتا تو بشریٰ سچ مچ اس کے گھنے سیاہ گھنگھریالے بالوں والا سر نوچ دیا کرتی تھی۔

مگر آج جب وہ اس بے تکے انداز میں منہ پھاڑ کر ہنسا تو پہلی بار وہ اسے اچھا لگا۔

گئے دنوں کا کوئی بھی بچھڑا ساتھی ہو، وہ آئے موسموں میں بالکل غیر متوقع طور پر سامنے آجائے تو اس کی ہر اچھی بری ادا پر پیار نہ بھی آئے مگر غصہ ہرگز نہیں آتا۔

بشریٰ کو بھی غصہ نہیں آیا چند لمحوں کے لیے سہی وہ اتنے مہینوں سے جس جمود کا شکار تھی اس کو بھول سی گئی۔

"اے..... سو تو نہیں گئیں تم کھڑے کھڑے۔ سمندری گھوڑی..... یہی جانور سوتا ہے نا کھڑے کھڑے پانی کے اندر ناں۔" وہ اپنی لمبی لمبی انگلیوں والا بڑا سا مردانہ ہاتھ اس کی آنکھوں کے آگے لہرا کر بولا۔

اور وہی بھونڈا سا خطاب دینے کا انداز، خفا ہوتے ہوتے بھی وہ ہنس پڑی۔ احسن نے زور سے اس کے چپت لگائی۔

"شکر ہے تم لوٹ آئیں ورنہ مجھے واقعی تمہارے سر پر کوئی بھاری پتھر یا کچھ ایسا مارنا پڑتا کہ تمہاری یادداشت لوٹ آئے۔" وہ پھر بے تکا قہقہہ لگا کر بولا۔

وہ بے وجہ مسکرائے گئی۔ بہت دنوں بعد تو کوئی ایسا بات کرنے والا ملا تھا جو اس کے حالیہ سانحے سے بے خبر تھا۔

"تم کہاں سے آن ٹپکے۔" وہ مسکراہٹ دبا کر بظاہر سرسری لہجے میں بولی۔

"کھجور سے" بشریٰ کو اس سے ایسے ہی جواب کی امید تھی۔

"آسمان سے گرے کھجور میں اٹکے ہمیشہ سے تمہارے محاورے کا حال برا رہا ہے۔"

"ماضی تو اچھا تھا پھر حال کیسے برا ہو سکتا ہے۔" وہ فوراً اپنی پکڑی جانے والی غلطی کو معنی خیز معنی پہناتا ہوا بولا۔

"بابا آئے کہاں سے ہو اتنے سالوں بعد۔" بشریٰ کچھ زچ ہو کر بولی۔

"بس یہیں کھڑے کھڑے محل کی دربان بنی سوال پہ سوال کرتی چلی جانا۔ جیسے وہ بچپن میں الف لیلیٰ دیکھتے تھے تو شہزادی بھٹکے ہوئے مسافر سے پوچھتی تھی اے بندہ خدا تو کون کدھر سے آیا ہے اور کیا چاہتا ہے؟ تین سوالوں میں پوری زندگی کا خلاصہ دریافت کرنا ان عربوں کا ہی فن ہے۔"

بشریٰ زور سے کانوں میں انگلیاں گھساتے ہوئے ایک طرف ہو کر اشارہ کرنے لگی۔

"شکر ہے تمہیں خیال تو آیا۔" اس نے آگے پیچھے پڑا بڑا سا سوٹ کیس اندر کی طرف دھکیلا۔

بشریٰ مڑنے لگی اس کی آواز سن کر ٹھٹک گئی۔

"آؤ ناں سیفی ڈارلنگ، میری جان تھک گئی۔" وہ مڑ کر اندھیرے میں کسی سے مخاطب تھا۔

بشریٰ چونک کر دیکھنے لگی۔

وہ دس گیارہ سال کا خوش شکل سہمی ہوئی صورت والا ایک بچہ تھا۔ احسن کمال اب اسے اپنے ساتھ لگائے اندر لا رہا تھا۔

"سنو بشریٰ!" وہ رک گئی۔

"یہ میرا بیٹا ہے سیف کمال..... ہے نا میرے بچپن کی تصویر، وہی آنکھیں، وہی تلوار جیسی ناک اور لڑکیوں جیسے نازک ہونٹ یہی کہتی تھیں نا تم اور کئی بار تم نے کمینگی دکھاتے ہوئے مجھے سچ مچ لپ اسٹک بھی لگا دی تھی یاد ہے نا تمہیں اور پھر میری جوتوں سے پٹائی ہوتی تھی امی کے ہاتھوں۔"

وہ پہلے کی طرح بولتا ہی چلا جا رہا تھا بغیر کسی کومہ، فل اسٹاپ کے۔

بشریٰ اس کی باتوں میں بہتی بہت دور نکل گئی تھی۔

بچہ اب باپ کے مسلسل بولنے سے بھی اکتا گیا تھا۔

"بابا ہم کہیں بیٹھ نہیں سکتے اور مجھے نیند بھی بہت آ رہی ہے اور بھوک بھی لگی ہے۔" وہ باپ کا باقاعدہ بازو ہلا کر متوجہ کرتے ہوئے بولا۔

"اوہ یار! یس یس..... سوری یار..... رئیلی سوری، بہت عرصے کے بعد کسی اپنے کو دیکھا ہے نا تو نہ جذبات قابو میں ہیں نہ زبان" وہ بے ساختہ کہہ گیا۔

بشریٰ نے اسے چونک کر دیکھا۔

اس کے جذبات بھی تو کچھ بے لگام ہوتے جا رہے تھے۔ ماضی کے ہنستے کھیلتے دنوں میں کہیں کھو گئے تھے۔ وہ کچھ دیر کے لیے..... بھول گئی تھی کہ وہ بشریٰ ہے اور اسے ابھی کچھ ہی ہفتے پہلے طلاق ہوئی ہے اور اس کی

مثال جیسی گڑیا بھر کر رہ گئی۔

"سن لو! اب تو بچہ بھی تمہیں ٹوک رہا ہے تو پھر بڑوں کا کیا حال ہوتا ہو گا۔ بے چارے مروت میں خاموش رہتے ہیں اور تم سمجھتے ہو تمہاری باتوں سے لطف اندوز ہو رہے ہیں۔" بشریٰ بچے کے ٹوکنے پر محظوظ ہو کر بولی۔

"چلو یوں بھی ہوتا ہے اپنے جذبات کو چھپانے کا ایک یہ بھی طریقہ ہے۔" وہ اس کی آنکھوں میں جیسے جھانک کر بولا بشریٰ لمحہ بھر کو سٹپٹا سی گئی۔ اسے ابھی بھی بشریٰ کے اندر تک جھانکنا آتا تھا۔

وہ نظریں چرا کر رہ گئی۔ وہ ابھی بلکہ کبھی بھی نہیں چاہ سکتی تھی کہ اس کا بھید کھلے۔

وہ بنا کچھ کہے تیزی سے اندر جانے لگی۔

"چلو بیٹا! یہاں کے میزبان کچھ ایسے ہی ہیں۔ خود ہی ڈھیٹ بن کر ہمیں اندر جانا ہو گا۔ بٹ ڈونٹ وری۔ تمہیں یہاں کھانا بھی ملے گا اور بہت مزے کی نیند بھی آئے گی۔ یہ میں تمہیں گارنٹی دیتا ہوں۔" وہ بچے کا ہاتھ تھامے ابھی بھی مسلسل بولتا ہوا پیچھے آ رہا تھا اور بشریٰ کا جی چاہ رہا تھا وہ اس سے چھپ کر کہیں اس جگہ روپوش ہو جائے جہاں سے وہ اسے کبھی بھی نہ دیکھ پائے۔

مگر یہ اب ممکن نہیں تھا!

☼ ☼ ☼

اس عورت کے پاس ایک سیاہ رنگ کا ڈبہ پڑا تھا۔ جس میں سرخ رنگ کا مائع تھا۔ وہ آنکھیں بند کیے اپنے آگے تسلے میں جلی آگ میں اس ڈبے سے کچھ سرخ مائع لیتی اور اس کے چھینٹے آگ پر مارتی۔

آگ سے شعلے سے نکلتے اور سرخ دھواں کمرے میں بھرنے لگتا۔

وہ سرخ مائع...... خون تھا۔

اسے لگا اس کا دل اچھل کر حلق میں آگیا ہے۔

اس نے بے اختیار منہ کے آگے ہاتھ رکھ لیا۔

نہیں اسے خود پہ قابو رکھنا تھا اگر اس عورت کو ذرا بھی یہاں اس کی موجودگی کا شک ہو گیا تو وہ کچھ بہت برا بھی کر سکتی ہے۔ اس کے ساتھ اس کے بچوں کے ساتھ۔

وہ تیزی سے الٹے قدموں پیچھے ہوتے ہوئے دل میں درود شریف آیت الکرسی اور قرآنی آیات پڑھنے لگی۔

اس کے قدم جو بھاری ہو رہے تھے اسے اٹھانا محال تھے۔ اس سے چلا بھی نہیں جا رہا تھا۔ آیات کا ورد شروع کرتے ہی بھاری پتھر سے قدم اٹھنے لگے۔ وہ ایک ایک سیڑھی ایک ایک زینے پر رک رہی تھی۔

اس کے دل کی عجیب حالت ہو رہی تھی۔ کچھ ایسا انہونا انوکھا احساس تھا جو اس کے دل کو جکڑے جا رہا تھا۔

"یا اللہ رحم فرما معافی دے دے ہمارے گناہوں کی حفاظت فرما میری اور میرے بچوں کی۔ میرا تیرے سوا کسی پر یقین نہیں۔ تو وحدہ لاشریک ہے۔ جادو بھی بہت اثر کرتا ہے۔ اے رب باری! اگر تو چاہے تو رحم کر میں تیرے رحم کی طلب گار ہوں تو میری بے چارگی، بے کسی سے واقف ہے۔ تو جانتا ہے صرف تو جانتا ہے میں کتنی بے بس ہوں بے کس ہوں رحم کر مجھ پر میرے یتیم و یسیر بچوں پر...... رحم، رحم۔"

وہ وضو کیے بغیر ہی اپنے کمرے کے ٹھنڈے فرش پر بے اختیار سجدہ ریز ہو گئی تھی۔

وہ جانے کتنی دیر یونہی زمین پر اکڑوں جھکی خدا کے آگے گڑگڑاتی رہی۔

"مما...... مما آپ کو کیا ہوا ہے۔" ننھی اریبہ اس کا کندھا ہلاتے ہوئے نیند سے بھری آنکھوں کے ساتھ پوچھ رہی تھی۔

عاصمہ خالی خالی نظروں سے اسے دیکھتی رہ گئی۔

گریہ زاری سے اس کی آنکھیں سوج گئی تھیں۔ مگر دل جیسے ٹھہر سا گیا تھا۔ بے قراری کو قرار مل گیا تھا۔

وہ اریبہ کا ہاتھ پکڑ کر اسے بستر تک لے کر آئی اور اسے آہستہ آہستہ تھپکتے ہوئے سلانے لگی۔ خود اس کی آنکھیں بھی نیند سے بوجھل ہوئی جا رہی تھیں۔

رات بھر کا رت جگا تھا، پھر ایسے خوفناک لمحے؟

وہ جیسے گہری نیند سے ہڑبڑا کر اٹھ گئی۔ چونک کر ادھر ادھر دیکھنے لگی۔

"نہیں، نہیں مجھے ان لمحوں میں غافل نہیں ہونا۔ یہی تو مانگنے کی خالص گھڑیاں ہیں۔ ہم جیسے طلب گاروں کے لیے ان لمحوں میں مانگی گئی سلامتی رد ہوتی ہے نہ دعائیں پلٹائی جاتی ہیں۔ مجھے آج خدا کے در کو ہلانا ہے اپنے بچوں کی سلامتی اور ان کے لیے رزق اور تحفظ مانگنا ہے آج مجھے سونا نہیں۔" اس کا دل پوری طرح بیدار ہو چکا تھا۔

اگر وہ ڈر کر بیٹھ گئی۔ اس عورت کے جادو ٹونے کے آگے ہار گئی۔ خوفزدہ ہو گئی تو پھر اس دلدل میں اترتی چلی جائے گی۔

بے شک اس عورت کی باتوں سے اس کا دل متزلزل ہو رہا۔ جب اس نے صاف لفظوں میں بتایا تھا کہ ایک مرد سے دھوکا کھانے کے بعد عاصمہ کا محتاط رویہ اچھا ہے۔ اور پھر یہ کہ ابھی اسے نوکری نہیں ملنے والی اور...... اور کچھ باتیں جو اس کے حافظے میں گڈمڈ ہوتی جا رہی تھیں مگر کچھ لمحوں کو سہی اس کا کمزور بے یقین سا دل یقین کرنے لگا تھا۔

کچھ ہی دیر میں وہ وضو کر کے مصلہ بچھائے اپنے رب کے آگے بڑے دل سے بڑی لگن سے رکوع و سجود میں مگن تھی۔

تہجد کے نفل پڑھنے کے بعد وہ بڑے صوفے کے ساتھ اپنے رب کے ساتھ سرگوشیاں کرتے ہوئے اسے ایک ایک کر کے اپنے سارے مسائل اور اپنے محدود وسائل کے بارے میں بتاتی چلی گئی۔

وہ خدا رب جلیل جو پتھر میں موجود کیڑے کے رزق سے غافل نہیں رہ سکتا اس کے مسائل سے کیسے بے خبر ہو سکتا تھا۔ مگر اس کے باوجود وہ یہ سب کہتی چلی گئی۔

ایک ایک کر کے اس دل پر دھرے چھوٹے بڑے بھاری ہلکے وزنی سارے پتھر ہٹتے چلے گئے۔

اسے گھپ اندھیرے میں روشنی دکھائی دینے لگی تھی۔ ایک دم سے اپنا کمزور وجود بہت مضبوط اور طاقت ور لگنے لگا تھا۔

جب وہ مصلہ تہہ کر رہی تھی تو بہت کچھ سوچ چکی تھی۔

کم از کم اسے ہارنا نہیں اور ڈرنا تو بالکل بھی نہیں اور خود کو مضبوط ظاہر ہی نہیں کرنا، بنانا بھی ہے۔

وہ خود کو جسمانی طور پر بھی ہر برائی سے لڑنے کے لیے آمادہ کر چکی تھی۔ آج اسے پہلی بار لگا تھا وہ بیوگی کے بعد اپنے پیروں پہ کھڑے ہونے کے لیے تیار ہے۔

وہ احسن اور اس کے بچے کو کھانا دے کر بغیر اس کے ساتھ شامل ہوئے۔ اگرچہ وہ اصرار کر رہا تھا مگر وہ سر درد کا بہانہ کر کے اسے ذکیہ کے حوالے کر کے چھوڑ آئی تھی۔

وہ اس کا چہرہ یوں ہی پڑھ لیا کرتا تھا۔ یہی خوف بشریٰ کو اس سے دور بھگا رہا تھا۔

مگر کب تک...... اس کا بھاری سوٹ کیس تو کچھ اور کہہ رہا تھا۔

بہت سال پہلے جب اس کی انگلی میں احسن کمال کے نام کی انگوٹھی اس کی چچی نے بہت محبت اور پیار سے ڈالی تھی۔ احسن کمال کچھ زیادہ ہی اس پہ اپنا حق جتانے لگا تھا۔

بشریٰ دوست بنائے گی تو احسن کمال کی پسند اور اجازت سے۔

کھیل کھیلے گی تو اس کی مرضی اور پسند کے۔ حتیٰ کہ اوقات بھی وہ ہوں گے جس میں احسن کمال اپنی پڑھائی، اپنے کلب اور اپنے دوستوں کی کمپنی سے فارغ ہو گا اور وہ اوقات چاہے رات نو بجے کے بعد کے ہوں۔

بشریٰ کے کپڑوں کی شاپنگ امی اور چچی مل کر کیا کرتی تھیں مگر پھر احسن کمال نے اس میں بھی دخل دینا شروع کر

جوتے، باریک ہیل کے سینڈل بشریٰ کی جان تھے اور احسن کمال نے ان پر بین لگا دیا۔

"تم یہ سینڈل پہنتی ہو تو یوں لگتا ہے جیسے سرکس میں کرتب دکھا رہی ہو۔ یا فیوز بلب چینج کرنے لگی ہو یا بغیر بانس کے تمہارے گھر کے جالے صاف کرنے ہوں۔"

وہ انتہائی بدتمیزی سے تبصرے کرتا، بشریٰ رو ہی پڑتی۔ اس نے باریک ہیل والے سینڈل پہننے چھوڑ دیے مگر ان کی خواہش اس کے دل سے مر نہ سکی۔

عدیل سے شادی ہوتے ہی اس نے ان گنت ایسے سینڈل خریدے تھے۔ نازک اور قیمتی۔ عدیل کو بھی اس کی پسند کا علم تھا۔ وہ اکثر ہی اسے ان جوتوں کی دل کھول کر شاپنگ کراتا۔

گیارہ ماہ دونوں کی منگنی رہی۔

جب تک احسن کمال کو نازیہ بھٹی سے عشق نہیں ہو گیا۔

بشریٰ تو اس کی حد سے زیادہ جتاتی محبت سے عاجز ہی آچکی تھی۔ اگر احسن کمال اس منگنی کو ختم کرنے کا اعلان نہ کرتا تو وہ خود اس کے نام کی انگوٹھی اتار کر پھینک چکی ہوتی۔

مگر اچھا یہ ہوا کہ پہل احسن کمال نے کی۔ گرین کارڈ ہولڈر نازیہ بھٹی اس کے دوست زبیر بھٹی کی فرسٹ کزن تھی۔

اس نے بھی کھٹ سے احسن کمال کو اوکے کر دیا۔

ان دنوں چچی شرمندگی کے مارے کئی دن تک ذکیہ اور بشریٰ سے نظر بھی نہیں ملا پائی تھیں اور پھر چپکے سے ایک دن ان لوگوں نے گھر شفٹ کر لیا تھا۔

بس رسمی طور پر ملنے کے لیے آئیں وہ بھی اوپرے دل سے۔ ہنس ہنس کر ادھر ادھر کی باتیں کرتی رہیں۔

ذکیہ نے تو غصے میں وضو کیا اور جا کر نماز کی نیت کر لی۔

وہ یوں ہی کچھ دیر بیٹھی رہیں پھر اونچی آواز میں سب کو فی امان اللہ کہہ کر چلتی بنیں۔

اس کے بعد احسن کی شادی کا کارڈ بھی اپنی بہن کے ہاتھوں بھجوایا۔ مگر کوئی گیا ہی نہیں۔ ذکیہ کو بے حد غصہ تھا۔

لیکن بشریٰ بہت خوش تھی کہ اس جیسے دم گھٹ منگیتر سے، ہمیشہ کے لیے چھٹکارا مل گیا۔

پھر احسن کمال کے نازیہ کے ساتھ امریکا جانے اور وہیں رچ بس جانے کی خبریں ملتی رہیں۔ چچی کچھ عرصہ بیمار رہ کر بیٹے سے ملنے کی آس لیے خاموشی سے دنیا سے چلی گئیں۔

اور احسن کمال کا باب ان کے گھر اور بشریٰ کی زندگی میں ہمیشہ کے لیے بند ہو کر رہ گیا۔ اس نے دانستہ و نادانستہ طور پر اس سب کو بھلا دیا تھا، پھر عدیل آ گیا۔ اس کی زندگی میں اور سب کچھ بدلتا چلا گیا۔

اس نے شادی کے آٹھ نو سالوں میں کبھی مڑ کر احسن کمال کو نہیں سوچا۔ دو ایک بار امی نے شاید اس کے امریکا سے چکر لگانے کا ذکر بھی کیا مگر بشریٰ تو اپنی خوشیوں بھری زندگی میں کچھ ایسی مگن تھی کہ وہ کچھ سن ہی نہ سکی۔

اور اب اتنے سالوں بعد یہ کیوں آ گیا؟

وہ مثال کو سوتے میں پیار کرتے ہوئے بے وجہ اس کے بارے میں سوچے جا رہی تھی۔

وہ آج بھی اتنا ہی باتونی اور کھلنڈرا تھا۔

ہاں اس کے کھلنڈرے پن میں کچھ کمی نہیں آسکی تھی کہ اسے ایک بار بھی احساس ندامت یا شرمندگی نے نہیں گھیرا کہ ماں کے منہ کو ہی سہی۔ لوگوں نے ان کے ساتھ بھی کمٹ منٹ کی تھی اور وہ یہاں کس استحقاق سے آیا... کیا اس وجہ سے کہ چچی نے چچا کا حصہ اس گھر سے لیا ہی نہیں تھا؟

پھر ان کے خاموشی سے گزر جانے پر احسن کمال کے مستقل لاپتا ہونے پہ امی نے کئی بار شکرانے ادا کیے تھے۔ ورنہ گھر کی ملکیت میں آدھا تو ان کے حوالے کرنا پڑتا۔

اب یہ آ گیا تو یقیناً "بٹوارہ چاہے گا۔ اگرچہ امی نے بعد میں سارا گھر گرا کر نئے سرے سے ماڈرن طرز کا بنوایا تھا۔ مگر ملکیت میں وہ ابھی بھی برابر کا حصے دار تھا۔

"خیر یہ امی اور عمران کا سر درد تھا، بشریٰ کا نہیں۔" آخری سوچ اس کے غنودگی میں ڈوبتے دماغ میں یہی آئی تھی۔

اور بہت سارے دنوں اور بہت ساری کالی راتوں کے بعد یہ ایک اکیلی رات آئی تھی، جس میں آخری سوچ اس کے دماغ میں عدیل یا مثال کی نہیں تھی، کسی اور کی تھی۔

اور وہ کسی اور آنے والے دنوں میں کیسے ہر رات اور ہر دن میں اس کی سوچ پر قابض ہونے والا ہے... اس نے اس لمحے ذرا بھی نہیں سوچا تھا۔

☼ ☼ ☼

"نہیں فوزیہ! ہرگز نہیں۔ تم اور امی کان کھول کر سن لو! یہ بات کسی بھی طرح ممکن نہیں۔" عدیل سنتے ہی ہتھے سے اکھڑ گیا۔

فوزیہ نے بے بسی سے ماں کی طرف دیکھا۔

کل اس کی فلائیٹ تھی خالد کے ساتھ اور جانے سے پہلے نسیم نے یہ پہاڑ سا مرحلہ اس کے ذمے لگایا تھا کہ وہ عدیل کو کسی بھی طرح نگہت کی بیٹیوں میں سے کسی ایک کے لیے راضی کر لے۔

مگر عدیل تو یہ سنتے ہی جیسے آگ بگولہ ہو گیا۔

"تو کیا اس بے وفا کی یادوں کو سینے سے لگا کر بیٹھے رہو گے ساری عمر... ابھی تمہاری عمر ہے ہی کیا، یوں بھی اتنے سالوں میں اس نے تمہیں دیا ہی کیا تھا۔ ایک بچی کے سوا۔ یا بے شمار فرمائشوں اور جھگڑوں کے سوا۔" نسیم بھی خم ٹھونک کر میدان میں آ گئیں۔

یہی وقت تھا اس بپھرے شیر کے پٹھے پر ہاتھ رکھنے کا۔

"امی! زیادہ بہتر ہو گا کہ آپ آئندہ اس کا تذکرہ نہیں کریں گی ورنہ۔" وہ ایک دم سے پہلے والا غصیلا جذباتی عدیل بن گیا تھا۔

"ورنہ کیا کرے گا۔ اینٹ لے کر سر پھاڑ دے گا میرا۔" نسیم بھی آج حساب بے باق کرنے پہ تلی تھیں۔ ورنہ فوزیہ کے جانے کے بعد عدیل سے بات کرنا ناممکن ہو جاتا۔

"ورنہ میں یہ گھر ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر چلا جاؤں گا۔" وہ سرد لہجے میں بولا اور "ورنہ" سے آگے تو یہ نسیم نے یا فوزیہ نے ایسا کبھی بھی نہیں سوچا تھا۔ اگر عدیل اس پر عمل کر لیتا تو...

نسیم کو جھرجھری سی آ گئی۔ وہ ایسا سوچ بھی نہیں سکتی تھیں۔

فوزیہ نے آنکھوں میں ماں کو ابھی کچھ ٹھہر جانے کا مشورہ دیا مگر ایسے نازک لمحے نسیم کی زندگی میں پہلے بھی بہت آئے تھے اور انہیں اچھی طرح علم تھا کہ کس موقع پر کیا کرنا ہے۔

وہ بے اختیار دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر پھپک پھپک کر رونے لگیں اور روتی چلی گئیں۔

"امی...! امی پلیز حوصلہ کریں، کیا ہو گیا ہے۔ کیوں ایسے بے قابو ہو کر روئے جا رہی ہیں۔ آپ کی طبیعت خراب ہو جائے گی۔" فوزیہ کن انکھیوں سے عدیل کی طرف دیکھتے ہوئے رندھی آواز میں بولی۔

"مر جانے دو مجھے۔ جان خلاصی ہو میری۔ اب زندہ رہ کر روں گی بھی کیا۔ بیٹے کی محتاج ہو گئی ہوں اب اس کی دھمکیاں ہی تو سنوں گی۔ مر جاؤں میں تو اس سے اچھا۔ اللہ موت دے دے مجھے۔ ایسی زندگی..." وہ حسب عادت سینے پر ہاتھ مار کر واویلا کرنے لگیں۔

عدیل کے ماتھے کی رگ غصہ ضبط کرتے ہوئے پھڑکنے لگی۔ اس نے سختی سے ہونٹ بھینچ کر خود کو کچھ بہت سخت کہنے سے روکا اور ایک جھٹکے سے اٹھ کر تیزی سے چلا گیا۔ نسیم کا واویلا ایک لمحے میں تھم گیا۔

فوزیہ کے لیے بھی یہ کسی جھٹکے سے کم نہیں تھا۔

نسیم کا یہ تیر بہدف نسخہ تھا جس کے آگے عدیل ہار جاتا تھا کہ وہ ماں کے آنسو' برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ موم کی طرح پگھل جاتا تھا۔

مگر آج تو وہ کسی پتھر کی طرح بے حس بنا رہا اور پھر یوں لاتعلقی سے اٹھ کر چل دیا۔

"امی! آپ بھائی کی شادی کا خیال فی الحال دل سے نکال دیں۔ بھائی ابھی کسی بھی صورت میں شادی نہیں کریں گے۔" فوزیہ نے ماں کو مشورہ دیا۔ نسیم کے آنسو تو وہیں تھم چکے تھے۔

"تو کیا میری بوڑھی ہڈیوں میں دم ہے، جو میں سارے گھر کو سنبھالوں اور ہانڈی چولہا بھی کروں اس عمر میں؟" وہ چیخ کر بولیں۔

فوزیہ بے بسی سے ماں کو دیکھ کر رہ گئی۔

"میں نے پروین خالہ سے بات کی ہے نا۔ وہ اور ان کی بیٹی صبح سے آجایا کریں گی اور رات تک سارا کام نپٹا کر جایا کریں گی۔" وہ کچھ دیر بعد ماں کو تسلی دینے کو بولی۔

"اب میں گھر غیروں کے حوالے کردوں؟" وہ چمک کر بولیں۔ فوزیہ کچھ بول ہی نہ سکی۔

"مان جائے تو ابھی بھی دس لڑکیاں ہیں اس کے ساتھ شادی پر راضی۔" وہ ملال بھرے لہجے میں بولیں۔

"زبردستی کریں گی تو کچھ بھی کر سکتے ہیں وہ۔" فوزیہ نے سمجھایا۔ نسیم کچھ سوچنے لگیں۔

"اگر مثال کو یہاں لے آئیں پکا پکا۔ اس کے کاموں کو دیکھنے بھالنے کے لیے کوئی عورت چاہیے ہوگی پھر تو مان ہی جائے گا۔" وہ ذرا دیر بعد جوش بھرے لہجے میں بولیں۔

"دیکھ لیں مثال کی ذمہ داری آپ اٹھا نہیں پائیں گی۔ میں تو کہتی ہوں رہنے دیں اسے ماں کے پاس ہی۔ یہاں آئے گی تو بھائی کی ساری توجہ اس کی طرف ہو جائے گی۔ آپ کی طرف دھیان دیں گے اور نہ دوسری شادی کے لیے راضی ہوں گے۔ اتنی چھوٹی نہیں ہے مثال کہ اس کی دیکھ بھال کے لیے کسی عورت کے ساتھ کی اسے ضرورت پڑے۔" فوزیہ ٹھہر ٹھہر کر بولی۔

نسیم دل مسوس کر رہ گئیں۔

کوئی بھی تو دوست نظر نہیں آرہا تھا اور عدیل کی دوسری شادی بھی ضروری تھی۔ فوزیہ اب ادھر ادھر کی باتیں کیے جا رہی تھی مگر نسیم کا دماغ اسی ایک نقطے کی تلاش میں جتا تھا کہ کیسے عدیل کو شادی پہ راضی کریں۔

☼ ☼ ☼

"ہیلو!" وہ کچن میں مثال کے لیے ناشتہ بنا رہی تھیں جب وہ صبح سویرے اس کے سر پر سوار ہو گیا۔

"اٹھ گئے تم..... میں تو سمجھی تھی' رات بہت دیر میں سوئے ہو تو صبح دیر تک سوؤ گے۔" بشریٰ مروتاً بولی۔

"ہائے سویٹی! تمہاری بیٹی ہے نا؟" وہ مثال کی سنہری پونیاں ہلا کر اسے جھک کر پیار کرتے ہوئے بولا۔

"ہوں!" بشریٰ کی آنکھوں میں ڈھیر ساری محبت سمٹ آئی۔

"بہت کیوٹ ہے۔ تمہارے بچپن سے زیادہ۔" وہ اسے چڑانے کو بولا مگر بشریٰ کو اچھا لگا۔ مثال کی تعریف تو اسے اپنے سے بڑھ کر لگتی تھی۔

"تمہارا بیٹا ابھی سویا ہوا ہے؟" بشریٰ مثال کے آگے ناشتہ رکھتے ہوئے بولی۔

"ہاں' وہ دیر تک سوئے گا۔ میں تو صبح جلدی اٹھنے کا عادی ہوں اور واک کے لیے جانے کا۔ آج کچھ دیر ہو گئی۔" وہ بولتے ہوئے مثال کے آگے رکھے آملیٹ کو چھری سے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں کاٹنے لگا۔

"تمہاری بیوی نہیں آئی ساتھ؟" بشریٰ نے رات سے روکا ہوا سوال پوچھ ہی ڈالا بالآخر۔

اس کے ہاتھ لمحہ بھر کو تھم سے گئے۔

"سچ کہوں بشریٰ!" وہ سر اٹھا کر اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے گہری سنجیدگی سے بولا۔ "ہم دونوں کو ہی جیون ساتھی قدر کرنے والے نہیں ملے یا شاید ہم ہی ان کے قابل نہیں تھے۔"

بشریٰ کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔ وہ اس کے ساتھ بیت جانے والے سانحے کو یوں ایک جملہ میں سمیٹ کر اپنی بھی کہانی اس میں بیان کر جائے گا۔

اور وہ جو رات سے ڈری ہوئی تھی کہ جب احسن کمال عدیل کے بارے میں پوچھے گا پھر جھگڑے اور طلاق کی وجہ اور پھر مثال اور اس کے فیوچر کے بارے میں خوفناک اندیشوں کا اظہار کرے گا تو وہ کیسے اس کا سامنا کرے گی۔

اس نے کتنی آسانی سے ایک جملہ میں کہہ دیا جبکہ اسے یقین تھا ذکیہ نے رو رو کر بشریٰ کی بدنصیبی اس کی پہاڑ سی زندگی اور اس کی بچی کی برباد زندگی کے قصہ کو کتنا طویل کیا ہوگا اور احسن کمال۔

وہ پہلی بار اسے دلچسپی سے دیکھنے لگی۔

"بلکہ میں تو کہتا ہوں وہی ہمارے قابل نہیں تھے سوان پر چار حرف بھیجو ہم اپنی باتیں کرتے ہیں۔" وہ چھری رکھ کر ہاتھ جھاڑتے ہوئے بولا۔

"کیا مطلب؟" وہ چونکی۔

"یہی کہ آج تم مجھے ناشتے میں کیا کھلانے والی ہو۔" اس نے ہلکے پھلکے انداز میں کہا۔

"جو تم کہو۔" بشریٰ خوش دلی سے بولی۔

"پراٹھا' آملیٹ اور رات کا سالن' ساتھ گرما گرم چائے کا فل سائز مگ۔" وہ بے تکلفی سے بولا۔

بشریٰ اٹھ کر فریج سے آٹا نکالنے لگی۔

"تم بتاؤ' مجھے سیف کو کون سے اسکول میں داخل کرانا چاہیے۔" وہ اب مثال کو بچا ہوا ناشتہ زبردستی کرا رہا تھا۔ پراٹھا بیلتے ہوئے بشریٰ کے ہاتھ رک سے گئے۔

"تم کیا مطلب؟"

اف یار! تم مطلب بہت پوچھنے لگی ہو ایسی کوڑھ مغز کو تم کبھی بھی نہیں تھیں۔" وہ چڑ کر بولا۔

"تم کیا مستقل یہاں آگئے ہو۔" وہ سنبھل کر بولی۔

"آف کورس۔" وہ اب نیپکن سے مثال کا منہ صاف کر رہا تھا اور دودھ کا گلاس اس کے آگے رکھ رہا تھا۔

بشریٰ کو اس کے انداز بہت اچھے لگ رہے تھے۔

اس نے بہت آرام سے مثال کو سارا ناشتہ ختم کرا دیا تھا۔

"دیکھو نا' وہاں میں نے بزنس اسٹارٹ کیا تھا۔ جاب کچھ عرصہ کی پھر بعد میں بزنس میں آگیا۔ ابھی کچھ عرصہ پہلے یہاں کی دو کمپنیوں کے ساتھ بہت اچھی ڈیل ہو گئی۔ پارٹنر شپ بھی چل رہی ہے اور کچھ دوسرے معاملات بھی تو مجھے لگا' مجھے پاکستان واپس آجانا چاہیے۔" وہ تفصیل بتانے لگا۔

"بلکہ بشریٰ! اگر تم مائنڈ نہیں کرو تو مجھے تمہاری تھوڑی ہیلپ چاہیے ہوگی یہاں سیٹل ہونے میں۔" وہ بے تکلفی سے کہہ رہا تھا۔ بشریٰ اب اس کے لیے آملیٹ بنا رہی تھی۔

"مجھے یہاں اپنے اور سیفی کے لیے گھر دیکھنا ہے۔ آفس کا ارینج منٹ میں کر لوں گا۔ سیفی کا اسکول تم کرواؤ گی اور کچھ گھر کو سیٹ کرنے میں..... کیا تم تھوڑا ٹائم دے سکو گی مجھے؟"

وہ بہت طریقے سے پوچھ رہا تھا۔

"ہوں کیوں نہیں۔" بشریٰ کو کہنا پڑا۔

"اوکے تو آج ہی سے کام اسٹارٹ کیا جائے۔ اسپیشلی گھر دیکھنے کا۔" بشریٰ ہاتھ روک کر اسے دیکھے گئی۔

"ارے... آملیٹ کوئلہ بن جائے گا' واپس آجاؤ۔" وہ زور سے بولا تو وہ جلدی سے آملیٹ پلیٹ میں نکالنے لگی۔

"چلو' دو چار دن بعد شروع کریں گے سروے' جس میں تم ایزی فیل کرو۔" وہ ناشتہ کرتے ہوئے اطمینان سے بولا۔

[illegible] رکھتے ہوئے چولہا بند کر کے لمحہ بھر کو رکی۔
"میں امی سے ناشتے کا پوچھ لوں۔" وہ کہہ کر تیزی سے باہر نکل گئی۔
احسن اسے جاتا دیکھتے ہوئے کچھ سوچنے لگا۔

☆ ☆ ☆

"غلطی ساری آپ کی ہے عاصمہ بہن! آپ کو بغیر قانونی کارروائی کے اس عورت کو اپنے گھر میں داخل نہیں ہونے دینا چاہیے تھا۔" الیاس ساری بات سن کر کچھ پریشانی سے بولا۔
"میں جانتی ہوں۔ غلطی میری ہے لیکن بھائی آپ یقین کریں' میں کچھ اس طرح سے بے بس ہو گئی تھی کہ....."
وہ دونوں ہاتھوں سے کنپٹیاں دبا کر بولی۔ "آپ اس سے ملیں گے تو یقین کریں..... میں نے ایسی عورت پہلے کبھی نہیں دیکھی۔ وہ جادو ہی نہیں کرتی' سامنے والے کو بے بس بھی کر دیتی ہے۔ اور خدا کے لیے کچھ کریں' میرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔ وہ رات بھر چلے کاٹتی ہے اور..... یا اللہ! میں کیا کروں؟"
وہ روئی نہیں' مگر آنسو کنٹرول کرنا بھی مشکل ہوتا جا رہا تھا۔
"خیر آپ پریشان نہیں ہوں' میں اس کا بندوبست کر لوں گا۔ بس آپ کو اپنے گھر کے اندر والا دروازہ بند رکھنا ہے ہر صورت' جو راستہ اوپر کی طرف جاتا ہے وہ۔" وہ کچھ دیر سوچنے کے بعد بولا تھا۔
"وہ تو بند ہے اسی دن سے' جس دن وہ عورت آئی تھی اور اتنی چھوٹی ہے۔ کہتی تھی میری ماں اور بہنیں ایک دو دن میں آ جائیں گی۔ کوئی بھی نہیں آیا۔" عاصمہ حقیقتاً" پریشان تھی۔
"خیر یہ اس کا انتظام تو میں کر لوں گا۔"
"بھائی! آج ہی کچھ کریں۔ میں اس جادوگرنی کو مزید ایک رات بھی اپنے گھر میں برداشت نہیں کر سکتی۔" وہ تیزی سے بولی۔
"آپ پرسکون ہو کر گھر جائیں۔ میں کچھ نہ کچھ کرتا ہوں۔" الیاس نے اسے تسلی دے کر بھیج دیا۔
مگر گھر آ کر بھی اس کا دل گھر کے کاموں میں نہیں لگ رہا تھا۔ سارا دھیان اوپر کی طرف تھا' جہاں بالکل خاموشی تھی۔
"کمبخت رات بھر جاگ کر جادو ٹونا کرتی ہے اور دن میں پڑی سوتی ہے۔" وہ خوامخواہ جھلائے جا رہی تھی۔ غصہ اپنی بے بسی پر آ رہا تھا کہ اپنے گھر میں بھی وہ کتنی لاچار ہے' ایک ناپسندیدہ انسان کو نکال باہر نہیں کر سکتی۔
"بچے اسکول سے آ جائیں تو میں حمیدہ خالہ کے گھر جاؤں' شاید ان کے کچھ آنے کا پتا چل سکے۔" اس نے بے دلی سے کھانا بنایا۔
دھونے والے کپڑے کافی اکٹھے ہو چکے تھے۔ مگر وہ ابھی دھونا نہیں چاہتی تھی۔ پھر اوپر چھت پر سوکھنے کے لیے ڈالنے جانا پڑتا اور اسے ابھی اس عورت کا سامنا نہیں کرنا تھا۔
بیرونی دروازے پر ہونے والی دستک سے وہ چونکی۔
"اس وقت کون ہو سکتا ہے۔ بچے تو ابھی نہیں آئیں گے۔" وہ سوچتی ہوئی دروازے تک گئی۔
"کون؟" اس نے دروازے کی جھری سے جھانکتے ہوئے پوچھا۔ اور دوسرے لمحے دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔ وہ عورت دروازے کی جھری میں نظریں جمائے دیکھ رہی تھی۔
"تو تم باز نہیں آئیں غلط حرکت کرنے سے۔" وہ عجیب پھٹی ہوئی آواز میں عاصمہ پر نظریں جمائے کہہ رہی تھی۔

عاصمہ کوشش کے باوجود کچھ بول نہیں پائی۔
"دروازہ کھولو' مجھے بات کرنا ہے تم سے۔" وہ حکمیہ انداز میں بولی۔ عاصمہ جہاں کھڑی تھی' وہاں سے ہل بھی نہیں سکی۔
"تو تم دروازہ نہیں کھولوگی؟" وہ اور بھی حقارت بھرے انداز میں بولی۔
"نہیں۔" اللہ جانے کیسے وہ اپنے پورے جسم کی قوت مجتمع کر کے بول پائی۔
"اوہ تو اتنی جرات آ گئی ہے تم میں' مبارک ہو پھر تو تمہیں..... تم بہت جلد اپنے بچوں کو بھی رونے والی ہو۔" وہ منحوس لہجے میں بولی۔
اور دوسرے لمحے دروازے کے باہر مختلف آوازیں آنے لگیں۔
"اے ادھر منہ کرو۔ تم زلیخا ہو نا..... زلیخا شمشاد۔" کوئی بہت ہی بھاری رعب دار آواز تھی۔
"سر جی! یہی عورت ہے' شناخت کی کیا ضرورت ہے۔ اس مردود کو تو میں نے خود موقع واردات سے پکڑا تھا مگر یہ مجھے جل دے کر بھاگ گئی۔" دوسری خوشامدی سی آواز ابھری۔
"آپ کون ہیں جی۔ ہٹیں۔ جانے دیں مجھے اوپر اپنے گھر۔" وہ اب کے ذرا گھبرائے ہوئے لہجے میں بولی۔
"اپنے گھر کی بچی..... تیرے باپ نے خرید کر تیرے نام کیا تھا۔" یہ یقیناً" کسی پولیس والے کا لہجہ تھا۔ مگر ڈر کی وجہ سے عاصمہ نے دروازہ نہیں کھولا۔
"یہی ہے وہ انسپکٹر صاحب! جادو ٹونا کرتی ہے اور لوگوں کو بے وقوف بنا کر رقمیں اینٹھتی ہے۔" یہ الیاس کی آواز تھی۔ عاصمہ صاف پہچان گئی۔
"ارے جی جادو ٹونے کو گولی ماریں۔ یہ تو بڑی مردود عورت ہے۔ ڈیڑھ مہینے سے مختلف جگہوں پر اس کی تلاش میں چھاپے مار رہے ہیں۔ پھانسی کا پھندا اس کا انتظار کر رہا ہے۔" وہی خوشامدی آواز تھی۔ اب کے عاصمہ سے رہا نہیں گیا۔
اس نے دوپٹے کو اچھی طرح چہرے پہ اور سر پر لپیٹا اور ذرا سا دروازہ کھول دیا۔
باہر پولیس والے کھڑے تھے۔ ان کے ساتھ الیاس تھا۔ زلیخا کے چہرے کا رنگ اڑا ہوا تھا۔ آنکھوں کی جادوئی طاقت ناپید تھی۔ اس وقت آنکھوں میں التجا اور بے بسی تھی۔
عاصمہ کو یک گونہ اطمینان ہوا۔
"اپنے شوہر کو قتل کر کے بھاگی ہے یہ۔ پکڑی گئی تھی عین موقع واردات سے مگر بچ نکلی' سارے ثبوت' گواہ اس کے خلاف سب کچھ موجود ہے۔ اب کے نہیں بچ سکے گی۔ چل لگ آگے۔" انسپکٹر غرا کر بولا۔
"سر جی! آپ لوگوں کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ میرا نام تو عذرا ہے۔ آپ عاصمہ بہن سے پوچھ لیں۔ انہوں نے خود چھان بین کر کے مجھے کرائے پر اپنے گھر کا اوپر والا پورشن دیا تھا۔ کیوں عاصمہ بہن.....؟" وہ کانپتی آواز میں اپنائیت بھرے لہجے میں عاصمہ کے ذرا قریب ہونے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔
"الیاس بھائی! میں اس عورت کو جانتی بھی نہیں' یہ زبردستی....." عاصمہ نے اسے نفرت سے دیکھتے ہوئے کہنا چاہا۔
"بہن جی! آپ کو بولنے کی ضرورت نہیں۔ میں کافی ہوں اس عورت سے نپٹنے کے لیے اور دیکھیں آپ کی جان چھڑانے کو اللہ نے کیسا انتظام فرمایا۔ خود سے مدد بھیج دی۔" الیاس اسے تسلی دیتے ہوئے بولا۔
"اب تم خود چل کر آگے گاڑی میں بیٹھوگی یا تمہاری ڈنڈا ڈولی کی جائے۔" پولیس والا فخر سے بولا۔
"سر جی! میں بے گناہ ہوں۔ میں نے کچھ نہیں کیا۔ آپ قسم لے لیں۔ قرآن اٹھوا لیں مجھ سے۔ میں تو....." وہ

اب گڑبڑاتے ہوئے دونوں ہاتھ جوڑے معافیاں مانگ رہی تھی۔

"سر جی! پیشہ ور ہے' ایسے نہیں مانے گی' اس کا علاج کرنا پڑے گا۔" اس نے بندوق کے بٹ سے اسے آگے دھکیلا تو پھر وہ کچھ بول ہی نہ سکی۔

گلی میں ایک' دو لوگوں کے سوا کوئی نہیں تھا۔

تینوں پولیس والے اسے دھکیلتے ہوئے آگے لے گئے۔

ایک پولیس والا واپس آتا دکھائی دیا۔ عاصمہ دروازہ بند کرتی رک گئی۔

"بہن جی! اوپر اس کا سامان ہے اور سر جی نے کہا ہے کہ اوپر کے کمرے ابھی سیل کیے جائیں گے۔" وہ پاس آکر بولا۔

عاصمہ پریشان نظروں سے الیاس کی طرف دیکھنے لگی۔

"آپ پریشان نہیں ہوں۔ میں جاتا ہوں ساتھ۔" الیاس پولیس والے کے ساتھ بیرونی سیڑھیوں سے اوپر چلا گیا۔

عاصمہ فکر مندسی صحن میں ٹہلنے لگی۔ آدھے گھنٹے بعد الیاس نے دروازے پر دستک دی۔

"کوئی گڑبڑ تو نہیں ہے الیاس بھائی!" وہ خوف زدہ سی تھی۔

"اللہ کا شکر ادا کریں۔ اس نے آپ کو بہت بڑی گڑبڑ سے بچالیا ہے۔" وہ گہرا سانس لے کر بولا۔

"کیا مطلب؟" وہ اور بھی پریشان ہو گئی۔

"شام تک پولیس یہاں سے اس کا سارا سامان اٹھالے جائے گی تو اسے کھول دیں گے۔ اس کا سامان کچھ خاص نہیں ہے۔ جادو ٹونے کے کچھ آلات ہیں۔ شاید اپنے قتل والے کارنامے کو چھپانے کے لیے اس نے جادوگرنی کا بہروپ بھرا تھا۔ بہرحال اللہ نے آپ پہ فضل کیا۔ آپ شکر ادا کریں۔"

"شکر ہے اس کی ذات کا۔" وہ آہستگی سے بولی۔ "اس نے کسی بڑی مصیبت سے بچالیا۔"

"فی الحال میں ادھر ہی ہوں۔ جب تک اوپر کا سیل ختم نہیں کیا جاتا میں کہیں نہیں جاؤں گا۔ آپ بالکل پریشان نہیں ہوں گا۔" وہ کہہ کر جانے لگا۔

"بہت شکریہ الیاس بھائی! آپ نے ساتھ دیا تو....."

"اللہ ساتھ دینے والا ہے جی اور بہن جی! آپ بچوں سے اس واقعہ کا ذکر نہ کیجئے گا' چھوٹے سے دل دماغ ہوتے ہیں ان کے۔ وہ ڈر جائیں گے تو اوپر کے پورشن سے خوف کھانے لگیں گے۔" وہ احتیاطاً" بولا۔

"جی بالکل۔ میں سمجھتی ہوں۔ بھائی! آپ کا ایک بار پھر شکریہ۔" وہ سر ہلا کر بولی تو الیاس کچھ کہے بغیر وہاں سے چلا گیا۔

"او میرے پیارے اللہ! ایک بار..... اپنی پوری زندگی میں صرف ایک بار میں پورے خلوص سے تیرے آگے جھکی اور تو نے مجھے اس طرح سے نوازا۔ اس طرح سے میری بے کسی پر رحم فرمایا۔ اگر میں تاعمر تیرا شکر ادا کروں۔ تجھے خلوص دل سے پکارتی رہوں تو..... تو بڑا مہربان ہے' تو بڑا رحیم ہے۔ مجھے بخش دینا اور میرے گناہوں سے سیاہ ہوتے دل کو بھی حق اور یقین کی روشنی سے منور کردے۔"

وہ بالکل رات والے انداز میں پھر خدا کے آگے سجدہ ریز تھی۔

☼ ☼ ☼

"آؤ کھیلیں۔" سیفی نے ہاتھ میں پکڑے فٹ بال کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کرسی پر گم صم بیٹھی مثال سے

کہا۔

"نہیں....." وہ بے نیازی سے بولی۔

"کیوں؟" وہ اس کے پاس آگیا۔

"مجھے نہیں کھیلنا۔" وہ منہ دوسری طرف پھیر کر بولی۔

"وہی تو پوچھ رہا ہوں' کیوں نہیں کھیلنا۔" وہ اصرار سے بولا۔

"میری مرضی۔" وہ اڑیل پن سے بولی۔

"چلو ٹھیک ہے' نہیں کھیلتے۔ ہم باتیں کرتے ہیں۔" وہ صلح جو انداز میں بولا۔

"نہیں۔ مجھے تم سے باتیں بھی نہیں کرنا۔" وہ رکھائی سے بولی۔

سیفی کچھ حیران سا اسے دیکھنے لگا۔

"تم مجھے پسند نہیں کرتیں؟" وہ کچھ پریشان ہو کر بولا۔

"نہیں۔" وہ کھٹ سے کہہ گئی۔

سیفی کا منہ اُتر گیا۔

"کیوں؟" وہ ذرا دیر بعد پھر بولا۔

"میں جواب نہیں دینا چاہتی۔" وہ پکا سا منہ بنا کر بولی۔

"لیکن تم تو مجھے اچھی لگی ہو اور تمہاری ماما بھی مجھے اچھی لگی ہیں۔ شی از ویری نائس۔" وہ نرمی سے بولا۔

"شٹ اپ!" وہ ایک دم غصے میں آگئی۔

"مثال..... میں نے ایسا کیا کہا ہے۔" وہ پریشان ہو گیا۔

"تم کون ہوتے ہو میری ماما کو پسند کرنے والے اور تمہارے پاپا..... تم لوگ یہاں کیوں آئے ہو' جاؤ اپنے گھر جہاں تم لوگ پہلے رہتے تھے۔" وہ غصے میں سرخ چہرہ لیے بولتی چلی گئی۔

اور باہر سے آتی بشریٰ اس کا یہ روپ دیکھ کر حیران سی رہ گئی۔ اس کے پیچھے ذکیہ بھی تھیں۔

"سن لو اپنی بیٹی کے فرمان' انہیں اب یہاں آنے والے مہمان بھی برے لگنے لگے ہیں۔" وہ جتا کر بولیں۔

"مثال میری جان! کوئی گیسٹ سے ایسے کہتا ہے۔" وہ نرمی سے مثال کو اپنے ساتھ لگا کر بولی۔

"مما! میں ان لوگوں کو پسند نہیں کرتی۔" وہ بے لحاظ لہجے میں بولی۔

"کیوں بیٹا! احسن انکل تو بہت اچھے ہیں اور سیفی بھی۔" وہ اس کے بال سنوارتے ہوئے نرمی سے بولی۔

"بٹ..... آئی ڈونٹ لائیک دیم۔" وہ قطعیت سے بولی۔

بشریٰ کچھ کہہ نہ سکی۔ مثال اس سے ہاتھ چھڑا کے اندر چلی گئی۔ سیفی اکیلا بال سے کھیلنے لگا۔

"ابھی سے اس بچی میں خود سری آتی جا رہی ہے۔ تم نوٹ کر رہی ہو بشریٰ؟" ذکیہ خبردار کرنے والے انداز میں بولیں۔

بشریٰ تھکے ہوئے انداز میں کرسی پر بیٹھ گئی۔ کچھ بول ہی نہ سکی۔

☼ ☼ ☼

فوزیہ چلی گئی۔

اور نسیم کے لیے جیسے گھر کیا پورا شہر ہی ایک دم سے سونا ہو گیا۔

پروین اور اس کی لڑکی آتیں۔ لشتم پشتم سارا کام نپٹاتیں۔ دو ٹائم کی ہانڈی چڑھاتیں۔

اکثر شام میں رات کی روٹیاں پکا کر ہاٹ پاٹ میں رکھ کر چلتی بنتیں۔
نسیم موٹے کچے کناروں والی ادھ پکی روٹیوں کو الٹ پلٹ کر دیکھتیں اور انہیں بشریٰ کے ہاتھوں کے پھلکے یاد آنے لگتے۔
ہنڈیا فوزیہ بنا بھی لیتی تو روٹیاں بشریٰ ہی بناتی تھی کہ نسیم کو اسی کے ہاتھ کی روٹی چاہیے ہوتی تھی۔
کچن کا راشن ہفتوں میں نہیں 'دنوں میں بار بار ختم ہونے لگا۔ عدیل تو اکثر ہی رات کا کھانا باہر کھا کر آتا۔ معلوم نہیں کھاتا بھی تھا یا نہیں۔ بس آکر کمرے میں پڑ کر سو جاتا۔
نسیم کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ ہاتھوں کی لگائی گرہیں اب دانتوں سے کیسے کھولیں۔ تھوڑی سی عجلت' تھوڑی سی جلد بازی نے کیسے زندگی کی کایا پلٹ ڈالی تھی۔
ان کے تو چند سال ہی تھے اور برے بھلے کٹ ہی جاتے مگر عدیل کی پوری زندگی.... اگر وہ دوسری شادی نہیں کرتا تو اس کی مجرم نسیم ہی ہوتیں۔ وہ ابھی سے بیٹے سے نظریں چرانے لگی تھیں۔
رشتے والی ان کے کہنے پر تین' چار اچھے گھروں کے رشتے لائی بھی تھی۔ مگر عدیل تو کچھ سننے کے لیے تیار ہی نہیں تھا۔
اور تو اور نسیم کو اب مثال بے طرح یاد آتی اور اس دن تو ان سے صبر ہی نہیں ہو سکا۔ وہ ذکیہ کی طرف پہنچ گئیں مگر وہاں موجود احسن کمال کو دیکھ کر وہ تو جیسے دنگ ہی رہ گئیں۔ مثال گیٹ پر ہی مل گئی تھی۔
"دادو' دادو.... " دوڑ کر وہ نسیم کی ٹانگوں سے لپٹ گئی۔
اور کچھ فاصلے پر احسن کمال کے ہمراہ باہر کی طرف جاتی بشریٰ بے اختیار ٹھٹک کر رکی تھی۔
نسیم نے مثال کو خوب چمٹا چمٹا کر پیار کیا۔
"اپنی نانی کو بلا کر لاؤ مثال! میں نے ان سے بات کرنی ہے۔" وہ وہیں گیٹ پر کھڑے بشریٰ کو دیکھ کر لاتعلق بنتے ہوئے بولیں۔
"دادو! اندر آجائیں۔ اندر بیٹھ کر بات کرلیں۔" مثال بڑے مودب انداز میں میزبان بنی کہہ رہی تھی۔
بشریٰ کو جی بھر کر غصہ آیا۔
"جن کی نسل ہے یہ دیکھنا.... ان ہی پر پڑے گی۔ بے مروت' بے لحاظ' تم لاکھ اسے بھر بھر دودھ کے کٹورے پلاؤ۔ یہ نسل ڈنک مارنے سے باز نہیں آئے گی۔" بشریٰ کو وہیں کھڑے کھڑے ذکیہ کی بات یاد آنے لگی۔
مثال نے بڑے پیار سے دادی کا ہاتھ پکڑ کر انہیں لان میں پڑی کرسی پر بٹھا دیا اور خود نانی کو بلانے چلی گئی۔
بشریٰ آہستگی سے اندر چلی گئی تو احسن کمال خاموشی سے باہر نکل گیا۔ نسیم کے لیے ایک بڑا موقع ہاتھ لگ گیا۔

☼ ☼ ☼

شام تک اوپر والے پورشن کی سیل ختم کردی گئی۔
الیاس نے جلد اچھے کرائے دار لانے کا وعدہ بھی کیا تھا مگر اب وہ واقعی ڈر گئی تھی۔
نیا آنے والا کسی اور ڈھب کا نکل آئے تو پھر وہ کیا کرے گی۔
ابھی تو غیب سے مدد آگئی پولیس کی۔ اگر واقعی کوئی جرائم پیشہ آکر رہنے لگا۔ اسے یا بچوں کو نقصان پہنچا گیا تو.... وہ اکیلی عورت کیا کرے گی۔ وہ اب بہت کچھ سوچنے لگی تھی۔
"ممّا! اب آپ ایسے کسی کو گھر میں نہیں گھسنے دیں گی اور دروازہ تو بغیر پوچھے دیکھے بالکل نہیں کھولیں گی۔" واثق اسے تاکید کر رہا تھا۔

مگر وہ اپنے ہی دھیان میں گم تھی۔
"ممّا! وہ علی کے ماموں نے پھر پیغام بھیجا تھا کہ اپنی 'ممّا سے کہو وہ آکر ہمارا اسکول جوائن کرلیں۔" وہ پھر سے ماں کو متوجہ کرنے کو بولا۔
"واثق! خاموش ہو جاؤ' جتنی تمہاری عمر ہے نا اتنی بات کیا کرو۔ جب میں تمہیں منع کرچکی ہوں' مجھے اس جگہ جاب نہیں کرنی تو.... اور کان کھول کر سن لو۔ آئندہ کسی کے سامنے اپنی مجبوریوں کے رونے نہیں رونا۔ یہ دنیا بہت دھوکے باز ہے۔ بہت سے جال ہیں اس کے پاس سنا تم نے.... " وہ ایک دم سے اس پر برس پڑی۔
واثق پریشان سا ماں کی شکل دیکھتا رہ گیا۔
یہ بات عاصمہ کو بھی آج ہی سمجھ میں آئی تھی کہ اپنی مجبوریوں اور بے بسی کا حال ہر کسی سے نہیں کہنا چاہیے۔ حتیٰ کہ الیاس سے بھی نہیں۔ خالہ حمیدہ سے بھی نہیں۔ ہر ایک کے ساتھ ایک فاصلہ ضروری ہے۔ سننے کے لیے اس کا اللہ موجود ہے تو پھر ادھر ادھر کسی دوسرے سے کیوں کہتے پھریں۔ وہ جو اس کے دل کا حال جانتا ہے' اب اسے کسی اور رازدار کی ضرورت نہیں۔
وہ فیصلہ کرکے مطمئن انداز میں اٹھ کر اندر چلی گئی۔

☼ ☼ ☼

"یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں امی؟" بشریٰ کے لیے یہ بات کسی جھٹکے سے کم نہیں تھی۔
"اب کیا اس پر بھی انکار کروگی۔" وہ طنزیہ لہجے میں بولیں۔ بشریٰ کو بہت برا لگا۔
"تو آپ کے خیال میں مجھے اقرار کرلینا چاہیے جھٹ سے۔" وہ ناگواری سے بولی۔
ذکیہ بیٹی کی شکل دیکھتی رہ گئیں۔
"انکار کروگی تو میں سمجھوں گی تمہیں کفران نعمت کی عادت پڑگئی ہے۔" وہ جتا کر بولیں تو بشریٰ کچھ کہہ ہی نہ سکی۔
"بہرحال احسن کمال نے ابھی پروپوزل دیا ہے۔ وہ تم سے بھی بات کرے گا۔ بشریٰ! میرے خیال میں اس سے اچھا رشتہ اور نہیں ہوگا۔ یوں تو طارق والے پروپوزل میں بھی کچھ کمی نہ تھی۔ لیکن یہ تو اپنے گھر کی بات ہے۔" ذکیہ نرمی سے بولیں۔
"امی! جب مجھے شادی کرنی ہی نہیں۔" وہ زچ کر بولنے لگی۔
"میری بچی! جلد بازی نہیں کرو۔ خدا ایسی کرم نوازیاں ہر کسی پر نہیں کیا کرتا۔ آج اس نسیم کا حلیہ دیکھا تھا تم نے۔"
بشریٰ کچھ نہیں بولی کہ اس موضوع پر بات کرنا بہت تکلیف دہ تھا۔
"عدیل دوسری شادی پر راضی نہیں۔ اس نے اپنی ہر آس صرف مثال سے جوڑ رکھی ہے اور مثال کو آج تم نے دیکھا۔ کیسے وہ بچی دادی کے آگے بچھی جاری تھی۔ بیٹا! ناخنوں سے ماس جدا نہیں ہوسکتا۔ تم لاکھ اپنا سب کچھ اس بچی کے لیے نچھاور کردو تو بھی یہ ددھیال سے دور ہوگی' نہ باپ کی محبت کو نظر انداز کرسکتی ہے۔ تم سوچ لو اس لاحاصل تپسیا میں تمہارے ہاتھ کیا آئے گا۔" ذکیہ رک' رک کر بول رہی تھیں۔
"اس بچی کے لیے سب کچھ تیاگ دوگی۔ یہ کل کو جوان ہو کر باپ کے ساتھ چلتی بنی۔ میری زندگی تو بجھتا چراغ ہے اور عمران.... اس کی طرف سے میں تمہیں کوئی گارنٹی نہیں دے سکتی۔ وہ دل چاہے تمہارا اپنے۔ ورنہ آج گھر میں بیوی آئی تو وہ اس کا ہو جائے گا۔"

بشریٰ کی آنکھوں میں نہ چاہتے ہوئے بھی نمی آگئی۔ ذکیہ نے اس کی لاچاری کا نقشہ ہی کچھ ایسا کھینچا تھا۔

"میری بیٹی! میری زندگی میں پھر سے اپنے گھربار کی ہوجاؤ گی تو میں سکون سے آنکھیں بند کرسکوں گی۔ یوں طلاق کے بعد ایک بھی رشتہ خود سے آجائے تو فی زمانہ اسے معجزہ سمجھا جاتا ہے اور اللہ نے تمہارے لیے دو، دو رشتے بھیجے ہیں۔

میں نے انسپکٹر طارق کو بھی صاف جواب نہیں دیا لیکن میری مانو تو احسن کمال جیسا رشتہ کسی بھی طرح ٹھکرانے کے لائق نہیں۔ تم سوچو اور خوب ٹھنڈے دل اور دماغ سے غور کرو۔ بہت جلدی نہیں۔ ابھی وہ گھر ڈھونڈ رہا ہے اور پھر دیکھو! اس رشتے میں تو ماں، بہن والی کوئی چخ چخ بھی نہیں۔ ان چڑیلوں کی وجہ سے پہلے تمہارا بسا بسایا گھر اجڑا۔ انسپکٹر طارق کی تو پھر ماں سلامت ہے اور ہم کسی کی زندگی کی کمی کی دعا کیوں مانگیں۔ بہرحال تم سوچ لو۔"

بشریٰ کی خاموشی کو نیم رضامندی جانتے ہوئے ذکیہ کہہ کر اٹھیں اور باہر نکل گئیں۔

اور سچ بات تو یہ ہے کہ صبح والا منظر بشریٰ کی نظروں میں جیسے جم سا گیا تھا۔ مثال جس طرح دادی سے لپٹی تھی پھر انہیں کرسی پر بٹھا کر نانی کو بلانے گئی راستے میں کھڑی ماں کو نظر انداز کرکے۔

"میں مثال پر جتنی بھی اپنی زندگی قربان کردوں یہ باپ اور دادی کو نظر انداز نہیں کرسکتی۔ انہیں فراموش نہیں کرسکتی۔ پھر میں کیا کروں عدیل کی جگہ کسی اور کو..... وہ بھی احسن کمال ایک نکتہ چین انسان جس کے ساتھ منگنی کا ایک ناخوشگوار عرصہ بھی وہ گزار چکی تھی۔" اس نے نڈھال ہوکر آنکھیں بند کرلیں۔

وہ ابھی کچھ بھی نہیں سوچنا چاہتی تھی۔ مگر اس کے باوجود سوچے جارہی تھی کہ ان دس بارہ دنوں میں احسن کمال کی وجہ سے اس کی زندگی ایک دم سے بدل سی گئی ہے۔

اسے اب عدیل بہت کم یاد آتا تھا۔

اسے اپنے ساتھ ہونے والے سانحے سے پہنچنے والے زخم کی ٹیسیں بہت کم محسوس ہوتی تھیں۔ اسے بار بار خود اذیتی کا احساس بھی بہت کم ہونے لگا تھا۔

وہ بہت کچھ جو بہت برا تھا۔ بھولنے لگی تھی۔ اور اس میں سارا کمال احسن کمال کا تھا۔

احسن کمال بہت بدل گیا تھا۔ اس نے اتنے سارے دنوں میں ایک بار بھی اسے نہ عدیل کے حوالے سے کچھ کہا تھا، نہ پوچھا تھا۔

نہ اس کی آئندہ زندگی کا کوئی خوفناک ڈراوا دیا تھا۔ وہ گھر کے سروے کے دوران اسی کی رائے کو مقدم رکھ رہا تھا۔

کل اس نے اس کے ساتھ فرنیچر دیکھنے جانا تھا۔ گھر وہ فائنل کرچکے تھے۔ ایسا گھر جس کا خواب بشریٰ نے عدیل کے ساتھ سوچا تھا مگر جسے خرید احسن کمال رہا تھا۔

اور جس میں اسے تو نہیں رہنا تھا مگر پھر بھی وہ بہت خوشی سے اس کی ڈیکوریشن، تزئین و آرائش کے لیے پرجوش تھی۔ کیوں...؟

☼ ☼ ☼

"میں جانتا ہوں۔" عدیل نے نسیم کی مرچ مسالے سے گھڑی کہانی سننے کے بہت دیر بعد کہا بھی تو یہ مختصر سا جملہ۔

"کیا... یعنی وہ اس لڑکے کے ساتھ گلچھرے اڑاتی پھر رہی ہے اور....."

"امی! وہ نہ اب میری بیوی ہے، نہ میرا اس سے کوئی تعلق ہے تو بہتر ہے وہ جو بھی کررہی ہے اسے کرنے دیں کہ اس کی ذاتی زندگی سے اب مجھے کوئی سروکار نہیں۔" وہ تو ایک دم سے جیسے برف کی سل بن گیا تھا۔

"تیری لڑکی کی ماں تو ہے نا۔ کیا تربیت کرے گی وہ اس کی۔ یہ نہیں سوچتے تم۔" نسیم نے عدیل کی کمزوری کو چھیڑا۔

وہ لمحہ بھر کو چپ ہوگیا۔

"میں آج کل میں کیس فائنل کروا رہا ہوں مثال کی کسٹڈی کے لیے اگر بشریٰ دوسری شادی کرلیتی ہے تو یہ بات میرے حق میں اور بھی اچھی ہوگی۔ اس طرح مثال کے مجھے ملنے کے چانسز بڑھ جائیں گے اور مجھے بشریٰ کی دوسری شادی کا بہرحال انتظار تھا۔" وہ کہہ کر اٹھ کر چلا گیا۔

اس کا ردعمل نسیم کی توقع کے برعکس تھا۔

"مثال تو اس کے حواسوں پر چھا گئی ہے، اس چھٹکی کی فکر ہے اور اپنی زندگی کی کچھ فکر نہیں کہ اس کا بھی کچھ کرنا ہے۔" وہ بڑبڑانے لگی۔

"اگر بشریٰ شادی کرلیتی ہے اور مثال یہاں آجاتی ہے تو اس کو سنبھالے گا کون..... اور یہ عدیل پھر تو کبھی دوسری شادی نہیں کرے گا۔ یااللہ! میں کیا کروں، یہ فوزیہ بھی اتنی دور جا کر بیٹھ گئی۔" وہ سخت پریشان تھیں۔

☼ ☼ ☼

"میں جانتا ہوں جس طرح میں نے تم سے منگنی کی اور پھر جس طرح غلط طریقے سے توڑ کر چلا گیا اور منگنی کے دوران میں تمہیں پریشان کرتا رہا۔ تمہارے دل میں میری جگہ بہت پسندیدہ نہیں۔" دونوں چاند کی چاندنی میں باہر لان میں بیٹھے کافی پی رہے تھے۔ جب احسن کمال نے ایک دم سے کہنا شروع کردیا۔

"ان دنوں میرے لیے کچھ بھی اہم نہیں تھا۔ میری ترجیحات ہر روز بدلتی تھیں۔ تم مجھے بہت اچھی لگتی تھیں مگر جب تم منگنی کے بعد میری دسترس میں آگئیں تو میں نے تمہیں تنگ کرنا شروع کردیا۔ کبھی کسی بات پر، کبھی کسی بات پر اور میں دل میں توقع کرتا تھا کہ تم مجھ سے لڑو گی اور پہلے کی طرح ری ایکٹ کرو گی مگر تم تو مجھ سے مزید دور ہوتی چلی گئیں اور میں اس ضد میں تمہیں اور ستاتا کہ ایسے میں نازیہ آئی۔

ان دنوں گرین کارڈ کس کا خواب نہیں تھا۔ میں نے اس غیر متوقع تحفے کو خدائی نعمت سمجھا اور فوراً" سے پیشتر اپنی ترجیح بدل دی۔ میں نے صرف اپنے لیے سوچا اور پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔

لیکن یقین کرو اور اس یقین کو دلانے کے لیے میرے پاس کوئی ثبوت نہیں۔ نازیہ بھٹی جس احسن کمال کو اپنے ساتھ امریکا لے کر گئی، وہ کوئی اور احسن کمال تھا۔ اصل والا احسن تو پیچھے کہیں تمہاری معصوم صورت کے ساتھ بندھا رہ گیا۔

بشریٰ! مجھے وہاں جا کر معلوم ہوا، میں تو تمہارے عشق میں گرفتار ہوچکا ہوں۔ پھر اس کے بعد آنے والے ہر مہینے، سال، ہفتے، دن، گھڑیاں اس عشق کو بڑھاتی چلی گئیں اور میں بے بس ہوتا چلا گیا۔"

وہ کہتا جارہا تھا اور بشریٰ کسی بت کی طرح ساکن بیٹھی تھی۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاءاللہ)

سعدیہ عزیز سعدی

محبت اور مادیت

کبھی کبھی اندرونی خواہش اتنی زور آور ہو جاتی ہے کہ ہمارے قدم اس سمت کی طرف اٹھنے لگتے ہیں جو ہماری منزل نہیں ہوتی..... لیکن یہ دل بڑا ہی ضدی ہے جو آنکھوں میں دھڑکتے ہوئے انہی بے سمت راستوں کو کھوجنے لگتا ہے۔

ایک لاحاصل سفر!

میں نے آسمان پر بکھری نارنجی شعاعوں کے جال کو دیکھا اور طویل مدت گزرنے کے باوجود بھی مجھے یاد نہیں کرنا پڑا کہ سرمئی شام میں وہ اپنے ایزل و کینوس کے ساتھ کہاں ہوگی۔

ہاں وہ وہیں تھی ندی کے کنارے۔

کینوس پر اپنا دکھ رقم کرتی، تصویروں کو کرب و الم کا پیراہن اوڑھا کر سکون ڈھونڈتی۔ اپنے اور اس کے درمیان بظاہر چند قدموں کے فاصلے کو پاٹنے کے لیے میں نے لڑکھڑاتے قدموں کو مضبوط کرنے کی ناکام سی کوشش کی۔

"ابھی تک رنگوں سے کھیلنا چھوڑا نہیں تم نے؟"

میں نے زرد پتوں کی شاخوں کے سائے تلے کھڑی اس لڑکی کو مخاطب کیا جس کے چہرے پر غروب ہوتے سورج سے کہیں زیادہ ملال کے رنگ بکھرے تھے۔

وہ چونکی نہیں، سر گھما کر ذرا کی ذرا میری جانب دیکھا اور دوبارہ تصویر میں رنگ بھرنے لگی۔ مجھے اپنا آپ اس پھول کی مانند لگا جس کو مرجھانے کے بعد پھینک دیا جاتا ہے۔

"پوچھو گی نہیں..... میں کب آیا؟"

میں نے دوبارہ اس کی سماعتوں پر دستک دے کر بے تو جہی بر دہائی دی۔

"جس ہستی کا زندگی میں آنا، ناممکنات میں سے ہے تو پھر مجھ جیسی حقیقت پسند لفظوں کو منافقت کی پوشاک کیوں کر پہنائے گی آزر خان؟"

گھاس سے ڈھکی وادی کو ایک نظر دیکھتے ہوئے اس کا برش پھر چلنے لگا۔ جذبات کی ہلکی سی چنگاری بھی اس کے لہجے میں نہ سلگی اور یہی چیز میرے اندر بھانبڑ لگا گئی۔ جلنا اسے چاہیے تھا مگر وہ پرسکون تھی۔ راحت میرا مقدر ہونا چاہیے تھی مگر میں ہر لمحہ بھٹی میں جھلس رہا تھا۔

"امیزنگ! تم ابھی تک محبت جیسے سراب کے پیچھے بھاگ رہی ہو؟"

میری آواز میں حسرت انگڑائی لے کر بیدار ہوئی یا میں نے چند لمحوں کے لیے خود کو اس خود ساختہ مقفل سے آزاد کیا، میں نہیں جانتا.....

اس کا متحرک ہاتھ ساکت ہو گیا۔ وہ میری جانب گھوم آئی۔

"محبت تن اور من کی جنگ ختم کر کے روح تک کو سیراب کر دینے کا نام ہے، محبت سے کیونکر منکر ہو جائیں، اللہ سوہنا تو محبت ہے۔ کیا آپ اس کے نہ ہونے کی گواہیاں دیں گے؟"

پتھریلے تاثرات اور سپاٹ آواز میرا اندر تک کپکپا گئی مجھے لگا جیسے میرے جسم پر کسی نے بڑی بڑی آئس کیوبز رکھ دی ہوں۔

یوں ہی بہت سے لمحے ماضی کی وسیع گود میں جا گرے۔

"آج بھی تمہارے نزدیک زندگی کی سمت جانے والے تمام راستے محبت کے محتاج ہیں۔" میری آواز سرگوشی میں تبدیل ہو گئی..... میں اپنے عمل میں جھوٹا جو تھا۔

برش رکھ کر اس نے کرسی کی پشت سے سر ٹکا کر آنکھیں موندلیں اور میں چپ چاپ اس کی لرزیدہ پلکوں کو دیکھنے لگا۔

"ہوں..... محبت کے بنا آج بھی وجود بے معنی ہے محبت کل، جو ٹھہری اور اس کل کا ایک فیصد بھی مل جائے تو وجود مکمل ہو جائے..... میں اور ذات کے مہیب جالے اتر جائیں لیکن....."

وہ چپ سی ہو گئی، اس کی آنکھوں میں نمی گہری ہونے لگی۔

"لیکن کیا.....؟"

"لیکن اب انسان بدل گیا ہے اس کی ترجیحات بدل چکی ہیں، پہلے محبت ہمہ وقت مجھے ہنسایا کرتی تھی لیکن اب بے حرمتی محبت میری نم آنکھوں کو خشک نہیں ہونے دیتی آزر خان۔" آنسو تواتر سے اس کے رخساروں کو بھگونے لگے۔ میرے ضمیر نے مجھے لتاڑنا چاہا مگر میں نے ڈپٹ دیا۔

"پتا ہے آزر! مجھے ان دنوں اپنے بچپن کا زمانہ بہت یاد آنے لگا ہے۔" لبوں پر نرم مسکراہٹ نے چھب دکھلائی اور بڑی بڑی آنکھیں زمین میں کچھ ڈھونڈنے لگیں۔ لہجہ وہی محبتوں سے لبریز۔

"ہم زمین میں بیج بویا کرتے تھے جس کے ثمر سے نسلوں کو مستفید کرنے کی خواہش تھی، پتا ہے میں اس مٹی کی سوندھی خوشبو اپنے اندر اتار کر کس قدر خوش ہوا کرتی تھی، اس مٹی کے تن من پر شبنمی قطروں کی پھوار ایسے برستی جیسے کسی چہرے پر عاجزی کا نور..... وہاں فصل محبت کاشت ہوتی اور..... اور محبت کے سنہری پنجرے میں مقید ہم کتنی بھلی زندگی گزارا کرتے تھے..... ہے ناں؟"

خواب آگیں لہجے میں کہتی وہ میری آنکھوں میں دیکھتی تائید چاہ رہی تھی۔ میں نے زور سے اپنے لبوں کو بھینچ لیا۔

"پھر رفتہ رفتہ زمانے کے طریق نے اس پر اپنا اثر کیا، دنیاوی مال و دولت اور مادیت کی سختی نے نرمی کو نگل لیا، وہ مٹی اتنی سخت ہو گئی اور ایسے بجنے لگی جیسے لوہے پر ہتھوڑا..... محبت کے اس شہر کو جو اس وقت تک "ثمر آور" اور ہریالی قائم رکھ سکتا تھا جب تک ہم مادیت کے گرم پانی سے خود کو جھلسنے سے محفوظ رکھ سکتے ..... اور ہم نے خود اپنے ہاتھوں سے سب برباد کر دیا اور بدقسمتی دیکھیں..... افسوس تک نہیں ہمیں..... محبت سرنہیوڑائے چپکے سے دنیا سے کوچ کر گئی..... آپ نے جاتے ہوئے دیکھا تھا ناں؟"

میرا دل چاہا چلا، چلا کر کہوں ہاں، ہاں میں نے دیکھا، اسی کارواں میں تو میں شامل تھا لیکن مرد بھلا اعتراف کب کرتا ہے۔ سو میں بھی نہ کر سکا۔ اس نے بلاوجہ پہلے سے درست شدہ شال کو دوبارہ ٹھیک کیا اور اٹھ کھڑی ہوئی..... اسے اضطراب ایسے چمٹا تھا جیسے سامنے سبک رو ندی کے کناروں پر سبز کائی۔

"اتنی زود رنج نہ بنو ماہین! تمہارے ساتھ شادی سے انکار تمہارا دل دکھانا نہ تھا، دیکھو ہر انسان زندگی میں چند ترجیحات متعین کرتا ہے اور میری ترجیحات میں سرفہرست اس سسکتی بلکتی زندگی سے نجات تھی جو نمرہ سے شادی کر کے میں نے حاصل کر لی۔ اس لیے چاچو کو انکار کر دیا۔ آج دولت شہرت اور عزت سب کچھ ہے اور یہ میرے دل کی خواہش سے ہے ماہین!"

بڑے طمطراق سے سورج کی دم توڑتی کرنیں اس کے پرحزین چہرے سے کھیل رہی تھیں۔ عین اس

کے سامنے کھڑے ہو کر میں نے "سچ" کو ایک زوردار طمانچہ مار دیا تھا۔

"دل کو درمیان میں مت لائیں آزر!"

ترشی سے کہتے ہوئے اس نے ایک کنکر ندی میں پھینکا ارتعاش ایسے ہوا جیسے اس کا چہرہ میری بات پر چٹخا تھا۔

"دل..... ہونہہ۔" وہ طنزیہ ہنسی۔

"آج آپ جس مقام پر ہیں ناں' یہ نفسانی خواہشات کی بدولت ہے تو پھر دل پر الزام کیوں؟ جانتے ہیں دل اور نفس کے درمیان جارحانہ جنگ ہوتی ہے اور فتح اسی کو نصیب ہوتی ہے جو حاوی ہو جائے اور جو انسان نفس کی سرکش موجوں پر ایمان و محبت کا بند باندھ دے تو اس کا دل "مسکن خدا" ہوا کرتا ہے اور اگر دل پر نفس غالب آجائے تو صنم کدہ بنتے دیر نہیں لگا کرتی..... افسوس آپ کا دل چھوٹی چھوٹی خواہشات کا صنم کدہ بن کر لذت گناہ میں لتھڑ چکا ہے۔ آپ کے اندر سے محبت بے جان سے کانپ کر مر چکی ہے۔" وہ میرے دل کی موت پر نوحہ کناں تھی اور میں بالکل منجمد اسے دیکھ رہا تھا۔ مجھے محسوس ہوا خود میں نے اپنے نفس کے ہاتھوں محبت کی کونپلوں کو اجاڑا ہے۔ ناجانے آج میری یادداشت اتنا کیوں کام کر رہی تھی۔ میں سمجھا تھا سب بھول گیا لیکن نہیں ..... وہ مجھے اکثر کہا کرتی تھی۔

"نفس محبت کو ایسے بکھیرتا ہے جیسے آسمان سے ٹپکتی ننھی منی بوندوں کو تیز ہوا۔" تھوڑی دیر بعد میرے ضمیر پر پھر مادیت پرستی کا رنگ گہرا ہونے لگا۔ جس کو کہتے میں نے سنا۔

"میرا فیصلہ غلط ہوتا تو میں آج اتنا خوش نہ ہوتا' ہر لحاظ سے قابل رشک زندگی گزار رہا ہوں کیا تم کو نہیں لگتا؟"

چڑیا کے جوڑے کو درخت کی کھوہ میں بیٹھے دیکھ کر میں نے بے ساختہ اک غلط سوال پوچھ لیا۔

"خوش.....؟ ہوں' آپ بہت خوش ہیں' بہت خوش۔"

ایک گہری نگاہ ڈال کر وہ بے بسی سے مسکرائی مجھے یقین ہونے لگا وہ میرے زر پرست چہرے کے پیچھے اصل چہرے کو جانتی ہے۔ میں نے رخ موڑ لیا۔ خاموشی شام کی طرح گہری ہونے لگی۔

"کافی پئیں گے۔" میں خاموش رہا۔

اس نے تھرماس سے کافی نکال کر ایک کپ میری طرف بڑھا دیا اور اپنا کپ لے کر ندی کے کنارے بیٹھ گئی۔

"محبت میں اتنا نہ ڈوبو کہ سطح تک آنا ممکن نہ رہے ماہین!"

ندی کے شفاف پانی سے جھانکتے اس کے عکس کو جس کو میں چاہتا تو ایک غریبانہ فیصلہ کر کے اپنا بنا سکتا تھا' نظریں چرا کر تنبیہہ کی۔

"اگر صرف آپ کی محبت پہ "مادیت" کی تہہ چڑھتی تو آج میرے دل کی فصیلوں میں تنہائی ٹکریں مار کر شور نہ مچاتی' ایک طوفان' جو متاع حیات لے گیا نہ لے کر گیا ہوتا' میرا جسم محبت کے نام پر سود و زیاں دیکھ کر ہی کھوکھلا ہو گیا ہے۔ کبھی محبت بین کرتی ہے محبت اتنی "ارزاں" تو نہ تھی پھر ایسا کیوں ہوا آزر خان؟" اس کے چہرے پہ موتی بکھرنے لگے۔

وہ اس شخص سے سوال کر رہی تھی جس نے تمام جوابوں کو ایک سنہری پوٹلی میں بند کر کے مادیت کے تیز دریا میں بہا دیا تھا۔

ہاں میں نے دنیاوی آسائشات کے لیے روح کو بیچ دیا تھا۔ میں اہل دنیا کی نظر میں ایک بڑا انسان تھا لیکن ظرف مفقود.....

مرد بھلا اعتراف کرتا کب اچھا لگتا ہے؟

میں نے ندی کے کنارے اشک بہاتی سورج کی اس روپہلی کرن جیسی پاکیزہ اور "محبت" سے گندھی لڑکی کو دیکھا اور تھکے تھکے قدموں سے "آشیانۂ محبت" سے نکل کر ان ہی بے دل لوگوں میں شامل ہو گیا جن کے محبت سے مبرا دلوں پر وہ نوحہ کناں تھی۔

مادیت پرست جو ٹھہرا۔

✡

WWW.PAKISTAN.WEB.PK

کیلی فورنیا ہائی وے پر "مہریز خان" نامی ایک نوجوان کا ایکسیڈنٹ ہوگیا ہے۔ آفیسرز کے مطابق اس نوجوان کے زندہ بچنے کے امکانات کم ہیں۔

مہریز خان اپنے والدین کی اکلوتی اولاد ہے۔ روڈ ایکسیڈنٹ میں اس کے والدین کی وفات ہوچکی ہے۔ اب وہ کیلی فورنیا میں اپنے پرانے اور بااعتماد ملازم جیری کے ساتھ رہتا ہے۔ رضا اس کا دوست ہے۔ مہریز کا اس کے گھر بھی آنا جانا ہے۔ رضا کی چھوٹی بہن عنبر کو وہ بھی اپنی بہن سمجھتا ہے۔

رامین ایک مغموم و معصوم لڑکی ہے۔ ماں کے ظلم کی وجہ سے ہر وقت وحشت زدہ رہتی ہے۔ ماں کے انتقال پر اس کی پھوپھیاں آمنہ بیگم اور قدسیہ بیگم اسے سنبھالتی ہیں۔ تایا شفیق الرحمان اسے اپنے ساتھ لے جانے پر اصرار کرتے ہیں مگر وہ منع کردیتی ہے۔

رامین اور مہریز کے درمیان اسکول کے پہلے دن سے ہی خوب اچھی دوستی ہوجاتی ہے۔ پھر حسن بھی ان کے ساتھ شامل ہوجاتا ہے مگر ایک دن رامین کے والد اسے مہریز اور حسن کے ساتھ باتیں کرتے دیکھ کر بہت سختی کرتے ہیں۔ اس دن کے بعد سے رامین ان دونوں سے کھنچ جاتی ہے۔ میٹرک تک آتے آتے رامین کی سرد مہری کے باوجود مہریز اس کو پسند کرنے لگتا ہے۔

مطیع الرحمان اور صبیحہ بیگم کے دو بیٹے شفیق الرحمان اور عبید الرحمان اور بیٹیاں آمنہ بیگم اور قدسیہ بیگم ہیں۔ لاڈلی بیگم، مطیع الرحمان کی چھوٹی بہن ہیں اور صالحہ بیگم، صبیحہ بیگم کی چھوٹی بہن ہیں جو بیوہ اور تین بچوں کی ماں ہیں۔ صبیحہ بیگم اپنے میاں کی رضامندی سے انہیں اپنے ساتھ رکھ لیتی ہیں۔ ان کی بہت سگھڑ مگر قدرے عام صورت بیٹی گل ناز کو صبیحہ بیگم عبید الرحمان کے لیے لینے کا ارادہ رکھتی ہیں۔ گل ناز بھی عبید الرحمان کو پسند کرتی ہے۔ دوسری طرف لاڈلی بیگم کی خواہش ہے کہ عبید الرحمان کے لیے ان کی بیٹی طوبیٰ کو لیا جائے۔ صبیحہ بیگم بہت ہوشیاری سے مطیع الرحمان اور اپنی ساس کو گل ناز کے حق میں راضی کرلیتی ہیں۔

آماسیہ خان

دوسری قسط ۲

فرح ایک ہفتے کے لیے اپنے والدین کے ساتھ عمرہ کرنے گئی ہوئی تھی۔ رامین کو میتھس Quadratic theorems سمجھنے میں کافی دقت کا سامنا تھا۔ گھر میں یکسوئی سے پڑھائی نہیں کی

جاسکتی تھی۔ وہ اکثر اوقات اپنا ہوم ورک ورک اسکول آکر مکمل کیا کرتی تھی۔ بریک کے بعد میتھس کا پیریڈ تھا اور اس کا کام ابھی تک باقی تھا۔ کچھ سمجھ میں ہی نہیں آرہا تھا' کیسے کرے؟ وہ پریشان سی کاریڈور کی سیڑھیوں پر بیٹھی ادھر ادھر دیکھ رہی تھی۔

مہریز اس کے سامنے سے گزرا تو رامین نے اسے آواز دے کر روک لیا۔ وہ فوراً" اس کے پاس چلا آیا۔

"ہاں بولو؟" وہ تھوڑا جھجک رہی تھی۔ اپنے سلوک کے پیش نظر اسے توقع نہیں تھی کہ مہریز اس کی مدد کرے گا لیکن دو دن پہلے لائبریری میں دی گئی تسلیوں نے تھوڑی ہمت بندھائی تھی کہ وہ اسے مدد کے لیے بلا رہی تھی۔ "مجھے یہ formula Quadratic کی ذرا سمجھ نہیں آرہی... میرا تھیورم بھی رہتا ہے۔ مجھے سمجھا دو گے پلیز؟" اس نے اپنے مزاج کے بالکل برعکس نرمی سے التجا کی۔ مہریز نے اپنی گھڑی میں وقت دیکھا۔

"دیکھو... بریک ختم ہونے میں پانچ منٹ رہتے ہیں۔ میں اپنا جرنل لاتا ہوں۔ تم فی الحال اسے کاپی کرلو اور ٹیچر کو ہوم ورک سب مٹ کروادو... میں تمہیں کل گیمز کے پیریڈ میں سمجھادوں گا۔"

وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ مہریز نے ہمیشہ کی طرح چٹکی میں اس کا مسئلہ حل کیا تھا۔ رامین نے اس کا شکریہ ادا کرنا چاہا مگر وہ اپنا جرنل لانے جاچکا تھا۔

اگلے دن مہریز نے اپنے قول کے مطابق اسے تھیورمز حل کرنا سکھائے۔ وہ نہایت سنجیدگی سے اسے ایک ایک بات سمجھا رہا تھا۔ اس کی نظریں کتاب کے علاوہ کہیں نہیں بھٹکی تھیں۔ سارا فارمولا سمجھانے کے بعد اس نے رامین کو اپنا رف رجسٹر تھمایا اور کہا۔

"کلاس اور ہوم ورک میں کیے گئے سارے تھیورمز اس میں لکھے ہیں۔ تم اسے گھر لے جاؤ اور ان سے ہیلپ لے کر پریکٹس کرو۔

اوکے... میں جارہا ہوں... مزید کوئی اور ہیلپ چاہیے ہو تو بلا جھجک بتادینا۔" مہریز اپنا بیگ اٹھا کر اپنے دوستوں کے پاس چلا گیا۔ اس کے جانے کے کچھ ہی دیر بعد رامین کو یاد آیا کہ اسے بائیولوجی کے بھی نوٹس چاہییں تھے۔ وہ اپنا پین بند کرکے اٹھی اور نپے تلے قدموں سے باسکٹ بال کورٹ سے گزر کر اس کے سامنے پہنچ گئی۔ مہریز اور کچھ لڑکوں کا گروپ پول سے ذرا آگے کھڑا باتوں میں مصروف تھا۔ رامین کچھ دنوں سے مہریز کے دیکھنے پر گڑبڑا سی جاتی تھی۔ حالانکہ زیادہ تر وہ نظریں جھکائے رکھتا تھا' مگر جب اٹھاتا تو...

وہ کچھ جھجکتی ہوئی اس سے بات شروع کرنے ہی والی تھی کہ سب لڑکے اکٹھے آگے بڑھنے لگے۔ ان کے سامنے مہریز بھی چلنے لگا۔ رامین الٹے قدموں پیچھے ہٹتی رہی اور بات بھی کرتی رہی۔ پھر جیسے ہی وہ اپنی بات ختم کرکے تیزی سے مڑی' اس کا سر پول سے ٹکرا گیا۔ جہاں اس کی آنکھوں کے آگے یکدم اندھیرا چھایا۔ وہیں سب لڑکوں کے بے اختیار قہقہے بلند ہوئے۔ رامین نے زور سے اپنا سر جھٹک کر دن میں نظر آتے تاروں کو رقص کرنے سے روکا تھا۔ اتنے قہقہوں کے بیچ میں فقط ایک شخص کی نرم آواز اس کی خیریت دریافت کررہی تھی۔ اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ مہریز لب بھینچ کر اپنی مسکراہٹ چھپانے کی ناکام کوشش کرتا اس کے پاس کھڑا ہو کر اس کا حال چال پوچھ رہا تھا۔

"ہوں... ہاں۔" وہ بمشکل کہتی آگے بڑھ گئی۔ وہ شرمندہ تھی لیکن ہنسی تو اسے بھی آرہی تھی۔

یہ واقعہ یاد آتے ہی مہریز مسکرانے لگا۔ کیسی پگلی تھی وہ... ہر کام میں تیزی دکھاتی... اپنی خوب صورتی سے بے خبر... سیدھی سادی سی...

اسکول کو آرڈینیٹر آنے والے تھے۔ پورے اسکول میں تیاریاں زور و شور سے جاری تھیں۔

وزٹ والے دن وہ سب سینئر پریفیکٹس ہائی الرٹ تھے۔ خیر خیریت سے پورے اسکول کا چکر لگا لینے کے بعد جیسے ہی کو آرڈینیٹر' پرنسپل اور وائس پرنسپل اور سب ٹیچرز کے ساتھ ہال کے اندر گئے۔ ان لوگوں نے سکھ کا سانس لیا۔ تمام جونیئر پریفیکٹس کو ان کی ڈیوٹیز پہلے ہی بتادی گئی تھیں۔ وہ سب متعلقہ کلاسز میں جاچکے تھے۔ اب یہ لوگ سکون سے ہال کے باہر کھڑے آپس میں باتیں کررہے تھے۔ رامین دیوار سے ٹیک لگائے کھڑی تھی۔ جلال اور آصفہ ہیڈ بوائے اور ہیڈ گرل تھے۔ انہوں نے وہ گلدستے اور ہار اٹھا کر اسٹاف روم میں رکھنے جانا تھا۔ جو کو آرڈینیٹر کو استقبالیہ میں پیش کیے گئے تھے۔ پتا نہیں جلال کو ایک دم کیا سوجھی۔ اس نے ایک کھلا ہوا گلاب گلدستے سے کھینچ کر باہر نکالا اور رامین کو جاکر پیش کردیا۔

"دس از فار یو۔"

وہ حیرانی سے اسے دیکھنے لگی۔ وہ جانتی تھی کہ تمام لڑکے اس کی سخت طبیعت کی وجہ سے اس سے خار کھاتے ہیں۔ اس لیے جلال کا اس طرح پھول پیش کرنا اسے حیران کرگیا تھا۔ دیکھے بنا ہی وہ جانتی تھی کہ اس وقت ان سب کی نظریں اسی سین پر ہوں گی۔ وہ جلال سے پھول لینا نہیں چاہتی تھی لیکن کوئی بھی سخت جواب دینے کی وجہ سے وہ خود بھی تماشا بن جاتی۔ اس نے کچھ بھی کہے بغیر خاموشی سے وہ پھول پکڑ لیا اور جلال مڑ کر آصفہ کے پیچھے چل دیا۔

مہریز یہ سب دیکھ رہا تھا۔ اسے توقع نہیں تھی کہ رامین خاموشی سے وہ گلاب رکھ لے گی۔ اسے اچھا نہیں لگا۔ کچھ دن بعد اس نے جلال سے پوچھا کہ اس نے اسے وہ پھول کیوں دیا تھا؟

"ایسے ہی یار... اچھی لڑکی ہے۔ میں نے سوچا اسے بھی پتا ہونا چاہیے کہ وہ اچھی ہے۔"

لیکن مہریز مطمئن نہ ہوسکا۔ اسے افسوس بھی ہو رہا تھا کہ یہ ہمت اس نے کیوں نہیں کی۔

☼ ☼ ☼

مہریز کو نئے پریفیکٹس کی ڈیوٹی لسٹ ان کی کلاس میں جاکر دینی تھی۔ اس نے حسن کو ساتھ لیا اور وہ دونوں چلتے ہوئے کیمبرج کلاسز کی طرف آگئے۔

سر تنویر نے لسٹ دیکھ کر تینوں پریفیکٹ کے نام لیے۔ جب سارہ خان کا نام پکارا گیا تو مہریز نے کھڑی ہونے والی لڑکی کی طرف دیکھا اور دیکھتا رہ گیا۔ وہ بہت پیاری لڑکی تھی اور کافی پُراعتماد بھی... مسلسل مسکراتے ہوئے وہ بھی مہریز کی جانب دیکھے جارہی تھی۔ حسن نے مہریز کو ٹہوکا دیا۔ پھر سر سے اجازت لے کر وہ دونوں باہر آگئے۔

"کیوٹ ہے یار... ہے نا؟" حسن نے اس کی رائے بھی پوچھی۔

"مگر تمہارے ساتھ سوٹ نہیں کرے گی۔" اس نے حسن کی پستہ قامت کو نشانہ بنایا۔

"جانتا ہوں... سوٹ تو وہ تیرے ساتھ کرے گی۔ دونوں پٹھان ہو... گورے اور لمبے بھی... اسٹڈیز میں بھی سب سے آگے... ہم غریبوں کو وہ کیوں گھاس ڈالے گی۔" حسن نے جل کر جواب دیا۔

"اونہوں... فضول باتیں مت کیا کرو... مجھے کسی لڑکی میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ میں بس اپنی اسٹڈیز کو اہمیت دیتا ہوں۔"

وہ لوگ چلتے چلتے نوٹس بورڈ کے سامنے آگئے۔

"تم دیکھنا' ایک دن رول آف آنر میں یہاں میرا نام لکھا ہوگا۔" اس نے اونچی دیوار پر ٹنگے اس آبنوسی بورڈ کی طرف اشارہ کیا۔ جن پر رول آف آنر حاصل کرنے والے تمام اسٹوڈنٹس کے نام جلی حروف میں درج کیے گئے تھے۔

سارہ بہت جلد اپنی بولڈ طبیعت کی وجہ سے مشہور ہوگئی۔ بہت سے لڑکوں سے اس کی دوستی ہوچکی تھی۔

ان سے بھی جو اس کی کلاس میں نہیں پڑھتے تھے۔ وہ نئی آئی تھی' اس لیے کسی بھی لڑکے سے واقف نہیں تھی۔ کچھ دنوں بعد لڑکوں کے ایک گروپ سے اس کا جھگڑا ہوگیا اور بڑھتے بڑھتے بات پرنسپل تک جا پہنچی۔ وہ جھگڑا مہریز کے سامنے شروع ہوا تھا مگر ان کے ساتھ شامل نہ ہونے کے باوجود سارہ نے اس کا بھی نام لے دیا تھا۔

مہریز کو بھی پرنسپل کے آفس میں طلب کرلیا گیا تھا۔ سب لوگ بے حد حیران ہوئے تھے۔ سینئر کلاسز کے تمام سیکشنز میں اس بات کو خوب اچھالا جارہا تھا کہ مہریز نے سارہ کے ساتھ بدتمیزی کی ہے اور وہ اکثر بریک میں اس کے پیچھے آوازیں کستا پھرتا ہے۔

مہریز کا غم و غصہ سے برا حال تھا۔ جس گروپ کے ساتھ سارہ کی لڑائی ہوئی تھی۔ وہ سارے نالائق اور بدتمیز لڑکوں پر مشتمل تھا۔ مگر مہریز کی کنڈیکٹ ہمیشہ سے قابل ستائش رہی تھی۔ وہ پڑھائی میں بھی اچھا تھا۔ پرنسپل نے جب دوسرے لڑکوں کے ساتھ اسے اپنے آفس میں طلب کیا تو بطور خاص اسے مخاطب کرکے کہا کہ ہمیں آپ سے یہ امید نہیں تھی۔

گویا اسے صفائی کا موقع دیے بغیر ہی مجرم قرار دیا گیا تھا۔ اس کا قصور صرف اتنا تھا کہ وہ اس گروپ کے نزدیک کھڑا احسن سے باتیں کررہا تھا۔ جب اس نے سنا کہ سارہ نے ایک لڑکے کو ہلکے سے دھکا دیتے ہوئے راسکل (بدمعاش) کہا۔ اس لڑکے نے اپنے دوستوں کے ساتھ مل کر اسے انتہائی نامناسب القابات سے نوازا تھا۔

مہریز طنزیہ انداز میں مسکراتا ہوا ان کی لڑائی دیکھ رہا تھا۔ سارہ نے اپنی تضحیک کا بدلہ لینے کے لیے ان تمام لڑکوں کو شامل شکایت کرلیا جو اس وقت وہاں موجود تھے۔ باقی لڑکوں کو اس کارروائی سے اتنا فرق نہیں پڑا تھا۔ وہ پہلے کون سا نیک نام مشہور تھے مگر مہریز کی ساکھ بہت متاثر ہوئی۔ یہ سب اس کے لیے تکلیف دہ تھا۔ اس کے والد اسی سال امریکہ شفٹ ہوگئے تھے اور اگلے تین سال تک ان کے آنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ وہ وہیں اپنا سارا بزنس سیٹ کرنے میں دن رات مصروف رہتے تھے۔ اپنی امی کو وہ یہ قصہ سنا کر پریشان نہیں کرنا چاہتا تھا۔ یہاں وہ کس کس کو بتاتا کہ اس نے کچھ نہیں کیا تھا۔ وہ بہت خاموش رہنے لگا تھا۔

اس واقعے کے تین دن بعد جب ایک صبح وہ حسب معمول ساڑھے سات بجے اسکول پہنچا اور اپنا بیگ سیٹ پر رکھنے کے لیے کلاس کے اندر جانے لگا تو دروازہ کھولتے ہی اس کی نظر عائشہ ' سمیرا ' رامین اور فرح پر پڑی جو آپس میں اسی حوالے سے گفتگو کررہی تھیں۔ مہریز اپنا نام سن کر دروازے میں ہی رک گیا۔ ان سب کی پشت دروازے کی جانب تھی۔ اسی لیے وہ اسے آتا دیکھ نہیں پائی تھیں۔ عائشہ سارہ کے ساتھ دوستی کا حق ادا کررہی تھی' اس نے کہا۔

"تمہیں معلوم ہے وہ سارہ سے فرینڈشپ کرنا چاہ رہا تھا۔ جب اس نے مہریز سے دوستی کرنے سے انکار کردیا تو وہ اسے تنگ کرنے لگا اور ان لڑکوں کو بھی وہی اکساتا تھا کہ اسے پریشان کریں۔"

"میں نہیں مانتی۔" مہریز کو رامین کی آواز سنائی دی۔ اس نے دروازہ تھوڑا اور کھول لیا۔ "مجھے بالکل بھی یقین نہیں ہے کہ مہریز ایسی گھٹیا حرکت کرسکتا ہے۔ وہ بہت ڈیسنٹ لڑکا ہے۔ ہم اسے دس سال سے دیکھ رہے ہیں۔ اس نے کبھی کوئی چیپ حرکت نہیں کی۔ نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا وہ لڑکیوں کی طرف ' اتنی ریسپیکٹ کرتا ہے سب کی۔ تم لوگ سارہ کی بات کا یقین کرلوگی جو ابھی نئی آئی ہے۔ اس کی حرکتیں دیکھی ہیں؟ لڑکوں کے ساتھ بے تکلفی سے بیٹھ جاتی ہے۔ گپیں لگاتی ہے۔ ہاتھ پہ ہاتھ مار کے ہنستی ہے۔ چھٹی کے بعد ان کے ساتھ باسکٹ بال کھیل رہی ہوتی ہے۔ اتنا عجیب لگتا ہے۔ تو لڑکوں کے بیچ میں اکیلی لڑکی... سب اس سے ٹکراتے گزرتے ہیں۔ تب اسے برا نہیں لگتا۔ کم از کم میں تو اس کی بات پر یقین نہیں کرسکتی۔ یقیناً" وہ جھوٹ بول رہی ہے۔"

مہریز نے یہاں تک سن کر دروازہ آہستگی سے بند کردیا۔ رامین نے اس اسکینڈل میں مہریز کی ذات کو ہر الزام سے بری کردیا تھا۔ کوئی تو ہے۔ جو اس پر بھروسا کرتا ہے۔ اور وہ ہستی پہلے ہی اس کے دل کے اتنے قریب تھی۔ اب کچھ اور اہم ہوگئی تھی۔

اس کے ساتھ بھی رامین کے رویے میں تھوڑی لچک پیدا ہوئی تھی۔ اس نے بات بے بات الجھنا اور

بحث کرنا چھوڑ دیا تھا۔ اب ایک دم غصے میں بھی نہیں آتی تھی۔ اس کی بات کا سیدھا جواب دیا کرتی تھی۔ گو بچپن جیسی بے تکلفی نہیں تھی۔ پر مہریز کے لیے یہ بھی غنیمت تھا۔

رامین کے مزاج کی اس معمولی سی تبدیلی کو وہ کچھ زیادہ ہی اہمیت دے رہا تھا۔ یہ ان کا آخری سال تھا۔ دو مہینے بعد انہیں بورڈ کی تیاری کے لیے اسکول سے چھٹی مل جانی تھی۔ جہاں ٹیچرز جلد سے جلد سارا کورس مکمل کرنے کی کوشش تھے۔ وہیں ان کی جونیئر کلاسز انہیں فیرویل پارٹی دینے کی تیاریوں میں مصروف تھیں۔ جونیئر پریفیکٹس نے اپنے تمام سیکشنز میں پیسے جمع کرنا شروع کردیے۔ تمام ٹیچرز کو بھی مدعو کیا جانا تھا۔ ٹینتھ کلاس کے تین سیکشنز تھے۔ ان سب کے لیے ڈنر اور میوزک نائٹ کا اہتمام کیا جارہا تھا۔ جونیئر کلاسز چاہتی تھیں کہ اسکول ختم ہونے سے دو ہفتے پہلے ہی فیرویل پارٹی کا انعقاد ہوجائے' تاکہ تمام اسٹوڈنٹس کسی بھی قسم کی ٹینشن کے بغیر اپنی ریویژن کلاسز سے پہلے یہ پارٹی انجوائے کرسکیں۔

اس کے علاوہ اسپورٹس ڈے کی بھی تیاریاں عروج پر تھیں۔ وہ سب یک دم بہت مصروف ہوگئے تھے۔ اس جوش خروش میں ایک دوسرے سے جدا ہوجانے کا ملال بھی شامل ہونے لگا تھا۔

مہریز نے ابھی تک رامین سے اپنے جذبات کا اظہار نہیں کیا تھا۔ اس کے خیال میں یہ مناسب نہیں تھا۔ ابھی اسے اپنا کیریر بنانا تھا۔ اس کے بعد دیکھی جاتی۔ جانے کیوں اسے یقین تھا کہ رامین بھی اسے پسند کرتی ہے۔ اسے کبھی اندیشہ محسوس نہیں ہوا تھا کہ وہ اس کے علاوہ کسی اور کی ہوجائے گی۔

فیرویل پارٹی کی شام اس نے اپنے سب کلاس فیلوز کے ساتھ تصویریں کھنچوا کر اپنے کیمرے میں محفوظ کیں۔ حالانکہ وہ رامین کے ساتھ اکیلے کھڑے ہوکر بھی ایک تصویر بنوانا چاہتا تھا۔ لیکن یہ ناممکن تھا۔ رامین کبھی راضی نہ ہوتی۔ مہریز چاہتا تو اسے لاعلم رکھتے ہوئے حسن سے یہ کام لے سکتا تھا۔ مگر یہ اس کی فطرت کے خلاف ہوتا' دھوکا دینا اسے پسند نہیں تھا اور وہ رامین کی بہت عزت کرتا تھا۔

یہ خوب صورت شام ان کے دامن میں بہت سی خوب صورت یادیں بھرنے والی تھی۔ اسے یقین تھا۔ ڈنر کرتے ہوئے وہ سب لوگ ایک ہی ٹیبل کے گرد بیٹھے تھے۔ فرح' رامین' حسن اور مہریز۔۔۔ بیٹھے بیٹھے جانے حسن کو کیا ہوا کہ وہ بچوں کی طرح اپنی کرسی جھلانے لگا۔ اسی وقت فرح اپنے لیے سلاد لانے کے لیے اٹھی تو حسن نے گردن موڑ کر جاتی ہوئی فرح سے اپنے لیے کولڈ ڈرنک لانے کی فرمائش کردی۔ حسن کے یوں اچانک پیچھے دیکھنے سے کرسی کا بیلنس خراب ہوا۔ قریب تھا کہ حسن کرسی سمیت الٹ کر گرتا کہ مہریز نے سرعت سے کرسی کی پشت پر اپنا ہاتھ رکھ کر فوراً" اسے واپس دھکیل دیا۔

"کیا کررہے ہو حسن! تمیز سے بیٹھو گرنا ہے کیا؟"

"سوری۔۔۔" حسن فوراً" شرمندہ سا ہوکر سیدھا ہوگیا اور اپنا کھانا کھانے لگا۔

رامین کو ہنسی آگئی۔ مہریز نے بھی اس کی طرف مسکرا کر دیکھا تو وہ کہنے لگی۔

"ویری گڈ۔ تو تم Muscleman بن ہی گئے۔" رامین نے اس کی برسوں پرانی خواہش کا ذکر ہنستے ہوئے کیا تو مہریز نے جواباً" اسے گہری نگاہوں سے دیکھا اور پھر کہا۔

"ہاں۔۔۔ لیکن تم مس نینسی سے زیادہ خوب صورت ہوگئی ہو۔" وہ ہنسنا بھول کر حیرت سے اسے دیکھنے لگی۔ جبکہ مہریز یہ بات کہہ کر وہاں سے اٹھ گیا۔

اسے اندازہ نہیں ہوسکا کہ مہریز نے مذاق کیا تھا یا وہ سنجیدہ تھا۔ بہرحال وہ تھوڑی ڈسٹرب ہوگئی تھی۔ اس سے قبل کہ وہ مہریز سے کوئی سوال کرتی' ساجد نے غزل گانا شروع کردی اور سب طرف خاموشی چھاگئی۔

تو اپنے دل کی جواں دھڑکنوں کو گن کے بتا
میری طرح تیرا دل بے قرار ہے کہ نہیں

رامین سر جھکائے غزل سن رہی تھی۔ اس شعر پر بے اختیار اس نے سر اٹھایا تو مہریز کو اپنی جانب متوجہ پایا۔ وہ جانے کب سے اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ رامین گڑبڑا سی گئی اور دوسری طرف دیکھنے لگی۔ وہ بہت کنفیوز ہورہی تھی۔

وہ پل کہ جس میں محبت جوان ہوتی ہے
اس ایک پل کا تجھے انتظار ہے کہ نہیں
دبا دبا سا ہی' دل میں پیار ہے کہ نہیں
جھکی جھکی سی نظر۔۔۔

مہریز کو یقین سا ہورہا تھا کہ رامین اس کے جذبات سے آگاہ ہوچکی ہے۔ اس خیال پر مہر ثبت ہوگئی جب رامین نے واپس جانے سے پہلے اپنی book Openion اسے گھر لے جانے کے لیے دی۔ کلاس کے کسی لڑکے نے ابھی تک رامین کی بک کو چھوا بھی نہیں تھا۔ یہ اعزاز صرف اسے ہی ملا تھا۔

تو کیا اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ وہ مہریز پر اندھا اعتماد کرتی ہے اور اس اعتماد کی وجہ محبت کے علاوہ اور کیا ہوسکتی تھی؟

☼ ☼ ☼
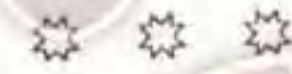
فیرویل کے بعد ہفتہ اور اتوار بہت پریشانی میں گزرا۔ مہریز سے بے خیالی میں ایک بہت بڑی غلطی ہوگئی تھی۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ رامین کو خود ہی جاکر بتادے گا اور معافی بھی مانگ لے گا۔

پیر کی صبح وہ جیسے ہی اسکول پہنچا۔ اس کی نگاہیں رامین کو ڈھونڈنے لگیں۔ وہ کلاس میں نہیں تھی لیکن اس کا بیگ سیٹ کے پاس ہی رکھا ہوا تھا۔ اس نے کاریڈور میں آکر دیکھا تو رامین فرح کے ساتھ کھڑی تھی۔ وہ اس کی طرف بڑھنے لگا۔ کافی بھیڑ تھی' آمنے سامنے کلاسز کے بہت سے اسٹوڈنٹس کاریڈور میں کھڑے باتیں کررہے تھے کہ اسمبلی شروع ہونے میں ابھی کافی وقت تھا۔ مہریز ان کے نزدیک پہنچا تو سب سے پہلے فرح کی نظر اس پر پڑی۔ اس کے کہنے پر رامین نے مڑ کر اسے دیکھا۔ مہریز کی صورت دیکھتے ہی وہ تیز تیز چلتی ہوئی اس کے پاس پہنچ گئی۔ مہریز نے ابھی سوری کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ رامین اس پر برس پڑی۔

"کہاں ہے میری opinion book۔" وہ بہت غصے میں نظر آرہی تھی اور اس کا چہرہ سرخ ہورہا تھا۔

"تم نے میرے گھر فون کیا تھا؟ میری ماما سے کہا کہ میں تمہاری گرل فرینڈ ہوں؟" وہ کیا کہہ رہی تھی۔ اسے یقین نہیں آیا۔ مہریز ہکا بکا اس کی شکل دیکھنے لگا۔

مہریز سے رامین کی opinion book کھوگئی تھی اور وہ یہی بتانے کے لیے اس کے پاس آیا تھا لیکن وہ اس پر کچھ اور ہی الزام لگارہی تھی۔ وہ بھی اس طرح بھرے مجمع میں۔۔۔ مہریز کو غصہ تو بہت آیا مگر وہ اپنی آواز دبا کر بولا۔

"میں نے تمہارے گھر فون نہیں کیا۔ تمہاری بک کھوگئی ہے مجھ سے۔۔۔ آئی ایم سوری۔ لیکن فون میں نے نہیں کیا تھا۔"

"تم جھوٹ بول رہے ہو۔" وہ اس کی بات کا یقین کرنے کے لیے تیار ہی نہیں تھی۔ اس کی آنکھیں سوج رہی تھیں' جیسے بہت زیادہ روتی رہی ہو۔ وہ پھر اسے لتاڑنے لگی۔ "میرے گھر کا نمبر اسی بک میں تھا اور وہ تمہارے پاس تھی۔ تم ہی نے فون کیا تھا میرے گھر اور میری ماما سے الٹی سیدھی باتیں کی تھیں۔"

فرح نے آگے بڑھ کر رامین کو روکنے کی کوشش کی لیکن اس نے ایک نہیں سنی اور جو منہ میں آیا کہتی رہی۔ اسے بالکل پروا نہیں تھی کہ بہت سے اسٹوڈنٹس ان کی طرف متوجہ ہوچکے تھے مگر مہریز کو تھی۔۔۔ رامین کو جو بھی غلط فہمی ہوئی تھی۔ اسے اکیلے میں دور کرنا چاہیے تھا۔ اس طرح تماشا بنا کر سب کو ہرزہ سرائی کا موقع دینا کوئی عقل مندی نہیں تھی۔ وہ کب تک برداشت کرتا رہتا۔ آخر وہ بھی غصے میں چلا اٹھا۔

"مجھے کوئی ضرورت نہیں ہے ایسی گھٹیا حرکتیں کرنے کی' میں بہت پہلے سے تمہارا فون نمبر جانتا

ہوں۔ وہ کال میں نے نہیں کی اور اگر تمہیں مجھ پر اعتبار نہیں تھا تو دی کیوں تھی اپنی book ———— نہ دیتیں، میں نے تمہاری منتیں نہیں کی تھیں۔"

رامین خاموش ہوگئی۔ مہریز غصے میں پیر پٹختا ہوا وہاں سے چلا گیا۔ یہ پہلی بار ہوا تھا کہ مہریز نے جواباً" اس پر غصہ نکالا تھا۔ اس نے بھی تو حد کردی تھی۔

ایک بار پھر وہ اسکول میں ہاٹ ٹاپک بن چکا تھا۔ رامین اس کے ساتھ اس طرح بات کرے گی۔ اسے یوں سب کے سامنے ذلیل کرے گی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ شدید غم و غصے کی حالت میں وہ اس دن اسکول سے نکلا تھا۔ اس دن کے بعد وہ دوبارہ وہاں نہیں گیا تھا۔ وہ رامین کی صورت بھی دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔

اسٹوڈنٹس کی معنی خیز شک بھری نگاہوں کا سامنا کرنے کی اب اس میں ہمت نہیں تھی۔ وہ گھر پر رہ کر بھی اپنے ایگزام کی تیاری کرسکتا تھا۔ مشکل تو تھا، لیکن اس نے کوشش کرکے سب کچھ بھلا کر اپنا سارا دھیان پڑھائی کی طرف کرلیا۔

لڑکے، لڑکیوں کے امتحانی مرکز مختلف تھے۔ اس واقعے کے بعد ان دونوں کا آمنا سامنا نہیں ہوا تھا۔ بورڈ کا رزلٹ جاری ہوا تو مہریز نے فرسٹ پوزیشن حاصل کی تھی اور فرح علیم فقط تین نمبروں کے فرق سے سیکنڈ آئی تھی۔ اپنی مارکس شیٹ لینے وہ حسن کے ساتھ اسکول گیا تھا۔ ایڈمنسٹریشن میں کوئی مسئلہ چل رہا تھا۔ جس کے باعث ان کی ایوارڈ سرمنی نہیں کی جارہی تھی۔ ٹیچرز اور پرنسپل سے آخری ملاقات کرکے وہ دونوں باہر آگئے۔ اسی وقت رامین اپنی گاڑی سے نکل رہی تھی۔ مہریز کو دیکھ کر وہ اس کی طرف بڑھی۔ وہ بھی اسے دیکھ چکا تھا لیکن ملنا نہیں چاہتا تھا۔ حسن کے روکنے کے باوجود وہ تیزی سے اپنی گاڑی میں جاکر بیٹھ گیا اور وہاں سے روانہ ہوگیا۔ رامین نم آنکھوں سے اسے جاتا دیکھتی رہی۔

☆ ☆ ☆

جی سی کالج سے ایف ایس سی کرنے کے بعد مہریز TOPI چلا گیا۔ اسے GIKI میں ایڈمیشن مل گیا تھا۔ اس کی رہائش کا بندوبست ہاسٹل میں ہوا اور وہ اپنا ضروری سامان لے کر اسلام آباد چلا گیا۔ جہاں سے انسٹی ٹیوٹ کی بس تمام اسٹوڈنٹس کو لے کر تربیلا سے آگے وسیع و عریض رقبے پر تعمیر شدہ خوب صورت عمارتوں کے جھرمٹ میں پہنچ گئی۔ غلام اسحاق خان انسٹی ٹیوٹ آف انجینئرنگ شہری آبادی سے دور ہونے کے باعث اسٹوڈنٹس کو تمام سہولیات درس گاہ میں ہی فراہم کررہا تھا۔

مہریز نے یہاں بھی غیر معمولی کارکردگی دکھائی اور ہر سمسٹر میں پوزیشن لیتا رہا۔ اسے دن رات پڑھائی کے علاوہ کچھ نہیں سوجھتا تھا۔ بیتا ہوا کل جیسے کبھی اس کی زندگی کا حصہ تھا ہی نہیں۔ وہ اس طرح اپنے ماضی سے پیچھا چھڑا بیٹھا تھا۔ اس نے جان بوجھ کر حسن سے بھی ہر قسم کا رابطہ توڑ رکھا تھا۔ حسن کے مختلف میسجز اکثر اس کے منتظر ہوتے۔ اس کے باوجود وہ نہ اسے فون کرتا، نہ ہی کوئی پیغام چھوڑتا تھا۔ پتا نہیں وہ اسے کیوں نظرانداز کررہا تھا۔

☆ ☆ ☆

اس کے گریجویشن کا ابھی دوسرا سال تھا۔ وہ کچھ دنوں کے لیے لاہور آیا تھا۔ کچھ کپڑے خریدنے کے لیے وہ شاپنگ مال پہنچا۔ شاپ کے اندر وہ ہینگرز پر لگی شرٹس آگے پیچھے کررہا تھا کہ اپنے کندھوں پر اسے کسی کے ہاتھ کا دباؤ محسوس ہوا۔ اس نے گردن موڑ کر پیچھے دیکھا تو وہ حسن تھا۔

"نئے دوست بنالیے تو پرانے دوستوں کو بالکل بھول گیا؟" حسن کے شکستہ لہجے میں اس کے گزشتہ رویے کا شکوہ تھا۔ مہریز نے کوئی جواب دیے بغیر آگے بڑھ کر اسے گلے لگالیا۔ حقیقتاً" اسے حسن کو دیکھ کر خوشی ہورہی تھی۔

کچھ ہی دیر میں وہ دونوں کیفے میں ساتھ بیٹھے گپیں لگارہے تھے۔ کھانا آرڈر کرنے کے بعد حسن نے اپنی زندگی کے حوالے سے کچھ باتیں کیں اور مہریز سے اس کے کام کے بارے میں پوچھتا رہا۔ مختصراً" اپنی اسٹڈیز کے بارے میں بتاتے ہوئے مہریز کو اچانک خیال آیا۔

"کچھ معلوم ہے دوسرے کلاس فیلوز کہاں ہیں۔۔۔ کیا کررہے ہیں؟"

"چند ایک سے رابطہ ہے۔ فیصل اور فرح ٹوگنگ لیڈورڈ میں ہیں، باقی کا معلوم نہیں۔"

"تمہارا فرح سے رابطہ رہتا ہے؟"

"نہیں، اس سے اولڈ اسٹوڈنٹس گیٹ ٹوگیدر میں ملاقات ہوئی تھی چھ ماہ پہلے، وہیں بتایا تھا اس نے۔" ویٹر ان کے سامنے کھانا رکھ کر چلا گیا۔ کھانے کے دوران حسن بولا۔

"مہریز! تمہیں رامین یاد ہے؟" اور مہریز کا ہاتھ جہاں تھا، وہیں رک گیا۔ وہ بھلا اسے کیسے بھول سکتا تھا۔ اس نے اپنا کانٹا پلیٹ میں واپس رکھا اور گلاس ہاتھ میں لے لیا۔ وہ حسن کی طرف دیکھنے سے دانستہ گریز کررہا تھا جو بغور اس کی ہر ہر حرکت کو نوٹ کررہا تھا۔ کافی دیر بعد اس نے حسن کو جواب دیا تھا۔

"کیوں۔ تم کیوں پوچھ رہے ہو؟" حسن کو محسوس ہوا کہ مہریز اس ذکر سے ڈسٹرب ہوا ہے۔

"تم نے اس دن کے بعد اسکول آنا ہی چھوڑ دیا تھا، ورنہ۔۔۔"

"پلیز حسن۔۔۔ میں اس بارے میں کوئی بات نہیں کرنا چاہتا۔" مہریز کا ضبط جواب دے گیا۔

"تم ایک بار سن تو لو۔۔۔ کہ اسے یہ غلط فہمی کیوں ہوئی تھی۔"

"نہیں حسن۔۔۔ اسے کوئی غلط فہمی نہیں ہوئی تھی۔ میری تو شکل پہ لکھا ہے کہ میں آوارہ بدمعاش ہوں۔۔۔ اور مجھے لڑکیوں کے پیچھے بھاگنے کے علاوہ کوئی کام نہیں ہے۔" مہریز نے زور سے اپنا گلاس میز پر پٹختے ہوئے غصے سے کہا۔

"تمہیں نہیں لگتا تم سارہ کا غصہ رامین پر نکال رہے ہو۔" حسن نے احساس دلانے کی کوشش کی۔ مہریز بھڑک گیا۔

"تو کیوں نہ نکالوں؟ اس نے بھی میرے ساتھ وہی کیا جو سارہ نے کیا تھا۔ بے عزت کردیا تھا مجھے سب کے سامنے۔" مہریز کے سخت لہجے میں صرف شکوہ ہی نہیں، عزت نفس کی پامالی کا دکھ بھی بول رہا تھا۔

"نہیں مہریز۔۔۔ سارہ نے تم پر جھوٹا الزام لگایا تھا جبکہ رامین۔۔۔" حسن کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی وہ بدک گیا۔

"تمہارا مطلب ہے رامین کا مجھ پر اس طرح شک کرنا صحیح تھا۔ تم اس کی سائیڈ لے رہے ہو؟"

"میں کسی کی سائیڈ نہیں لے رہا ہوں۔۔۔ تم میری بات تو پوری ہونے دو۔" مہریز گہری سانسیں لے کر اپنے آپ کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش میں کرسی کی پشت پر سر ڈال کر دونوں ہاتھوں سے اپنا ماتھا سہلانے لگا۔ اضطراب اس کے انگ انگ سے پھوٹ رہا تھا۔ حسن نے اسے کول ڈاؤن کرنے کے بعد دوبارہ وہیں سے سلسلہ کلام جوڑا۔

"دیکھو۔۔۔ سمجھنے کی کوشش کرو۔ سارہ نے جان بوجھ کر تم پر جھوٹا الزام لگایا تھا، لیکن رامین کو غلط فہمی ہوئی تھی اور وہ اس میں حق بجانب تھی۔" مہریز نے کچھ کہنے کے بجائے بے یقینی سے اسے دیکھا۔

"مجھے معلوم ہے وہ فون تم نے نہیں کیا لیکن کسی نے تو کیا تھا نا۔" حسن نے اس کے غصے کی پروا کیے بغیر اپنی دلیل پیش کی تھی۔

"کسی لڑکے نے اس کے گھر فون کرکے اس کی ماما سے کہا کہ وہ رامین کا بوائے فرینڈ ہے۔ رامین اس کے پاس اپنی opinion book بھول گئی ہے۔ وہ گھبرائے نہیں۔ جب منڈے کو وہ اسکول آئے گی تو وہ اسے واپس کردے گا۔" حسن نے ساری گفتگو من و عن اس کے گوش گزار کردی۔

"تمہیں یہ سب کس نے بتایا؟" مہریز سیدھا ہو بیٹھا۔

"فرح نے گیٹ ٹوگیدر میں جب ملاقات ہوئی تو اس نے بتایا۔ تم سوچو مہریز۔۔۔ کلاس فور میں ہمارے سامنے اس کے پاپا نے کیا کیا تھا؟ اب جب اس طرح

کی کوئی کال موصول ہوئی ہوگی تو انہوں نے کیا کیا ہوگا؟" مہریز خاموش رہا۔ اس نے واقعی اس پہلو سے نہیں سوچا تھا۔

"ہمارا معاشرہ بہت عجیب ہے یار! میرے یا تمہارے گھر میں اس طرح کوئی لڑکی فون کرتی تو ہمارے گھر والے ہمیں برا بھلا نہ کہتے اس لڑکی کو آوارہ اور بدچلن کہا جاتا۔ لیکن کسی لڑکی کے گھر اس طرح کے فون آنے پر اس لڑکے کو مورد الزام ٹھہرانے کے بجائے لوگ اپنی بیٹیوں پر شک کرتے ہیں۔" حسن نے تاسف سے سرہلایا۔

"تم یا میں اس پر ٹوٹنے والی مصیبت کو کم نہیں کرسکتے۔ لیکن کم از کم یہ انڈراسٹینڈ تو کرسکتے ہیں کہ اس کی کوئی غلطی نہیں تھی۔ اس نے اپنی بک تمہیں دی تھی۔ تمہاری لاپروائی۔۔۔ تم نے اسے سنبھال کر نہیں رکھا جانے کس کے ہاتھ لگی تھی۔ کیا ہوا تھا۔ وہ تو یہی سمجھی تھی کہ یہ حرکت تمہاری ہے۔ میں اس کی جگہ ہوتا تو میں بھی یہی خیال کرتا۔"

"اسکول میں تمہاری بات ہوئی تھی رامین سے۔ کچھ کہا تھا اس نے؟" مہریز کا غصہ ٹھنڈا ہوچکا تھا۔

"نہیں۔" حسن نے ایک گہری سانس لی۔ "اس دن وہ بھی آخری دفعہ اسکول آئی تھی۔ اس کے بعد نہ تم آئے نہ وہ۔ فرح بھی اس سے رابطہ کرنے میں ناکام رہی تھی۔ اس کے گھر کا فون نمبر تبدیل ہوگیا تھا۔ پھر ایگزامز شروع ہوگئے۔ تب ملی تھیں وہ آپس میں۔ مجھے تو یہ سب ابھی چند ماہ پہلے معلوم ہوا ہے۔ فرح بتارہی تھی' اس کے والدین بہت سختی کرتے ہیں اس پر۔ کہیں آنے جانے نہیں دیتے۔ کالج میں آنے کے باوجود اسے کسی قسم کی آزادی نہیں ہے۔"

رامین پر کیا گزر رہی ہے۔ حسن نے مقدور بھر کوشش کی تھی اسے سمجھانے کی۔ اسے ایسا کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ مہریز اس سے کہیں بہتر سمجھ سکتا تھا کہ رامین کیا محسوس کررہی ہوگی۔ وہ اپنے برہم دل کی پکاران سنی کرتا' ایک بار پھر دل کے اس خانے کے پاس جا پہنچا تھا جہاں رامین کے لیے صرف محبت ہی

محبت تھی۔ اپنے اس جذبے کو پروان چڑھانے کے لیے اسے کبھی کوئی تردد نہیں کرنا پڑا تھا۔ ایک خودرو پودے کی طرح وہ محبت بنا کسی دیکھ بھال کے دن بدن پھلتی پھولتی رہی تھی۔ مشکل تو اسے رامین سے خفا ہونے اور اس خفگی پر قائم رہنے میں پیش آئی تھی۔ اس سے دور رہنے میں ہوئی تھی۔

اب جبکہ وہ جان گیا تھا کہ وہ پریشان ہے۔ جس طرح وہ اس کے بغیر اداس اور پریشان رہتا ہے۔ وہ اس کے پاس جانا چاہتا تھا' اس سے ملنا چاہتا تھا۔ اس سے بات کرنا چاہتا تھا۔

بے کل' بے تاب۔ وہ اپنے گھر کے لان میں یہاں سے وہاں چکر لگاتا رہا۔ اسے چین ہی نہیں آرہا تھا۔ اسے رامین کی آواز سننی تھی۔ اس سے کہنا تھا کہ وہ اس سے خفا نہیں ہے۔ اسے رہ رہ کر افسوس ہورہا تھا کہ آخری بار جب وہ اس سے بات کرنے کے لیے آگے بڑھی تو وہ اس سے دور کیوں چلا گیا تھا۔ شاید تب وہ اسے جتانا چاہتا تھا کہ وہ ہرٹ ہوا ہے۔ رامین کے غلط سلوک پر رد عمل ظاہر کرتے وقت وہ یہ کیوں بھول گیا تھا کہ اسے تکلیف دے کر وہ خود بھی کبھی خوش نہیں رہ سکتا تھا۔

وہ لاکھ اس سے دور رہتی۔ دل سے بے حد قریب تھی۔ ہمیشہ سے تھی۔ اور ہمیشہ رہنے والی تھی۔

مہریز بے قرار ہو کر گھر کے اندر چلا آیا۔ فون اٹھایا اور رامین کا نمبر ملانے لگا۔ آخری ہندسہ دبانے سے پہلے اس کی انگلی ساکت ہوگئی۔ پورا نمبر نہ ملانے کی وجہ سے انگیج ٹون بجنے لگی تو وہ ہوش میں آیا۔ اس نے ڈس کنیکٹ کرنے کے بعد دوبارہ پورا نمبر ملانا شروع کیا۔ لیکن اس بار بھی وہی ہوا' آخری دو ہندسے ملانے سے پہلے اس کا ہاتھ جہاں کا تہاں رک گیا۔ آخر وہ کرکیا رہا تھا۔ ایک کال۔ فقط ایک کال ہی تو کرنے جارہا تھا۔ بھلا فون کرنے سے پہلے کوئی اتنا سوچتا ہے؟ لیکن وہ سوچ رہا تھا۔

ایک فون پہلے بھی رامین کے گھر آیا تھا جو اس نے نہیں کیا تھا۔ تب کیا ہوا تھا؟ وہ آج جان گیا تھا۔ لیکن

یہ ایک فون جو وہ کرنے جارہا ہے۔ اس کے بعد رامین کے ساتھ کیا ہوتا۔ وہ زندگی بھر نہیں جان پائے گا۔ وہ ایک غلطی جو اس نے پہلے نہیں کی تھی۔ کیا اب کردیتا؟

"نہیں۔ وہ ایسا نہیں کرسکتا تھا۔ اس نے فون کا ریسیور واپس کریڈل پر رکھ دیا۔

لڑکے بلاسوچے سمجھے کچھ بھی کر گزرتے ہیں۔ بے لگام جذبوں کو مہار ڈالنا شرافت کا اولین تقاضا ہے لیکن اپنے نفس کی خواہش کو پورا کرنے کے لیے بے تاب عاشق۔ اس لڑکی کا نہیں سوچتے جو بے جرم معتوب ٹھہرا دی جاتی ہے۔ محبت مجبور تو ہوسکتی ہے ظالم نہیں۔ اور وہ رامین سے محبت کرتا تھا اس لیے بے بس تھا۔ مجبور تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ فون نہیں کرسکا تھا۔ اس شام رامین کے گھر جا پہنچا تھا۔ شاید اس کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے۔ اس کی کار نزدیک آنے سے پہلے رامین کے پاپا آراستہ محل کا گیٹ کھلوا کر اپنی کار اندر داخل کررہے تھے' پھر گیٹ بند کردیا گیا تھا۔ مہریز لب بھینچے باہر سڑک پر اپنی کار میں بیٹھا اس محل کی طرف دیکھنے لگا' جہاں وہ شہزادی قید تھی۔ جس کے گیسو نہ تو اس قدر دراز تھے کہ اپنے محبوب کو چوری چھپے بے در مینار سے اوپر کھینچ لیتی۔ نہ ہی اس کی آہ و فغاں پر تڑپ کر کوئی پری جادو کی چھڑی سے کسی کدو کو بگھی میں تبدیل کرنے والی تھی کہ وہ اپنے راجکمار کے محل تک خود ہی پہنچ جاتی۔ اس کی تو ماں بھی سوتیلی نہیں تھی کہ شکاری کو جنگل میں اس کے ہمراہ بھیج کر اسے قتل کرنے کا حکم دیتی اور وہ بھاگ کر اپنی جان بچا کر بونوں کی مدد سے اس کے پاس پہنچ سکتی۔ اس کے باہر آنے کا کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ وہ فقط سوئے ہوئے محل کی سوئی ہوئی اس شہزادی کی مانند تھی' جس کی محبت حاصل کرنے کے لیے شہزادے کو سو سال انتظار کرنا تھا۔ سو سال بعد ہی وہ خاردار جھاڑیوں سے گھرے اس محل کی حدود پار

کرسکتا تھا۔

وہ بہت دیر تک وہیں بیٹھا رہا۔ اسے نہیں معلوم تھا وہ اور کتنی دیر یہاں بیٹھا رہے گا۔ شاید ساری رات بیٹھا رہتا۔ ساری عمر بیٹھا رہتا کہ سو سال پورے ہونے میں تو ابھی بہت وقت باقی تھا۔

☼ ☼ ☼

"ماجد کا فون آیا تھا۔" اس کی امی نے کافی کا مگ اس کے سرہانے رکھتے ہوئے اسے مطلع کیا۔ "انہیں امریکن شہریت مل گئی ہے۔ انہوں نے کچھ پیپرز منگوائے ہیں۔ پھر ہمیں بھی بلالیں گے اپنے پاس۔"

مہریز نے ٹی وی کی آواز بند کردی اور بستر پر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ ان کی بات کا اس نے کوئی جواب نہیں دیا تھا' بس خاموشی سے اپنا مگ اٹھا کر کافی کے گھونٹ بھرنے لگا۔ وہ یوں بھی کم بولتا تھا۔ اس کی امی کو عادت تھی۔ ان کی دس باتوں کے جواب میں ہوں ہاں کے علاوہ مہریز کے منہ سے کچھ اور بات نکلتی تو وہ فوراً" کھڑکی سے باہر دیکھنے لگتیں کہ شاید سورج مغرب سے نکلا ہے۔ ویسے انہیں اس سے کوئی شکایت نہیں تھی اور نہ ہی اس نے اس نے موقع دیا تھا۔

"تمہارا گریجویشن مکمل ہونے میں ابھی دو سال ہیں۔ سوچتی ہوں اس کے بعد تمہاری شادی کردوں۔ پھر ہم سب امریکہ چلے جائیں گے۔"

"مجھے ابھی شادی نہیں کرنی۔" اپنی کافی ختم کرتے ہی اس نے مگ ایک طرف رکھا اور کمبل ہٹا کر بستر سے نکل کر کھڑا ہوگیا' اور الماری سے کپڑے نکالنے لگا۔

"ابھی نہیں ہوگی شادی۔" وہ اپنا رخ اس کی جانب کرتے ہوئے بولیں۔ "بس لڑکی ڈھونڈنا شروع کروں گی۔ اس میں تھوڑا ٹائم نکل جائے گا' پھر جیسے ہی میرے بیٹے کے لائق اچھی سی لڑکی ملی' منگنی یا نکاح وغیرہ کردیں گے اور اس کے بھی پیپرز بنوالیں گے۔ یوں جانے میں کس وقت کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔" وہ ان کی پلاننگ سن کر مسکرادیا۔

"آپ تو بہت دور کا سوچ رہی ہیں۔ ویسے فی الحال میں اس جھنجھٹ میں نہیں پڑنا چاہتا۔ جب گردن پھنسانی ہوگی۔ بتادوں گا آپ کو۔" وہ ساتھ ساتھ اپنے کپڑے پریس کررہا تھا۔

امی نے ٹیبل سے مگ اٹھایا۔ پھر کچھ سوچتے ہوئے انہوں نے پلٹ کر مہرز کی طرف دیکھا اور اس کے نزدیک آکر پیار سے اس کے چہرے پر ہاتھ پھیرنے لگیں۔ مہرز پہلے تو حیران ہوا' پھر اس کے سنجیدہ چہرے پر نرم سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

"کیا ہوا ہے مہرز! مجھے تم خوش نہیں لگتے۔"

مہرز نے امی کو پریشان دیکھا تو اسے افسوس سا ہونے لگا۔ گو اس نے کبھی اپنے رویے سے ظاہر نہیں کیا تھا' پر ان سے چھپانا مشکل تھا۔

"آپ کو کیوں لگتا ہے کہ میں خوش نہیں ہوں۔" وہ ان کا ہاتھ پکڑ کرسی تک لے کر آیا اور آہستگی سے انہیں بٹھا کر اپنا سر ان کی گود میں رکھ کر زمین پر بیٹھ گیا۔ وہ اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے کہنے لگیں۔

"مجھے ایسا لگتا ہے۔ یا تو نی تو تم پہلے بھی نہیں تھے' لیکن تمہاری آنکھیں جگمگاتی تھیں۔ مسکراتے رہتے تھے تم' اب مجھے تمہاری آنکھوں میں گہرا دکھ نظر آتا ہے۔ مجھے نہیں بتاؤ گے۔ ماں ہوں تمہاری۔" وہ دلار سے پوچھ رہی تھیں۔

"کچھ نہیں امی! پڑھائی کا اسٹریس زیادہ ہے۔ تھک جاتا ہوں۔ آپ فکر نہ کریں۔ جب آپ کا بیٹا میکینکل انجینئر بن جائے گا اور اچھی سی جاب حاصل کرلے گا نا۔ تب آپ مجھے ہمیشہ مسکراتا دیکھیں گی۔" ماں نے یقین کرلیا۔ مائیں بہت جلد یقین کرلیتی ہیں۔

مہرز ان سے کیا کہتا' جو اسے چاہیے تھا وہ دینا کسی کے بس میں نہ تھا۔ اس کی آنکھ سے بغیر اجازت چند آنسو ٹپکے اور اس کی ماں کے دامن میں جذب ہوگئے۔

کچھ دن پہلے اس نے رامین کو اس کے منگیتر کے ساتھ دیکھا تھا۔ وہ دونوں شاپنگ کررہے تھے۔ ان کے ساتھ ایک ادھیڑ عمر خاتون بھی تھیں' جو شاید اس لڑکے کی والدہ تھیں۔ مہرز ان کی طرف اس وقت متوجہ ہوا' جب اس شخص نے رامین کا نام لے کر اسے پکارا تھا۔ مہرز نے فوراً" مڑ کر دیکھا تھا۔ وہ کتنے سالوں سے اسے دیکھنے کا خواہش مند تھا۔ لیکن اس طرح؟ یوں کسی اور شخص کے ساتھ..... ہرگز نہیں۔

وہ شخص کتنے استحقاق سے اس کا نام لے رہا تھا۔ مہرز کا دل دکھ سے بھر گیا۔ رامین کو تو اس نے چاہا تھا۔ وہ کسی اور کے ساتھ کیوں تھی؟ اسے مہرز کا نہیں ہونا تھا تو پھر۔ اس کے دل میں کیوں بس گئی تھی؟ رامین کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ وہ فوراً" وہاں سے چلا آیا تھا۔

اپنے گھر آکر۔ اپنے کمرے میں بند ہو کر۔ وہ زندگی میں پہلی بار رویا تھا۔ پھوٹ پھوٹ کر بچوں کی طرح بلک بلک کر۔ اسے صبر آکے نہیں دے رہا تھا۔ پھر... جانے کیوں اس نے وہ کام کیا۔ جو پہلے کبھی کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی تھی۔ اس نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھادیے۔ بہت تڑپتے ہوئے' دل سے دعا مانگی۔

"یا اللہ! وہ شخص رامین کو چھوڑ کر چلا جائے۔ میں اس لڑکی کو اپنے لیے چاہتا ہوں۔ اسے میرا نصیب کردے۔ وہ مجھے مل جائے۔" وہ دعا مانگ کر رکا نہیں تھا۔ کافی دیر تک روتا رہا تھا۔

شام کو وہ رامین کے گھر کی طرف روانہ ہوگیا تھا۔ اس کے دل کا سکون جانے کیوں اسے یقین دلا رہا تھا کہ اس کی دعا قبول ہوگئی ہے لیکن وہاں پہنچ کر اسے علم ہوا کہ وہ خالی ہاتھ لوٹا دیا گیا تھا۔ رامین کا شان دار گھر رنگ و نور کے سیلاب میں ڈوبا ہوا تھا۔ باہر گیٹ پر اپنی کار پارک کرکے جب وہ اندر داخل ہوا تھا تو کچھ انجان چہروں نے مہمان سمجھ کر اس کا استقبال کیا۔ وہ خاموشی سے آگے بڑھ کر اسٹیج کی طرف آیا' جہاں رامین نکاح کے بعد دلہن بنی اپنے شوہر کے ساتھ بیٹھی تھی اور مسکراتے ہوئے آنے والوں کی مبارک باد وصول کررہی تھی۔ مہرز جس خاموشی سے وہاں آیا تھا' اسی طرح واپس ہولیا۔

☼ ☼ ☼

محسنہ نے ہلکے نیلے روغن شدہ لکڑی کے دروازے سے لٹکتی زنجیر کھڑکھڑائی۔ کچھ لمحوں کا انتظار بھی جان لیوا تھا۔ دروازہ کھل گیا۔

"اتنی دیر لگادی؟" گھر میں داخل ہوتے ہی محسنہ نے برقعہ اتار کر مہ جبیں کو پکڑایا۔ مہ جبیں نے سر پر تولیہ لپیٹ رکھا تھا' ماں کا برقعہ تہ کرتے ہوئے بولی۔

"بس امی جی' نہانے چلی گئی تھی۔"

"ہانڈی چڑھائی تو نے؟" محسنہ صحن میں رکھے موڑھے پر بیٹھ گئیں اور دستی پنکھا جھلاتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں امی جی... اسکول کا کام ختم کرکے نہانے چلی گئی تھی۔"

"کیا؟ ابھی تک ہانڈی نہیں چڑھائی تو نے؟ ساڑھے چھ بج رہے ہیں' کب کرے گی؟" انہیں غصہ ہی آگیا۔

"میں آپ کرلوں گی... تو نہ آنا بورچی خانے ماں۔" وہ ناراض ہوتی اٹھنے لگیں کہ مہ جبیں نے منع کیا۔

"اوہو' امی جی' غصے نہ ہو۔ میں آلو چڑھا دوں گی' جلدی پک جاویں گے۔"

"رہن دے... آلو چڑھا دوں گی۔" محسنہ نے خفگی میں اس کی بات دہرائی۔ "ایک کم کیا سی... اوری نہ ہووے تجھ سے... میری ایسی حالت' رشتہ داریاں نبھاؤں' سودے لاؤں' بچے پالوں' کھانے پکاؤں۔ ہر وقت اپنی ہڈیاں ساڑھوں' تم بچیاں سے کوئی آسرا نہ ہووے' ماں کلی مرجائے۔" محسنہ اٹھ کر باورچی خانے میں پیڑھی پر بیٹھ کر پیاز چھیلنے لگیں۔

مہ جبیں نے زبردستی ان کے ہاتھ سے چھری لی اور انہیں کمرے میں چھوڑ کر آئی۔ ان کی حالت ایسی نہیں تھی کہ باورچی خانے میں پیڑھی پر بیٹھ کر کام کرسکتیں' محسنہ کے ہاں پانچویں بچے کی آمد نزدیک تھی۔ دائی نے متوقع دن مہینے کا آخر بتایا تھا۔ مہ جبیں ان کی سب سے بڑی بیٹی تھی۔ اس کے بعد محسنہ کا ایک بچہ کوکھ میں ہی ضائع ہوگیا تھا۔ پھر ایک بیٹا طارق تھا۔ جو چھ سال کا ہوچکا تھا۔ طارق کے بعد ایک اور بیٹا ہوا تھا۔ جو ڈیڑھ سال کی عمر میں ہی انتقال کرگیا تھا۔ اب جبکہ مہ جبیں تیرہ سال کی ہورہی تھی' محسنہ ایک بار پھر امید سے تھیں۔ مہ جبیں حتی المقدور ان کا خیال رکھنے کی کوشش کرتی تھی۔

ہنڈیا چڑھا کر وہ ہاتھ دھو کر گیلے ہاتھ اپنے دوپٹے سے پونچھتی ماں کے پاس کمرے میں آگئی۔

"لاؤ ماں جی! پیروں کی مالش کردوں... سوجن کم ہوجاوے گی۔" محسنہ نے خاموشی سے چارپائی پر پاؤں پھیلا دیے۔ سوجے ہوئے پاؤں پر نیلی رگیں پھول کر بہت نمایاں نظر آرہی تھیں۔ مہ جبیں نے تاسف سے ماں کی حالت دیکھی اور آہستہ آہستہ تیل ملنا شروع کردیا۔

"اس بار ابا جی آئیں تو انہیں جانے نہ دینا امی جی۔" اس نے کہا۔

"تو' تو کیا سمجھے ہے' میں نے نہیں کہا' ہزار بار کہا پر وہ میری کہاں سنے۔" وہ ٹھنڈی سانس بھر کر بولیں۔

☼ ☼ ☼

"السلام علیکم پروفیسر صاحب... کیسے مزاج ہیں آپ کے؟" انیس صاحب اسٹاف روم میں داخل ہوتے ہی شاکر علی کی جانب بڑھے اور ان سے ہاتھ ملا کر ان کی خیر خیریت دریافت کی اور مبارک باد دینے لگے۔ "مبارک ہو' سنا ہے آپ کوئی کتاب لکھ رہے ہیں۔"

"جی! آپ کو ملنے والی اطلاع درست ہے۔" شاکر علی نے تصدیق کردی۔ انیس صاحب ان کے سامنے کرسی پر براجمان ہوگئے۔

"ویسے میں ابھی تک ورطہ حیرت میں ہوں کہ ہمارے ملک کو وجود میں آئے فقط دس گیارہ برس ہی گزرے ہیں۔ ابھی سے کیا لکھیں گے۔"

"اس پر بھی کتاب لکھوں گا' اگر زندگی نے وفا

[illegible] ہی بدلا تھا۔ ویسے میں آپ کی معلومات کے لیے یہ بتانا ضروری سمجھتا ہوں کہ میں دراصل مسلمانوں کی ابتدائی تاریخ سے کتاب کا آغاز کررہا ہوں اور اختتام کی طرف بڑھتے ہوئے اسے ملک کی موجود صورت حال تک لے کر آؤں گا۔"

وہ اپنے کام سے متعلق کسی قسم کی نکتہ چینی برداشت نہیں کرتے تھے۔

"تو بھئی انگریزی میں کیوں لکھ رہے ہیں؟ یوں اس کتاب سے ہمارے عوام کی اکثریت استفادہ نہیں کرپائے گی۔"

پروفیسر شاکر علی اپنی چائے ختم کیے بغیر ہی جانے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔

"انیس صاحب! آپ پریشان نہ ہوں۔ میں کتاب شائع ہونے کے بعد خصوصاً" آپ جیسے افراد کے لیے اس کا اردو ترجمہ کرواؤں گا اور آپ کے لیے آپ کے گاؤں والے گھر کے پتے پر ارسال کروں گا۔۔۔ آپ بھینسوں کے باڑے سے متصل اپنے مکان کے کچے صحن میں دھوتی باندھے چارپائی پر بیٹھ کر حقہ پیتے ہوئے میری کتاب کو پڑھیے گا اور استفادہ کرنے کی ناکام کوشش کیجیے گا۔" پروفیسر شاکر نے اپنی بھاری بھرکم کتابیں اوپر تلے رکھ کر ہاتھوں میں اٹھالیں۔ "چلتا ہوں۔۔۔ میری کلاس کا وقت ہورہا ہے' اللہ حافظ۔"

انیس صاحب اس قدر حیران پریشان ہوئے کہ ان سے کوئی جواب بن نہ پڑا۔ جب شاکر علی اسٹاف روم سے باہر نکل گئے تو ساتھ والی کرسی پر موجود نذر السلام سے مخاطب ہوئے۔ "یہ شاکر میاں تو نہایت بدلحاظ انسان ہیں' دیکھیے! کیسے ہمارے دیہاتی ہونے کا طعنہ دیا۔"

"آپ جانتے تو ہیں کہ وہ صرف تعریف سننا پسند فرماتے ہیں۔"

"ہاں میاں۔" انیس صاحب نے اپنی عینک اتار کر جیب سے رومال نکال لیا۔ "تھوڑے مغرور ہیں۔۔۔ لیکن۔۔۔ قابل بھی تو بہت ہیں۔" انہوں نے رومال سے اپنی عینک صاف کی۔ "اب یہی دیکھ لیں۔۔۔ ان کی تیسری کتاب چھپ کر آچکی ہے اور چوتھی تقریباً" مکمل ہے۔" انہوں نے دوبارہ اپنی عینک پہن لی۔

"تھوڑے نہیں' اچھے خاصے مغرور ہیں۔ آپ نے فقط اپنی رائے کا اظہار ہی تو کیا تھا۔ بھلے ہی عمل نہ کرتے اور قابل ہونے کی کیا بات ہے؟ وہ تو آپ بھی ہیں لیکن اپنی عاجزی اور انکساری کے سبب ذرا بے نیاز سے رہتے ہیں۔" انیس صاحب سر جھکا کر مسکرا دیے۔ نذر الاسلام نے اپنی گفتگو جاری رکھی۔

"ویسے سننے میں آیا ہے۔ ان کی اپنے گھر والوں سے بھی نہیں بنتی' خاندان والے لاہور میں رہتے ہیں۔ پرانی انار کلی میں اچھا خاصا مکان ہے۔ مگر انہوں نے یہاں ٹرانسفر کرالیا اور ہاسٹل میں قیام پذیر ہوگئے۔"

"اچھا۔۔۔ ایسا کیوں؟" تجسس کے مارے ان کی آنکھیں عینک کی اوٹ سے بھی جگمگاتی دکھائی دیں۔

"ان کی اپنی بیوی سے ناچاقی رہتی ہے۔ وہ انبالہ کی ہیں۔ وہاں کے حکیم صاحب کی سب سے بڑی بیٹی تھیں۔ والدہ کی وفات کے باعث گھرداری میں مصروف ہوکر تعلیم حاصل نہ کرسکیں۔ شاکر صاحب کو شادی کے بعد تمام صورت حال کا علم ہوا تو بہت مایوس ہوئے۔ ان کی خودپسند طبیعت سے تو آپ واقف ہی ہیں۔ بے چاری بیوی کو تو اور زیادہ بھگتنا پڑتا ہوگا۔" انہوں نے انیس صاحب کو ہر تفصیل سے آگاہ کیا۔

"اب تو دو بچے بھی ہوگئے' لیکن یہ صرف لگی بندھی رقم بھجوانے کے علاوہ اور کسی چیز کا تردد نہیں کرتے۔۔۔ یہیں رہتے ہیں' کتابیں لکھتے ہیں اور تاریخ کھنگالتے ہیں۔"

"ارے واہ۔۔۔ نذر السلام صاحب! کیا کہنے۔۔۔ آپ کی معلومات تو قابل رشک ہیں۔"

"مجھے بھی یوں ہی اتفاقاً" معلوم ہوا تھا۔ ان کی بیوی کا کوئی رشتہ دار ان کے پاس پیغام لے کر آیا تھا۔ بے چارہ دو ڈھائی گھنٹہ باہر دھوپ میں سڑتا رہا۔ انہوں نے مصروفیت کا بہانہ کرکے ملنے سے ہی انکار کردیا۔

میں سائیکل سے گھر واپس جارہا تھا تو اسے پانی کے دو گھونٹ پلادیے اور بس اسٹینڈ تک چھوڑ دیا۔ اسی نے مجھے یہ سب کچھ بتایا تھا۔ اللہ جانے سچ ہے یا جھوٹ۔" تب ہی کلاس شروع ہونے کی اطلاع دیتی گھنٹی بجتی چلی گئی اور وہ دونوں بھی اپنی اپنی کلاس لینے چلے گئے۔

☼ ☼ ☼

صرف ان پڑھ ہونا ہی محسنہ کا واحد جرم نہیں تھا۔ شاکر علی کے مقابلے میں محسنہ کا رنگ و روپ بھی واجبی سا تھا۔ وہ بدصورت تو نہیں تھیں۔ چہرے پر نمک تھا اور نین نقش تیکھے تھے لیکن اپنے شوہر کے ساتھ کھڑے ہوکر ان کی شخصیت دب سی جاتی۔ شاکر علی دراز قد' خوش شکل اور خوش لباس تھے۔ پر خوش مزاج ہرگز نہیں تھے۔ شاکر علی ان سے محبت نہیں کرتے تھے اور نہ ہی ان کی رائے کو اہمیت دیتے تھے۔ اوپر سے محسنہ انبالے کی زبان میں گفتگو کرتی انہیں زچ کردیتی تھیں۔ اب محلے داروں سے بول چال بڑھتے' ان کی انبالوی گفتگو میں پنجابی زبان کا بے دھڑک لہجہ بھی آسمایا تھا۔ یوں سر سے پاؤں تک وہ شاکر علی کے لیے ناقابل برداشت ہوچکی تھیں۔ ان کا توہین آمیز رویہ مہ جبیں کی پیدائش کے بعد بھی نہیں بدلا تھا۔ محسنہ نے بھی خاموش رہنا چھوڑ دیا۔ یوں گھر میں آئے دن جھگڑا بڑھنے لگا۔ شاکر صاحب سکون سے اپنا کام نہیں کرپاتے تھے۔ کالج میں بھی ان کی کارکردگی متاثر ہورہی تھی۔ اس لیے انہوں نے اپنا تبادلہ دوسرے شہر کے گورنمنٹ کالج میں کروالیا اور اپنا سامان لے کر وہاں ہاسٹل میں منتقل ہوگئے۔ شاکر علی مہینہ ڈیڑھ مہینہ بعد چکر لگاتے اور پیسے کبھی خود اور کبھی ڈاک سے بھجوادیتے۔

ہاسٹل میں رہتے ہوئے ان کی تنخواہ کا زیادہ حصہ اپنی ذات کے لیے مختص تھا۔ کچھ ہفتہ وار غیر ملکی جریدے باقاعدگی سے خریدا کرتے تھے۔ اچھے سے اچھا لباس پہنتے اور بے فکری سے زندگی گزارتے۔ وہاں لاہور میں محسنہ کس طرح بچوں کو پال رہی تھیں یا انہیں کن مسائل کا سامنا تھا۔ شاکر علی نے کبھی سوچنے کی زحمت گوارا نہیں کی تھی۔

ازدواجی زندگی کے تیرہ سال گزر جانے کے بعد ان کی توجہ گھر کی جانب مبذول ہونے لگی۔ جس کی وجہ ان کی بیٹی نازنین کی پیدائش تھی۔ ان دنوں وہ اتفاق سے لاہور آئے ہوئے تھے۔ دائی نے محسنہ کے کمرے سے باہر آکر صحن میں اخبار کا مطالعہ کرتے شاکر علی کو متوجہ کیا اور کپڑے میں لپٹی سرخ و سفید بچی ان کے سامنے کرتے ہوئے مبارک باد دی۔ شاکر علی بچی کی صورت دیکھ کر بے اختیار اس کی جانب کھنچے چلے آئے۔ بچی بے حد خوب صورت تھی۔ شاکر صاحب کو اس میں اپنی جھلک دکھائی دے رہی تھی۔ ان ہی کی طرح صاف شفاف رنگت' کشادہ پیشانی اور بڑی بڑی آنکھیں۔۔۔ وہ ہوبہو باپ کی طرح تھی۔ انہوں نے فوراً" اسے اپنی گود میں لے کر سینے سے لگالیا۔ اس کا نام بھی انہوں نے ہی رکھا تھا۔ نازنین۔۔۔ وہ اس لحاظ سے خوش قسمت تھی کہ باقی بچوں کے مقابلے میں اسے باپ کی محبت اور توجہ زیادہ ملی۔ شاکر علی اب ہر ہفتے گھر کا چکر لگانے لگے۔

جب نازنین تین سال کی ہوئی تو محسنہ ایک بار پھر امید سے ہوگئیں۔ اب بھی بیٹی ہی پیدا ہوئی۔ تابندہ۔۔۔ لیکن اس کے حصے میں بھی باپ کی وہ محبت نہ آئی' جو خاص نازنین کے لیے امڈ آئی تھی۔ شاکر علی اسے ہر دم اپنے ساتھ رکھتے' اس سے اردو اور انگریزی میں باتیں کرتے اور بولنا سکھاتے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ ان کے بڑے بچوں کی دیکھا دیکھی نازنین بھی پنجابی لہجے میں انبالہ کی زبان بولے۔ وہ اس کے لیے خصوصی طور پر اردو اور انگریزی کے قاعدے اور کہانیاں لاتے تھے اور اپنے ساتھ بٹھا کر اسے پڑھاتے تھے۔ ان کا لاڈ پیار صرف کتابوں تک محدود نہیں تھا۔ وہ اسے اپنے ساتھ بازار لے کر جاتے اور اسے بہترین لباس اور جوتے خرید کردیتے۔ اسے ہر وہ چیز میسر تھی' جو دوسرے بچوں کے نہیں تھی۔ ان کا غیر منصفانہ

رویہ طارق کو بہت کھلتا تھا۔ وہ ماں سے جب بھی شکایت کرتا۔ وہ اسے اپنے طور پر سمجھا بجھا کر چپ کروا دیتی تھیں۔ ان کے لیے یہ ہی کافی تھا کہ اتنے سالوں بعد ہی سہی 'شاکر علی نے گھر میں ٹکنا تو شروع کیا۔ شاکر علی صرف ناز کی خاطر گھر آنے لگے تھے۔ پھر گھر کے معمولات پر بھی اعتراض کرنے لگے تھے۔

"تمہارے بہنوئی کس خوشی میں تشریف لائے تھے۔ بڑا لہک لہک کر باتیں کر رہے تھے۔ مجھے دیکھا تو دروازے سے ہی بھاگ لیے۔" محسنہ نے ناگواری سے انہیں دیکھا۔ انہیں اندازہ ہی نہیں تھا۔ وہ کتنی بے ہودہ بات کر رہے تھے۔

"گاؤں سے پھل آئے تھے۔ وہ دینے آیا تھا الیاس۔"

"اونہہ!" انہوں نے پھلوں کی ٹوکری کو لات ماری اور پاؤں پٹختے ہوئے چلے گئے۔

☼ ☼ ☼

نازنین نے صرف شکل و صورت ہی نہیں 'مزاج بھی شاکر علی جیسا ہی پایا تھا۔ ضدی 'خود پسند 'خود غرض اور بے حد مغرور۔ شاکر صاحب نے ہر دم اپنے سلوک سے اسے یہی احساس دلایا تھا کہ وہ اپنے بھائی 'بہنوں سے برتر ہے اور باپ کی شفقت اور پیسے کے ساتھ ساتھ ہر بہترین چیز پر صرف اسی کا حق ہے۔ یہ شاکر صاحب کی محبت کا ہی اثر تھا کہ نازنین اپنے سوا کسی کو خاطر میں نہیں لاتی تھی۔ جس طرح وہ اس کے علاوہ اپنے کسی بچے سے پیار نہیں کرتے تھے 'اسی طرح نازنین نے بھی اپنے بھائی 'بہنوں کو کبھی اہمیت نہیں دی تھی۔ وہ تو اپنی ماں کو بھی باپ کے نظریے سے پرکھتی تھی۔

"جھوٹھ بول دی اے... جوٹھیے آکاش وانی اے۔" طارق لہک لہک کر گاتا جا رہا تھا۔

65ء کی جنگ ختم ہوئے تین سال گزر گئے تھے 'پر ان دنوں ریڈیو پر تواتر سے چلنے والے گیت بچے بچے کو منہ زبانی یاد ہو گئے تھے۔ طارق اپنی سائیکل کے پہیے رگڑ رگڑ کر دھوتا یہ گیت گا رہا تھا۔ شاکر علی کہیں باہر سے آ رہے تھے۔ گھر میں داخل ہوتے ہی ان کی نظر اپنے اکلوتے بیٹے پر پڑی اور ان کی تیوریاں چڑھ گئیں۔ طارق کی مسیں بھیگنے لگی تھیں۔ چہرے سے بچپنا غائب ہوتا دکھائی دے رہا تھا۔ جوان ہوتے بیٹے کو دیکھ کر بھی شاکر علی کی پدرانہ محبت نہیں جاگی تھی... وہ اپنے بیٹے کا حلیہ اور حرکتیں سخت ناپسند کرتے تھے۔ نہ تو وہ پڑھنے لکھنے کا شوقین تھا' نہ ہی اس نے کبھی باپ کی خوشامد کی تھی۔ اس کا تعلق صرف ماں سے تھا۔ نازنین سے زیادہ وہ تابندہ کا خیال رکھتا تھا۔ اسے گود میں اٹھاتا 'پیار کرتا تھا اور اپنی سائیکل پر سیر بھی کرواتا تھا۔ باپ کی بے اعتنائی پر... جلنے کڑھنے کے بجائے تینوں نے اسے خاموشی سے قبول کر لیا تھا۔ مہ جبیں' طارق اور تابندہ 'انہوں نے باپ سے کوئی امید نہیں باندھی تھی' نہ ہی کوئی مطالبہ کیا تھا۔ نازنین کے ساتھ ان کے خصوصی رویے کو دیکھ 'اگر کبھی کوئی احساس محرومی پیدا ہوا بھی تھا تو بھی اس کا شکوہ انہوں نے شاکر علی سے کبھی نہیں کیا تھا۔

شاکر علی نازنین کو پڑھا رہے تھے۔ تب ہی اس نے اپنی اردو کی نوٹ بک کھول کر انہیں دکھائی۔ "یہ دیکھیے اباجی! میں نے نظم لکھی ہے... پوری کلاس کو سنائی... مجھے انعام بھی ملا تھا۔" شاکر صاحب نے اسے شاباش دیتے ہوئے نوٹ بک ہاتھ میں لے لی۔

"71ء کا المیہ" عنوان پڑھتے ہی وہ چونک کر سیدھے بیٹھ گئے۔

اور پوری توجہ سے دو صفحوں پر مشتمل وہ نظم پڑھنے لگے۔ اس نظم میں ایک ایسے شخص کا احوال تھا' جس کا پورا خاندان بنگلہ دیش میں رہ گیا تھا۔ وہ اپنے پیاروں کو یاد کرتے ہوئے اپنے دکھ کا اظہار کر رہا تھا۔ سندر بن کے جنگل' بنگال کے سیاہ لمبے بالوں والی سانولی سلونی لڑکیاں اور ڈھاکے کی ململ... اس نظم میں ہر چیز کا ذکر تھا۔ شاکر علی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ نازنین ان کا فخر تھی اور انہوں نے اس پر جتنی محنت کی تھی' اس کا اثر صاف نظر آنے لگا تھا۔

☼ ☼ ☼

محسنہ' نازنین کی چھٹی کے وقت اسکول اسے لینے آئیں تو وہ اپنی سہیلیوں کے جمگھٹے میں کھڑی باتوں میں مصروف تھی۔ اس نے ماں کو نہیں دیکھا تھا۔ پیچھے سے اس کی ہم جماعت نے آکر اس کا کندھا تھپتھپایا۔

"ناز! تمہاری امی تمہیں ڈھونڈ رہی ہیں... وہ وہاں درخت کے پاس کھڑی ہیں۔"

اس کی ایک دوست نے حیران ہو کر کہا۔

"یہ تمہاری امی ہیں؟ لگتی تو نہیں... تم اتنی پیاری ہو' تمہارا رنگ بھی گورا ہے 'مگر یہ تو..." اتنے میں محسنہ کو بھی ناز نظر آ گئی۔

"ہاں... مجھے ہر کوئی یہی کہتا ہے' مجھے بھی لگتا ہے' یہ میری سوتیلی ماں ہیں۔" وہ ہنستے ہوئی مڑی تو ٹھٹک گئی۔ محسنہ کا فق چہرہ بتا رہا تھا کہ وہ اس کا فقرہ سن چکی ہیں۔ نازنین کو اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔

وہ نازنین تھی... جس کی تربیت شاکر علی نے کی تھی اور ورثے میں ذہانت اور خوب صورتی کے ساتھ بے حسی اور تکبر بھی منتقل کیا تھا۔ اس تکبر نے نازنین کو جہاں اعتماد سے نوازا تھا۔ وہیں تھوڑا بہت تنہا بھی کر دیا تھا۔ اس کی ماں' بہنوں اور بھائی سے کسی قسم کی جذباتی وابستگی نہیں تھی۔

☼ ☼ ☼

مہ جبیں کے لیے اس کی سہیلی کے سسرال سے رشتہ آیا تھا۔ لڑکے والے آئے تو شاکر صاحب ان سے مل کر بہت خوش ہوئے۔ اچھے سلجھے ہوئے لوگ تھے' پڑھا لکھا خاندان تھا۔ اس رشتے میں بظاہر کوئی خامی نہیں تھی۔ اگلا مرحلہ لڑکے کے گھر جانے کا تھا۔ جسے شاکر علی نے اکیلے ہی طے کرنے کا فیصلہ کیا۔ محسنہ جیسی سادی عورت کی رائے کی ویسے بھی ان کی نظر میں کوئی اہمیت نہیں تھی۔ محسنہ کو ان کے اس فیصلے پر کوئی اعتراض نہ ہوا' اچھا تھا' وہ مہ جبیں کو بھی اپنی ذمہ داری سمجھ رہے تھے' بھلے دیر سے ہی سہی۔

شاکر صاحب کو لڑکا پسند آیا تھا۔ اس نے امریکا میں امیگریشن کے لیے اپلائی کر رکھا تھا۔ خاصا پڑھا لکھا اور قابل لڑکا تھا اور نہایت پر امید بھی کہ اسے ضرور بلوا لیا جائے گا۔ رشتہ طے ہو گیا اور شادی بھی جلد کر دی گئی۔ محسنہ بڑی بیٹی کی رخصتی پر بہت روئی تھیں۔ اس نے ہمیشہ ماں کا احساس کیا تھا اور دعائیں سمیٹی تھیں۔ مہ جبیں کے شوہر نے شادی ہوتے ہی اس کے کاغذات بھی جمع کروا دیے۔ اب یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ شوہر کے ساتھ اس کا بھی ویزا لگ گیا اور وہ دونوں امریکا چلے گئے۔

ان کی دیکھا دیکھی شاکر صاحب کو بھی شوق چرایا اور کچھ دوستوں سے مشورے کے بعد انہوں نے امریکن یونیورسٹی میں جاب کے لیے اپلائی کر دیا۔ تین مہینے بعد ان کا بلاوا آ گیا۔ پیسوں کا انتظام ہوتے ہی شاکر علی امریکا سدھار گئے۔ جاتے ہوئے ان کا دل محسنہ سے زیادہ نازنین کے لیے پریشان تھا۔ لیکن آفر اتنی پرکشش تھی کہ انہیں جانا پڑا۔ سو ہر ذمہ داری کو پس پشت ڈال کر شاکر علی امریکا کے ہو گئے۔ وہاں سے ہر مہینے محسنہ کے نام ایک مناسب رقم کا ڈرافٹ نازنین کے لیے خط ہوا کرتا تھا۔ شاکر صاحب نے وہاں بھی کتابیں لکھنا جاری رکھا تھا۔ اضافی آمدنی سے وہ ناز کے لیے کپڑے' جیولری اور کتابیں بھجوایا کرتے تھے اور ہر وہ چیز جس کا نازنین اپنے خط میں مطالبہ کیا کرتی تھی۔

"ہائے امی جی! کتنے پیارے کلپ ہیں' یہ میں لے لوں۔" تابندہ پارسل کھلتے ہی رنگا رنگ کلپس دیکھ کر مچل گئی۔

"نا... رہن دے..." محسنہ نے حقارت سے وہ پیکٹ پرے کیا۔ "یہ تیرے اباجی نے اپنی لاڈلی کے لیے بھجوائے ہیں گے۔ تو حرص نہ کر... پراں کر دے۔" محسنہ چاہ کر بھی آنے والی سوغات میں سے تابندہ کے لیے کچھ نکال نہیں سکتی تھیں۔ نازنین کا شاکر علی سے رابطہ رہتا تھا۔ اگر وہ باپ سے شکایت کر دیتی تو محسنہ کو ملنے والے ماہانہ خرچ میں کمی بیشی کا دھڑکا تھا۔

"پر امی جی! میرے پاس تو ایسا ایک بھی کلپ نہیں

ہے۔ ناز باجی کی تو پوری دراز بھری پڑی ہے۔" تابندہ کے لہجے میں حسرت تھی۔

"میری بٹی اللہ سے دعا کر' وہ تجھے ہور چنگی چیز دیوے گا۔ اسے واپس ڈال دے۔ فضول میں لڑے کی تجھ سے۔"

"ساری چیزاں ناز باجی کو ملتی ہیں... ہمارے لیے کچھ نہیں بھیجتے ابا جی۔" دس سال کی معصوم بچی روتے ہوئے اٹھی اور کمرے سے باہر نکل گئی۔ محسنہ دکھی دل سے اسے جاتا دیکھتی رہیں۔ دوسرے کمرے میں بیٹھے طارق نے یہ سب باتیں سنی تھیں اور روتی ہوئی تابندہ کو گلے لگا کر تسلی دی تھی۔

"میری گڑیا! روؤ نہیں' جب میں باہر جاؤں گا تو صرف تمہارے لیے چیزیں بھیجوں گا۔"

طارق نے مہ جبیں سے اسپانسر شپ کے لیے کہہ رکھا تھا۔ اس کے کاغذات بن رہے تھے۔ وہ اپنے باپ کی ناانصافی بچپن سے دیکھ رہا تھا۔ اسے اپنی ماں' بہنوں کا احساس تھا۔ وہ امریکا جا کر پیسے کمانا چاہتا تھا۔ تاکہ ماں کو باپ کے سامنے ہاتھ پھیلانے سے منع کر سکے۔ مہ جبیں کے شوہر نے طارق کو اسپانسر کیا اور پھر ایک دن طارق بھی ماں' بہنوں کو چھوڑ کر امریکا چلا گیا۔ لیکن وہ اپنے ابا جی کے پاس نہیں گیا تھا اور نہ ہی شاکر علی نے اسے بلانے کی کوشش کی تھی۔ طارق نے تعلیم مکمل نہیں کی تھی۔ اس نے بہن کے گھر رہتے ہوئے مختلف کام کرنے شروع کیے۔ ورک پرمٹ کی بدولت اسے کام حاصل میں کسی دقت کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ لیکن بہن کے گھر ٹھہرنا بھی اسے گوارا نہ تھا۔ وہ نیو جرسی چلا گیا اور ٹیکسی ڈرائیور بن گیا۔ کچھ پاکستانی لوگوں کے ساتھ ایک اپارٹمنٹ شیئر کیا' پھر ایک جنرل اسٹور میں سیلز مین کی نوکری حاصل کر لی۔ ہر روز گاہکوں سے بات چیت کرتے اسے امریکن انگلش بولنا آ گئی۔ یہ پیشہ اسے راس آ گیا تھا۔ اب وہ گھنٹوں کے حساب سے ڈالر کمانے لگا۔

محسنہ کو ملنے والی رقم میں دن بدن اضافہ ہو رہا تھا۔ گھر کے حالات بہتر ہونے لگے۔ اب وہ بیٹیوں کی شادی کے لیے جوڑ رہی تھیں۔

نازنین اے گریڈ کے ساتھ ایف اے کر چکی تھی اور اب میو اسکول آف آرٹ میں داخلے کے لیے اپلائی کر رکھا تھا۔ داخلے کے ڈرائنگ' انگلش اور میتھس کے ٹیسٹ اس نے باآسانی کلیئر کر لیے اور اسے اپنے من پسند کالج میں داخلہ مل گیا۔ جہاں بھیجنے کے لیے محسنہ ہرگز راضی نہ تھیں۔ اس نے باپ کو خط لکھ کر اجازت لے لی اور وہی کیا' جو وہ چاہتی تھی۔

کالج بھیجتے ہوئے جب محسنہ نے اسے چادر اوڑھنے کا کہا تو اس نے صاف انکار کر دیا۔ محسنہ سوائے سر پیٹنے کے اور کیا کر سکتی تھیں۔

☼ ☼ ☼

"یہ سامان کس نے بھجوایا ہے؟" ناز کالج سے واپس آئی تو دیکھا تابندہ صحن میں رکھے تخت پر کچھ امپورٹڈ چیزیں لے کر بیٹھی تھی۔

"طارق بھائی نے بھجوایا ہے۔" تابندہ کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ نازنین اس کی طرف توجہ دینے کے بجائے سامان کی طرف لپکی۔

"اچھا... کیا کیا بھیجا ہے' دکھاؤ۔" اس نے جھٹ پٹ تمام چیزیں الٹ پلٹ کر دیں۔ "یہ کلپس اور سلیپرز تو میں لوں گی۔" وہ اپنی پسند کی چیزیں اٹھانے لگی تھی۔ اسی لمحے محسنہ باورچی خانے سے باہر آئیں۔

"یہ سامان طارق نے تابندہ کے واسطے بھجوایا ہے' واپس رکھ۔" نازنین نے ان کی بات سن کر خشمگیں نگاہوں سے تابندہ کو دیکھا جو ہاتھ میں کچھ خوش رنگ ربنز اور مصنوعی پھولوں سے سجے کلپس اور کیچرز پکڑے بیٹھی تھی اور رو رہی تھی کہ طارق نے اس کی معصوم خواہش یاد رکھی تھی اور کس محبت سے اپنا وعدہ نبھایا تھا۔

"بڑا بے دید ہے' میرے لیے کچھ نہیں بھیج سکتا تھا۔" ناز کا پارہ چڑھ چکا تھا۔ مگر تابندہ نے فوراً" ناز کے آگے چیزیں رکھ دیں۔ "امی جی! نہ ڈانٹو ناز باجی کو... لے لو باجی' تمہیں جو اچھا لگے' لے لو۔"

"مجھے نہیں چاہیے۔ ایویں فقیروں والی' ہونہہ... ایک بھی چیز میرے ابا جی کی بھیجی چیزوں کے پاسنگ نہیں ہے' یہ تو اپنے پاس ہی رکھ... دو ٹکے کا سامان' ہونہہ..." وہ حقارت سے کہتی ہوئی اپنے کمرے میں چلی گئی۔ کمرے میں جا کر بھی اس کے دل میں ابال اٹھتے رہے۔ اسے ان چیزوں کو نہ ملنے کا اتنا افسوس نہیں تھا' جتنا خود کو نظر انداز کیے جانے پر تھا۔

اگلی صبح تابندہ نے اسکول جانے سے پہلے کلپس والا تھیلا کھولا تو اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ تمام کلپس ٹوٹے ہوئے تھے اور ربنز قینچی سے کتر دیے گئے تھے۔

☼ ☼ ☼

ناز کے سامنے کچھ پرانے میگزین کھلے پڑے تھے۔ اس نے 67ء کا LIFE میگزین اٹھایا۔ جس کے سرورق پر الزبتھ ٹیلر کی تصویر کے نیچے اس کے شوہر رچرڈ برٹن کے تاثرات شہ سرخیوں میں نمایاں تھے۔

Liz.... my nagging scherning seductive honest wife (لز... میری نکتہ چیں' سازشی مرغوب اور ایمان دار بیوی) اندرونی صفحات میں اس حسین جوڑے کی کچھ تصاویر دی گئی تھیں۔ ناز نے وہ صفحات اپنے سامنے رکھے اور آئینے کے روبرو کھڑے ہو کر خود کو دیکھنے لگی۔ ہر زاویے سے خود کو دیکھنے کے بعد اس کی گردن تفاخر سے اکڑ چکی تھی۔ کچھ اثر عالیہ کی تعریف کا بھی تھا۔ جس کے ساتھ وہ آج پورا دن گزار کر آئی تھی۔

عالیہ اس کی نئی سہیلی تھی۔ نازنین نے فائن آرٹس لے رکھا تھا' جبکہ عالیہ مجسمہ سازی کی کلاس میں تھی۔ مزاجاً" کافی بے حجاب اور منہ پھٹ لڑکی تھی۔ سرعام اپنے دوستوں کے ساتھ سگریٹ پھونکتی نظر آتی تھی۔ اس کا تعلق نہایت امیر خاندان سے تھا اور بڑی سی کوٹھی میں رہتی تھی۔

شاکر علی کے چلے جانے کے بعد نازنین کو گھر میں سراہنے والا کوئی نہیں تھا۔

نازنین اکثر عالیہ کے ساتھ بازار جاتی تھی۔ عالیہ کے پاس اپنی کار تھی۔ وہ خود ڈرائیو کرتی تھی۔ اس دن وہ ناز کو کالج کے بعد اپنے گھر لے گئی تھی۔ نازنین اس کے ٹھاٹ باٹ رشک سے دیکھتی اس کے بیڈ روم میں داخل ہوئی۔ "تمہارا گھر بہت خوب صورت ہے' کاش میرا گھر بھی ایسا ہوتا۔" اس نے تعریف کے ساتھ اپنی حسرت کا اظہار بھی کر دیا۔

"فکر نہ کرو ڈارلنگ... کسی امیر آدمی سے شادی کر کے تم بھی لاکھوں کی مالک بن سکتی ہو۔ پھر تم بھی ٹھاٹ سے رہنا۔"

"یار ہم جیسوں میں کوئی ہم جیسا ہی آئے گا نا۔" ناز نے اپنی حیثیت کو خود ہی طعنہ دیا۔

"ارے نہیں... تم جیسی حسین و جمیل لڑکی کو حاصل کرنے کے لیے تو شہزادے لائن میں لگ کر آتے ہیں... سوالی بن کر... تم دیکھنا تو سہی... کیسے کیسے طلب گاروں کا جمگھٹا لگتا ہے۔" اس کی بات سن کر نازنین اٹھلا کر آئینے کے سامنے کھڑی ہو گئی۔

"تم نے کیا خود کو کبھی غور سے نہیں دیکھا۔ قیامت لگتی ہو' قسم خدا کی' جو بھی دیکھے دیوانہ ہو جائے' اپنا گریبان چاک کر کے گلیوں میں ناز ناز پکارتا پھرے۔" ناز کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

عالیہ کے منہ سے اپنی تعریف سن کر ایک نشہ جیسے دل و دماغ پر چڑھ رہا تھا۔ خمار چھاتے چھاتے رک سا گیا۔ جب محسنہ نے اس کے دروازے پر دستک دی۔

"کیا ہے؟" وہ جھلا کر پیر پٹختی دروازے کے پاس آئی۔

"آہستہ بول" محسنہ نے فوراً" گھر کا۔ "ادھر مہمان آئے ہیں گے' چل چائے لے کر آجا۔"

تابندہ نے باورچی خانے سے باہر آ کر ٹرے اس کے ہاتھ میں پکڑا دی۔ ناچار اسے ماں کی بات پر عمل کرنا ہی پڑا۔

مہمانوں کو رخصت کر کے محسنہ نے اسے آنے والے رشتے کی تفصیل سے آگاہ کیا۔ "بھلے لوگ ہیں

گے۔ لڑکا بینک میں ملازم ہووے' پانچ ہزار روپے تنخواہ ہے۔" ماں کے مزید کچھ کہنے سے قبل ہی اس نے تڑخ کر اپنا فیصلہ سنا دیا۔

"مجھے نہیں کرنی ایسے پھٹیچر لوگوں میں شادی اور شکل دیکھی تھی ماں' بہنوں کی۔ لڑکا بھی کالے کوے جیسا ہو گا۔۔۔ ہونہہ۔۔۔ اتنا ہی شوق ہو رہا ہے تو اپنی لاڈلی کو بیاہ دو۔۔۔ وہی جچے گی ایسے لوگوں میں۔" ناز نے اپنے کپڑے نکالے اور غسل خانے میں چلی گئی۔

محسنہ افسوس سے گردن ہلاتی اس کے کمرے سے باہر نکل آئیں۔ شاکر علی نے امریکا جانے کے بعد دوبارہ واپسی کا راستہ نہیں دیکھا تھا۔ چار سال پہلے اطلاع بھجوائی تھی کہ دل کا دورہ پڑا ہے۔ جس کے بعد اب ان کا اتنا لمبا سفر کرنا ناممکن ہے۔ ڈاکٹر اجازت نہیں دے رہے۔ دونوں بیٹیوں کی ذمہ داری محسنہ کی تھی۔ نازنین دن بدن بے لگام ہوتی جا رہی تھی۔ باپ نے بگاڑنے میں تو کوئی کسر نہ چھوڑی تھی۔ منہ زور' لاڈلی کو سنبھالنے کے لیے' خود موجود نہ تھے۔ محسنہ کی تو راتوں کی نیند اڑ چکی تھی۔

☼ ☼ ☼

نازنین کی سہیلی آسیہ کی شادی تھی۔ محسنہ نے اس شرط پر اجازت دی کہ ہمسائی خالہ رشیدہ اس کے ساتھ جائیں گی۔ واپسی کا انتظام آسیہ کی طرف سے تھا۔ وہ اپنے بھائی کی وین میں سب سہیلیوں کو ان کے گھر بھجوانے کا وعدہ کر چکی تھی۔ نازنین کو خالہ رشیدہ کے ساتھ چلنے پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ خالہ رشیدہ کو اس کے سر پر سوار رہنے کا قطعی شوق نہیں تھا۔ وہ رونق میلہ اور پلاؤ قورمہ کی دعوت پر ہی راضی تھیں۔

مہندی کی شام چھ بجے وہ خوب بن ٹھن کر رکشے میں سوار ہوئی اور آسیہ کے گھر جا پہنچی۔ نازنین ہمیشہ کی طرح خوب دل لگا کر تیار ہوئی تھی۔ سرخ چوڑی دار پائجامہ اور سبز پشواز کے ساتھ چنا ہوا دوپٹا' کانوں میں کندن کے آویزے' چوڑیوں سے بھرے ہاتھ اور سونے جیسے پاؤں میں چاندی کی پازیب چھنک رہی تھی۔ طیبہ نے پیلا جوڑا پہن رکھا تھا۔ اس کا میک اپ ناز نے کیا تھا۔ وہ بھی اچھی لگ رہی تھی۔ پر ناز کے سامنے کسی کا ٹھہرنا ذرا مشکل ہی تھا۔ خالہ رشیدہ اپنی سونف سپاری کی مخملی پوٹلی اٹھائے ان کے پیچھے چل رہی تھیں۔ مکان کی دیواروں اور باغیچہ کی سبز جھاڑیوں پر سرخ اور سبز قمقمے جگمگا رہے تھے۔

ڈھولک کی تھاپ کے ساتھ نوعمر لڑکیوں کی باریک اور بے سری آوازیں گھر کی چوکھٹ پار کر چکی تھیں۔ ہر طرف چہل پہل اور کھلکھلاہٹیں تھیں۔ ناز اور طیبہ نے خالہ رشیدہ کو مہندی کے تھال سجاتی ایک بوا کے ساتھ پنڈال میں بٹھایا اور بالا خانے میں آسیہ کے کمرے کی طرف بڑھ گئیں۔ تمام لڑکیاں بالیاں فی الحال وہیں گانوں کی مشق کر رہی تھیں۔ ناز اور طیبہ بھی ان ہی میں شامل ہو گئیں۔

کچھ دیر بعد صبیحہ بیگم نے آسیہ کے کمرے میں آ کر تمام لڑکیوں کو متوجہ کیا۔

"چلو لڑکیو۔۔۔ لڑکے والے آ گئے ہیں' پھولوں والی پلیٹیں لے کر نیچے آ جاؤ۔" یہ کہنے کے بعد جیسے وہ ہی پلٹیں انہیں۔ اپنے پیچھے ایک آواز سنائی دی۔

"چلو بھئی۔۔۔ پولیٹیں لے کر نیچے آ جاؤ۔" ایک لڑکی ان کی آواز اور لہجے کی نقل اتارتے ہوئے تمسخر اڑا رہی تھی۔ انہوں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ ایک نظر میں انہیں معلوم ہو گیا کہ وہ لڑکی کون ہے۔ وہ فوراً اس لڑکی کے مقابل آ کھڑی ہوئیں۔

"میں نے پلیٹیں کہا ہے۔ پولیٹیں نہیں۔ زیادہ شوخی میں آنے کی ضرورت نہیں ہے لڑکی!"

صبیحہ بیگم کی ڈانٹ سن کر سب لڑکیاں تھوڑی سی شرمندہ ہو گئی تھیں کہ پولیٹیں والے مذاق پر سب کے جان دار قہقہے برآمد ہو گئے تھے لیکن اس لڑکی پر کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ وہ نہایت اعتماد سے ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی۔

"آپ نے پولیٹیں ہی کہا تھا۔ کان خراب نہیں ہیں میرے۔" یہ کہہ کر اس نے اپنا ہاتھ اٹھا کر انہیں راستہ دینے کا کہا۔ "نیچے جانا ہے ہمیں' راستے سے ہٹ جائیں۔" صبیحہ بیگم تیورا کر وہاں سے جانے کے لیے مڑیں۔

"ہونہہ۔۔۔ بڈھی مائی کو بڑا شوق ہو رہا تھا رعب جھاڑنے کا۔"

یہ جملہ بھی صبیحہ بیگم کی سماعتوں سے محفوظ نہیں رہ پایا تھا لیکن وہ چپ چاپ آگے بڑھ گئیں۔ آسیہ کے سب گھر والوں کو وہ اچھی طرح جانتی تھیں اور رشتہ داروں میں بھی ان کی سب سے جان پہچان تھی۔ یہ لڑکی یا تو پڑوس کی تھی یا پھر کوئی سہیلی' جو بھی تھی اچھی خاصی بدلحاظ اور بدتمیز تھی۔ صبیحہ بیگم نے اس سے مزید الجھنا مناسب نہیں سمجھا۔

☼ ☼ ☼

دولہا والوں کے استقبال میں لائن سے کھڑی لڑکیاں پرشوق نگاہوں سے گلی کے نکڑ سے آگے بڑھتے مہمانوں کی جانب دیکھ رہی تھیں۔ قدسیہ بھی ان میں شامل تھیں۔ سب کے ہاتھ میں پھولوں کی پتیوں سے بھری پلیٹیں تھیں۔ آتش بازی جاری تھی۔ زمین پر دھم دھما دھم ڈھول بجاتے رقص کرتے میراثی مہندی لاتے دولہا والوں سے آگے آگے ان کی آمد کا اعلان کرتے جا رہے تھے۔

قدسیہ نے ساتھ کھڑی ایک انجان لڑکی سے یوں ہی پوچھ لیا۔

"سنیں۔۔۔ میری لپ اسٹک ٹھیک ہے۔" وہ اپنی لپ اسٹک کے پھیل جانے کا اندیشہ کر رہی تھی۔ تب ہی پوچھ بیٹھی' لیکن بہت جلد اسے اندازہ ہو گیا کہ اس نے غلط لڑکی سے پوچھ لیا تھا۔ اس لڑکی نے پہلے سر سے پاؤں تک قدسیہ کا معائنہ کیا' پھر اس کی لپ اسٹک کو غور سے دیکھتے ہوئے استہزائیہ لہجے میں گویا ہوئی۔

"آپ نے شاکنگ پنک کپڑوں کے ساتھ ریڈ لپ اسٹک لگا رکھی ہے اور سینڈلز پیلے رنگ کے پہنے ہوئے ہیں۔ بہتر تھا آپ کسی سے پوچھ کر بناؤ سنگھار کرتیں۔"

اس بے لاگ تبصرے نے قدسیہ کی پوری شام غارت کر دی تھی۔ باقی محفل میں وہ اپنے دوپٹے کا پلو جوتوں پر ڈال کر انہیں چھپانے کی کوشش کرتی رہی اور لپ اسٹک تو اس نے فوراً ہی پونچھ ڈالی تھی۔ اس کے باوجود وہ لڑکی ہر تھوڑی دیر میں اسے حقارت بھری نظروں سے دیکھے جا رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

کھانے کے بعد دولہا والے چلے گئے۔ آسیہ کے کمرے میں کزنز اور قریبی سہیلیاں ڈیرہ جما کر بیٹھ گئیں۔ کیسٹ پلیئر آن کیا اور گانے لگا کر رقص کیا جانے لگا۔ سب لڑکیاں ہنسی کھیل میں فلمی گانوں پر الٹا سیدھا ناچ کر خوش ہو رہی تھیں۔

صبیحہ بیگم نے قدسیہ کو نیچے بلوانے کے لیے عبید میاں کو گھر کے اندر بھیجا۔ وہ جانتی تھیں کہ آسیہ کے کمرے میں وہ بدلحاظ لڑکی ابھی تک موجود ہے اور انہیں دوبارہ اس کی شکل دیکھنے کا کوئی شوق نہیں تھا۔

عبید نے سیڑھیوں کی طرف بڑھتے فضلو کے ہاتھ سے شربت کی ٹرے زبردستی لے لی۔ آسیہ کے کمرے سے ملے گلے کی آوازیں نیچے تک آ رہی تھیں۔ یوں ہی عبید کو شوق ہوا کہ ایک نظر ناچتی گاتی حسیناؤں کا دیدار کیا جائے۔ وہ سنبھل کر سیڑھیاں چڑھتے آسیہ کے کمرے کے باہر کھڑا ہو گیا اور ٹرے زمین پر رکھ دی۔ دروازہ بھڑا ہوا تھا۔ انہوں نے ہلکا سا دباؤ ڈال کر جھری سے اندر دیکھنے کی کوشش کی۔ اچھل کود کر لڑکیاں خوب دل خوش کر لینے کے بعد تھک کر بیٹھتی جا رہی تھیں۔ تب ہی آسیہ نے ہاتھ اٹھا کر مطالبہ کیا۔

"چلو طیبہ! اب تم ڈانس کرو' تمہیں اچھا آتا ہے۔"

طیبہ کا سانس پھول رہا تھا۔ اس نے آسیہ سے کہا۔

"میں تھک گئی ہوں' میری جگہ نازنین تمہیں اچھا سا ڈانس کر کے دکھائے گی۔" پھر وہ ساتھ بیٹھی نازنین سے مخاطب ہوئی۔

"چلو اٹھو۔۔۔ اتنی دیر سے بیٹھی ہمارا ریکارڈ لگا رہی ہو۔ اب تمہاری باری ہے۔ چلو شاباش۔۔۔"

اور ناز کو اٹھتے ہی بنی۔ عبید نے تھوڑی دیر کے لیے دروازہ مکمل بند کرلیا۔ کچھ لمحوں بعد کھولا تو وہ لڑکی جس کا نام ناز تھا' سب لڑکیوں کے درمیان کھڑی دوپٹے کو گانٹھ لگا رہی تھی۔ عبید کو ابھی تک اس کا چہرہ نظر نہیں آیا تھا۔ اس کے لیے اسے دروازے کا پٹ تھوڑا اور کھولنا پڑتا' جس میں لازما" اس کے اپنے دیکھے جانے کا خطرہ تھا۔ تو بس جتنا ہے کافی ہے' کے مصداق وہ خاموش کھڑا نظارہ کرتا رہا۔ کیسٹ آن ہوا۔

چلتے چلتے یونہی کوئی مل گیا تھا۔

بڑی ادا سے وہ بل کھا کر پلٹی اور رقص شروع کردیا۔ عبید اس حسین لڑکی کو دیکھتا رہ گیا۔

ناز کے بدن میں لوچ تھا۔ انتہائی خوبی سے ہر لے پر اپنے اعضا کی شاعری کرتی وہ حاضرین پر سحر طاری کرنے لگی۔

گانا کب شروع ہوا اور کب ختم۔۔۔ عبید کو معلوم نہ ہوسکا۔ وہ تالیوں کی آواز سن کر ہوش میں آیا تھا۔ سب لڑکیاں نازنین کو تالیاں بجا کر داد دے رہی تھیں۔ جب ذرا شور تھما تو عبید نے زمین پر رکھی ٹرے اٹھائی اور آسیہ کو آواز دے ڈالی۔ پیلے جوڑے میں ملبوس آسیہ فورا" دروازے پر آئی اور عبیدالرحمان کو سامنے دیکھ کر پرجوش ہوگئی۔ پہلے شربت کی ٹرے اس کے ہاتھوں سے لے کر اندر پکڑائی' اسے بھی زبردستی اپنے ساتھ اندر لانا چاہا تو وہ گڑبڑا گیا۔

"نہیں آسیہ! امی بیگم نے قدسیہ کو بلوایا ہے' اسے بھیج دو' بس۔"

آسیہ نے ایک نہ سنی' کہنے لگی۔ "قدسیہ آپ کے ساتھ بعد میں جائے گی' پہلے ہمیں ایک اچھا سا گانا سنا دیں۔" عبید کے لاکھ نہ نہ کرنے کے باوجود وہ اسے کھینچ کر اندر لے ہی آئی اور پکڑ کر بٹھا دیا۔

"یہ لیں۔۔۔ شربت پییں اور ہمیں گانا سنائیں۔" آسیہ نے شربت کا گلاس تھما کر فرمائش کی۔

وہ کئی سال تک پڑوسی رہ چکے تھے۔ آسیہ اس کے شوق سے بخوبی آگاہ تھی۔ عبید کی آواز خوب صورت بھی تھی اور اسے سرتال کی بھی اچھی سمجھ تھی۔ ہر نئی فلم کے گانے اسے زبانی یاد ہوجایا کرتے تھے۔ آسیہ کی شادی تھی' پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ اس اہم موقع پر وہ اس سے گانا نہ سنتی۔ عبید نے بھی اپنی پرانی سامع کو مایوس کرنا مناسب خیال نہیں کیا۔

اس کی نگاہوں کے عین سامنے نازنین فرش پر بچھی چاندنی پر آکر بیٹھ گئی۔ اس کا چہرہ تمتما رہا تھا۔ سب لڑکیوں کی طرح وہ بھی ایک خوب صورت گیت کی منتظر تھی مگر عبید کا گیت ناز کے لیے تھا۔

جان بہاراں' رشک چمن
غنچہ دہن' سیمیں بدن
اے جان من۔۔۔!
اے ناز پرور' ناز آفریں
لاکھوں حسیں ہیں' تجھ سا نہیں
رنگیں ادا' توبہ شکن' اے جان من!

نازنین نے چونک کر اس کی طرف دیکھا تھا۔ یہ بول گاتے ہوئے عبید کی فریفتہ نگاہیں ناز کے چہرے پر مرکوز رہیں۔ حتیٰ کہ اسے یقین ہوگیا کہ وہ اس کی شان میں قصیدہ پڑھ رہا ہے۔ تعریف کا یہ انداز اس کے دل کو چھو گیا تھا۔ عبید اپنے دل کی بات کہہ کر مطمئن ہوگیا۔ جو پیغام اس کی آنکھوں نے نازنین کو دیا تھا' وہ اچھی طرح سمجھ گئی تھی۔

کب محفل برخاست ہوئی اور کب سب اپنے گھروں کو روانہ ہوئے۔ ان دونوں نے محسوس نہیں کیا تھا۔ وہ جس لمحے کی قید میں تھے۔ وہ انہیں دنیا و ما فیہا سے بے خبر کر گیا تھا۔ اپنے اپنے گھروں کو پہنچ کر بھی وہ دونوں ایک دوسرے کے ہمراہ تھے۔ وہ رات نازنین اور عبید کی زندگیوں کی پہلی خوب صورت رات تھی۔

☼ ☼ ☼

"آپ کہاں رہتے ہیں؟ ہمیں اپنا گھر نہیں دکھائیں گے؟" دہی بڑوں کی پلیٹ ہاتھ میں لیے ناز نے عبید سے کچھ عجیب سی فرمائش کر ڈالی۔ عبید کو اس کے اعتماد پر ذرا کی ذرا حیرت ہوئی' پھر وہ سنبھل کر بولا۔

"آپ ہمارے گھر والوں سے ابھی ملنا چاہتی ہیں؟"

"نہیں۔۔۔ میں صرف آپ کا گھر دیکھنا چاہتی ہوں۔" وہ دونوں گاڑی میں نیلا گنبد تک آئے تھے۔ عبید نے نازنین کو اس کے کالج سے پک کیا تھا۔ اپنی کلاس ختم ہونے کے بعد جب وہ گیٹ کے پاس پہنچی تو عالیہ اس کی طرف لپک کر آئی تھی اور اسے بتایا۔ "وہ گیٹ سے باہر میرون کرولا کھڑی ہے نا' اس میں جو شخص بیٹھا ہے وہ ابھی میرے پاس آکر تمہارا پوچھ رہا تھا۔"

ناز کو حیرت ہوئی۔ اس نے عالیہ کو ساتھ لیا اور گیٹ سے باہر نکل آئی۔ گاڑی میں عبید تھا۔

عالیہ کے ہمت دلانے پر نازنین اس کے ساتھ جاکر بیٹھ گئی تھی اور اب وہ دونوں دہی بڑے کھا رہے تھے کہ ناز نے اس کا گھر دیکھنے کی فرمائش کر ڈالی۔

عبید نے گاڑی اپنے گھر کی طرف لے لی تھی۔ راستے بھر نازنین اس سے مختلف سوال کرتی رہی۔ تعلیم اور کاروبار کے حوالے سے وہ اس کے تمام سوالوں کے جواب دیتا رہا۔ عبید جان گیا تھا کہ وہ اس کے اسٹیٹس کے بارے میں تفصیل جاننا چاہتی ہے۔ اس نے کار اور فیکٹری کا ذکر کرتے ہوئے اسے اپنی ملکیت کہا۔ ناز تھوڑا مطمئن ہورہی تھی۔ اسے کنگلے عاشق بہت ملے تھے' جو اس قابل بھی نہیں تھے کہ ناز انہیں پلٹ کر دیکھتی' لیکن عبید کا معاملہ کچھ اور تھا۔ وہ خوبرو تھا اور سب سے اہم بات مالی طور پر مستحکم تھا۔

اب گاڑی اس کے گھر سے ذرا فاصلے پر کھڑی تھی۔ عبید نہیں چاہتا تھا کوئی جان پہچان والا اسے ناز کے ساتھ دیکھے۔ نازنین کو اس کا گھر بھی پسند آیا تھا۔ کافی بڑی سی کوٹھی تھی۔ اپنے طور پر اسے سب کچھ ٹھیک ہی نظر آرہا تھا۔ واپسی میں عبید نے اسے کالج ہی ڈراپ کیا اور اگلی ملاقات کا وعدہ لے کر چلا گیا۔ نازنین کا گھر کالج سے نزدیک تھا۔ وہ پیدل آیا جایا کرتی تھی۔ راستے بھر اس کا ذہن مستقبل کے تانے بانے بنتا رہا۔

اس ایک ملاقات کے بعد ان کی اور بہت ملاقاتیں بھی ہوئیں۔ ہر ملاقات عبید کے شوق میں اضافہ کررہی تھی اور پھر عبید نے نازنین کو پروپوز کردیا۔

☼ ☼ ☼

قدسیہ چائے دینے مطیع الرحمٰن کے کمرے میں آئی تو اسے صبیحہ بیگم کی آواز سنائی دی جو دادی بیگم اور لاڈلی بیگم کو عبید اور گلناز کے رشتے کی بابت تفصیل بتا رہی تھیں۔ انہیں مطیع الرحمان کی حمایت حاصل تھی۔ طے یہ پا رہا تھا کہ عبید کے بزرگوں کی حیثیت سے اماں بیگم اور لاڈلی بیگم گلناز کا رشتہ مانگنے ان کے ساتھ چلیں۔ قدسیہ نے آواز دے کر اندر آنے کی اجازت مانگی اور سب کو چائے دے کر واپس ہولی۔ جوش و جذبات میں اس کے قدم زمین پر نہیں ٹھہر رہے تھے۔ وہ بھاگتی ہوئی گلناز کے پاس پہنچی اور اسے بازوؤں سے پکڑ کر پورا گھما ڈالا۔ گلناز بے چاری اپنی الماری ٹھیک کررہی تھی۔ اس افتاد سے گڑبڑا کر رہ گئی۔

"بس آج سے تم میری ناز بھابھی ہو۔۔۔ ٹھیک ہے گل باجی۔" گلناز اس کی بات سن کر شرما گئی اور سر جھکا لیا۔ قدسیہ کو اس کے حیران نہ ہونے پر حیرت ہوئی۔

"اچھا! تو تم پہلے سے جانتی تھیں۔ ہائے گل باجی! تم کتنی خراب ہو' مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا۔" قدسیہ منہ بنا کر اس سے مصنوعی خفگی کا اظہار کرتی رہی اور گلناز۔۔۔ اسے تو بس ہنسی آئے جارہی تھی۔

صالحہ نے رشتہ فورا" ہی منظور کرلیا تھا۔ دونوں گھرانوں میں مٹھائی کا تبادلہ ہوا اور بات پکی ہوگئی۔ عبید کو شام میں جب اس واقعے کی خبر ملی تو وہ پریشان ہوگیا۔ گھر کے بڑوں نے اسے آزمائش میں ڈال دیا تھا۔ مبارک بادیں وصول کرتے وہ صبیحہ بیگم کو اپنے کمرے میں لے گیا اور گلناز سے شادی سے انکار کردیا۔

صبیحہ بیگم کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ گھر میں جشن کا سا سماں تھا اور عبید میاں ان کے سر میں خاک ڈلوانے کا انتظام کررہے تھے۔ مطیع الرحمان کے

لاکھ ہنسنے پر بھی انہوں نے عبید سے پوچھنا ضروری نہ سمجھا تھا۔ ان کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہ تھی کہ عبید اپنی شادی کے لیے خود لڑکی ڈھونڈ لے گا۔ انہوں نے پیار محبت سے عبید کو سمجھانے کی کوشش کی' پر وہ نہ مانا۔ صبیحہ بیگم نے ناراضی دکھائی تو عبید پریشان ہو کر گھر سے باہر نکل گیا۔ جب تین دن تک وہ گھر واپس نہیں آیا ـــــ تو صبیحہ بیگم نے مطیع الرحمان کے سامنے روتے ہوئے اپنی ماں کی شکست کا اعتراف کر لیا۔ انہیں بیٹے کی جدائی برداشت نہ ہوئی۔ اب سوائے اس کی ضد مان لینے کے ان کے پاس کوئی چارہ نہ تھا۔

☆ ☆ ☆

"بہو بیگم! دیکھ آئیں عبید میاں کی پسند۔" اماں بیگم پان چباتے ہوئے صبیحہ بیگم کے سلام کا جواب دے کر پوچھ رہی تھیں۔ صبیحہ بیگم ان کے ساتھ مسہری پر بیٹھ گئیں۔ ان کے چہرے پر شدید تھکن کے آثار تھے۔ اماں بیگم کے سوال کے جواب میں فقط "جی" ہی کہہ پائیں اور ایک سرد آہ بھر کر خاموش ہو گئیں۔ پر لاڈلی بیگم خاموش نہ رہ سکیں۔

"ارے اماں بیگم! کیا کہیں' کیا خوب حسن و جمال پایا ہے لڑکی نے ـــــ چندے آفتاب چندے ماہتاب ـــــ عبید میاں یوں ہی دیوانے نہیں ہوئے ہیں۔ اسے تو کوئی بھی دیکھے' ریجھ جائے۔"

صبیحہ بیگم نے کلس کر لاڈلی آپا کی طرف دیکھا۔ اس سارے قصے میں ابتدا ہی سے وہ بے حد جوش و خروش کا مظاہرہ کر رہی تھیں۔ مطیع الرحمان کو عبید کے حق میں انہوں نے راضی کیا تھا اور اب اس لڑکی کو دیکھ کر آنے کے بعد وہ محض صبیحہ بیگم کا دل جلانے کے لیے اس کی تعریف کیے جا رہی تھیں۔

"اماں بیگم! فقط حسن و جمال کو کیا کرنا ہے۔ نہ طور طریقہ' نہ رہن سہن اور نہ ہی بول چال' کچھ بھی ہمارے معیار کا نہیں۔" صبیحہ بیگم کہے بغیر رہ نہ سکیں۔ اماں بیگم ان کی اتری ہوئی صورت دیکھ کر ہی سمجھ گئی تھیں کہ لڑکی انہیں پسند نہیں آئی تھی۔

"تو کیا اب رشتہ نہیں کرو گی؟" اماں بیگم نے پوچھا تو صبیحہ بیگم سے تھا' لیکن ان کے کچھ بھی کہنے سے قبل ہی لاڈلی بیگم ٹھٹھا لگا کر بولیں۔

"آپ بھی کمال کرتی ہیں اماں بیگم! پسند نہ کرنے کا کوئی سوال ہی نہیں ہے۔ بھابھی بیگم تو مجبور ہیں۔ اس کے علاوہ عبید میاں کسی اور لڑکی سے بیاہ کرنے کو تیار ہی نہیں۔" وہ تاک تاک کر صبیحہ بیگم کی بے بسی کو نشانہ بنا رہی تھیں اور ہر تیر نشانے پر لگ بھی رہا تھا۔ اماں بیگم نے انہیں خاموش کروایا۔

"اے ہائے لاڈلی بیگم! تم دو گھڑی کو خاموشی اختیار کرو تو ہم بہو بیگم کی بھی سنیں' وہ کیا کہتی ہیں۔" ساس کی حمایت صبیحہ بیگم کے دل کی بات زبان پر لے آئی۔

"میں کیا کہوں اماں بیگم! عبید نے کوئی گنجائش ہی کہاں چھوڑی۔ کہہ چکا ہے کہ اس معاملے میں کسی کی نہیں سنے گا۔ رشتے کی بات کر آئی ہوں' دیکھیں کب جواب آتا ہے۔"

"کب تک جواب دیں گے؟"

"والدہ صاحبہ فرما رہی تھیں کہ لڑکی کے والد امریکا میں ہوتے ہیں۔ ان سے مشورہ کر کے بتائیں گی۔ دوسرے لڑکی اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد شادی کرنا چاہتی ہے' جس پر عبید کو اعتراض ہے۔ وہ ایک دن بھی انتظار نہیں کر سکتا' فوراً" شادی کرنا چاہتا ہے۔ کہہ رہا ہے شادی کے بعد پڑھنے بھیج دوں گا۔" صبیحہ بیگم تفصیل سنا چکیں تو اماں بیگم نے سر پیٹ لیا۔

"اوئی اللہ! کیا بالکل عقل سے پیدل ہو گیا ہے۔ ایک تو غیر خاندان میں شادی کرنے جا رہا ہے' دوسرا اپنی ریت روایت سب بھول گیا۔ اسے سمجھا دو' ہمارے ہاں ایسا نہیں ہوتا۔"

"میں کیا سمجھاؤں؟" صبیحہ بیگم آپ تنگ آئی بیٹھی تھیں۔ "اولاد کچھ سنے تو والدین کہیں بھی' اب تو زمانہ ہی بدل گیا ہے۔"

"اب ایسی کیا ضروری پڑھائی پڑھ رہی ہے وہ لڑکی۔ کیا ڈاکٹر بن رہی ہے؟" ان کا رخ لاڈلی بیگم کی طرف

ہوچکا تھا کہ باقی تفصیل وہ گوش گزار کریں۔
"نہیں اماں بیگم! ڈاکٹری نہیں، فنون لطیفہ کی تعلیم حاصل کررہی ہے۔ تصویریں بناتی ہے، مجسمے بناتی ہے اور بھی جانے کیا کیا ہنر سیکھ رہی ہے۔" لاڈلی بیگم نے طنزیہ انداز میں کہتے ہوئے بھابھی بیگم کی طرف دیکھا۔
"اور وہ بھی لڑکوں کے کالج میں۔" جہاں صبیحہ بیگم نے پہلو بدلا، وہیں اماں بیگم حق دق رہ گئیں۔
"اے سچ کہہ رہی ہو؟" لاڈلی بیگم نے مسکرا کر گردن ہلادی۔
اور اماں بیگم کلیجہ پیٹنے لگیں۔ "توبہ توبہ! آثار قیامت ہیں، کیسی بے حیائی پھیل رہی ہے، اللہ معاف کرے۔"
"اماں بیگم! کچھ بھی کہیں، پر نازنین بے حد حسین ہے۔ بالکل پری چہرہ۔ عبید میاں کے جوڑ کی ہے، لانبا قد، دودھ ملائی رنگت، نرگسی آنکھیں اور ایسی طرح دار، واہ واہ کیا کہنے۔ بھلا گل جیسی عام سی لڑکی کہاں جچتی ہمارے عبید میاں کے ساتھ۔"
لاڈلی بیگم بظاہر اپنی والدہ ماجدہ سے مخاطب تھیں۔ عبید میاں نے گلناز کو ٹھکرا کر ان کے سینے میں ٹھنڈ ڈال دی تھی۔ "اگر میری طوبیٰ نہیں تو تمہاری گلناز بھی نہیں صبیحہ بیگم!" دل ہی دل میں خوب خوش ہوتی لاڈلی آپا کی نظریں اپنی بھابھی کے چہرے پر گڑی تھیں۔ حساب بے باق ہوچکا تھا۔
صبیحہ بیگم میں اور حوصلہ نہیں تھا۔ وہ کام کا بہانہ بنا کر اٹھ گئیں اور اماں بیگم کمرے سے باہر نکل آئیں۔ عبدالرحمان کی ضد نے انہیں سر اٹھا کر بات کرنے کے قابل نہیں چھوڑا تھا۔
عبید کی خوشی سمجھ کر وہ نازنین کے گھر رشتہ لے جانے پر رضامندی ہوئیں تو وہاں انہیں ایک اور دھچکا لگا۔ نازنین وہی بدلحاظ لڑکی تھی جس نے آسیہ کی مہندی کی تقریب میں صبیحہ بیگم کے ساتھ بدتمیزی کی تھی۔ چونکی تو نازنین بھی تھی لیکن پھر اس نے ایسے ظاہر کیا جیسے وہ ان سے پہلی بار مل رہی ہو۔ صبیحہ بیگم کو ناز میں حسن کے سوا اور کوئی خوبی نظر نہیں آئی تھی۔
عبید سے اس معاملے پر مزید کوئی بات کرنے کی گنجائش نہیں تھی۔ وہ نہایت بے دلی سے رشتے کی بات کرکے واپس آگئیں۔
صالحہ اور گلناز تمام صورت حال سے واقف تھیں۔ سب کچھ ان کے سامنے ہوا تھا۔ یوں صالحہ کو بہن سے کوئی گلہ نہیں تھا۔ اگر عبید ہی راضی نہیں تھا تو وہ بے چاری کیا کرسکتی تھیں۔ انہوں نے صبیحہ سے کوئی شکوہ نہیں کیا۔ گلناز بھی ماں کی طرح صابر تھی۔ اس نے قسمت کے لکھے کو چپ چاپ قبول کرلیا تھا۔ نہ کسی سے کچھ کہا، نہ ظاہر کیا، لیکن اس کی روئی روئی آنکھیں قدسیہ سے اس کے دل کا حال کہتی رہیں۔
صبیحہ بیگم کے ساتھ وہ بھی اپنے بھائی کی پسند دیکھ کر آئی تھی اور اسے سخت افسوس ہورہا تھا۔ ناز جیسی مغرور لڑکی جس نے اس کی ذات کے پرخچے اڑا دیے تھے۔ آسیہ کی مہندی میں وہ اس کے طنز کا نشانہ بن چکی تھی۔ بھلا اس قابل کہاں تھی کہ گلناز کے مقابلے میں اسے ترجیح دی جاتی۔ اس نے عبید کو بھی سمجھانے کی بہت کوشش کی۔ جس پر عبید نے کہا تھا۔
"مجھے حسین بیوی چاہیے.... عادتیں کیسی بھی ہوں، بدلی جاسکتی ہیں، صورت بدلنا میرے بس میں نہیں ہوگا۔"
نازنین کے ساتھ چند ملاقاتوں نے عبید کو اس کے مزاج سے تھوڑا بہت تو آگاہ کرہی دیا تھا مگر وہ دل کے ہاتھوں مجبور تھا۔ شادی طے ہوجانے کے بعد بھی وہ دونوں ملتے رہے۔ ناز اپنی تعلیم ادھوری چھوڑنا نہیں چاہتی تھی اور عبید سے صبر نہیں ہورہا تھا۔ اس نے ناز کو یقین دلایا کہ شادی کے بعد وہ ضرور اس کی تعلیم مکمل کروائے گا۔
یوں دونوں گھروں میں شادی کی تیاریاں شروع ہونے لگیں۔ جس میں صرف پندرہ دن بچے تھے۔
عام دنوں میں ہی ناز کی فرمائشی لسٹ کافی لمبی ہوا کرتی تھی۔ جسے شاکر علی ہمیشہ پوری کرتے آئے تھے۔ اب تو نازنین کی شادی ہونے والی تھی۔ اس نے دنیا جہان کی بہترین چیزیں اپنے جہیز کے لیے جمع کرنی

تھیں۔ فوراً" شاکر علی کو خط لکھ ڈالا۔ طارق اور مہ جبیں وقار کے ساتھ اس کی شادی کے لیے لاہور پہنچ گئے تھے۔ شاکر علی نے طارق کے ہاتھ ناز کا فرمائشی سامان بھجوایا تھا۔ جسے دیکھ کر ناز کو شدید جھٹکا لگا تھا۔ جو کچھ اس نے لکھ کر بھیجا تھا۔ یہ اس کا آدھا بھی نہیں تھا۔ نہ ہی کپڑوں، جوتوں اور میک اپ کی وہ برانڈ تھی جو اس نے منگوائی تھی۔ پہلے تو اسے طارق پر شک ہوا کہ شاید اس نے ابا جی کا دیا ہوا اصل سامان اس تک پہنچایا ہی نہیں ہے۔ اس نے عالیہ کے گھر جاکر لاس اینجلس ٹرنک کال ملوائی اور خود شاکر علی سے بات کی۔ وہ یہ سمجھے کہ ناز ان سے شادی میں شرکت نہ کرنے پر ناراضی کا اظہار کرنا چاہتی ہے لیکن ناز نے جب اپنی چیزوں کے متعلق سوال کیا تو ایک لمحے کو وہ خاموش ہوگئے۔ بیٹی کو باپ سے زیادہ چیزوں کی فکر تھی۔
انہوں نے نرمی سے سمجھانا چاہا کہ اب وہ ہارٹ پیشنٹ ہیں۔ کالج کی جاب چھوٹ جانے کے بعد وہ زیادہ تر گھر میں رہتے ہیں۔ گورنمنٹ کی جانب سے الاؤنس کے طور پر کچھ رقم ملتی ہے۔ ناز کی فرمائشی لسٹ پوری کرنا اب ان کے بس کی بات نہیں تھی۔ سو جتنا ہوسکا اتنا بھیج دیا۔
ناز اس عذر کو تسلیم کرنے سے انکاری تھی۔ اس نے پھر اصرار کیا کہ "ابا جی! آپ کے پاس بینک میں تو کچھ رقم ضرور ہوگی۔ وہی بھجوادیں، میں اپنی پسند سے خریداری کرلوں گی۔"
ناز جو مطالبہ ایک بار زبان سے کرتی اسے منوایا کرتی تھی۔ جیسا جہیز وہ لے جانا چاہتی تھی، طارق اور محسنہ اس کی حیثیت نہیں رکھتے تھے۔ اور اب شاکر صاحب بھی نہیں رکھتے تھے۔ ناز نے باپ کا انکار سن کر غصے میں باپ کی پوری بات سنے بغیر ہی فون پٹخ دیا۔

☆ ☆ ☆
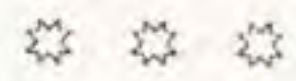
شاکر علی سے صاف انکار سننے کے بعد نازنین نے محسنہ کے سامنے رونا دھونا شروع کردیا۔ وہ آنسو بہاتی باپ کو برا بھلا کہتی جارہی تھی اور محسنہ کو مظلوم....
پہلے پہل تو محسنہ کو یقین ہی نہ آیا کہ ناز ان کی طرف داری میں باپ کو برا کہہ رہی ہے مگر وہ ماں تھیں، ناز کو نادم دیکھ کر انہوں نے بھی اپنا دل صاف کرلیا۔
ماں کو منا لینے کے بعد اگلے ہی دن وہ اپنا فرمائشی پروگرام لے کر ان کے پاس پہنچ گئی۔ طارق بھی وہیں موجود تھا۔ محسنہ شاید بھائی سے کہہ کر اس کے لیے وہ سب کچھ ضرور خرید لیتیں، جو وہ لینا چاہ رہی تھی۔ مگر طارق نے اس کی لسٹ پڑھ کر صاف انکار کردیا۔
"یہ تمام چیزیں لے کر تم کیا کروگی؟ جتنا سامان لیا جاچکا ہے کافی ہے۔ ابھی ہمیں کھانے اور جگہ کا انتظام بھی کروانا ہے۔ اس پر تمہارے سسرال والوں کے ہاں کچھ رسم و رواج بھی ایسے ہیں۔ جن کو پورا کرنے کے لیے پیسے کی ضرورت پڑے گی۔" وہ اسے مناسب لفظوں میں سمجھا رہا تھا۔
"تمہارے سسرال والے ولیمہ سے اگلے دن کسی چوتھی کی رسم کا کہہ گئے ہیں اور ان سب کو پہناؤنیاں بھی دینی ہیں۔ اس کے علاوہ تمہارے ساس اور نندوں کو سونے کی کوئی چیز بھی دینی پڑے گی۔ ہزاروں خرچے اور ہیں.... ہمارے حساب سے تمہارا سب کچھ مکمل ہے۔ اب امی جی کو اور پریشان مت کرو، یہ لسٹ لے جاؤ۔"
نازنین کا چہرہ اتر گیا تو محسنہ، طارق سے بولیں۔
"وے تھوڑی سی چیزاں ولادے...." طارق نوٹ بک پر سر جھکائے حساب کتاب جوڑتا رہا۔ اس نے ماں کو بھی صاف منع کردیا۔ "امی جی! تابندہ کی بھی شادی کرنی ہے آگے، اس کے لیے بھی یہی سب لاکے رکھنا ہوگا۔ اتنا ہی کرو جتنی حیثیت ہے۔"
نازنین پیر پٹختی وہاں سے اٹھ کر اپنے کمرے میں آگئی۔ ہمیشہ وہ اپنی پسند، اپنی خواہش کے حساب سے جیتی آئی تھی۔ لیکن اب سب کچھ بدلنے والا تھا۔ جس کے لیے وہ ذہنی طور پر قطعی تیار نہیں تھی۔
آمنہ بیگم نے اپنی چھوٹی بھابھی کا میک اپ کرنے کے بعد داد طلب نظروں سے اس کی سہیلی عالیہ کی طرف دیکھا جو پہلے ہی انہیں تمسخرانہ نگاہوں سے دیکھ

رہی تھی۔ آمنہ کا سارا جوش و خروش ایک دم ٹھنڈا پڑ گیا۔ انہوں نے خاموشی سے دلہن کو زیور پہنائے اور خدا حافظ کہہ کر اپنا پرس اٹھاتے ہی کمرے سے باہر نکل گئیں۔

"اس نے تمہیں کیا بنا دیا ہے؟ قسم سے، ہونق لگ رہی ہو۔ سارا کاجل آنکھ سے باہر پھیلا دیا ہے۔ بڑی میک اپ کرنے آئی تھیں.... چہرہ بگاڑ کر چلی گئیں۔"

آمنہ کے باہر جاتے ہی عالیہ نے نازنین سے کہا، جو اس کے تبصرے سے پریشان ہو کر آئینے میں اپنا جائزہ لے رہی تھی۔ صحیح معنوں میں اسے شدید رنج ہوا۔

"اس سے اچھا میک اپ تو میں خود کر لیتی۔" اس نے کہا۔

"اب ٹھیک کر لوں؟" عالیہ نے فوراً" اثبات میں سر ہلاتے ہوئے اپنے پرس میں سے ایک ٹشو نکال کر اس کی طرف بڑھایا۔ "اس سے آئی میک اپ صاف کرو، میں کاٹن بھگو کر لاتی ہوں۔ ابھی تمہارا میک اپ دوبارہ کر دیں گے۔"

"کوئی ضرورت نہ ہے۔" محسنہ کی آواز سنائی دی۔ وہ ان کی گفتگو کمرے میں داخل ہوتے سن چکی تھیں۔ ڈپٹ کر بولیں۔ "خبردار.... کچھ بدلنے کی ضرورت نہیں ہے گی، جیسا کر گئے ہیں، ٹھیک ہے گا.... او عالیہ سر ڈھانپ لے، مولوی صاحب آ رہے ہیں۔"

عالیہ نے نہایت بے دلی سے اپنے چنے ہوئے رسی نما دوپٹا کو سر پر رکھا۔ پھر دروازے پر دستک کے ساتھ ہی نکاح خواں اور چند قریبی رشتہ داروں کو طارق کے ساتھ اندر آتے دیکھ کر وہ پیچھے ہٹ گئی۔ محسنہ نے ناز کو پلنگ پر بٹھا دیا تھا۔ نکاح خواں نے نازنین سے اس کی مرضی معلوم کی تو وہ اپنے مہر کی رقم سن کر بجھ سی گئی "قبول ہے؟" پوچھے جانے پر چند لمحوں کے لیے کچھ بول ہی نہ پائی۔ مولوی صاحب نے دوبارہ پوچھا تو محسنہ نے اس کا کندھا پکڑ کر ذرا سا ہلایا۔ چونک کر نازنین نے اپنے سامنے بیٹھے بھائی کو دیکھا، جو اس کے جواب کا منتظر تھا۔ سر کو خفیف سی جنبش دے کر نازنین نے قبول ہے کا عندیہ دے دیا۔

تین بار ایجاب و قبول کروانے کے بعد مولوی صاحب اور گواہان باہر نکل گئے۔ محسنہ روتے ہوئے نازنین سے لپٹ گئیں۔ عالیہ بھی سوں سوں کرتی جھوٹ موٹ کا رونا رو رہی تھی۔ جبکہ نازنین اسے تو اپنی استانی یاد آ رہی تھیں، جنہوں نے ایک بار حقوق نسواں پر کلاس میں نہایت پرجوش تقریر کرتے ہوئے کہا تھا۔

"اری نامراد لڑکیو! شوہروں کی محبت میں اپنے حق مہر معاف نہ کیا کرو، بہلاووں میں نہ آنا، یہ حق مہر ہی تو لڑکی کی قدر و قیمت ہوتا ہے۔" اور یہاں تو ایسا کچھ تھا ہی نہیں، جو اسے وصول کرنے میں مشکل پیش آتی۔

☆ ☆ ☆

عبید نے پھولوں کا سہرا چہرے سے ہٹا کر دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیے تھے۔ ان کے ساتھ بیٹھے شفیق الرحمان اور سب دوست احباب نکاح کے ایجاب و قبول انجام بخیر پانے کے بعد ان کی خوشگوار ازدواجی زندگی کے لیے دعا گو تھے۔

"کہاں رہ گئی تھی مہ جبیں۔" محسنہ نے کمرے میں تابندہ کے ساتھ داخل ہوتی مہ جبیں سے پوچھا۔ تو وہ بولی۔

"کیا کہوں امی جی! نازنین کی ساس کو ہر گلاس میں سے بو آ رہی تھی، گھر میں آ کر کانچ کا گلاس اچھی طرح مانجھ کر انہیں برف ڈال کے ٹھنڈا پانی دے کر آئی ہوں، اف.... بڑے غصے والی ہیں اس کی ساس۔"

"اچھا رہن دے.... ایس ویلے ایہو جی گلاں نہ کریے تے چنگا اے.... اس کو لے کر باہر جاوے ہیں گے۔" محسنہ نے پیار سے نازنین کا گھونگھٹ ہٹا کر اسے محبت سے پیشانی پر چومتے ہوئے ہمیشہ خوش رہنے کی دعا دی اور اپنی آنکھوں میں امڈتے آنسو سب سے چھپانے کی کوشش میں سر جھکا کر جلدی سے باہر چلی گئیں۔

تھوڑی دیر میں اس کی سہیلیاں اور بہنیں اسے تھامے ہوئے کمرے سے باہر لے کر آئیں اور اسے

چھیڑتی ہوئی ہنستی کھلکھلاتی پنڈال کی طرف چلنے لگیں۔ چلتے چلتے طیبہ نے اس کے کان میں سرگوشی کی۔

"بڑے بے چین ہیں دولہا بھائی تمہارے دیدار کے لیے۔" اور کھل کھل کرنے لگی۔

"ہاں بھئی' محبت سے بیاہ کر لے جارہے ہیں' بڑی قدر کریں گے۔" تابندہ بھی شامل گفتگو ہوئی۔

"ہونہہ۔۔۔ کیا خاک قدر کریں گے۔" عالیہ تپ کر بولی۔ "کچھ معلوم بھی ہے' سوا تیں روپے تو حق مہر لکھوایا ہے انہوں نے۔"

مہ جبیں نے عالیہ کی بات سن کر آنکھوں ہی آنکھوں میں اسے اشارہ کیا کہ خاموش رہے۔ وہ لوگ پنڈال میں داخل ہونے والی تھیں۔ اگر یہ باتیں نازنین کے سسرال والے سن لیتے تو اس کے لیے مسائل پیدا ہونے کا اندیشہ تھا لیکن عالیہ پر مہ جبیں کے اشاروں کا خاک اثر نہ ہوا اور وہ جو منہ میں آیا بولتی رہی' بنا سوچے سمجھے۔

"ہماری نازنین تو لاکھوں میں ایک ہے' اتنی خوب صورت' ایسی حسین کہ لاکھوں اس پر وار دیے جائیں اور افسوس نہ ہو اور ان کی محبت؟ ایسی کنجوس نکلی کہ فقط سوا تیں روپے مول طے کیا۔ بے چاری! کیسے ناقدروں میں جان پھنسی ہے۔ بھئی ناز! مجھے تم سے پوری ہمدردی ہے۔"

آخری جملہ عالیہ نے نہایت بناوٹی انداز میں ہمدردی جتاتے ہوئے ادا کیا۔ جسے سن کر ساتھ چلتی تمام لڑکیاں ہنسنے لگیں۔ نازنین کو اپنی ہتک کا احساس جلائے دے رہا تھا۔ کیا کیا ارمان تھے اس کے' کیا کیا نہیں سوچا تھا اس نے۔ لیکن یہاں تو ابتدا ہی کچھ ایسی ہوئی تھی کہ دل کھٹا ہو رہا تھا۔ پہلے چہرے کا ستیاناس ہوا فضول میک اپ سے اور اب حق مہر کی رقم کو لے کر سہیلیوں کی ہرزہ سرائی۔

عبید سے اسے ہرگز یہ امید نہیں تھی۔ حجلہ عروسی میں اس کا اظہار بھی کر دیا۔ اس کا شکوہ سن کر عبید لمحہ بھر کو چپ سا ہوا تھا۔ پھر سنبھل کر بولا۔

"یہ معاملات میرے والدین نے طے کیے ہیں۔ میں اس میں دخل نہیں دے سکتا تھا۔ لیکن ہاں! اتنا وعدہ ضرور کرتا ہوں کہ میرے ساتھ رہتے ہوئے تمہاری کوئی خواہش' کوئی آرزو تشنہ نہیں رہے گی۔ میں مقدور بھر تمہاری ہر خواہش پوری کرنے کی کوشش کروں گا۔ ہمیشہ تم سے محبت کروں گا اسی شدت اور دیوانگی کے ساتھ۔"

عبید کے وعدے وعید اور خوب صورت باتیں سن کر وہ اپنے سارے شکوے شکایتیں بھول گئی کہ اس رات محبت نے اپنے خواب کی تعبیر پالی تھی۔

☼ ☼ ☼

"عبید میاں۔۔۔ دروازہ کھولیں۔"

آمنہ کے بار بار دستک دینے پر عبید کی آنکھ کھلی۔ نازنین باتھ روم میں تھی۔ اسی وقت وہ بھی باہر نکل آئی اور دروازہ کھول دیا۔ سامنے ہی آمنہ کھڑی مسکرا رہی تھیں اور ان کے پیچھے گلناز اور قدسیہ ہاتھ میں ناشتا کی ٹرے تھامے ہوئے تھیں۔ نازنین نے ایک طرف ہو کر انہیں سلام کرتے ہوئے کمرے میں آنے کا رستہ دیا۔ تب تک عبید بھی بستر سے اتر کر کھڑا ہو گیا تھا۔ آمنہ نے پیار سے بھائی کی پیشانی چومی۔

"تمہیں ابا میاں بلا رہے ہیں' پہلے ان کی بات سن آؤ پھر آ کر ناشتا کر لینا۔"

عبید سر ہلا کر منہ ہاتھ دھونے باتھ روم میں چلا گیا۔

"گلناز! یہ ناشتے کی ٹرے یہاں چھوٹی میز پر رکھ دو اور قدسیہ! تم ذرا یہ کمرا سمیٹو۔" ان دونوں سے کہنے کے بعد پھر وہ ناز کی طرف متوجہ ہوئیں۔

"آپ ناشتا کر لیجئے' میں نے خود بنایا ہے آپ کے لیے' امی بیگم تو کہہ رہی تھیں کہ رہنے دو' دلہن کے گھر والے بھیج دیں گے' میں نے کہا' دس تو بجنے والے ہیں' اب کہاں آئے گا' میں ہی بنا دیتی ہوں۔"

نئی نویلی دلہن نازنین شرمندہ سی ہو گئی۔ "وہ دراصل ہمیں معلوم نہیں تھا کہ یہاں کون کون سی رسمیں ہوتی ہیں' اس لیے۔"

"کوئی بات نہیں۔" آمنہ میٹھے لہجے میں بولیں۔ "اچھا ہوا آپ نے غسل کر لیا۔ اب جلدی سے ناشتا کر لیجئے۔ پھر میں آپ کو نیچے لے چلوں گی۔ سب بزرگوں کو سلام کرنا ہے نا۔۔۔ منہ دکھائی بھی وہیں ملے گی۔" تب ہی گلناز اور قدسیہ کسی بات پر ہنسنے لگیں تو آمنہ نے ان کی طرف دیکھا۔

"کیا ہوا؟ تم لوگوں کی ہنسی نہیں رک رہی۔"

"ہاں آپا بیگم۔۔۔ یہ دیکھیں! امی بیگم جو کہانی سنایا کرتی تھیں' ہماری بچپن میں۔۔۔ وہ آج سچ ثابت ہو گئی۔" قدسیہ نے بدستور ہنستے ہوئے کہا تو آمنہ کے بجائے عبید نے سوال کیا' جو اسی وقت باتھ روم سے باہر آیا تھا۔

"کون سی کہانی۔۔۔ ذرا ہمیں بھی تو بتاؤ۔" دلچسپی تو نازنین کو بھی ہو رہی تھی۔ قدسیہ نے کہا۔

"وہی کہانی جس میں شہزادی ایک مرد کے بھیس میں شہزادے کے محل میں داخل ہوتی ہے اور ملکہ کو شک ہو جاتا ہے۔ وہ رات کو اس کے سرہانے پھول رکھ دیتی ہے' جو صبح ہونے تک بالکل مرجھا جاتے ہیں اور یوں شہزادی پکڑی جاتی ہے۔ کیونکہ مرد کے بجائے عورت کے پاس پھول جلد مرجھا جاتے ہیں۔ اب یہ دیکھیں۔" قدسیہ نے ایک طرف ہو کر سب کی توجہ دلائی۔

"یہاں چھوٹی بھابھی کی چوڑیوں کے پاس رکھے پھول قدرے مرجھا چکے ہیں۔ جبکہ عبید بھائی۔۔۔ آپ کے سرہانے رکھے پھولوں کے ہار ابھی تک تر و تازہ ہیں۔ دیکھا آپ نے۔" قدسیہ کی تفصیل سن کر یک بارگی سب ہی ہنسنے لگے تھے سوائے نازنین کے' جسے قدسیہ کا انداز بالکل پسند نہیں آیا تھا۔ وہ منہ بناتی صوفے پر بیٹھ گئی۔ آمنہ نے فوراً" ناشتے کی ٹرے اس کے سامنے میز پر رکھ دی۔ نازنین نے عبید کی طرف دیکھا۔

"تم شروع کرو' میں ابا میاں کی بات سن کر آتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ کمرے سے باہر نکل گیا اور آمنہ بھی ان کے پیچھے چلی گئیں۔

"ناز بھابھی۔۔۔ اوہ سوری۔۔۔ میرا مطلب ہے ناز باجی! تم بھی لو نا۔۔۔ تم نے بھی ناشتا نہیں کیا۔" قدسیہ نے جب کہا تو پہلے نازنین یہی سمجھی کہ اسے مخاطب کیا گیا ہے۔ لیکن اسے حیرت ہوئی کیونکہ قدسیہ نے ایک بار بھی اس کی طرف نہیں دیکھا تھا۔ یعنی وہ گلناز کو ناز بھابھی کہہ رہی تھی؟ اور گڑبڑائی تو گلناز بھی تھی۔ بات سنبھالنے کی غرض سے بولی۔

"آپ کا اور میرا نام دراصل ملتا جلتا ہے نا۔ اس لیے قدسیہ کے منہ سے نکل گیا۔ آپ برا مت مانیے گا۔" اس کی وضاحت پر نازنین کوشش کے باوجود مسکرا نہیں سکی تھی۔ وجہ قدسیہ کے تاثرات تھے۔ وہ دانتوں تلے مسکراہٹ دبائے گلناز کی ناشتے کی پلیٹ میں روغنی روٹی اٹھا کر رکھ رہی تھی۔ اس کے انداز سے نازنین کو یقین ہو گیا کہ اس نے جان بوجھ کر گلناز کو بھابھی کہا تھا' لیکن کیوں؟

وہ چھوٹے چھوٹے لقمے لیتی رہی اور عبید کی آمد کا انتظار بھی کرتی رہی۔ آدھے گھنٹے بعد آمنہ اس کے پاس آئیں اور اپنے ساتھ نیچے چلنے کا کہا تو بالآخر وہ ہمت کر کے پوچھ بیٹھی۔

"عبید کہاں ہیں۔ انہوں نے ناشتا بھی نہیں کیا۔"

آمنہ اس کے سر پر دوپٹے میں پنیں اٹکا رہی تھیں۔ منہ میں دابی پن نکال کر بولیں۔

"آپ فکر نہ کریں' انہوں نے ابا میاں کے ساتھ ناشتا کر لیا ہے۔ اب جلدی چلیں' سب آپ کے منتظر ہیں۔"

آمنہ اسے کندھوں سے تھام کر کمرے سے باہر لے آئیں اور وہ حیران پریشان سوچ میں گم۔

"عبید نے میرے بغیر ہی۔۔۔" سختی سے لب بھینچ کر وہ آہستہ آہستہ سیڑھیاں اترنے لگی۔

☼ ☼ ☼

"السلام علیکم ابا میاں!" عبید نے مطیع الرحمان کو سلام کیا۔ مطیع الرحمان نے ان کے سلام کا جواب دے کر اپنے سامنے پڑی کرسی کی طرف اشارہ کرتے

ہوئے کہا۔ ”بیٹھ جائیے عبید میاں! ہم آپ سے چند ضروری باتیں کرنا چاہتے ہیں۔“

پورے گھر میں مہمان بھرے ہوئے تھے۔ شادی والا گھر تھا۔ قریبی عزیز رشتہ دار سبھی جمع تھے۔ اس لیے مطیع الرحمان گھر کے پچھلے صحن میں کرسی پر اخبار پڑھتے ہوئے عبید کے منتظر تھے۔ ان کے سامنے لوہے کی میز پر ان کا ناشتا بھی رکھا ہوا تھا۔ انہیں عبید سے اکیلے میں بات کرنی تھی۔ اس لیے انہیں یہیں بلوا بھیجا تھا۔ وہ اخبار لپیٹ کر سیدھے ہو کر بیٹھے۔ ”آپ نے ناشتا کرلیا۔“

”جی نہیں... میں بعد میں ناشتا لوں گا۔ آپ کہیے ابا میاں! آپ مجھ سے کیا کہنا چاہ رہے ہیں۔“

”ہوں...“ مطیع الرحمان نے ایک لمبی گہری سانس لی اور کہنا شروع کیا۔ ”دیکھیے بھئی عبید! اب آپ ماشاء اللہ سے شادی شدہ ہیں اور اس صورت حال میں آپ پر کچھ اہم ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔“ وہ پل بھر کو رکے۔ عبید پوری طرح ان کی طرف ہی متوجہ تھے۔ اس اطمینان کے بعد وہ گویا ہوئے۔

”آپ کی ماں گلناز سے آپ کی شادی کرنا چاہتی تھیں لیکن آپ کے انکار سے انہیں بے حد دکھ پہنچا تھا۔“ عبید نے شرمندگی سے سر جھکا لیا‘ ابا میاں کہتے رہے۔

”انہوں نے آپ سے اپنی شدید محبت کا ثبوت دیتے ہوئے آپ کی ضد کے آگے ہتھیار ڈال دیے۔ حالانکہ نازنین کا خاندان اور ان کا رہن سہن ہرگز ہمارے معیار کا نہیں‘ اس کے باوجود ہم آپ کی خوشی کی خاطر اسے بیاہ کر اس گھر میں لائے ہیں۔ اب وہ آپ کی ذمہ داری ہے۔ نئے ماحول میں آئی ہے۔ اسے ہمارے طور طریقوں کا علم نہیں ہے۔ یہ سب آپ کو سمجھانا ہوگا۔ اس گھر میں بزرگوں کا احترام کیا جاتا ہے اور چھوٹوں سے پیار... آپ کی ماں کو اندیشہ ہے کہ شادی کے بعد آپ بدل جائیں گے اور میں آپ سے یقین دہانی چاہتا ہوں کہ آپ زندگی بھر اپنی ماں کے سامنے سر نہیں اٹھائیں گے۔ خود بھی ان کی عزت پہلے سے زیادہ کریں گے اور اپنی بیوی سے بھی کروائیں گے۔ انہوں نے آپ کی خوشی پوری کردی۔ اب آپ کی باری ہے۔“ ان کی بات ختم ہونے پر عبید نے اپنا جھکا ہوا سر اٹھایا۔

”میں آپ کو یقین دلاتا ہوں ابا میاں! آپ کو یا امی بیگم کو مجھ سے اور نازنین سے کبھی کوئی شکایت نہیں ہوگی۔“

”ہمیں آپ سے یہی امید تھی۔“ ابا میاں مسکرائے۔ ”چلیے ناشتا شروع کریں۔“

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

اُم ایمان

[illegible]

ناولٹ

معمولی سا فلو اور نزلہ ایسا بگڑا کہ جان کو ہی آگیا۔ پچھلے تین دن سے بخار میں مبتلا ہنیہ آج ذرا بستر سے اٹھی تھی، پر نقاہت ایسی کہ ذرا سا چلنے میں ہی چکر آنے لگتے تھے، پر بستر پر پڑے پڑے بھی لاچاری کے احساس نے کچھ ایسا تنگ کیا کہ وہ اٹھ کر باہر آگئی۔ ثانی نے بھی اس کی تیمار داری کی خاطر دو دن تو اس کے بستر کی پٹی سے لگے گزار دیے، پر آج اس کا ضروری پریکٹیکل تھا، سو وہ کالج جا چکی تھی، ابو جی آفس، جبکہ کچن میں کھٹر پٹر

لگ رہا تھا کہ امی کچن میں ہوں گی، وہ وہیں آگئی۔

"ارے ہنیہ تم، کسی چیز کی ضرورت تھی بیٹا؟ میں بس آ ہی رہی تھی تمہارے پاس۔"

امی نے آہٹ پر پیچھے مڑ کر دیکھا اور اسے دیکھ کر چاولوں کی پرات واپس شلف پر رکھی اور خود تیزی سے اس کے پاس آکر تشویش سے بولیں۔

"بس امی، لیٹے لیٹے اکتا گئی تو باہر آگئی ہوں کہ کچھ باتیں ہی کرلوں گی آپ سے۔" اس نے بیزار سے لہجے میں کہا۔

"کیا پکا رہی ہیں؟" وہ وہیں کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گئی۔

"تمہاری طبیعت کیسی ہے؟ بخار تو نہیں ہے آج؟ کیسا چہرہ اتر گیا ہے میری بچی کا دو دن میں۔"

امی نے نزدیک آکر ماتھے پر ہاتھ رکھ کر بخار چیک کیا، پھر تسلی کرکے دوبارہ چاولوں کی طرف متوجہ ہوگئیں۔

"صبح احمد آیا تھا تمہاری طبیعت کا پتا کرنے، بتا رہا تھا کہ تمہارے ماموں اور ممانی آج تمہاری خیریت معلوم کرنے آئیں گے، تو میں نے کہا، کھانے میں ایک آدھ ڈش کا اضافہ کرلوں۔ ثانی تھکی ہاری آئے گی کالج سے۔ کیا یاد رکھے گی۔"

"احمد آیا تھا تو مجھ سے کیوں نہیں ملا؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔

"بیٹا! تم سو رہی تھیں۔ ثانی نے کہا بھی کہ تمہیں جگا دیتی ہے، لیکن احمد نے منع کردیا کہ مت ڈسٹرب کریں، سونے دیں ہنی کو، ورنہ تو سونے کا ٹائم بھی کام

کودیتی ہے۔" امی نے چاول صاف کرتے ہوئے مسکرا کر احمد کے کہے الفاظ دہرائے تو ہنیہ بھی مسکرائی۔

"میں نے تو کہا ہے کہ کھانے تک تم بھی پہنچ جانا' کہہ رہا تھا وعدہ نہیں کر سکتا اور نہ ہی آپ لوگ انتظار کیجئے گا' آگیا تو ٹھیک' نہیں تو پھر کسی وقت چکر لگالوں گا۔" امی نے مزید تفصیل بتائی۔

"کیسے نہیں پہنچے گا۔ میں ابھی فون کرکے اس کی خبر لیتی ہوں۔ آپ مجھے کچھ چٹ پٹا بنادیں۔ منہ کا ذائقہ عجیب کڑوا' کڑوا سا ہو رہا ہے۔" اس نے اٹھتے اٹھتے کہا تو امی اثبات میں سر ہلا کے رہ گئیں جبکہ وہ اٹھ کر اپنے کمرے کی جانب آگئی۔

☼ ☼ ☼

یونیورسٹی میں کسی ہنگامے کے باعث ہڑتال تھی' تو وہ بے فکر ہو کر لمبی تانے سو رہا تھا' جب ابا کی مخصوص چیختی چنگھاڑتی آواز نے اعصاب پر ناخوشگوار اثر چھوڑا' کچھ دیر تو کسلمندی سے پڑا دوبارہ نیند آنے کا انتظار کرتا رہا' پھر بھلا ہو ابا کی کراری آواز کا جس نے صبح ہی صبح اس کی پرسکون نیند میں خلل ڈال دیا تھا۔ حالانکہ یہ ابا کا روز کا معمول تھا' پر اس وقت ... یا تو وہ ناشتے کی ٹیبل پر ہوتا یا یونیورسٹی جاچکا ہوتا' اس لیے معمول کی بات لگتی' پر آج گہری نیند سے اٹھنا اس کے لیے خاصا ناخوشگوار تجربہ تھا' سو تھوڑی دیر تو ابا کے چپ ہونے کا انتظار کرتا رہا جو اماں پر پھر کسی بات پر چیخ رہے تھے' پر ان کا شاید بہت دیر تک ان کی اگلی پچھلی کوتاہیاں گنوانے کا پروگرام لگ رہا تھا' سو وہ اٹھ کر کمرے سے باہر چلا آیا۔

اماں شاید کچن میں تھیں' جبکہ ابا کی آواز بھی آنی بند ہوگئی تھی۔ سکون کی سانس لیتا وہ کچن میں ہی آگیا۔

"دن رات کے چوبیس گھنٹوں میں بغیر وجہ کے چیخ چلا کر والد محترم کیا ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ کبھی دو منٹ بیٹھ کر یہ بھی پوچھ لیں۔"

دروازے کے ساتھ ٹیک لگا کر ہاتھ باندھے اس نے سکون سے کہا تو چولہے کے پاس کوئی کام کرتی امی فوراً چونک کر مڑیں۔

"خدا کے لیے چپ ہوجاؤ ایان تمہارے ابا کو تو ویسے ہی بہانہ چاہیے ہوتا ہے بولنے کا۔ ابھی تک گھر میں ہی ہیں۔" اماں کے سراسیمگی سے بولنے پر اسے مزید طیش آگیا۔

"یہی تو... یہی تو میں جاننا چاہتا ہوں کہ آخر کیا وجہ ہے کہ کتنی ہی کوشش کیوں نہ کرلیں آپ ان کے ماتھے کے بل ہی نہیں جاتے۔ آخر کیا بات ان کے مزاج کو بگاڑنے کا باعث بنتی ہے۔ اچھے خاصے خوش حال ہیں ہم لوگ' اچھی فرماں بردار بیوی دی ہے اللہ نے انہیں' اولاد کی نعمت سے بھی نوازا ہے' کوئی مالی مسئلہ بھی نہیں تو کیوں مجھے اس گھر کا ماحول ایک نارمل گھر جیسا نہیں لگتا۔ ایک مطلق العنان بادشاہ کی موجودگی میں جیسے رعایا سہم جاتی ہے' اس گھر میں بھی ان کے آتے ہی ایک خوف کی فضا ہر چیز کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے۔"

وہ پھٹ ہی تو پڑا' جبکہ امی کا چہرہ ابا کی موجودگی اور ان کے کچھ سن نہ لینے کے خوف سے سفید پڑ گیا۔

"کیا ہوگیا ایان؟ ایسی بھلا کیا بات ہوگی جو میں تم سے چھپاؤں گی بیٹا۔ بس کچھ لوگوں کا مزاج ہی ایسا ہوتا ہے۔ تمہارے ابا بھی ذرا الگ مزاج کے ہیں اور سچ پوچھو تو جب سے میں نے ان کی فطرت کے اس پہلو سے سمجھوتا کیا ہے' تو مجھے برا بھی نہیں لگتا' مزاج کے کڑوے ضرور ہیں' پر دل کے اچھے ہیں۔ کبھی تمہیں یا مجھے کوئی کمی نہیں ہونے دی کسی چیز کے حوالے سے۔ منہ سے نکلنے سے پہلے تمہاری ہر فرمائش پوری کرتے ہیں۔"

"اماں... اماں! میں اپنی نہیں آپ کی بات کر رہا ہوں اس وقت اور ایسے اچھے دل کا کیا کرنا ہے۔ جس کی اچھائی چھپی ہوئی ہو۔ مجھے تکلیف ان الفاظ کی ہوتی ہے جو ان کے منہ سے آپ کی تذلیل کے لیے نکلتے ہیں۔" اس کا چہرہ سرخ ہوگیا۔

"او ہو ایان... دیکھ لو اب مجھے باتوں میں لگالیا تم نے۔ تمہارے ابا کی چائے گرم کرنے آئی تھی۔ اب تو ان کا غصہ آسمان پر ہوگا۔" امی اس پر جھنجلاتی ابل ابل کے... بکتی چائے کی کیتلی چولہا بند کرکے نیچے اتارتی ہوئی بولیں۔

"ہونہہ صاحب بہادر کا غصہ ہمیشہ کیا آسمان پر نہیں ہوتا۔" اس نے ناگواری سے کہا۔

"اچھا... اچھا اب زیادہ مت بولو تم' بیٹھو' میں ابھی آکر اپنے بیٹے کی پسند کا ناشتا بناتی ہوں۔"

امی اسے بہلاتی بھاپ اڑاتی چائے کا کپ لے کر اس کی سائیڈ سے نکلتی چلی گئیں تو ایان طویل سانس لیتے ہوئے کرسی گھسیٹ کر وہیں بیٹھ گیا۔ ہر دفعہ امی پر ابا کے چلانے پر وہ ایسے ہی تناؤ کا شکار ہوتا تھا' پر کوئی واضح وجہ معلوم نہ ہو سکی تھی۔ اس نے تو ہوش سنبھالتے ہی ابا کو امی پر غصہ ہوتے ہی دیکھا تھا۔ بس امی کو دیکھتے ہی ان کی تیوری پر بل پڑ جاتے' بگڑنے کی وجہ ہوتی یا نہ ہوتی ابا کوئی وجہ نکال ہی لیتے تھے۔

ننھیال کے نام پر امی کا کوئی رشتہ دار نہ تھا' جبکہ ددھیال میں نچلا پورشن تایا ابا کا تھا' جہاں آج سے تین سال پہلے تک ان کی بول چال' آنا جانا سب بند تھا۔ امی سے پوچھنے پر انہوں نے بتایا تھا کہ ان کے شادی ہو کر آنے پر دونوں بھائیوں کے درمیان کوئی اختلاف ہوگیا تھا' جس کے باعث نہ تو اوپر سے کوئی نیچے جاتا' نہ نیچے سے اوپر آتا تھا۔

اوپر سے ایک زینہ جو نیچے کی جانب جاتا تھا وہاں کا بھول کر بھی کوئی نام نہ لیتا تھا۔ بس اتنا پتا تھا کہ تایا ابا کی دو بیٹیاں تھیں۔ ایک یونیورسٹی اور ایک کالج کی طالبہ تھی۔ امی کو اتنی جرات ابا نے کبھی دی ہی نہ تھی کہ وہ ابا سے اس رویے کا سبب پوچھ سکتیں' سو راوی چین ہی چین لکھ رہا تھا۔ ابا بینک میں ایک اعلا عہدے پر فائز تھے۔ جبکہ وہ خود ایم بی اے کے آخری سال میں تھا۔

تین سال پہلے ابا نے یہ ناراضی ختم کی تھی جب ایک دن گھر واپسی پر ان کی طبیعت بہت خراب ہوگئی' انجائنا کے ہلکے سے دورے نے ہی ان کا برا حال کردیا اور وہ گاڑی سے نکل کر گھر تک آنا چاہتے تھے۔ وہیں گاڑی کے پاس ہی دل پر ہاتھ رکھ کر بیٹھتے چلے گئے اور تایا ابا کی بڑی بیٹی جو یونیورسٹی سے ابھی ابھی واپس لوٹی تھی اور ابھی گاڑی میں ہی تھی۔ ان کو کسی طرح ہسپتال لے گئی' جہاں ان کا فوری ٹریٹمنٹ کیا گیا۔ اس نے تایا ابا کو بھی بلالیا۔ ایان اور امی تو کہیں بعد میں ان کی طبیعت سنبھلنے پر پہنچے تھے۔

تین دن ہسپتال میں ایڈمٹ رہنے کے بعد جب ابا واپس گھر لوٹے تو تایا ابا کی پوری فیملی ان کی خیریت دریافت کرنے آئی تھی' بلکہ آنے والے کئی دنوں میں وہ لوگ کئی کئی بار ان کو پوچھنے آئے۔ ابا کی بھتیجیاں کبھی سوپ بنا کر لے آتیں تو کبھی پھل' کبھی جوس' تو کبھی کوئی پرہیزی خوراک۔

یوں ابا نے اس خودساختہ ناراضی کو ختم کرتے ہوئے وہ زینہ استعمال کرنے کی اجازت دے دی جو ناراضی نہ جانے کس بات پر شروع ہوئی تھی۔ ختم اس حادثے پر ہوئی۔

تائی اماں' تایا ابو اس سے بہت شفقت سے پیش آتے' پر ابا سے پرخاش رکھنے کے سبب اسے وہ محبت بناوٹی دکھتی۔

"میرے حقیقی ابا کو مجھ سے محبت نہیں تو یہ اوپری محبت جتانے والے کون ہوتے ہیں۔" ایسے میں ابا کا ان لوگوں کے سامنے بھی امی کی تضحیک کا وہی انداز ہوتا۔ سو اسے بہت تکلیف ہوتی' اس لیے تین سال گزر جانے کے باوجود اس کے تعلقات اپنے تایا کی فیملی سے کچھ خاص خوشگوار نہ تھے۔ ہاں تایا کی بیٹیاں وقت بے وقت اسے نظر آتیں۔ امی بھی جو اکیلے پن کا شکار تھیں اس دوسراہٹ سے اکثر خوش نظر آتیں' پر ایسے میں وہ خون کے گھونٹ بھرتا یا تو اپنے کمرے میں گوشہ نشین ہوجاتا یا گھر سے باہر جانے کو ترجیح دیتا' وجہ تایا کی فیملی کے سامنے اس بھرم کے ٹوٹنے کی تھی' جو اس نے گھر سے باہر ہر جگہ پر اپنے خاندان کے حوالے سے ایک ہیپی فیملی کا بنا رکھا تھا۔

☼ ☼ ☼

''اف آج تو بہت تھک گئے۔'' لیب سے نکل کر گھاس کے ایک قطعے پر اس نے کتابیں نیچے رکھیں اور خود دھم سے سبین کے برابر بیٹھ گئی۔

''تم اصل میں تازہ تازہ بیماری بھگتا کر آئی ہو' سو زیادہ ہی تھکن محسوس ہو رہی ہے' ورنہ تو یہ ہمارا روٹین ورک تھا۔'' سبین نے لاپروائی سے چیونگم چباتے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہا۔

''ہوں ٹھیک کہا تم نے اور تم مہربانی کر کے یہ لیب کوٹ تو اتارو' ویسے ہی کیمسٹری لیب کی ناگوار سی بو دماغ میں بس سی گئی ہے' رہی سہی کسر تم پوری کر دیتی ہو' نہ تو ہاتھ دھوئے' نہ ہی لیب کوٹ اتارا ہے۔'' ہنیہ نے ناگواری سے سبین کو ٹوکا۔

''ایک تو تمہاری یہ ضرورت سے بڑھتی ہوئی نازک مزاجی مجھے چین نہیں لینے دیتی' ایسے نہ اٹھو' یوں نہ کرو' یہ نہیں کہ تین گھنٹے سے خوار ہو رہے ہیں' کوئی پیٹ پوجا کا بندوبست کریں' بس فضول فضول مشورے دیے جانا۔'' سبین نے منہ بنایا تو اس نے بے اختیار ایک گہری سانس لی۔

''صحیح کہہ رہی ہو' تم نے کون سا سدھر جانا ہے یا میری بات پر عمل کرنا ہے۔ اٹھو پھر چلتے ہیں کینٹین' اس کے بعد سر خلیل کی کلاس ہے۔ افتخار بتا رہا تھا کہ سر نہیں آئے آج۔ کنفرم ہو جائے تو میں گھر چلی جاؤں گی۔ ممانی کے گھر قرآن خوانی ہے آج' امی اور ثانی تو صبح ابو کے ساتھ ہی چلی گئی تھیں۔ وہ انہیں چھوڑ کے آفس گئے ہوں گے' جبکہ میں صرف پریکٹیکل کے لیے آ گئی۔''

وہ دونوں کینٹین کی طرف جا رہی تھیں۔ تب راستے میں ہنیہ نے سبین کو بتایا۔

''پھر جاؤ گی کیسے؟'' سبین کو نئی فکر نے آن گھیرا۔

''امی کہہ رہی تھیں احمد کو بھیجیں گی' لے جائے گا۔'' سادہ سے انداز میں اس نے بتایا۔

''اور وہ تمہارے ہمسائے سڑیل کا کیا حال چال ہے ....مزاج پر خوشگوار اثرات مرتب ہوئے یا ویسے ہی خونخوار ہیں۔'' ساتھ چلتی سبین نے ایان کی خیریت دریافت کی۔

اصل میں جب ہنیہ کی طبیعت خراب تھی' تو وہ اس کی خیریت دریافت کرنے ان کے گھر چلی گئی۔ ہنیہ کی امی سے پتا چلا کہ اوپر چچی کے پاس گئی ہوئی ہے' پندرہ' بیس منٹ آنٹی سے باتیں کرنے کے بعد اس نے آنٹی سے کہا کہ وہ تو پتا نہیں کب آئے وہ خود ہی اوپر سے جا کر اسے بلا لاتی ہے' آنٹی نے بھی بخوشی اجازت دے دی' اوپر کی سیڑھیاں چڑھ کر وہ آئی تو پہلا ٹاکرا لاؤنج میں صوفے پر بیٹھے ٹی وی دیکھتے ایک خوبرو نوجوان سے ہوا۔

''سنیے....''

''جی فرمایے آپ کون؟'' اصل میں وہ نیچے والا زینہ چڑھ کر آئی تھی تو لامحالہ نیچے والوں کی رشتہ دار یا جاننے والی ہو گی' سو لہجہ خود بخود کڑوا ہو گیا۔ اچھی خاصی پر اعتماد سی لڑکی اس لمحے گڑبڑا گئی۔

''جی وہ میں... میں ہنیہ کی دوست... اس سے ملنے...''

''جی ہاں آپ کی دوست یہیں تشریف رکھتی ہیں اور چوبیس گھنٹے میں بیس نہیں تو اٹھارہ گھنٹے تو ضرور یہیں پائی جاتی ہیں۔ سامنے جو کمرا نظر آ رہا ہے اسے کھول کر چلی جایے آپ کی دوست آپ کو مل جائیں گی۔'' روکھے پن سے اس کی بات کاٹتے ہوئے اس نے مبالغہ آرائی کی حد ہی کر دی تھی۔ حالانکہ ہنیہ آج کم از کم پندرہ دن کے بعد یہاں آئی تھی۔ یہ کہہ کر ٹی وی آف کر کے وہ ناراض سالڑ کا غڑاپ سے دوسرے کمرے میں گھس گیا۔ ابھی اس کے حیرت انگیز رویے کو سوچتی سبین آگے بڑھی ہی تھی کہ سامنے دروازے پہ مسکراتی ہوئی ہنیہ اور ایک سوبر سی آنٹی باہر نکلیں۔

''ارے سبین تم' میں کوئی خواب تو نہیں دیکھ رہی۔'' خوشی سے وہ اسے آ کر لپٹ گئی۔ چچی بھی بڑے پیار سے اس سے ملیں۔ بٹھا کر حال احوال پوچھا اور اپنے ہاتھوں سے خاصا پر تکلف کھانا تیار کر کے کھلا کے بھیجا۔ اس سڑیل سے بندے کے رویے کی تلافی اس کی امی نے کر دی تھی۔ سبین ان کے رویے سے بہت متاثر ہوئی۔ اس وقت وہاں تو کوئی ذکر نہیں کیا' پر جب ہنیہ کو نیچے آ کر ساری تفصیل سنائی تو وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

''اوہ... تو تم نے بھی دنیا بھر سے ناراض بندے سے ملاقات کا شرف حاصل کر لیا۔'' سبین خاموش ہو گئی تھی۔

آج اچانک اسے اس بندے کا خیال آیا تو ہنیہ سے پوچھ بیٹھی۔

''کون ایان کا پوچھ رہی ہو؟'' ہنیہ نے ذرا کی ذرا رک کر اس سے پوچھا تو سبین نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''پتا نہیں بھئی' جہاں تک میں اسے سمجھ پائی ہوں وہ چچا کے رویے سے شاکی ہے' جو چچی سے بلاوجہ ہی اکھڑے اکھڑے رہتے ہیں اور چچا کے اس رویے کی وجہ سے ہی اس کا مزاج ایسا اکھڑا سا ہو گیا ہے۔''

''تمہارے چچا ایسا کیوں کرتے ہیں؟'' سبین کی جاسوسانہ رگ پھڑک اٹھی۔

''امی بتاتی ہیں کہ چچی شروع سے چچا کی منگیتر تھیں۔ چچازاد بھی تھیں ماں' باپ کی وفات کے بعد ان ہی کے گھر پلی بڑھیں۔ چچا کو بھی ان سے شادی پر کوئی خاص اعتراض نہیں تھا۔ میرے ابو جی نے امی سے پسند کی شادی کی' سب کچھ ٹھیک چل رہا تھا جب تک چچا میری روبی خالہ سے نہیں ملے تھے۔ پتا نہیں ان کو روبی خالہ کی کس ادا نے متاثر کیا کہ بچپن کی منگیتر کو چھوڑ کر ان سے شادی پر بضد ہو گئے۔ ابو کو یہ بات پسند نہیں آئی' کیونکہ ان کو پتا تھا کہ چچی جو کہ چچا کی منگیتر تھیں' ان کے انکار اور روبی خالہ سے شادی سے بہت ہرٹ ہوں گی۔ ایک ہی گھر میں رہنے کے باعث ابو کو چچی سے ایسا ہی لگاؤ تھا جیسے ایک بہن سے ہوتا ہے' پھر دادی کی وفات کے بعد وہی گھر کے بڑے تھے' سو انہوں نے چچا کی یہ خواہش ماننے سے انکار کر دیا' دوسرے روبی خالہ بھی اپنے کسی کزن میں انٹرسٹڈ تھیں' سو بات نہ بن سکی۔

ابو نے بہت دباؤ ڈال کر چچا کی شادی چچی سے کروا دی اور امی پر زور دیا کہ روبی خالہ کی بھی شادی جلد کر دی جائے۔ چچا کی بھی شادی ہو گئی۔ روبی خالہ بھی بیاہ کر کینیڈا چلی گئیں' پر شادی کے بعد چچا' چچی کو وہ مقام نہ دے سکے جو کہ ان کا حق بنتا تھا' اسی سلسلے کو دراز کرتے ہوئے انہوں نے اوپر والے پورشن کا الگ نیچے سے راستہ بنوایا اور ابو سے تعلقات قطع کر لیے۔ ابو کے لاکھ منانے پر بھی ان کے دل سے یہ بات نہ نکل سکی کہ اگر ابو چاہتے تو ان کی خواہش پوری کر سکتے تھے۔

چچی کو ابو نے بہن مانا تھا اور نبھایا بھی۔ چچا کی غیر موجودگی میں کئی بار ابو اور امی چچی سے مل کر آتے۔ انہیں تحائف دے کر آتے' پر ہم لوگ کبھی اوپر گئے نہ ایان کبھی نیچے آیا' پھر آگے کا حال تو تمہیں پتا ہی ہے کہ یہ خود ساختہ ناراضی کیسے ختم ہوئی اور اب سب تمہارے سامنے ہے۔'' اس نے سبین کو پوری تفصیل کہہ سنائی۔

''مجھے سارا قصور تمہارے چچا کا لگ رہا ہے' ویسے تم لوگوں کے ساتھ کیسا رویہ ہے ان کا؟'' سبین نے تجسس سے پوچھا۔

''مجھ سے اور ثانی سے تو بے حد پیار کرتے ہیں۔ فرمائشیں کر کر کے کھانے بنواتے ہیں' ایک دن کا ناغہ ہو جائے تو یا تو فون کر کے ہمیں بلا لیتے ہیں یا خود ہی نیچے آ جاتے ہیں۔ ایسے ہی چچی ہیں۔ بے حد نرم خو' محبت کرنے والی' پر ان کا بیٹا نہ جانے کس پر چلا گیا ہے۔'' ہنیہ نے منہ بنا کر کہا۔

''ویسے ہنیہ! مجھے قصور تمہارے کزن کا بھی نہیں ہے' ایسے ماحول کے بچے اس قسم کے سائیکی ہو جاتے ہیں۔'' سبین نے ایمان داری سے تجزیہ کیا تھا۔

''چھوڑو بھی اس قصے کو۔ احمد نہیں آیا ابھی تک' امی کو کال کیے ہوئے بیس منٹ ہو گئے اور احمد کا نمبر بھی بند جا رہا ہے۔'' ہنیہ نے پریشانی سے اپنی کلائی پر بندھی نفیس سی گھڑی پر نگاہ ڈالی' اسی پل اسے احمد کا سیل پر ٹیکسٹ موصول ہوا کہ وہ گیٹ سے باہر آیا ہوا

ہے۔ وہ بھی باہر نکل آئے۔ اس نے سبین کو احمد کے آنے کا بتایا اور خود تیز قدموں سے چلتے ہوئے یونیورسٹی کے گیٹ سے باہر آ گئی جہاں گاڑی سے ٹیک لگائے احمد اس کا منتظر تھا۔

سلام دعا کے بعد وہ فرنٹ سیٹ پر آ گئی۔

"احمد! پانچ منٹ کے لیے "دی رائزنگ سن" کے آفس کے سامنے گاڑی روکنا' میں یہ آرٹیکل دے آؤں' کل سے ایڈیٹر کے کتنے ہی فون آ چکے ہیں۔ بائے ڈاک لیٹ ہو جائے گا۔"

اس نے بیگ میں سے فولڈ کیے ہوئے کچھ کاغذات نکالے' ان کو لفافے میں ڈالا اور اسے ڈیش بورڈ پر رکھ دیا۔

"تمہیں نہیں لگتا ہنی! تم نے اپنی مصروفیات کا دائرہ بڑھا کر خود کو ہم سے بہت دور کر لیا ہے۔" ایک نظر اس پر ڈال کر احمد نے توجہ دوبارہ سامنے کی طرف مرکوز کی۔

"کیوں بھئی' تمہیں ایسا کیوں لگا۔ میرا ایم ایس سی کا فائنل ہے۔ پی ایچ ڈی میں ایڈمیشن کے لیے زیادہ محنت کرنا پڑ رہی ہے۔ جہاں تک لکھنے کی بات ہے تو اسے میرا شوق سمجھ لو۔ باقی ایسا تو بالکل بھی نہیں ہے کہ میں دنیا سے بالکل کٹ گئی ہوں۔ گھر کے کام کاج بھی کرتی ہوں' کہیں ضروری آنا جانا تو بھی ٹائم نکال ہی لیتی ہوں۔ اس کا ثبوت اس سے بڑا اور کیا ہو گا کہ اس وقت تمہارے ساتھ بیٹھی ہوئی ہوں۔"

"اچھا بابا تم جیتیں' میں ہارا۔" اس نے اخبار کے دفتر کے سامنے گاڑی روکتے ہوئے کہا۔

☼ ☼ ☼

ہفتہ وار تعطیل کے سبب آج امی نے ایان کو زبردستی اپنے آگے بٹھا رکھا تھا اور زبردستی اس کے سر میں تیل کی مالش کر رہی تھیں۔ ایان کو امی کے ہاتھوں کی نرمی اور ہلکا ہلکا مساج اچھا لگ رہا تھا۔ اس نے خود کو ڈھیلا چھوڑتے ہوئے سر پورا امی کی گود میں ڈال دیا۔ ابا پاس ہی پڑی کرسی پر بیٹھے صبح کے اخبار کی شہ سرخیاں ملاحظہ کر رہے تھے۔

جب ہی نیچے والا زینہ طے کرتی وہ اوپر چلی آئی' ہاتھ میں پلیٹ تھی' جو کہ رومال سے ڈھکی ہوئی تھی۔

"آج میں نے اپنے ہاتھوں سے پوریاں اور چنے کی ترکاری بنائی تھی ناشتے کے لیے' تو سوچا چچا اور چچی کو بھی ٹیسٹ کراؤں۔"

سلام کے بعد خوشگواری سے کہتی وہ ابا کے پاس پڑی دوسری کرسی پر بیٹھ گئی۔

"واہ بھئی' بہت خوب! ہماری بیٹی نے بنایا تو بہت اچھا ہو گا۔ اگرچہ ہم ناشتا کر چکے ہیں' پر چونکہ ہماری بیٹی نے بنایا ہے تو ہم ضرور کھائیں گے۔" ابا نے خوش دلی سے کہتے ہوئے پلیٹ پر سے رومال اٹھایا' جبکہ ایان جو سکون سے آنکھیں موندے بیٹھا تھا کی پیشانی پر ناگواری سے کئی شکنیں ابھر آئیں۔

"والد محترم جن کی زبان گھر کے افراد کے لیے ہر وقت انگارے اگلا کرتی ہے' اب کیسے شہد سا میٹھا بول رہے ہیں۔ ہونہہ!" دل ہی دل میں تلملاتا وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

"محترمہ! یہ اوٹ پٹانگ چیزیں لانے سے پہلے اتنا سوچ لیا کریں کہ آپ کے چچا محترم دل کے مریض ہیں اور معمولی سی بے احتیاطی بھی ان کی طبیعت کی خرابی کا باعث بنتی ہے۔ آپ تو یہ محبتیں جتا کر اپنے گھر کو سدھاریں گی۔ پیچھے بھگتنے والے جانیں۔"

ابا کو تو کچھ کہہ نہیں سکتا تھا' سو کھڑے ہوتے ہی روئے سخن اس کی جانب موڑا اور اخبار پر سرسری نظر ڈالتی ہنیہ کو ہی لتاڑ ڈالا' جس کا رنگ ایک لمحے کو پھیکا پڑا' لیکن جلد ہی اس نے خود کو کمپوز کر ڈالا۔

"تمیز سے بات کرو ایان' بہن ہے تمہاری۔" امی نے تادیبی انداز میں کہا۔

"یہ میری بہن نہیں ہیں' صرف ابا کی بھتیجی ہیں بس۔" کہتے ہی وہ سرخ چہرہ لیے وہاں سے جانے لگا۔ جب اس نے ابا کو امی پر برستے سنا۔

"یہ تربیت کی ہے تم نے جاہل عورت اپنی اولاد کی' جسے اتنی بھی تمیز نہیں کہ گھر آئے مہمان سے کیا

سلوک کرتے ہیں۔" وہ زور سے چلائے۔ اس نے بمشکل خود پر ضبط کیا۔

"بس کر دیں چچا۔ ایان واقعی ٹھیک کہہ رہا تھا' مجھے ہی خیال کرنا چاہیے تھا۔"

اس کی صلح جو آواز اسے مزید غصے میں مبتلا کر گئی۔ وہ درمیان میں پڑی چیزوں کو ٹھوکر مارتا ہوا اپنے کمرے میں آ گیا۔

پتا نہیں کیوں' بہت بار نہ چاہتے ہوئے بھی امی پر ابا کے عتاب کا سبب وہی بن جاتا تھا۔ اس نے اپنے آپ کو کوسا اور اپنے غصے پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگا۔ ٹھنڈے پانی سے شاور لے کر جب وہ واش روم سے باہر آیا تو کمرے کو طائرانہ نظروں سے دیکھتی ہنیہ کو دیکھ کر بے حد حیرت ہوئی۔

"مسٹر ایان! اپنے آپ پر اتنا ضبط میں نے آج تک نہیں کیا' جتنا تمہاری وجہ سے مجھے اپنی طبیعت کے خلاف کرنا پڑا۔ پہلی بات چچا کی طبیعت کا تم سے بہتر مجھے پتا ہے' کیونکہ تینوں ٹائم کی دوائیں انہیں میں ہی آ کر کھلاتی ہوں' تو اس بات سے بھی یقیناً بے خبر نہیں ہوں کہ زیادہ آئلی چیزیں ان کے لیے نقصان دہ ہیں۔ اسی بات کو مدنظر رکھ کر ہی میں کم مسالے اور کم گھی والی چیزیں الگ سے بنا کر ان کے لیے لائی تھی' کیونکہ پچھلی اپائنٹمنٹ پر ڈاکٹر کے پاس میں ہی ان کے ساتھ گئی تھی اور ڈاکٹر کی ہی ہدایت تھی کہ اب وہ بہت بہتر ہیں' معمول کی غذا لے سکتے ہیں۔ آپ کو ان سب باتوں کا پتا نہیں' کیونکہ دن کا بیشتر حصہ آپ پتا نہیں کہاں رہتے ہیں سو بے فکر رہیں کہ محبتیں جتانے کے بعد اپنے گھر سدھارنے کے بجائے اگر خدانخواستہ ان کی طبیعت گڑبڑ ہوئی تو میں ہی سنبھالوں گی۔" ایان کو بولنے کے لیے پر تولتا دیکھ اس نے ہاتھ اٹھا کر روکا۔ "میری بات ابھی پوری نہیں ہوئی۔

تیسری اور سب سے اہم بات میں آپ کی بہن نہیں ہوں تو مجھے بھی آپ کو بھائی بنانے کا بالکل بھی شوق نہیں ہے' نہ ہی ایسی کوئی خواہش رکھتی ہوں۔ سب سے آخری اور اہم بات مجھے نہیں پتا آپ کے ساتھ کیا مسئلہ ہے' لیکن باپ' بیٹے کی اس سرد جنگ میں اگر پس رہی ہیں تو چچی جان' کبھی ان کے بارے میں بھی سوچ لینا جو پہلے شوہر اور اب بیٹے کے مزاج کے رنگ سے خوف کھانے لگی ہیں۔ یہ ساری باتیں میں تمہیں اسی وقت باور کرا دیتی' لیکن ایسا کرنے میں تمہارا خوف یا رعب ہرگز نہیں تھا' بلکہ مجھے پتا تھا کہ چچا کا سارا نزلہ چچی پر گرے گا۔ اس لیے ابھی تک کرنے کی زحمت کرنی پڑی' مجھے امید ہے آئندہ میرے بارے میں اپنی کوئی بھی قیمتی رائے دینے سے پہلے کچھ سوچ لیں گے۔"

غصے میں کہی اس کی ایک ایک بات کا جواب دیتی وہ نہ صرف جا چکی تھی' بلکہ اسے آئینہ بھی دکھا گئی تھی کہ ابا سے ان کے تلخ رویے کے باعث ان سے عناد رکھنے والا ..... نہ چاہتے ہوئے بھی کسی نہ کسی حد تک خود بھی ان کے رنگ میں رنگ چکا تھا۔ "اف" جھنجلا کر اس نے اپنے بال نوچے اور تھک کر بیڈ پر بیٹھ گیا۔ ابھی امی کی ناراضی بھی جھیلنی باقی تھی اور انہیں منانا بھی تھا۔ وہ کچھ سوچ کر اٹھا اور کمرے سے باہر چلا آیا۔

امی آج خلاف معمول کچن کے بجائے اسے اپنے کمرے میں ملیں' جبکہ ابا شاید گھر پر نہیں تھے۔

"کیا کر رہی ہیں؟" اس کا لہجہ بے حد دوستانہ تھا۔ امی جو شاید الماری کی ترتیب درست کر رہی تھیں' نے ایک ناراض نظر اس پر ڈالی اور دوبارہ سے اپنے کام میں مشغول ہو گئیں۔

"ناراض ہونے والا کام صرف والد محترم کے لیے چھوڑ دیں' ان پر سجتا بھی ہے' آپ تو بس ہنستی مسکراتی محبت سے پیش آتی ہی اچھی لگتی ہیں۔" پیچھے سے آ کر لاڈ سے ان کی گردن کے گرد بازو حمائل کر کے اس نے کہا۔

"بس بس رہنے دو ایان! تمہارے ابا کا تو نام بدنام ہے۔ تم کچھ کم ہو ان سے۔ کیسا رویہ تھا تمہارا صبح اس بچی کے ساتھ۔ وہ تو طبیعت کی بھلی مانس ہے جو چپ کر گئی' ورنہ ایسی بے عزتی کے بعد کون ٹھہرنا گوارا کرتا

ہے کسی کے گھر۔" اس کے ہاتھ پیچھے جھٹک کر امی بیڈ پر آ کر بیٹھ گئیں۔

"بچی بے چاری چپ نہیں رہی امی بلکہ مجھے اچھی سنا گئی ہے۔" اس نے دل میں سوچا' لیکن چونکہ اپنی غلطی کا احساس تھا سو جب بولا تو اس کا لہجہ خاصا معذرت لیے ہوئے تھا۔

"اچھا اب آپ تو اپنی ناراضی ختم کریں۔ معافی مانگ لوں گا آپ کی بھتیجی سے۔"

"ہاں تو مانگنی بھی چاہیے نا۔ کتنے ہی کام ہیں جو اس نے بغیر کہے اس گھر کے سنبھال رکھے ہیں۔ اپنا گروسری کا سامان لینے جائے گی ہمارا بھی پوچھ کے لے آئے گی۔ تمہارے ابا کی جب سے طبیعت خراب ہوئی ہے ان کی دوائیاں ڈاکٹر سے چیک اپ اور تو اور بل بھی وہی بھر کے آتی ہے۔ آخری بار تمہیں پتا ہے اپنے ابا کو ڈاکٹر کے پاس کب لے کر گئے تھے تم سات ماہ پہلے۔ پتا نہیں کہاں رہتے ہو' کس دنیا میں رہتے ہو؟ یونیورسٹی سے آ کر یا تو کمرے میں بند یا دوستوں سے ملنے جاتے ہو تو وہیں کے ہو کے رہ جاتے ہو۔"

امی نے وہ کلاس لی اس کی جو آج تک نہ لی تھی۔ اپنی ساری کوتاہیاں جانتا تھا' سو چپ کر کے بیٹھا رہا۔ واقعی ابا کو نیچا دکھانے کے چکر میں وہ کئی ایسے کام کر چکا تھا جو نہیں کرنے چاہیے تھے۔ ابا کا رویہ امی کے ساتھ اگر ایسا تھا تو وہ ان کو یہ احساس مثبت طریقے سے بھی دلا سکتا تھا۔ اس نے تو سرے سے ان سے غفلت برتنی شروع کر دی تھی اور تو اور ان کی طبیعت کی طرف سے بھی خصوصاً" تایا کی فیملی کے ساتھ دوبارہ مراسم بحال ہونے کے بعد تو زیادہ لاپروا ہو گیا تھا۔ ایک اولاد ہونے کا فرض بھول گیا تھا وہ۔

دل میں خود کو سرزنش کرتے اس نے امی سے ایک بار پھر معذرت کی۔

"ٹھیک ہے' اب شام کو کہیں نکل مت جانا' تمہارے تایا نے شام کے کھانے پر بلایا ہے سب کو۔ ہمارے ساتھ ہی چلنا' کتنی دفعہ وہ لوگ آئے یہاں' ہم گئے ان کے ہاں۔ ایک بار بھی تم نے ادھر قدم نہیں رکھا۔ بھائی صاحب الگ پوچھتے ہیں' بھابھی الگ تمہارے ابا بے چارے کبھی کوئی بہانہ بناتے ہیں' کبھی میں کوئی بات بنا لیتی ہوں تمہاری غیر موجودگی کے جواز کے طور پر' اب تو وہ لوگ بھی سمجھ گئے ہیں تمہارے گریز کو' لیکن پھر بھی اعلا ظرفی ہے ان کی جو جتایا کبھی نہیں۔ ثانی بے چاری جب آتی' کہتی ہے۔ "چاچی اللہ نے ہمیں بھائی نہیں دیا' جب بھی گھر میں ایسی کوئی بات میرے منہ سے نکلی' امی اور ابو دونوں ہی ٹوک کر کہتے ہیں ایان ہے نا' یہ کیسے بھائی ہیں چچی جو ایک بار بھی ہمارے گھر نہیں آئے' اپنے گھر پر جب بھی ملیں ان کی تیوری کے بل سلام کے علاوہ کسی اور بات کی اجازت ہی نہیں دیتے۔"

امی آج چونکہ فراغت سے تھیں سو اچھی طرح سے اس کے ناروا رویے کا اسے احساس دلایا۔ کوئی اور وقت ہوتا تو واقعی وہ کوئی بہانہ بنا کر نکل جاتا' پر اپنی کوتاہیوں کا احساس تھا۔ سو شام کو امی اور ابا کے ساتھ ہی تیار ہو کر نیچے پہنچ گیا۔ ابا کی آنکھوں میں بھی خوشی اور طمانیت کا تاثر نظر آیا تھا۔ پر منہ سے کچھ نہیں کہا انہوں نے۔

تایا اور تائی کافی تپاک سے ملے پاس بٹھا کر تایا اس سے چھوٹے چھوٹے سوال پوچھتے رہے' اس کی تعلیم' رجحانات' آگے کے پلانز کے حوالے سے اسے پتا بھی نہ چلا کب تایا کے متاثر کردہ لہجے اور محبت کے زیر اثر وہ ان سے چھوٹی چھوٹی باتیں اور خواہشات شیئر کرتا چلا گیا۔ سامنے بیٹھے صوفے پر ہنیہ ابا سے شاید سیاست پر کوئی مسئلہ چھیڑے بیٹھی تھیں۔ امی اور تائی بھی وہیں بیٹھی کوئی گھریلو ٹاپک ڈسکس کر رہی تھیں' جبکہ تایا کے پاس بیٹھی ثانی خاموشی سے تایا کی اور اس کی گفتگو بڑے انہماک سے سن رہی تھی۔

"اللہ ایان بھائی آپ تو بہت اچھے ہیں' بالکل جیسے بھائی ہوتے ہیں' میں خوامخواہ دوسروں کی غلط اطلاعات پر آپ سے ڈرتی رہی۔" ثانی نے کہا تو جہاں سب کھلکھلا کر ہنس پڑے وہیں ایان بھی بے ساختہ مسکرا دیا۔

"ویسے ثانی! کیا تم بتاؤ گی کہ کن لوگوں کی اطلاع پر تم نے مجھے اتنا خونخوار سمجھ کر بات ہی نہیں کی۔" اس نے مسکراتے ہوئے پوچھا تو ثانی معنی خیزی سے ہنیہ کی طرف دیکھ کر مسکرا دی اور بولی۔

"چھوڑیں بھائی! لوگوں کا کیا ہے اڑاتے ہی رہتے ہیں۔" اس نے کہا اور ادھر ادھر باتوں میں مصروف ہو گئی' جبکہ ہنیہ ثانی کی بات سن کر بھی بغیر کوئی تاثر چہرے پر لائے صوفے پر سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ "میں کھانا لگواتی ہوں۔" اس نے تائی سے کہا۔ جنہوں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ابا کے چہرے پر نرم سا تاثر کتنا بھلا لگ رہا تھا۔ ثانی کی کسی بات کا جواب دیتے ایان نے ابا کو دیکھ کر سوچا۔ تھوڑی دیر بعد ہنیہ نے کھانا لگ جانے کی اطلاع دی۔

کھانا بڑے خوش گوار ماحول میں کھایا گیا۔ مجموعی طور پر اسے اپنا وہ تاثر زائل ہوتا ہوا معلوم ہوا جو تایا کی فیملی کے حوالے سے اس کے ذہن میں تھا۔ اس پورے دورانیہ میں ایک ہنیہ تھی جو سلام کے بعد نو لفٹ کا بورڈ لگائے رہی۔ ثانی کو تو گھر واپس آنے تک وہ پکی پکی بہن بنا چکا تھا اور اگلے ویک اینڈ پر آئس کریم کھلانے کا وعدہ بھی کیا تھا۔

حقیقت یہ تھی کہ ایک خالص محبت بھرے گھریلو ماحول میں وقت گزار کر اس نے بہت خوشی اور سکون محسوس کیا تھا۔ صبح ناشتے پر بھی اس کا موڈ خوشگوار ہی رہا۔ امی سے تو معمول کی بات چیت رہی۔ ابا کو بھی اس نے ایک' دو بار مخاطب کیا جو کافی عرصے سے وہ چھوڑ چکا تھا۔

الوینہ سے ملا تو اسے بھی اس کے مزاج کی یہ تبدیلی فوراً" پتا چل گئی اور خوش گوار حیرت بھی ہوئی۔

"آج ایسا کون سا قارون کا خزانہ مل گیا ہے مسٹر ایان کو جو کھلے کھلے سے نظر آ رہے ہیں۔" وہ خوشبوئیں بکھیرتی لہراتی اس کے پاس چلی آئی۔

دو ماہ بعد ان کے فائنل ایگزام تھے تو آج کل کم کم ہی کلاسز ہو پاتی تھیں' سو آج اس ہفتے میں وہ دوسری بار ملاقات کر رہے تھے۔ لڑکیوں سے ہمیشہ دور رہنے والے ایان کو طرح دار اور خوب صورت سی الوینہ میں نہ جانے کیا پسند آیا تھا کہ ان دو سالوں میں ان کی دوستی تیزی سے پروان چڑھی تھی اور اب ان کے روابط دیکھ کر لگتا تھا کہ دوستی سے آگے وہ اس رشتے کو کوئی نام دینا چاہتے ہیں۔

"موڈ خراب ہو تب بھی تمہیں برا لگتا ہے اور آج موڈ فریش ہے تو بھی وجہ پوچھ رہی ہو۔" وہ مسکرایا۔

"خدا کے لیے اب اسی بات کا برا مان کے اپنے پہلے والے موڈ میں مت چلے جانا' پہلے ہی میں بہت برداشت کر چکی ہوں۔" الوینہ بھی اس کے پل میں تولہ' پل میں ماشہ والے بدلتے موڈ سے خائف رہا کرتی تھی۔ اس لیے ہاتھ جوڑ کر بولی تو ہمیشہ مسکرا دینے والا ایان کھلکھلا کر ہنس دیا' جبکہ الوینہ حیرت سے بے ہوش ہونے کے قریب ہو گئی۔

"رکو ایان' مجھے اپنے آپ کو چٹکی کاٹ کر یہ یقین کر لینے دو کہ یہ میرا کوئی خواب نہیں حقیقت ہے۔" اس نے رک کر باقاعدہ خود کو چٹکی کاٹی۔

"آج تمہارے اس موڈ کو سیلیبریٹ کرنے کسی اچھے سے ریسٹورنٹ میں چلتے ہیں۔ جہاں ہم کھانا کھائیں گے اور میں تمہیں اپنی پسند کی آئس کریم کھلاؤں گی۔"

"اچھی زبردستی ہے بھئی تمہاری پسند کی کیوں' میری پسند کیوں نہیں؟" اس نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالتے ہوئے کہا۔

"کیونکہ آج مجھے لگ رہا ہے جیسے میں جو کچھ کہوں گی تم مان جاؤ گے۔" الوینہ نے اترا کر کہا تو وہ جواب دینے کے بجائے صرف مسکرا دیا۔

چند ہی لمحوں بعد گاڑی ہوا سے باتیں کرنے لگی۔ یونیورسٹی روڈ پر سے گزرتے ہوئے اسے ایک گاڑی کا بونٹ کھولے کھڑی لڑکی پر ہنیہ کا گمان ہوا تو تصدیق کی خاطر گاڑی کی اسپیڈ آہستہ کی اور پھر بے اختیار پاؤں بریک پر جا پڑے۔

"کیا بات ہے؟ گاڑی میں کوئی فالٹ ہو گیا ہے کیا؟ آجاؤ' میں تمہیں گھر ڈراپ کر دوں' پھر گاڑی آ کر لے

جاؤں گا۔" اس نے سر باہر نکال کر دوستانہ انداز میں کہا تو الوینہ کی پٹر پٹر کرتی زبان کو بریک لگے اور اس نے خاصی تنقیدی نظر سے سامنے کھڑی عام سی لڑکی کا جائزہ لیا جو کم از کم شکل و صورت میں تو ہرگز اس کے ہم پلہ نہیں تھی، پر ایان کا چلتی گاڑی روک کر اسے یہ آفر کرنا اسے کھٹک ضرور گیا تھا اور پیشانی پر کچھ ناگوار بل بھی آ ٹھہرے تھے۔ وہاں گاڑی کا بونٹ کھول کر خرابی کا کھوج لگاتی ہنیہ بھی جھٹکے سے سیدھی ہوئی۔ سرسری نگاہ فرنٹ سیٹ پر اس کے برابر بیٹھی نخریلی حسینہ پر ڈالی اور رسان سے گویا ہوئی۔

"نہیں تھینکس۔ میں نے ابو کو فون کر دیا ہے۔ ڈرائیور ان کی گاڑی لے کر پہنچنے ہی والا ہے۔"

"ہم ایسا کرتے ہیں اس وقت تک رک جاتے ہیں جب تک وہ آ نہیں جاتا، بلکہ تم بھی گاڑی میں آجاؤ۔ اس طرح مناسب نہیں لگتا تمہارا یہاں کھڑا ہونا اور ہاں یہ میری کلاس فیلو ہیں الوینہ اور الوینہ! یہ میری چچازاد ہیں ہنیہ۔" اس کو قطعی لہجے میں کہتے اس نے تعارف کی رسم گویا بھگتائی۔

"السلام علیکم! خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔" ہنیہ مسکرائی اور پھر سے ایان کی طرف متوجہ ہو کر بولی۔

"ایان! آپ فکر نہ کریں۔ آپ کے یہاں رکنے سے پہلے میری ابو کے ڈرائیور سے بات ہوئی ہے وہ مکینک لے کر آرہا ہے۔ اب تو یقیناً" وہ لوگ پہنچنے والے ہوں گے۔ آپ پلیز جائیں، مجھے اچھا نہیں لگے گا کہ میری وجہ سے آپ کا ٹائم ویسٹ ہو۔"

یہ کہہ کر پلٹ کر وہ دوبارہ اپنی گاڑی کی طرف مڑی، بونٹ بند کر کے خود گاڑی کے اندر بیٹھ گئی۔ گویا یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ وہ لوگ اب جا سکتے ہیں۔

ایان کو اس پل اس انا پرست لڑکی پر ٹھیک ٹھاک غصہ آیا اور وہ اسے بازو سے پکڑ کر زبردستی بٹھا بھی دیتا اگر جو الوینہ وہاں موجود نہ ہوتی، دوسرے گاڑی بھی الوینہ کی تھی۔ وہ بائیک پر یونیورسٹی آیا تھا اور الوینہ کی ضد تھی کہ گاڑی پر جایا جائے، اس کی بائیک وہیں چھوڑ دی جائے، لنچ سے واپسی میں وہ بائیک وہاں سے لے کر گھر چلا جائے۔

اس نے ایک نظر اپنے برابر بیٹھی ناگوار تاثرات چہرے پر سجائے الوینہ پر ڈالی۔

"اب چلنا بھی ہے یا اسے زبردستی اٹھا کر اپنے ساتھ لے جانے کا ارادہ ہے۔" الوینہ کے طنزیہ انداز پر اس نے ایک غصے بھری نظر ہنیہ پر ڈالی اور تیزی سے وہاں سے گاڑی نکال لے گیا۔

"تم نے کبھی اپنی اس کزن کا ذکر نہیں کیا۔" کھانے کے دوران الوینہ نے سوال کیا۔ ایان کی خاموشی اور ہنیہ سے ملنے کے بعد اس کے بدل جانے والے موڈ نے الوینہ کا دل بہت برا کیا تھا۔

"پہلے ہماری فیملیز کے درمیان کچھ کلیش تھا تو آنا جانا بھی نہیں تھا، کیا ذکر کرتا۔"

"اور اب وہ ٹوٹے ہوئے ریلیشنز اتنے ڈویلپ ہو گئے ہیں کہ تم جیسے دنیا سے بے زار بندے نے بھری سڑک پر گاڑی روک کر اسے لفٹ بھی آفر کر دی۔"

"تو... کیا مطلب ہے تمہارا؟ میرے گھر کی عورت روڈ پر اکیلی کسی مدد کی منتظر تھی اور میں اندھا بن کے گزر جاتا وہاں سے۔" الوینہ کا طنزیہ لہجہ اسے آگ ہی لگا گیا۔

"پر اس نے تو تمہیں ہری جھنڈی دکھا دی۔" وہ پھر اسی ٹون میں بولی۔

"الوینہ! مجھے اس طرح کی گفتگو کی عادت نہیں ہے۔ ہمیں اب چلنا چاہیے۔" غصے سے اس کا چہرہ سرخ پڑ گیا۔ "ویٹر بل لاؤ جلدی۔" اس نے ویٹر کو پکارا۔

"ایان میں نے ایسا کچھ نہیں کہا جس پر تم ٹیمپر لوز کر رہے ہو اور بل میں پے کروں گی، کیونکہ میں تمہیں یہاں لائی تھی۔" اب کے ایان نے اس کی بات کا جواب دینا ضروری نہیں سمجھا اور ویٹر کے آتے ہی دو بڑے نوٹ اس کو پکڑائے اور الوینہ کو دیکھے بغیر باہر نکلتا چلا گیا۔

بے عزتی کے احساس نے الوینہ کے خون میں گویا شرارے بھر دیے۔ "آئی ہیٹ یو ایان۔" غصے میں

کہتے اٹھ کر وہ باہر نکلی اور گاڑی میں بیٹھ کر گاڑی کو فل اسپیڈ پر چھوڑ دیا۔

یونیورسٹی سے اپنی بائیک لینے کے بعد بہت غصے میں جس وقت وہ گھر پہنچا لاؤنج میں مزے سے اسے آرام دہ کنڈیشن میں بیٹھے چائے پیتے دیکھ کر نئے سرے سے اپنی بے عزتی یاد آئی۔

"تم اپنے آپ کو سمجھتی کیا ہو؟ میں نے اگر بیچ سڑک پر تمہیں مصیبت میں کھڑے دیکھ کر ہیلپ کی آفر کی تھی تو قطعاً" کسی خوش فہمی میں مبتلا ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ ایسا میں تب بھی کرتا جب تمہاری جگہ کوئی ایکس وائی زیڈ ہوتی۔" اس نے ٹیبل پر بائیک کی چابیاں رکھتے دانت پیس کر کہا۔ چائے پیتی ہنیہ نے اپنے ازلی تحمل اور سکون سے اس کی پوری بات سنی۔ چائے کا آخری گھونٹ پی کر کپ ٹیبل پر رکھا اور بولی۔

"مسٹر ایان! میں ایک انسان اور ایک لڑکی ہوں اور ہمیشہ اپنی یہی حیثیت یاد رکھی ہے۔ خود کو کچھ سمجھنے والے لوگوں میں میرا شمار ہوتا ہے، نہ ہی میں کسی خوش فہمی میں مبتلا ہوں۔ اس وقت آپ تھے یا آپ کی جگہ کوئی بھی ایکس وائی زیڈ میں اس کے ساتھ ہرگز نہیں جاتی، کیونکہ میں ابو سے کہہ کر گاڑی منگوا چکی تھی اور یہ بات میں نے آپ کو اسی وقت بتا بھی دی تھی، لیکن آپ کو بلاوجہ غصہ کرنے اور دوسروں پر غصہ نکالنے کا شوق ہے غالباً" اور اس کا مظاہرہ بھی میں کئی بار دیکھ چکی ہوں۔ میری مانیے تو اپنی یہ عادت ترک کر دیجیے، اس سے دوسرے کا تو کچھ نہیں بگڑتا، لیکن آپ ضرور اپنی صحت بگاڑ لیں گے، اگر یہی حال رہا تو۔"

اس کے اسی دوٹوک انداز سے ایان کو چڑ تھی۔ صنف مخالف سے ملنے والی توجہ اور پذیرائی نے اسے قدرے خود پسند بنا دیا تھا۔ ایسے میں عام سی شکل و صورت کی یہ لڑکی اس قسم کی توجہ دیتا تو ایک طرف الٹا اس کی ذات کے بخیے ادھیڑ کر رکھ دیتی، ایسے میں وہ غصہ نہ ہوتا تو کیا ہوتا۔ اپنی بات مکمل کر کے وہ وہاں سے جا چکی تھی۔

"ابا کی بھتیجی... مائی فٹ۔" دل ہی دل میں تلملاتا ہوا وہ وہیں صوفے پر ڈھے گیا، جہاں ابھی کچھ دیر قبل وہ براجمان تھی۔

"ارے ایان بھائی آپ کب آئے؟ اور اچھے وقت پر آئے، آج چچی اور میں تم تھنک اسپیشل بنا رہے ہیں۔ پوچھیں تو بھلا کیا؟" اسے دیکھ کر ثانی خوشی سے بولی۔

"اور یہ ہنی کہاں گئی۔ ابھی کہہ رہی تھی، بھوک لگی ہے، کچھ بنا کے لاؤ میرے لیے، اب میں فٹافٹ یہ پکوڑے بنا کے لائی ہوں تو وہ غائب ہو گئی ہے۔" اس نے پکوڑوں کی پلیٹ ٹیبل پر رکھتے ہوئے کہا۔

"پتا نہیں میں تو خود ابھی آیا ہوں۔"

"اچھا آپ رکیں، یہ پکوڑے کھائیں میں ہنی کو بلاتی ہوں۔" وہ تیزی سے نیچے جانے والا زینہ عبور کر گئی۔

"ارے ایان! تم کب آئے بیٹا، کھانا لگا دوں۔" امی نے کچن سے آکر اس سے پوچھا۔ "اور یہ بچیاں کہاں چلی گئیں؟" انہوں نے ایان سے دریافت کیا۔

"کھانا کھا کر آیا ہوں۔ اب تو ایک زبردست سی چائے پلوا دیں۔" صوفے پر مزید پھیل کر بیٹھتے ہوئے اس نے کہا۔

"ہنی کے مزاج کا بھی کچھ پتا نہیں چلتا، اب بھی مجھے ڈانٹ کے بھگا دیا ہے کہ میرے سر میں درد ہے، جاؤ مجھے تنگ مت کرو۔ میں نے نہیں کھانے کوئی پکوڑے وکوڑے۔" ثانی منہ پھلائے اوپر آئی تھی۔

"اس کے واقعی سر میں درد ہو گا، ورنہ وہ بلاوجہ غصہ کرنے والی بچی نہیں ہے، تم ایسا کرو پریشر ککر کا چولہا بند کرو، میں ابھی آکر مزید بتاتی ہوں کہ کیا کرنا ہے۔ جب ہماری ڈش بن جائے گی تب تم جا کر ہنیہ کو بلا کر لے آنا۔" چچی نے ثانی کا موڈ ٹھیک کرنے کی غرض سے کہا تو وہ سر ہلاتی کچن کی جانب چلی گئی۔

☆ ☆ ☆

اس مغرور اور گھمنڈی شخص کو اس وقت تو منہ توڑ

جواب دے کر چلی آئی تھی پر اب رہ رہ کر اس کی باتیں یاد کر کے اسے غصہ آئے جا رہا تھا اور اسی موڈ کے زیر اثر اس نے بڑے پیار سے اسے بلانے کے لیے آنے والی ثانی کو بھی جھاڑ دیا تھا۔ کتنے پیار سے اسے بٹھا کر وہ اس کے لیے پکوڑے بنانے میں مصروف تھی۔

اسے افسوس سا ہوا کہ کیوں اس نے اسے ڈانٹ کر بھیج دیا' کوئی معقول بہانہ کر لیتی' اسی کشمکش تھی کہ دروازے پر دستک دے کر احمد چلا آیا۔ اسے خوش گوار سی حیرت ہوئی۔

"ارے احمد تم کیسے راستہ بھول پڑے۔" جب سے ماموں کے ساتھ اس نے اپنا آفس جوائن کیا تھا' بہت کم کم شکل دکھاتا تھا۔

"ڈیر ہنی ہم تو پھر بھی کبھی کبھار راستہ بھول پڑتے ہیں' تمہیں تو جب سے اپنے چچا کی فیملی ملی ہے ان کو ہی پیاری ہو گئی ہو۔ فون کرو تو جواب ملتا ہے چچا کے گھر ہوں' چچا کو ڈاکٹر کے پاس لے کر آئی ہوئی ہوں' گھر آؤ تب بھی یہی پتا چلتا ہے چچی کے ساتھ بازار گئی ہے۔ چچا کو بریانی دینے گئی ہے۔ آج تو میں ارادہ کر کے آیا تھا کہ آج بھی تم گھر پر نہ ملیں تو میں نے تمہیں ان کے گھر جا کر پکڑ لینا ہے۔"

اس کے جلے کٹے انداز پر ہنیہ بے ساختہ ہنس پڑی۔

"تم جیسا کول مائنڈڈ بندہ بھی غصہ کر سکتا ہے' امیزنگ؟" وہ مسکرا کر بولی۔

"ہاں تو غصہ والی بات ہو گی تو غصہ تو آئے گا نا۔" ٹیبل پر پڑی اس کی بکس کو الٹ پلٹ کر دیکھتے وہ بولا۔

"اچھا چھوڑو ان باتوں کو' یہ بتاؤ چائے پیو گے یا کچھ اور؟" وہ مسکراتے ہوئے گویا ہوئی۔ "چائے پھپھو کو کہہ آیا ہوں اور تم بیٹھو ذرا' مجھے تم سے بات کرنی ہے۔" صوفے پر بیٹھتے اس نے سنجیدگی سے کہا تو ہنیہ بھی اس کی سنجیدگی پر ٹھٹک گئی۔

"مما اور پاپا آج کل میری شادی کے سلسلے میں سرگرم ہیں اور مما تو اس سلسلے میں آنا بھی چاہ رہی تھیں یہاں۔ لیکن میں پہلے تمہاری رائے لے لینا چاہتا تھا۔ ایکچوئلی میں نے اپنے لائف پارٹنر کا اپنے ذہن میں جو خاکہ بنا رکھا ہے تم اس پر پورا اترتی ہو۔ اب آگے تمہاری مرضی' لیکن تمہاری ہاں یا نا سے وہ جو دوستی کا خوب صورت سا ریلیشن ہمارے درمیان ہے' تم یقین رکھنا' اس پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔" وہ کچھ کہنا چاہتی تھی' لیکن اس نے روک دیا۔

"آں ہاں' اتنی جلدی نہیں ہے' تم دو' تین دن بعد مجھے سوچ کر جواب دینا۔"

پھر موضوع بدلتے ہوئے کہا۔

"یہ ثانی نظر نہیں آ رہی' یہ تو ہو ہی نہیں سکتا کہ میں آؤں اور وہ اتنی دیر غائب رہے۔ شاید گھر پر نہیں ہے وہ۔"

"ہاں آج کل اس پر مختلف ریسیپیز ٹرائی کرنے کا شوق طاری ہے اور ہماری چچی ماشاء اللہ کوکنگ میں ایکسپرٹ ہیں' تو وہ آج بھی کسی ڈش کی شامت لانے کے سلسلے میں وہیں پائی جاتی ہے' بلکہ ابھی تھوڑی دیر پہلے تک میں بھی ادھر ہی تھی تمہارے آنے سے کچھ دیر قبل ہی نیچے آئی ہوں۔" اس نے تفصیل بتائی۔

"ویسے سنا ہے تمہارے کزن خاصے ڈیشنگ پرسنالٹی رکھتے ہیں' کبھی ملاقات نہیں ہوئی موصوف سے۔" چائے کے گھونٹ لیتا وہ بولا۔

"موڈی سے ہیں چچا' چچی کی نیچر سے بالکل مختلف ہم سے بھی بہت کم کم ملاقات ہو پاتی ہے۔ اچھا چھوڑو تم یہ بتاؤ ماموں جی اور ممانی کیسے ہیں۔ ان کو بھی لے آتے بہت دن ہو گئے ان سے ملے۔" وہ بات بدلتے ہوئے بولی۔

"ثانی تو دو بار پھپھو کے ساتھ چکر لگا چکی ہے' لیکن دنیا چونکہ تمہارے کندھوں پر چل رہی ہے' سو تم کو ہی ٹائم نہیں مل پاتا ہمارے آنے کا۔"

"اچھا بابا پرامس! کہ نیکسٹ ویک تک ضرور چکر لگاؤں گی۔" اس نے ہنستے ہوئے کہا۔ "اچھا اب اٹھو' کھانے کا وقت ہو گیا ہے' کھانا کھا کر جانا۔"

وہ دونوں باہر آ گئے جہاں کھانے کی ٹیبل پر امی اور ابو ان کا انتظار کر رہے تھے' جبکہ ثانی تاحال اوپر تھی۔

☼ ☼ ☼

اگلے دن ہنیہ اپنے تھیسس میں بری طرح منہمک تھی جب ثانی نے اسے ابو کا پیغام دیا کہ وہ اسے کمرے میں بلا رہے ہیں۔ وہ فوراً ہی ابو کے کمرے میں چلی آئی۔ امی بھی اس وقت وہاں موجود تھیں۔

"آپ نے بلایا ابو!" اس نے پوچھا۔

"ہاں بیٹا آؤ بیٹھو یہاں۔" وہ ان کے پاس بیٹھ گئی۔

"تم میری بہت پیاری بچیاں ہو۔ میری بہت سی ذمہ داریاں ایسی تھیں جو تم نے بانٹ کر مجھے سکھ دیا۔ تعلیمی مدارج ہوں یا گھریلو معاملات' میرے اللہ کا مجھ پر لاکھ کرم رہا کہ تم دونوں نے مجھے مایوس نہیں کیا۔"

ہنیہ منتظر نظروں سے ابو کو دیکھ رہی تھی جیسے جانچ رہی ہو کہ یہ تمہید کس سلسلے میں ہے۔ "تمہارے چچا کی طبیعت' ان کا مزاج' خود ساختہ ناراضی کا ایک طویل عرصہ اور اس تمام عرصہ میں بھائی کی ناراضی پہ میری پریشانی' تم سے کچھ چھپا ہوا بھی نہیں ہے بیٹیوں کی زندگیوں میں جلد یا بدیر مرحلہ آتا ہے جب ان کو والدین کا گھر چھوڑ کر اپنے اصلی گھر جانا پڑتا ہے۔ مطلب سسرال۔"

ابو نم آنکھوں سے مسکرائے تو بات کچھ کچھ سمجھ میں آنے پر ہنیہ چونک کر سیدھی ہو بیٹھی۔

"تمہارے چچا نے ایان کے لیے تمہارے رشتے کی بات کی ہے اور تمہارے ماموں بھی احمد کے لیے سرسری طور پر کہہ چکے ہیں اگرچہ باضابطہ طور پر کچھ نہیں کہا۔ ہم دونوں نے تم سے رائے لینے کے بعد ہی کسی حتمی فیصلے کا سوچا ہے مگر خوب سوچ سمجھ لو پھر اپنی امی کو بتا دینا۔"

ابو نے گیند اس کے کورٹ میں ڈال کر اسے جانے کو کہا تو وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ ایک نظر پاس بیٹھی امی پر ڈالی تو کوئی خاص تاثر نہ پا کر وہاں سے اپنے اور ثانی کے مشترکہ کمرے میں چلی آئی۔ حقیقت یہ تھی کہ اس نے ان دونوں کے متعلق کچھ اس انداز میں نہیں سوچا تھا خاص طور پر ایان کے متعلق تو بالکل بھی نہیں۔ دل کی بات ہوتی تو وہ فٹ سے دل کے حق میں فیصلہ دیتی کیونکہ جیسے وہ منہ پر کھری کھری سنا دینے والی تھی ویسے ہی اس کا دل بھی آئینے کی مانند شفاف تھا۔ زندگی کے کسی بھی موڑ پر اور کسی بھی رشتے میں منافقت اسے سخت ناپسند تھی۔ سوائے جو بھی فیصلہ کرتا تھا بہت سوچ سمجھ کر اور بہت سارے حقائق کو مدنظر رکھ کر کرتا تھا۔

بہرحال احمد کا پلڑا کچھ اس حوالے سے بھاری لگ رہا تھا کہ وہ اس کی عادات و مزاج کے تمام رنگوں سے واقف تھی اور ایک دن قبل ہی اس کے جذبات سے بھی آگاہ ہو چکی تھی' جبکہ دوسری طرف ایان اسے ایک موڈی' خودپسند اور کسی حد تک الجھی ہوئی شخصیت کی مانند لگا تھا ایسے لوگ سمندر کی طرح ہوتے ہیں تہہ در تہہ' اپنے اندر بہت کچھ چھپا کر رکھنے والے۔ زندگی کے کس موڑ پر ان کے مزاج کے کس پہلو سے آشنائی حاصل ہو جائے کچھ پتا نہیں لیکن ابو اور چچا کے تعلقات کی تجدید اور چچا اور چچی کا اس سے بے لوث پیار اسے کسی انتہائی فیصلے سے روک رہا تھا۔ جہاں تک چچا کی نیچر کو وہ سمجھی تھی وہ ایک جذباتی اور کسی حد تک شدت پسند انسان تھے۔ چھوٹی سی بات کو بنیاد بنا کر لمحوں میں جذباتی فیصلے کر لینے والے ان سے قطع تعلق اب کسی طور پر بھی ابو کے بس کی بات نہیں تھی اس نے گہری سانس لے کر خود کو حالات کے دھارے پر چھوڑ دینے کا فیصلہ کیا اور مطمئن ہو گئی۔

دو دن بعد امی نے جب اس کی مرضی کی بات دریافت کیا تو اس نے سکون سے کہا تھا۔

"امی میں سمجھتی ہوں انسان کی زندگی کے کچھ فیصلے ایسے ہوتے ہیں جو ماں باپ ہی کریں تو زیادہ بہتر ہوتا ہے کیونکہ وہ ہمارے اصل خیر خواہ ہوتے ہیں اور ہم سے کہیں زیادہ تجربات کی بھٹی میں سے گزرے ہوئے سو شادی جیسا اہم فیصلہ ان کی مرضی سے کیا جائے تو زیادہ اچھا ہوتا ہے۔ بعد میں جو کچھ ہو وہ پھر اپنے نصیب کی بات ہے۔"

بٹی کی بات پر امی نے تو سانس لگا کر اس کی پیشانی چومی تھی جبکہ امی کے پاس کسی کام کے لیے آئے ابو بھی نم آنکھیں لیے اور بیٹی کی فرمانبرداری کا خوش کن احساس لیے وہیں سے پلٹ گئے تھے۔

اب اس کے ماں باپ اس کے حق میں جو بھی فیصلہ کرتے اسے جی جان سے قبول تھا سو اس طرف سے بے فکر ہو کر وہ اپنی پڑھائی میں جت گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

چھٹی والے دن وہ ٹی وی پر اپنا کوئی پسندیدہ پروگرام دیکھ رہا تھا جب امی نے حکم جاری کیا کہ نیچے جا کر ثانیہ اور ہنیہ کو بلا لاؤ وہ دو دن سے نہیں آئیں وہ ان کے لیے ان کی پسندیدہ بریانی بنا رہی ہیں۔ امی کے کہنے پر وہ جز بز ہو کر اٹھ ہی گیا۔ ہنیہ تو اس دن والی مڈبھیڑ کے بعد اسے نظر ہی نہیں آئی تھی۔ اس کے آنے جانے کے اوقات کو مد نظر رکھ کے ہی اوپر چکر لگا جاتی تھی یہ امی کی زبانی پتا چلتا رہتا تھا۔ ہاں ثانی آتی رہتی تھی اور اس سے ایان کی بھی گہری چھننے لگی تھی۔ وہ اس کی فرمائشیں پوری کر کے خوش ہوتا اسے لگتا کہ جیسے واقعی وہ اس کی حقیقی بہن ہو۔ کبھی کبھار تایا کو بھی سلام کرنے چلا جاتا ایسے میں یا تو وہ قصداً خود اس کے سامنے آنا گوارا نہ کرتی یا شاید حقیقت میں ہی مصروف ہوتی۔ خیر وہ سیر تھی تو ایان بھی سوا سیر تھا۔ اس نے اس کی اس پہلو تہی کا نوٹس بھی نہیں لیا۔

جس وقت زینہ اتر کر نیچے آیا سامنے کوئی نظر نہیں آیا وہ ثانی کے کمرے کی جانب آگیا۔ ادھ کھلے دروازے پر دستک دینے کے لیے ہاتھ اٹھایا ہی تھا کہ اپنا نام سن کر اس کا ہاتھ وہیں فضا میں معلق رہ گیا۔

''کیا ہے ہنی صبح سے منتیں کیے جا رہی ہوں اوپر چلیں پر تمہیں نخرے سوجھ رہے ہیں اور کچھ دنوں سے میں فیل کر رہی ہوں جیسے تم ایان بھائی کو نظر انداز کر رہی ہو کیونکہ ان کی غیر موجودگی میں آرام سے میرے کہے بغیر چلی جاتی ہو اور ذرا سا بھی ان کی موجودگی کا شبہ ہو تو کئی بہانے بنا کر رک جاتی ہو کیا بات ہے کوئی بات یا کوئی جھگڑا ہوا ہے تم دونوں کے بیچ۔''

ثانی کی پہلے جھنجلائی ہوئی پھر مشکوک تاثرات والی آواز آئی تو اس کا جواب سننے کے لیے ایان آگے بڑھ آیا۔

''ہونہہ مجھے کیا ضرورت ہے تمہارے کڑوے کریلے بھائی سے لڑنے کی امی' ابو احسان انکل کی مسز کی عیادت کو گئے ہیں گھر کیسے خالی چھوڑ کے جاتیں جیسے ہی وہ لوگ آئیں گے میں آجاؤں گی۔'' اس نے جیسے زچ ہو کر ثانی کے ذہن میں آیا شک رفع کرنے کی کوشش کی جبکہ ثانی کی سوئی کریلے میں ہی اٹک گئی۔

''کیا کہا ہنی تم نے میرے اتنے سویٹ بھائی کو کڑوا کریلا۔'' ثانی کی چیخ نما آواز آئی۔

''ہاں تو کریلے جیسی خصوصیات رکھنے والے کو کریلا ہی کہا جائے گا ناں۔'' اس کی اطمینان بھری آواز پر ایان تلملا گیا اپنے متعلق مزید گوہر افشانیاں برداشت کرنے کے بجائے اس نے اندر جانا ہی مناسب سمجھا اور دروازہ ہلکے سے بجاتے ہوئے کھنکھار کر اندر چلا آیا ثانی کے چہرے پر تو گھبراہٹ پھیل گئی لیکن اپنی کتابیں ادھر ادھر کرتی ہنیہ کے چہرے پر وہی سکون تھا جو اس کا ازلی ساتھی تھا اور جو عموماً ایان کو غصہ دلانے کا باعث بھی بنتا تھا تاہم دونوں نے اسے سلام کیا اور ہنیہ نے بیٹھنے کو بھی کہا۔

''نہیں شکریہ۔ امی نے بھیجا ہے مجھے آپ لوگوں کو لینے کے لیے کافی دفعہ فون کرنے کی کوشش بھی کر چکی ہیں پر آف جا رہا ہے۔'' اس نے سنجیدگی سے کہا۔

''ہاں بھائی پچھلے دنوں ہونے والی بارشوں کی وجہ سے لائنز میں کچھ گڑ بڑ ہو گئی ہے' میں آپ کے لیے چائے لاؤں؟'' فون کا بتاتے ہوئے ثانی نے چائے کا پوچھا اور غور سے اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے جیسے کچھ اخذ کرنا چاہا کہ وہ کچھ سن تو نہیں چکا۔

''نہیں گڑیا! میں بس چلتا ہوں۔ پھر کسی وقت آؤں گا۔ آج تو تمہاری باری ہے۔ بھول گئی ہو آج ویک اینڈ ہے آئس کریم کا وعدہ تھا۔'' قصداً مسکرا کر اس نے ثانی کی تسلی کراتے ہوئے اڑتی پڑتی ایک نظر اس پر ڈالی ان دونوں کی گفتگو سے بے نیاز وہ ایسے ٹیبل پر رکھی بکس کی چھیڑ خانی میں مصروف تھی جیسے اس کے علاوہ یہاں کوئی ذی روح موجود ہی نہ ہو۔ ثانی کو جواب دیتے ہی وہ فوراً اوپر چلا آیا۔

خلاف توقع تھوڑی دیر بعد دونوں بہنیں اوپر آ گئیں۔ ثانیہ تو کچن میں اماں کے ساتھ مصروف ہو گئی جبکہ ہنیہ ابا کے ساتھ شطرنج کی بازی جما کر بیٹھ گئی۔ ایان نے خود کو اس ماحول میں مس فٹ فیل کیا اور بائیک کی چابی اٹھا کر باہر آ گیا۔

الوینہ کے ساتھ اس دن کے ہونے والے تلخ رویے کے باعث وہ بھی اس سے اکھڑی اکھڑی سی تھی' شاید ایان کی طرف سے کسی معذرتی پیش قدمی کی منتظر تھی پر ایان کہاں ان باتوں پر توجہ دینے والا تھا۔ ایک دو دفعہ اس نے اسے مخاطب کرنے کی کوشش کی پر اس کے روکھے رویے کے باعث اسے منانے کی بجائے خود ہی پیچھے ہٹ گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

انہی دنوں ایگزام شروع ہو کر ختم بھی ہو گئے اور اس کا ارادہ چونکہ بزنس کی فیلڈ میں جانے کا تھا سو رزلٹ آنے تک اس نے اپنے ایک کلاس فیلو کے چچا کی فیکٹری کو جوائن کر لیا اس کا نام تو علی کے ریفرنس سے آیا مگر چونکہ اس فیلڈ کے حوالے سے وہ سنجیدہ تھا سو جلد ہی اس کا کام نظر آنے لگ گیا تھا۔

بہت دنوں کے بعد آج آفس سے آ کر وہ فراغت سے ٹی وی سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ جب امی اس کے پاس آ کر بیٹھیں اور اسے فارغ اور خوشگوار موڈ میں دیکھ کر وہ بات بتائی جیسے سن کر وہ اچھل ہی پڑا۔

''کیا ابا نے مجھ سے پوچھے بغیر اپنی بھتیجی کے لیے رشتہ بھی بھیج دیا؟ میں پوچھتا ہوں ایسا کس کی اجازت سے کیا انہوں نے۔ آج کے ماڈرن دور میں تو لوگ لڑکیوں سے بھی ان کی مرضی کے متعلق جان کے بات کرتے ہیں آپ لوگوں نے پوچھنا تو ایک طرف بتانا بھی گوارا نہیں کیا۔ دو گز لمبی زبان کے سوا اور کون سی خصوصیت ہے اس پھولن دیوی میں نہ شکل نہ عقل۔ امپاسبل امی امپاسبل۔'' غصے سے چیخ کر اس نے کہا تو امی نے بے ساختہ اسے ٹوک دیا۔

''بس کرو ایان انکار کرنا ہے تو اپنے ابا کے سامنے کرو اور خوامخواہ اچھی' پڑھی لکھی اور باشعور لڑکی کو اپنے ابا کی ضد میں مت گنواؤ۔ لاکھوں میں نہیں تو ہزاروں میں بہتر ہے وہ بچی۔''

اس کے منہ سے نکلے ہوئے الفاظ غصے میں ہی سہی اوپر آئی ہنیہ نے سنے اور شاید پہلی بار دل پر بھی لیا کیونکہ نیچے جا کر وہ بے تحاشا روئی تھی۔

کیا شکل و صورت ہی کسوٹی ہوتی ہے انسان کو پرکھنے کی' اس کی قابلیت' تعلیم' سلیقہ' کردار اور شخصیت کوئی معنی نہیں رکھتے۔ اس نے ہمیشہ کردار اور عادات کو ترجیح دی تھی۔ شکل و صورت تو ان سب کے بعد کہیں آتے تھے خود اعتمادی اس کی شخصیت کا حصہ تھی پر آج اس خود اعتمادی میں بری طرح سے دراڑ ڈالی تھی ایان نے۔ ثانی کے اندر آنے پر وہ سوتی بن گئی تھی کہ اپنی انا اور بھرم ہی تو سب چیزوں سے عزیز تھا اسے۔

صبح ناشتے کی ٹیبل پر ایان کا موڈ خاصا بگڑا ہوا تھا۔

''یہ چیک میں نے سائن کر دیا ہے۔ ایان کو بینک بھیج کر جتنے کام آئیں پیسے نکلوا لینا۔ نکاح کے لیے جو ضروری لوازمات ہوتے ہیں بچی کو ساتھ لے کر جا کر اس کی مرضی سے خریداری کر لینا ہاں میں عندیہ تو دے ہی چکے ہیں بھائی' باقی میں آج یا کل ان سے مل کر نکاح کی تاریخ لے لیتا ہوں شادی بھی ایک دو ماہ میں ہی کر لیتے ہیں تب تک ہنیہ بھی پوری طرح اپنی پڑھائی سے فارغ ہو جائے گی۔''

ابا نے امی سے ایسے صلح جو انداز میں بات کی جیسے کبھی ان کا موڈ بگڑا ہی نہ ہو اور چائے پیتے ایان کی چائے نے چھلک کر اس کے کپڑوں کو داغدار کیا ہی اسے ہلکا سا جلا بھی ڈالا۔ وہ تو سمجھا تھا کہ اماں نے ابا تک اس کا انکار پہنچا دیا ہوگا پر یہاں تو وہ دونوں شادی تک کے پروگرام بنائے بیٹھے تھے۔

"امی! آپ نے ابا کو بتایا نہیں کہ میں نے آپ سے کیا کہا تھا۔" اس کے بگڑے ہوئے تیور دیکھ کر امی اندر ہی اندر سہم گئیں اور آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارہ بھی کیا کہ کچھ مت کہے کیونکہ عرصہ بعد ان کے مجازی ذرا خوشگوار موڈ میں نظر آئے تھے۔

"کیا کہا تھا برخوردار! آپ نے اپنی امی سے۔ ہمیں بھی تو پتا چلے۔ تم نے تو جب سے دفتر سنبھالا ہے شکل دیکھنے کو ترس گئے تمہاری ہم۔" ابا کا نرم انداز بھی اس کے برہم مزاج پر اثر نہ ڈال سکا۔

"میں نے امی سے کہا تھا کہ آپ ابا کو منع کردیں مجھے یہاں شادی نہیں کرنی۔ آپ کی بھتیجی سے تو ہرگز نہیں۔"

اس نے چبا چبا کر اپنی بات پوری کی جبکہ امی بے بسی سے کبھی ابا کو دیکھتیں تو کبھی ایان کو۔ کچھ لمحے ابا اسے غصے سے گھورتے رہے پھر جیسے غصہ ضبط کرکے بولے۔

"کیوں کیا خرابی ہے میری بھتیجی میں؟"

"سب سے بڑی خرابی ہی یہی ہے کہ وہ آپ کی بھتیجی ہے۔" اس کی یہ بات ابا کو پوری طرح سلگا گئی۔

"بھائی صاحب کے پاس اس کے بہت سے رشتے آئے ہوئے ہیں وہ تو میں ہی نہیں چاہتا تھا کہ اتنی اچھی اور سلجھی ہوئی بچی کہیں اور جائے۔ میری بھتیجی کو تم انکار کر بھی دو گے تو اس کو تو اچھا گھر اور قدردان لوگ مل ہی جائیں گے تم اپنی ماں کی خیر مناؤ۔ تمہارے انکار کی صورت میں اس عمر میں تمہاری ماں بے گھر ہوجائے گی۔ اس کو طلاق دے دوں گا' یہ بات اپنے ذہن میں رکھ لو۔"

ابا کے ہاتھ بھی اس کے خلاف ترپ کا پتا آہی گیا تھا اور انہوں نے اسے استعمال کرنے میں دیر نہیں کی تھی۔ ایان کے کچھ کہنے کے لیے کھلتے لب پھڑپھڑا گئے جبکہ امی کا چہرہ سفید پڑ گیا اور ابا۔ وہ زہریلے الفاظ ان کی سماعتوں میں انڈیل کر جاچکے تھے۔

"ٹھیک ہے ابا ایسے تو ایسے ہی سہی جب آپ میری ماں کو میرے خلاف میری کمزوری بنا کر استعمال کرسکتے ہیں تو میں بھی آپ کا بیٹا ہوں میں بھی آپ کی بھتیجی کو آپ کے خلاف استعمال کروں گا۔"

دل میں مصمم ارادہ باندھتے اس نے خوف و حیرت سے چپ بیٹھی امی کو مخاطب کیا تو لہجہ ان بہتے پانیوں جیسا رواں تھا جس میں ہزاروں طوفان چھپے ہوئے ہوتے ہیں۔

"ٹھیک ہے امی! میں ابا کی بھتیجی سے شادی کے لیے تیار ہوں" ٹھنڈے ٹھار لہجے میں کہتا وہ والٹ اور گاڑی کی چابی (حال میں ہی آفس کی طرف سے اسے گاڑی بھی مل گئی تھی) اٹھا کر باہر نکلتا چلا گیا۔

"اف یہ بیٹا اور باپ مل کر مجھے پاگل ہی نہ کردیں۔" امی نے سر تھام کر کہا۔

اس کی رضامندی پاتے ہی ابا اور امی اسی شام نچلے پورشن میں چلے آئے تھے کھانا کھا کر اب سب خوش گپیوں میں مصروف تھے جبکہ ہنیہ ابھی ابھی وہاں سے اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی آئی تھی جب سے پیپرز سے فارغ ہوئی تھی کچن کا چارج اس نے امی کے ہاتھ سے لے لیا تھا اور آج بھی دونوں بہنوں نے مل کر کھانا بنایا تھا۔ چچا' چچی کو چائے دے کر وہ اپنا کپ لے کر اپنے کمرے میں آگئی جبکہ ثانی ابھی تک سب کے ساتھ ہی تھی۔ ایان کو امی نے فون کردیا تھا اس کے آتے ہی وہ یہاں آگئی تھی۔ کھانا چونکہ سب کھاچکے تھے سو ثانی نے اب اسے کھانا نکال کردیا تھا۔ صبح کے برعکس اس کا موڈ خوش گوار تھا۔ امی ابا' دونوں نے اس کا موڈ دیکھ کر سکون کی سانس لی۔ دفعتاً" پھولی ہوئی سانس کے ہمراہ ثانی آئی اور دھپ سے اس کے برابر گر گئی۔

"اف ہنی ایک بمباسٹک نیوز لے کر آئی ہوں جلدی پوچھو کیا ہے؟ نہیں تو اس خبر کے بوجھ سے میرا پیٹ پھٹ جائے گا" کہہ کر ثانی کھلکھلا کر ہنسی خوشی اس کے ایک ایک انداز سے ہویدا تھی۔

"تمہیں تو دنیا کی ہر خبر ہی بمباسٹک لگتی ہے۔ سنادو یہ بھی دیکھیں کیسی خبر ہے۔" رسالے کی ورق گردانی کرتے ذرا کی ذرا نظر اٹھا کر اس نے پوچھا۔

"اف ایک تو مجھے شادی بیاہ کے گیت بھی نہیں یاد۔ خیر وہ تو میں جلد یاد کرلوں گی آخر کو گھر کی شادی ہے اور ہنی میں یہ سوچ رہی ہوں کہ کس فنکشن پر میں دلہا والی بنوں اور کون سے فنکشن پر دلہن والی۔" ثانیہ کی بے سروپا باتوں پر اس نے رسالہ رکھ دیا اور چونک کر پوری جی جان سے ثانی کی طرف متوجہ ہوئی۔

"کیا مطلب؟ کس کی شادی؟"

اس نے حیرت سے پوچھا "واہ بھئی واہ جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے۔ آپ کی اور ایان بھائی کی شادی جناب۔ نکاح سے لے کر ولیمہ تک کے پروگرام بھی بن گئے اور یہاں تمہیں رسالوں کی پڑی ہے۔" خوشی سے ثانی اور بھی بہت کچھ بتا رہی تھی پر اس کا ذہن ایک ہی بات پر اٹک گیا۔

"آپ کی اور ایان بھائی کی شادی۔" "مجھے تو اس نے پہلے ہی ریجیکٹ کردیا تھا تو کس چیز نے مان لینے پر مجبور کیا ہوگا' چچا نے سختی سے منوایا ہوگا یا چچی نے محبت کا واسطہ دے کر۔ میرے ابو کو چچا کے دوبارہ روٹھ جانے کا ڈر نہ ہوتا اور مجھے اپنے ابو سے حد درجہ محبت نہ ہوتی تو تم دیکھتے کہ تم سے پہلے ہی تم جیسے مغرور اور خود پسند شخص کو میں ٹھکرا دیتی پھر اس اذیت کا پوچھتی جو روح کو چھید ڈالتی ہے۔ چپ رہنے والی تو میں اب بھی نہیں ہوں ایان صاحب۔ اپنے ٹھکرائے جانے والے الفاظ کا بدلہ نہ لیا تو نام بدل دینا۔"

متنفری دل ہی دل میں اس کو مخاطب کیے بظاہر ثانی کی طرف متوجہ تھی۔

☆ ☆ ☆

آنے والے جمعہ کی شب ان کا نکاح بھی ہوگیا اور دونوں طرف سے شادی کی تیاریاں شروع ہوگئیں۔ چچی تو بہت عرصہ سے ہر کام' ہر چیز میں اس سے مشورہ لیتی تھیں اب جب وہ بہو بن گئی تھی تو ان کا پیار اس کے لیے اور زیادہ ہوگیا تھا۔

شادی کی تیاریوں میں یہ ڈیڑھ ماہ کیسے گزر گیا پتا ہی نہ چلا' زیادہ تر شاپنگ کے لیے امی' چچی اور وہ خود جاتی۔ پر جس دن ایان جاتا اس دن وہ ساتھ جانے سے گریز کرتی' ثانی اس کی کمی پوری کردیا کرتی تھی۔ بیبن بھی اکثر آکر شریک ہوجاتی۔ اب تو وہ بھی ایان کے متاثرین میں شامل تھی اس کے پچھلے رویے کو بھلا کر۔

احمد نے بہت دل سے اس کے نکاح کے بعد فون پر مبارک باد دی تھی' خود وہ آج کل آفس کے کام کے سلسلے میں دو ماہ کے لیے ملائیشیا میں تھا۔ دلہن بنی ہنیہ کو دیکھ کر بہت سے لوگوں نے کہا تھا کہ وہ بے حد پیاری لگ رہی ہے پر اس نے یہ سب سن کر سر جھٹک دیا تھا۔ اس کے پاس بیٹھے مغرور شخص نے صرف ایک غیر ارادی نظر ہی اس پر ڈالی تھی۔ پھر رخ موڑ کر ثانی کی کسی بات کا جواب دینے میں لگ گیا تھا۔

بہت لمبی اور تھکا دینے والی رسموں کے بعد میرج ہال سے آتے آتے انہیں بارہ بج گئے تھے۔ اس کمرے میں وہ پہلے ایک بار آئی تھی اور سرسری نظر ہی ڈالی تھی آج چونکہ گھر میں اس کی حیثیت بدل چکی تھی سو اور ہی نگاہ سے اس نے کمرے کا تفصیلی جائزہ لیا پورے کمرے کی آرائش گلاب کے پھولوں سے کی گئی تھی۔ یہ بھی چچا کے کہنے پر ڈیکوریٹر کے تخیلاتی ذہن کا کرشمہ ہی لگا تھا اسے' ورنہ ایان تو ہرگز نہیں اس کے استقبال کے لیے ہر طرف سرخ گلابوں کی آرائش کروا سکتا تھا۔

دفعتاً" ایک دل جلانے والی مسکراہٹ اس کے لبوں پر آئی اور ایان کے کمرے میں آنے سے پہلے اس نے اسی پل ذہن میں آنے والی سوچ پر عمل درآمد بھی کرڈالا۔

☆ ☆ ☆

ابا کی بھتیجی' اس نے دل ہی دل میں اسے مخاطب کیا بہت شوق تھا ناں مجھ سے رشتہ جوڑنے کا۔ مجبوری کا طوق میرے گلے میں تھا تمہارے تو نہیں' تم تو انکار کرسکتی تھیں۔ اب بھگتو۔

ایسی ہی منتقمانہ سوچیں لیے وہ کمرے میں داخل

ہوا۔ اس کا خیال تھا کہ زندگی کے اس اہم دن جب ہر لڑکی اپنے مجازی خدا سے سراہے جانے کی خواہش رکھتی ہے وہ اسے اتنی بری طرح اگنور کرے گا کہ آدھی اکڑ تو اس کی وہیں نکل جائے گی' حالانکہ اس پر سرسری نظر ڈالنے سے ہی وہ چونک گیا تھا ہمیشہ بے حد سادہ رہنے والی بقول اس کے ایک عام سی شکل و صورت کی بے حد معمولی سی لڑکی کیا اس حد تک حسین لگ سکتی تھی پھر بیوٹیشن کے ماہرانہ ہاتھوں کا کارنامہ سمجھ کر مطمئن ہو گیا۔ پر کمرے میں آکر حیرت کے شدید جھٹکے کے باعث اسے کمرے کے وسط میں ہی رک جانا پڑا۔

صوفے پر اس کا وہ عروسی لباس نفاست سے تہہ کر کے رکھا تھا جس میں ابھی کچھ دیر قبل وہ ملبوس تھی اور وسیع و عریض بیڈ کے ایک کونے میں سرتاپا کمبل میں لپٹا وجود یقینا" اسی کا تھا۔ ابا کی بھتیجی کے ہاتھوں یہ اس کی ایک اور شکست تھی' دل میں تو آئی کہ کمبل اتار پھینکے اور اس طرم خان لڑکی کو خوب جھنجوڑ کر رکھ دے' پر دل ہی دل میں غصے ہوتا وہ ڈریسنگ روم میں گھس گیا۔

فریش ہو کر کپڑے چینج کرنے کے بعد ایک خونخوار نظر کمبل میں لپٹی ابا کی بھتیجی پر ڈالی۔ وارڈ روب کے نچلے خانے سے ایک اور کمبل کھینچا اور غصے میں بل کھاتا بیڈ کے دوسرے کونے میں جا کر ٹک گیا۔ دل میں کئی منصوبے بناتا وہ کب نیند کی گہری وادی میں اتر گیا پتا ہی نہ چلا۔

دن چڑھے آنکھ کھلنے پر اس نے مندی مندی آنکھوں سے گھڑی کی جانب دیکھا جو نو بجا رہی تھی پھولوں پر نظر پڑتے ہی سب کچھ نئے سرے سے یاد آیا تو وہ اٹھ بیٹھا صوفے پر رکھا ہوا عروسی لباس وہاں سے غائب تھا۔ کمبل بھی بیڈ کی پائنتی پر نفاست سے لپٹا رکھا تھا کمرے میں اس کے کلون کے علاوہ ایک نئی خوشبو چکراتی پھر رہی تھی۔ فریش ہو کر جس پل وہ باہر آیا ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھے گھر کے افراد خوش گپیوں میں مصروف تھے' ثانی بھی آئی ہوئی تھی۔ ابا' امی' ثانی پر سے ہوتی ایان کی نظر اس پر جا پڑی۔

فیروزی رنگ کے کام والے سوٹ میں ہلکا پھلکا میک اپ اور ہلکے پھلکے زیورات کے ساتھ ہنستی ہوئی ہنیہ اس پل دل کے بے حد قریب محسوس ہوئی پر دل سے تو اس کی بغاوت ٹھہری تھی سو اس کی پکار کو نظر انداز کرتا وہ کھنکھار کر اجتماعی سلام کرتا گویا زبردستی اس ماحول کا حصہ بنا ورنہ اس کی کوئی خاص کمی محسوس نہیں کی جا رہی تھی۔

"اچھا بھئی میں تو ہنی کو دیکھنے چلی آئی تھی امی نیچے سخت خفا ہو رہی ہوں گی میں چلتی ہوں۔" ایان کے سلام کا جواب دیتی ثانی یہ کہہ کر تیزی سے وہاں سے غائب ہو گئی۔

"میں ناشتا لے آؤں اپنے بیٹے کے لیے۔" امی کرسی سے اٹھنے ہی والی تھیں جب اس نے انہیں ٹوک دیا۔

"بیٹھیں امی! گھر میں بہو آگئی ہے تو یہ اس کی ذمہ داری بنتی ہے ناں۔ تم جاؤ اور میرے لیے ناشتا لے کر آؤ۔" وہ ہنیہ سے مخاطب ہوا۔

"یہ کون سا طریقہ ہے ایک دن کی دلہن سے بھی کوئی کام کراتا ہے بھلا۔" امی جھنجلا کر کھڑی ہوئیں۔

"دیکھ لی اپنی تربیت۔ پھر مجھے الزام دیتی ہو کہ بغیر وجہ کے ہی بگڑتا ہوں۔" ابا بھی طنزیہ لہجے میں گویا ہوئے۔

"میں نے آپ میاں بیوی کے معاملات میں کبھی دخل نہیں دیا تو آپ دونوں سے خاص طور پر آپ سے ابا یہی امید رکھتا ہوں کہ ہم میاں بیوی کے معاملات میں دخل اندازی نہیں کریں گے ورنہ نتائج کی ذمہ داری آپ پر ہوگی۔" سپاٹ لہجے میں متنبہ کرتا ابا اور امی کو بہت مختلف سا ایان لگا۔

"تم نے سنا نہیں میں نے کیا کہا کہ میرے لیے ناشتا لے کر آؤ اور چائے میں ہمیشہ تازہ بنی ہوئی لیتا پسند کرتا ہوں۔" اس نے سر جھکائے بے تاثر چہرہ لیے بیٹھی ہنیہ کو مخاطب کیا تو وہ فورا" ہی اٹھ کھڑی ہوئی۔

"ایان!" امی نے کچھ کہنے کی کوشش کی۔

"آپ چاہتی ہیں ناں میں ابھی کچھ دیر یہاں بیٹھ کر سکون سے ناشتا کروں تو پلیز چپ بیٹھی رہیں۔" اس نے ہاتھ اٹھا کر ماں کو کہا تو تلملاتے ہوئے ابا چائے کا ادھ پیا کپ وہیں پٹخ کر اندر چلے گئے۔ وہیں ایان کو جیسے ڈھیروں سکون مل گیا۔

مجھے بھی ایسے ہی دکھ سے گزرنا پڑتا تھا ابا جب جب آپ امی کے ساتھ ناروا سلوک روا رکھتے۔ آج آپ کے خون کو میں نے ناشتا بنانے کو کیا کہہ دیا آپ کو ناگوار گزرا اور آپ نے گزشتہ تیس سال کے پل پل میری ماں کو کتنی بار اپنے الفاظ کے تیروں سے چھلنی کیا اور افسوس کی بات یہ ہے کہ ایک بار بھی آپ کو احساس ندامت چھو کر نہیں گزرا۔ جہاں سے ابا گزر کر گئے تھے ٹکٹکی باندھے دیکھتا دل ہی دل میں وہ ان سے مخاطب تھا جب چمچ بجا کر اسے ناشتے کی طرف متوجہ کیا گیا۔

"آپ کا ناشتا!" آہستہ سے اس نے کہا تو وہ چونک کر سیدھا ہو گیا۔ لہجے کی وہ مخصوص طراری غائب تھی جو اس کی طبیعت کا خاصا تھی۔

"آؤ تم بھی ناشتا کر لو۔" اس کی آنکھوں کی ہلکی سی سرخی سے نظر چرا کر وہ بے اختیار اسے ناشتے کی آفر کر بیٹھا۔ ابھی وہ جواب میں کچھ کہنے ہی لگی تھی کہ درمیانی راستے سے تایا' تائی اور ثانی ملازمہ کے ہمراہ ناشتے کے نام پر کئی لوازمات لے کر چلے آئے۔

"ارے ہمارے بیٹے نے ہمارا انتظار کیے بغیر ہی ناشتا شروع کر دیا۔ ہنیہ کو تو میں نے کہلوا بھیجا تھا کہ تمہیں بتا دے' تمہارا ابھی قصور نہیں ہے اتنا ٹائم ہو چلا ہے اصل میں پہلے ہنیہ ہوتی تھی منٹوں میں سب سنبھال لیتی تھی آج یہ ثانی نکمی نے جلدی کرتے کرتے بھی بہت دیر کر دی۔" تائی اماں نے پہلے ایان اور پھر چاچی سے مخاطب ہو کر کہا۔

"آؤ ثانی جلدی سے ٹیبل سیٹ کر کے اپنے چچا کو بھی بلا لاؤ بیٹا۔" تایا ابو نے خوش گواری سے کہتے کرسی سنبھالی۔

"جی جی تائی اماں مجھے بتایا تھا ہنیہ نے پر یاد نہیں رہا۔" ایک نظر اس پر ڈال کر ایان نے تائی امی سے معذرت کی۔ ثانی بھی ابا کو ہمراہ لیے چلی آئی تو ناشتے کے ساتھ ساتھ شام کو ہوٹل میں ہونے والا ولیمہ کا فنکشن ڈسکس ہونے لگا۔

ناشتے سے فارغ ہو کر ایان بھی علی کو ساتھ لے کر ہوٹل چلا گیا تھا تاکہ شام کے فنکشن کے متعلق سارے انتظامات چیک کر سکے اور کسی کمی بیشی کی صورت میں مزید ہدایات دے سکے۔ وہاں سے فارغ ہو کر جب وہ واپس گھر آیا تو امی کی زبانی پتا چلا کہ ہنیہ' ثانی اور ببین کے ہمراہ پارلر جا چکی ہے اور وہیں سے سیدھی ہوٹل پہنچے گی۔

فنکشن میں لائٹ پنک اور سی گرین لانگ شرٹ شرارہ میں ملبوس سجی سنوری ہنیہ کو دیکھ کر کچھ پل کو اس کی نگاہیں اسی پر ٹک سی گئی تھیں۔

"ہنی آپ کی ہو چکی ہے ایان بھائی! یقین نہیں آرہا کیا؟"

ثانی کی معصوم سی شرارت پر وہ سیدھا ہو گیا۔ اس نے الوینہ کو شادی میں نہیں بلایا تھا پر اسے گفٹ تھامے اسٹیج پر آتا دیکھ کر وہ حیران ہی رہ گیا۔

"میں نے تو اسی وقت تم سے کہہ دیا تھا کہ کچھ خاص ہے تم دونوں کے بیچ۔ پر تم آگ بگولہ ہو گئے تھے آج دیکھو میری پیش گوئی کی عملی تفسیر نظر آرہے ہو اس وقت۔"

لہجے میں ہلکی سی رقابت کی چبھن لیے اس نے بظاہر مسکرا کر کہا تو ایان نے کچھ کہے بغیر مسکرا کر اس کا گفٹ وصول کر لیا کہ اس پل کچھ اور لوگ دولہا دلہن کے ساتھ تصویریں بنانے کے شوق میں آگے بڑھ آئے تھے۔

☼ ☼ ☼

آج بھی اس نے وہی عمل دہرایا تھا اور ایان کے آنے سے قبل سوتی بن گئی تھی۔ ایان کو کون سی پروا تھی اس نے بھی پروا نہ کی۔ شادی کے سلسلے میں ایان نے صرف ایک ہفتہ کی چھٹیاں ہی لی تھیں۔ وہ بھی

خاندان میں یہاں وہاں اٹینڈ کی جانے والی دعوتوں میں گزر گئی تھیں۔ ابا پر اثر ہوتے دیکھ کر ایان بات بے بات ان کے سامنے ہنیہ کو یہاں وہاں کئی کاموں کے لیے دوڑائے رکھتا لہجہ و انداز بھی بہت سخت ہوتے ہاں چاہتے ہوئے بھی اس کی ویسی تضحیک نہ کر پاتا تھا جیسی ابا امی کی کرتے تھے۔ ابا کے جانے کے بعد اس کا لہجہ بدل جاتا پر ہنیہ نے پہلے دن سے نظر انداز کرنے اور چپ کی جو ڈگر اپنائی تھی اس پر ابھی تک چل رہی تھی۔ امی کو بھی اب کچھ کچھ اندازہ ہو گیا تھا کہ ایان کس وجہ سے ایسا کر رہا تھا پر بہت سمجھانے پر بھی کہ اس سب میں اس بچی کا کوئی قصور نہیں اس کی عقل میں یہ بات نہیں بیٹھی تھی الٹا وہ ان کو چپ کرا دیتا۔

احمد کی بات طے ہونے کے سلسلے میں ماموں کے گھر ایک تقریب تھی جس میں وہ سب انوائیٹڈ تھے۔ امی، ابا تیار ہو کر آ گئے ہنیہ بھی تیار ہونے لگی۔ آج ثانی کے مشورے پر اس نے ساڑھی باندھنے کا ارادہ کیا تھا۔ ٹی پنک ساڑھی پہن کر مناسب تیاری کر کے جس پل وہ لاؤنج میں آئی امی اور ابا بھی اس کا انتظار کر رہے تھے۔ جوں جوں دیر ہو رہی تھی ابا کا غصہ امی پر نکلنا شروع ہو گیا تھا۔

شام ڈھلے جس پل تھکا ہارا وہ لوٹا ابا تو بغیر لگی لپٹی رکھے اس پر برس پڑے۔ تحمل سے ان کی تمام جلی کٹی سننے کے بعد جرابیں اور جوتے اتارتے آرام سے گویا ہوا۔

"میں نے کب آپ لوگوں سے کہا تھا کہ میں اور میری بیوی اس تقریب میں شرکت کریں گے۔"

"یہ۔ یہ تم اچھا نہیں کر رہے ہو ایان! تمہیں مجھ پر جو غصہ ہے یا جو بھی بات ہے مجھ سے کرو اس بچی کے ساتھ ایسا مت کرو۔" ابا شاید سمجھ گئے تھے۔ اور زندگی میں پہلی بار غصے میں بولتے بولتے آخر میں ان کا لہجہ التجائیہ ہو گیا۔

"تم۔ تم ہی کچھ سمجھاؤ اس کو۔ گھر میں تو جو رویہ ہے سو ہے گھر سے باہر مت تماشا بنائے تمہارا نہ اس بچی کا۔" ابا کا روئے سخن اب اماں کی طرف ہو گیا تھا۔

"ایان تمہارے ابا ٹھیک کہہ رہے ہیں بیٹا۔ تم اپنے ابو کی وجہ سے ایسا کر رہے ہو ناں تو خدا کی قسم بیٹا مجھے ان سے کوئی شکایت نہیں ہے مجھے تو اب ان کے مزاج کی اتنی عادت ہو گئی ہے کہ اب آرام سے بات کر لیں تو اجنبی اجنبی سے لگنے لگتے ہیں۔ پانچ بجے تقریب کا ٹائم تھا۔ تمہارا انتظار کرتے کرتے سات بج گئے اب جس کا قریبی رشتہ ہے، ان سے وہ ہی نہ جائے تو کتنا برا لگے گا۔ تم تو میرے بہت اچھے بیٹے تھے۔ کیوں کر رہے ہو ایسا؟" امی تو باقاعدہ اس کے پاس بیٹھ گئیں اور اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر رسان سے گویا ہوئیں۔

ابا بھی امی کی بات سن کر ٹھٹک گئے تھے تو گویا جس بات کا انہیں شک تھا وہی ہوا وہ ان کو سزا دینے کے لیے ہنیہ سے برا رویہ اختیار کر رہا تھا۔

"ایان! تمہارے ایسا کرنے سے بہت پہلے ہی مجھے میرے رویے کا احساس ہو گیا تھا بیٹا! مجھے اس بات کا احساس دلانے والی بھی ہنیہ بیٹی ہی تھی بخدا تمہاری ماں سے مجھے کبھی بھی نفرت نہیں تھی۔ بس ماں باپ سر پر نہ رہیں تو بچے یونہی اکھڑ اور خود سر ہو جاتے ہیں۔ مزاج میں حاکمانہ پن کو تمہاری ماں کی جی حضوری کی فطرت سے تسکین ملی تو وہ سب کچھ عادت بنتا چلا گیا۔ تم مجھے معاف نہیں کر سکتے تو اس بچی کو سزا نہ دو۔"

ابا کے لہجہ میں پشیمانی تھی۔ جھکا ہونے کے باعث وہ اس کے تاثرات نوٹ نہ کر سکے تھے جبکہ ہنیہ کی برداشت کی حد بس یہی تک تھی آنکھوں میں آنسو بھرے وہ جھٹکے سے اٹھی۔

"بس کریں چچا جان، چچی جان ماں باپ معافیاں مانگتے اچھے نہیں لگتے۔ رعب اور مان سے بات کرتے اچھے لگتے ہیں۔ پتا نہیں کیسی اولاد ہیں، یہ جن کو ماں باپ کو سر جھکائے دیکھ کر تسکین مل رہی ہے۔ آپ دونوں کا قصور صرف اتنا تھا کہ ان کی مرضی کے خلاف ان کی شادی مجھ سے کی جبکہ یہ اس جگہ پر کسی طرح دار حسینہ کو لانا چاہتے تھے۔ مجھ جیسی کم شکل اور کم عقل لڑکی کو نہیں بقول ان کے جس کی گز لمبی زبان بھی ہے،

آپ لوگوں کو نہ تو منتیں کرنے کی ضرورت ہے نہ شرمندہ ہونے کی۔ میں فون کر کے ماموں کو اپنی طبیعت خرابی کا بتا کر معذرت کر لیتی ہوں۔"

بہت دنوں بعد اس کا وہی دو ٹوک انداز سنائی اور دکھائی دیا اس کے بعد وہ رکی نہیں تھی کمرے میں چلی گئی تھی۔ پر اپنے کمرے میں آ کر زیادہ دیر ضبط نہ ہو سکا تو پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ بہت مضبوط تھی کہ چھوٹی موٹی مشکلات کو کبھی خاطر میں نہ لائی تھی پر عزت نفس پر پڑنے والی چوٹ بہت بڑی اور بری تھی۔ زندگی کے سب سے اہم معاملے میں مات کھائی تھی تو بہت چوٹ لگی تھی۔ اسے ماموں کے گھر فون کر دینے کا خیال آیا تو خود پر قابو پا کر اٹھی اور سائیڈ ٹیبل پر پڑا اسیل اٹھا کر لینڈ لائن نمبر ڈائل کیا کسی ملازم نے اٹینڈ کیا تھا۔ اس نے شکر ادا کیا کہ گھر کے کسی بندے نے نہیں اٹھایا سو اس کو اپنی طبیعت کی خرابی کا بتا کر تاکید کی کہ ممانی کو بتا دیا جائے کہ وہ فنکشن میں شریک نہیں ہو سکے گی۔

کپڑے تبدیل کر کے وہ یونہی بے مقصد بیٹھی پتا نہیں کیا کیا سوچتی رہی۔ تھوڑی دیر بعد چچی اسے کھانے کے لیے بلانے آئیں منہ ہاتھ دھو کر وہ باہر آ گئی۔ کھانے پر صرف چچا اور چچی تھے۔ وہ خود نجانے کہاں تھا۔

"ہنیہ بیٹا!" چچا نے کچھ کہنے کی کوشش کی۔

"کچھ مت کہیں چچا! کچھ کہا یا جتایا ان لوگوں کو جاتا ہے جو بے خبر ہوں میں تو ہر بات سے باخبر ہوں۔ یہ جو سب کچھ ہو رہا ہے یا ہو گا اس میں آپ لوگوں کا کوئی دوش نہیں ہے میری قسمت ہے اور اسے میں نے قبول کر لیا ہے آپ کچھ کہہ کر مجھے شرمندہ نہ کریں۔ کھانا نکالیں۔" اس نے پھیکی مسکراہٹ سے ڈش ان کی طرف بڑھائی تو چچا اتنی اچھی بھتیجی کے اتنی اچھی طبیعت و فطرت اور بیٹے کی کم عقلی پر بہت کچھ سوچ کر رہ گئے۔

اور جس وقت وہ کھانا کھا رہے تھے امی، ابا اور ثانی چلے آئے۔ وہ لوگ ماموں کے ہاں سے سیدھا یہیں آئے تھے۔ اس کی طبیعت کی خرابی کا سن کر پریشان ہو گئے تھے وہ لوگ۔

"بس امی! سر میں شدید درد ہو گیا ایک دم ہی۔ میں نے ان سب سے کہا کہ چلے جائیں پر میرے بغیر یہ سب بھی نہیں آئے۔ میں تو ماموں، ممانی اور احمد سے سخت شرمندہ ہوں۔"

چچی اور چچا نے ان کا اور ان کے بیٹے کا بھرم رکھتی ہنیہ کو غور سے دیکھا وہیں گھر میں آتے ایان نے بھی سب کچھ خاموشی سے سنا اور آ کر خوش دلی سے ان سب سے ملا۔

"ماموں، مامی تو پھر بھی آپ کو چھوڑ دیں گے، احمد بھائی سخت خفا ہیں آپ سے کہہ رہے تھے ہنی سے کہنا۔ وہ دعوے کہاں گئے کہ شادی کے بعد بھی نہیں بدلیں گے اور اچھے دوست رہیں گے آپ لوگ اور ان کی زندگی کے اہم موقع پر ان کی دوست ہی موجود نہیں ہے۔"

ثانی نے اسے کہا تو وہ مسکرا دی۔ چائے ان سب نے خوشگوار ماحول میں پی۔ اور جب تایا اور تائی وغیرہ گھر جانے کے لیے پر تول رہے تھے سب کی درمیان بیٹھی ہنیہ کو مخاطب کرنا امی ابا اور خود ہنیہ کو حیرت میں ڈال گیا جبکہ تایا تائی اور ثانی چونکہ کچھ نہیں جانتے تھے سو مسکرا دیے تھے اس کی بات سن کر۔

"ہنیہ! کیا خیال ہے اب تو طبیعت بہتر ہے تمہاری کیوں نہ ماموں اور ممانی کے گھر جا کر معذرت بھی کر آئیں اور احمد کو بھی بتا آئیں اس کی دوست شادی کے بعد بھی نہیں بدلی، ویسی ہی ہے۔" ایان کا لہجہ ایسے دوستانہ تھا جیسے بہت خوشگوار تعلقات ہوں ان کے درمیان اور کبھی کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

"ہاں ہاں بیٹا چلے جاؤ تم لوگ۔ وہ لوگ بھی خوش ہو جائیں گے، رات گہری ہونے سے پہلے لوٹ آنا۔"

ابا کا بس نہیں چل رہا تھا کہ "فوراً" سے پیشتر ان دونوں کو روانہ کر دیں۔ ہنیہ جو انکار کرنے کے لیے پر تول رہی تھی سب کی منتظر نظریں خود پر جمی دیکھ کر "فوراً" ہی تیار ہونے کے لیے اٹھ گئی۔

"ہنی! وہی ساڑھی پہننا جو میں سلیکٹ کرکے رکھ گئی تھی۔" ثانی نے پیچھے سے ہانک لگائی تو وہ سرہلا کر اندر آگئی۔

پل میں تولہ پل میں ماشہ ہوتے اس شخص پر دل میں اتنا غصہ تھا کہ اگر وہ سب نہ ہوتے تو اس وقت اس کی خوب خبر لیتی۔ پندرہ منٹ سے بھی کم ٹائم میں وہ تیار ہو کر آئی تو چچی نے پیشانی چوم کر ماشاء اللہ کہا۔ ایان نے ایک نظر اس پر ڈال کر نظر چرالی۔ جبکہ امی ابو ثانی جو اس کے انتظار میں تھے اس سے مل کر نیچے چلے گئے۔

وہ خاموشی سے آکر گاڑی میں اس کے پہلو میں بیٹھ گئی۔

"یاد ہے ایک دفعہ اس جگہ بیٹھنے کے لیے تم نے انکار کردیا تھا۔"

وہ جیسے کسی یاد کے زیر اثر بولا تو وہ چپ بیٹھی رہ گئی۔ سگنل پر رک کر ایان نے ایک لڑکے کو روک کے اس کے لیے گجرے لیے اور دھیرے سے اس کا دایاں ہاتھ اٹھا کر اس میں ڈال دیے۔ ہنیہ کی آنکھوں میں نہ جانے کیوں نمی سی تیر گئی۔ اب یہ نہ جانے اس شخص کا اصل روپ تھا یا وہ جو دو دن میں نہ جانے کئی بار دیکھتی اور اپنا دل جلاتی تھی، اسی کا کوئی ڈھنگ۔

"ناراض ہو؟" اس کے دھیمے سے پوچھے گئے سوال پر بھی وہ چپ ہی رہی۔

"ہونا بھی چاہیے اور بہت زیادہ ہونا چاہیے۔ اپنی انا کے زعم میں ابا سے بدلہ لینے کی خاطر میں نے یہ نہیں سوچا کہ تمہارے بھی احساسات و جذبات ہیں جو یقیناً" بہت مجروح ہوئے ہوں گے' پر یقین جانو' میں نے جو اس دن امی کے سامنے تمہیں بدشکل' بدعقل اور دو گز کی زبان رکھنے والی کہا تھا تو جان کر کہا تھا کہ تمہارے دوپٹے کا ایک کونا سیڑھیوں پہ دیکھ لیا تھا اور تمہاری اس بیگانگی کا بدلہ لینا چاہ رہا تھا جو تم نے میرے ساتھ گاڑی میں لفٹ نہ لے کر دکھائی تھی۔ دل میں ایک کونا تمہارے نام کا جگمگایا ہی تھا کہ اپنے بارے میں تمہارے خیالات سنے "کڑوا کریلا" یہی کہا تھا نا تم نے بدگمانی نے اس کونے کی چمک ماند کردی۔ پھر شادی کی رات تمہارے رویے نے تابوت میں آخری کیل ٹھونکی۔" ہنیہ سوچ رہی تھی مرد ہمیشہ یہ کیوں چاہتا ہے کہ ہر بار عورت ہی جھکے' اسی انا' انا کے کھیل کھیلنے میں کئی دن' کئی مہینے اور سال اپنی خوب صورتی کھو بیٹھتے ہیں۔

وہ مسکرایا۔ "دل جو تمہاری اسیری کے راگ الاپ رہا تھا۔ میں نے اسے کچھ دن کے لیے ڈپٹ دیا کہ ابا کو ان کے ناروا رویے کا احساس دلانا مقصود تھا۔ بس۔۔۔ لیکن کیا ہے کہ جب ابا نے مجھ سے معافی مانگی تو ایک پل کو میں بے حد شرمندہ ہوگیا کہ یہ کام تو میں محبت سے بھی کرسکتا تھا۔ اس کے لیے ضد کی جنگ کی ضرورت ہی نہیں تھی' اب بھی دیر نہیں ہوئی ہے۔ جو ہوگیا سو ہوگیا آئندہ کے لیے میرا وعدہ کہ تمہارے ہونٹوں پر صرف میرے نام کی ہنسی ہوگی۔ بس۔۔۔ میں چاہتا ہوں ماموں کے گھر جب ہم جائیں تو تمہارے چہرے پر بناوٹی نہیں' بلکہ حقیقی مسکراہٹ ہو جو کہ دل سے نکلے جس میں تمہاری آنکھیں بھی شریک ہوں۔"

آہستہ آہستہ کہتے وہ اس کی طرف جھکا۔

"معاف کردیا یا میری طرح ابھی کچھ دن مجھے سزا دینے کا ارادہ ہے جیسے میں نے تمہیں بے وجہ دی۔"

ہنیہ اس کو بہت کچھ سنانا اور کہنا چاہتی تھی۔ اس نے اپنے بہتے ہوئے آنسو پونچھے اور تھک کر اس کے شانے سے سر ٹکا دیا۔

ایان نے سائیڈ پر کھڑی کی ہوئی گاڑی دوبارہ اسٹارٹ کی اور تیز رفتاری سے ماموں کے گھر کی طرف بڑھنے لگا کہ گھر پہنچ کر طمانیت کا وہ احساس جو اس وقت ان کے چہرے پر چھلک رہا تھا ابھی امی اور ابا کو بھی دکھانا تھا۔

پردیسی!

اس بار اکیلے مت آنا

کوئی بات ادھوری لے آنا

جسے مل کے پورا کرنا ہو

کوئی لفظ، جسے تم کبھی کہیں نہیں بول سکے

کوئی گیت، جسے تنہا نہیں گایا جاسکتا

کوئی رنگ، جو میں نے ساری عمر نہیں دیکھا

اک بیگ میں بھر کے لے آنا

جو خواب پرائے دیس میں تم نہیں دیکھ سکے

وہ پھول

جو تم نے کسی کو دینا چاہے اور نہیں دے پائے

وہ نیند

جسے گٹھڑی کی طرح

پلکوں پہ لادے پھرتے ہو

سب اپنے ساتھ اٹھا لانا

اس بار اکیلے مت آنا

حمیدہ شاہین

لڑکھڑاتے ہوئے بھی اور سنبھلتے ہوئے بھی
اس کے در پر ہی گئے خواب میں چلتے ہوئے بھی

عشق آثار بھی، ہر راہ گزر تیری تھی
ہم بھٹک سکتے نہ تھے راہ بدلتے ہوئے بھی

سلسلہ تجھ سے ہی تھا تیرے طلب گاروں کا
برف ہوتے ہوئے بھی، آگ میں جلتے ہوئے بھی

زندگی! فقط تیرے ایک تبسم کے لیے
ہم کہ ہنستے ہی رہے درد میں ڈھلتے ہوئے بھی

بن ترے ایسا اندھیرا تھا مرے اندر یار!
ڈر لگا عشق کے سورج کو نکلتے ہوئے بھی

پیرزادہ قاسم

یوں بھی ہونے کا پتا دیتے ہیں
اپنی زنجیر ہلا دیتے ہیں

پہلے ہر بات پہ ہم سوچتے تھے
اب فقط ہاتھ اُٹھا دیتے ہیں

قافلہ آج کہاں ٹھہرے گا
کیا خبر آبلہ پا دیتے ہیں

بعض اوقات ہوا کے جھونکے
لَو چراغوں کی بڑھا دیتے ہیں

دل میں جب بات نہیں رہ سکتی
کسی پتھر کو سُنا دیتے ہیں

ایک دیوار اُٹھانے کے لیے
ایک دیوار گرا دیتے ہیں

باقی صدیقی

جب سے اک چاند کی چاہت میں ستارا ہوا ہوں
شہرِ شب زاد کی آنکھوں کا سہارا ہوا ہوں

اے مرے درد کے دریا کی روانی! مجھے دیکھ
میں ترے قرب سے کٹ کٹ کے کنارہ ہوا ہوں

زندگی! تجھ سا منافق بھی کوئی کیا ہوگا
تیرا شہکار ہوں اور تیرا ہی مارا ہوا ہوں

سامنے پھر مرے اپنے ہیں، سو میں جانتا ہوں
جیت بھی جاؤں تو یہ جنگ میں ہارا ہوا ہوں

زخم گنتا ہوں شبِ ہجر میں اور سوچتا ہوں
میں تو اپنا بھی نہ تھا، کیسے تمہارا ہوا ہوں

میں پیمبر ہوں نہ ہو سکتا ہوں، پھر بھی احمد
ایسا لگتا ہے سرِ خاک اتارا ہوا ہوں

احمد فرید

اس ماہ کی مسکراہٹیں

صبا سحر

بے نیازی

نئے نئے دولت مند ہونے والے میاں، بیوی یورپ کی سیر کو چلے گئے۔ واپسی پر ان کے دوست احباب بے چینی سے ان کے سفر کا حال سننے کے منتظر تھے۔ ان کے اعزاز میں دی گئی ایک دعوت میں ایک خاتون نے نو دولت مند کی بیگم سے پوچھا۔

"آپ نے روم کو بھی اپنے دورے میں شامل رکھا تھا یا نہیں؟"

"مجھے تو نہیں معلوم۔" بیگم نے بے نیازی سے کندھے اچکا کر کہا۔ "ٹکٹ ہمیشہ میرے شوہر ہی خرید کرلاتے تھے۔"

ندا جمیل۔۔۔ ناظم آباد

راز کی بات

شہرت جانے والا فٹ بال کا ایک کھلاڑی اپنے گاؤں کے چند نوجوانوں کو جمع کرکے فٹ بال کھیلنا سکھا رہا تھا۔ کھیل کے قواعد بیان کرنے کے بعد وہ بولا۔

"اب میں آپ کو قانونی اصولوں سے ہٹ کر ایک راز کی بات بتاتا ہوں۔ اگر کسی موقع پر آپ فٹ بال کو کک نہ لگا سکیں تو کم از کم مخالف ٹیم کے کسی کھلاڑی کو ضرور ایک کک لگادیں۔"

کچھ توقف کے بعد اس نے کہا۔ "چلیں اب کھیل شروع کرتے ہیں۔ فٹ بال کہاں ہے؟"

"او گولی ماریں جی فٹ بال کو۔۔۔ بس کھیل شروع کریں۔" ایک نوجوان جوش سے بولا۔

ماہم اختر۔۔۔ سائٹ کراچی

ٹیکس

خالد نے سگریٹ کا آخری کش لیتے ہوئے سرفراز سے پوچھا۔ "اس دفعہ سگریٹوں پر نئے ٹیکس کیوں لگا دیے گئے ہیں؟"

سرفراز نے جواب دیا۔ "یہ ایک پوشیدہ ٹیکس ہے اس نئے قبرستان کو ترقی دینے کے لیے۔۔۔ جو صرف سگریٹ نوشوں کے لیے مخصوص ہوگا۔"

فائزہ۔۔۔ ملیر کراچی

صدمہ

مالکن اداس بیٹھی آہیں بھر رہی تھی۔ ملازمہ نے پوچھا۔ "بیگم صاحبہ! آپ اتنی اداس کیوں ہیں؟"

مالکن نے بڑے دکھ سے جواب دیا۔ "تمہارے صاحب اپنے دفتر میں کسی ٹائپسٹ کی محبت میں گرفتار ہوگئے ہیں۔" ملازمہ نے بے ساختہ چیخ کر کہا۔

"ایسا نہیں ہو سکتا۔ آپ مجھے جلانے کے لیے کہہ رہی ہیں نا۔"

مدیحہ احمد۔۔۔ گلشن اقبال

سفارشی خط

مشہور زمانہ ادبی رسالہ "ساقی" کے مدیر شاہد احمد دہلوی کے پاس ایک نئے شاعر نے ایک مشہور شاعر کے سفارشی خط کے ساتھ اپنی ایک غزل اشاعت کے لیے بھیجی۔ شاہد احمد دہلوی نے انہیں جواب لکھا۔

"آپ کی غزل تو اچھی ہے لیکن جن صاحب سے آپ نے سفارشی خط لکھوایا ہے۔ ان کے بارے میں میری رائے اچھی نہیں ہے۔ لہٰذا یہ غزل واپس کر رہا ہوں۔"

رخسار ظفر۔۔۔ اقبال ٹاؤن لاہور

گھنٹی کی آواز

ایک صاحب اپنے دوست کو بتا رہے تھے۔
"کل میرے ساتھ بڑا برا ہوا میں رات کے تین بجے گھر پہنچا۔ میری بیوی سو رہی تھی۔ اسے میرے آنے کا اندازہ ہوا تو غنودگی میں پوچھنے لگی کہ کیا وقت ہوا ہے؟ میں نے جلدی سے کہا۔ صرف بارہ بجے ہیں جان! لیکن اسی وقت کم بخت وال کلاک نے تین گھنٹیاں بجادیں۔"
"پھر تو واقعی بڑی مشکل ہو گئی ہوگی۔" دوست نے کہا۔
"ہاں یار! مجھے دیوار کے ساتھ لگ کر اپنے منہ سے نو گھنٹیوں کی مزید آوازیں نکالنی پڑیں۔" ان صاحب نے گہری سانس لے کر کہا۔

مسرت الطاف احمد... کراچی

بہترین دور

ایک صاحب اپنے دفتر کے ساتھی کو بتا رہے تھے۔
"میرے بچے اس وقت عمر کے بہترین دور میں ہیں۔"
"اچھا... کیا عمر ہے ان کی؟" ساتھی نے اشتیاق سے پوچھا۔
"ارے بھئی! وہ نہ تو اتنے چھوٹے ہیں کہ راتوں کو اٹھ اٹھ کر روئیں اور نہ اتنے بڑے ہیں کہ گھومنے پھرنے کے لیے میری کار کی چابیاں مانگیں۔" ان صاحب نے ہنستے ہوئے نہایت اطمینان سے جواب دیا۔

عائشہ غلام... سرجانی ٹاؤن

سراغ رسانی

ایک پرائیویٹ سراغ رساں نے اپنی موکلہ کو رپورٹ دیتے ہوئے کہا۔
"میں آج صبح سے آپ کے شوہر کے پیچھے لگا ہوا ہوں۔ وہ اپنے فاضل وقت میں چار مختلف ہوٹلوں کے بار میں اور ایک کنواروں کے کلب میں تشریف لے کر گئے ہیں۔"
"بہت خوب!" بیوی نے کہا۔ "آگے کہو۔ وہ وہاں کیا کرنے گیا تھا؟"
"جہاں تک میں نے معلومات حاصل کی ہیں، وہ آپ کی پرائیویٹ مصروفیات کی چھان بین کرتے پھر رہے ہیں۔" سراغ رساں نے پیشہ ورانہ مہارت کا ثبوت دیتے ہوئے کہا۔

افشاں فرقان... حیدر آباد

احمق

اسکاٹ لینڈ کا ایک نوجوان لندن کی سیر کو گیا۔ واپسی پر اس کے دوستوں نے پوچھا۔
"اور سناؤ لندن پسند آیا؟"
"ویسے تو اچھا ہے مگر وہاں کے لوگ بڑے احمق ہیں۔" اس نے قدرے بے زاری سے کہا۔
"وہ کیسے بھئی!" دوستوں نے حیرت سے سوال کیا۔
"ایک رات دو بجے کسی نے میرے دروازے پر دستک دی اور پھر دیتا ہی رہا۔ ساتھ ساتھ وہ بری طرح سے چیخ بھی رہا تھا۔ دیکھو! ہے نا کتنی بڑی حماقت... رات دو بجے کسی کے دروازے پر چیختے ہوئے دستک دینا؟"
"پھر تم نے کیا کیا؟" دوستوں نے اب کے تعجب سے پوچھا۔
"میں نے کچھ نہیں کیا۔ بس اپنا ماؤتھ آرگن بجاتا رہا۔" اس نے لاپروائی سے بتایا۔

بینا صدیقی... کورنگی کراسنگ

ڈر

"میرا بوائے فرینڈ بہت خوبرو، تعلیم یافتہ اور دولت مند ہے۔ میں اسے بہت چاہتی ہوں۔ وہ بھی مجھ پر جان چھڑکتا ہے اور مجھ سے شادی کرنا چاہتا ہے لیکن مجھے ڈر لگتا ہے۔" ایک خوب صورت لڑکی نے اپنے نفسیاتی معالج سے اپنی الجھن بیان کی۔
"کس سے ڈر لگتا ہے آپ کو؟" ماہر نفسیات نے پوچھا۔
"اپنے شوہر سے۔" خوب صورت لڑکی نے افسردگی سے جواب دیا۔

شگرف اعجاز... گلشن اقبال

وقت کی پابندی

بورڈ کا سیکریٹری اعلانیہ کہہ رہا تھا۔
"زندگی میں پہلی بار ہم نے آج کی میٹنگ وقت مقررہ پر شروع کی لیکن میٹنگ ایک گھنٹہ تاخیر سے اختتام کو پہنچی کیونکہ دیر سے آنے والوں کو ان فیصلوں سے مطلع کرنا ضروری تھا، جو میٹنگ میں شروع میں کر لیے گئے تھے..."

کومل عدنان... گلستان جوہر

سمجھوتا

ایک نو آموز مصنف نے ایڈیٹر سے شکوہ کیا۔
"آپ نے مصنفوں پر یہ پابندی کیوں لگا رکھی ہے کہ وہ کاغذ کے ایک طرف لکھیں؟"
"یہ تو ہم نے حالات سے سمجھوتا کیا ہے۔" ایڈیٹر نے گہری سانس لے کر کہا۔
"حالات سے سمجھوتا... کیا مطلب؟" نو آموز مصنف نے حیرت سے پوچھا۔
"بھئی کیونکہ بعض لوگوں کے بارے میں تو ہمارا خیال ہے کہ وہ صفحے کے ایک جانب بھی نہ لکھیں۔" ایڈیٹر نے جواب دیا۔

سحر سہیل... بفرزون

قید

ایک مرتبہ مرزا غالب کو قید ہو گئی۔ رہائی کے بعد میاں کالے صاحب کے ہاں آ کر رہے۔ ایک روز میاں صاحب کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ کسی نے آ کر قید سے رہائی پانے کی مبارک باد دی۔
غالب نے فوراً جواب دیا۔
"کون قید سے چھوٹا ہے۔ پہلے گورے کی قید میں تھا۔ اب کالے کی قید میں ہوں۔"

انیلا سرفراز... ملتان

اظہارِ محبت

مغربی ممالک میں اظہار محبت یوں بھی ہوتا ہے۔
"یہ تم کن جھنجھٹوں میں پھنسی ہوئی ہو۔ میرا دل چاہتا ہے کہ تمہیں یہاں سے کہیں دور، بہت دور لے جاؤں۔ ہمارا ایک چھوٹا سا گھر ہو۔ جس کے آنگن میں خوشیوں کے پھول کھلیں۔ ننھے منے معصوم بچوں کی ہنسی کی چہکار سے در و دیوار جھوم اٹھیں۔ اور... اور..."
"کہو نا... خاموش کیوں ہو گئے؟" دوسری طرف سے فوراً پوچھا جاتا ہے۔
"اور اگر حالات اجازت دیں تو ہم شادی بھی کر لیں۔" بہت محبت سے جواب دیا جاتا ہے۔

صائمہ عمران... جوہر ٹاؤن

سانحہ ارتحال

شعبہ کتابت کے محمد امین کی والدہ محترمہ مختصر علالت کے بعد اس دار فانی کو الوداع کہہ گئیں۔
اناللہ وانا الیہ راجعون
والدین کا سایہ سر سے اُٹھ جانا بہت بڑی محرومی ہے۔ ادارہ شعاع محمد امین کے غم میں برابر کا شریک ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا گو ہیں۔ مرحومہ کو جنت الفردوس میں اعلا مقام عطا فرمائے۔ اور ان کے لواحقین کو صبرِ جمیل سے نوازے۔ آمین
قارئین سے دعائے مغفرت کی درخواست ہے۔

خالدہ جیلانی

کھلتا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ

لاریب ـــــ پچھونیاں

خوشبوؤں کا اک نگر آباد ہونا چاہیے
اس نظامِ زر کو اب برباد ہونا چاہیے
ظلم بچے جَن رہا ہے کوچہ و بازار میں
عدل کو بھی صاحبِ اولاد ہونا چاہیے

کوثر ناز ـــــ حیدرآباد

میں وہ نہیں جس سے تم نے عہدِ وفا کیا تھا دوست
میرے حصے میں تو فقط ایسا ایک لمحہ بھی نہیں آیا

ارم کمال ـــــ فیصل آباد

سب فسانے ہیں دُنیاداری کے
کس نے کس کا سکون لُوٹا ہے
سچ تو یہ ہے کہ اس زمانے میں
میں بھی جھوٹا تو بھی جھوٹا ہے

عائشہ نورین ـــــ کنگن پور

کھو گئی صبح کی امید اور اب یوں لگتا ہے
ہم نہیں ہوں گے کہ جب ہوں گے اُجالے کبھی

زوباریہ خالد ـــــ لاہور

پھر کبھی نہیں ہو سکتی محبت سنا تم نے
وہ شخص بھی ایک تھا اور میرا دل بھی ایک

فاکہہ سہیل ـــــ کراچی

اے عدم احتیاط لوگوں سے
لوگ منکر نکیر ہوتے ہیں

حرا قریشی ـــــ ملتان

ایک دُنیا کا قصیدہ تھا اگرچہ مرے نام
لطف آتا تھا کسی شخص کی فہمائش میں
اُس کی آنکھیں بھی مری طرح سے گروی کہیں اور
خواب کا قرض بڑھا جاتا ہے اک خواہش میں

رضوانہ شکیل راؤ ـــــ لودھراں

وہی محفوظ رکھے گا زمانے کی بلاؤں سے
جو بارش میں شجر سے گھونسلہ گرنے نہیں دیتا

اقراء عرفات ـــــ گوجرانوالہ

آنگن میں گھنے پیڑ کے نیچے تیری یادیں
میلہ سا لگا دیتی ہیں اچھا نہیں کرتیں

آصفہ نورین ـــــ کنگن پور

اپنے سامان کو باندھے ہوئے اس سوچ میں گم ہوں
جو کہیں کے نہیں رہتے، وہ کہاں جاتے ہیں

اُفق آتش ـــــ پیچہ وطنی

زندگی آ بیٹھ ذرا بات تو سن
دوست بھول بیٹھے ہیں کوئی مشورہ تو دے

امبر گل ـــــ جھڈو (سندھ)

محبت کا سخن وہ ہے کہ دشتِ سنگ میں کہیے
تو اس کی بازگشت، غمِ دلِ مہتاب سے نکلے
نہ ٹھہرا ایک بھی امجد مری آنکھوں کے ساحل پر
ہزاروں کارواں اس دائرہ زارِ آب سے نکلے

طیبہ نوار ـــــ اٹک

ایسی آنکھوں سے تو بہتر تھا کہ اندھے ہوتے
ہم جنہیں آئینہ سمجھے، وہی پتھر نکلے
جن کو نفرت سے ہوا راہ میں چھوڑ آئی تھی
آسماں پر وہی ذرے مہ و اختر نکلے

ایس۔ آر مسکان ـــــ جام پور

میرے دل کے ویران جزیروں میں
تمہاری یاد کا دیا آج بھی جلتا ہے

حنا سلیم اعوان ـــــ آخون باندی

کسی اور چہرے کو دیکھ کر تیری شکل ذہن میں آ گئی
تیرا نام لے کر ملا اُسے، مرے حافظے کا یہ حال تھا
تیرے بعد کوئی نہیں ملا جو یہ حال دیکھ کے پوچھتا
مجھے کس کی آگ جھلسا گئی، میرے دل کو کس کا ملال تھا

عذرا ناصر، اقصیٰ ناصر ـــــ کراچی

ریزہ ریزہ ہے میرا عکس تو حیرت یہ ہے
میرا آئینہ سلامت ہے تو ٹوٹا کیا ہے

شگفتہ جاہ

باتوں سے خوشبو آئے

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک شخص نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا۔ آپ سے دوران گفتگو اس نے کہا۔

"جو اللہ چاہے اور آپ چاہیں۔"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"کیا تو نے مجھے اللہ کے برابر بنا دیا۔ بلکہ یوں کہو جو اللہ اکیلا چاہے۔"

(مسند احمد 3247)

سوچ سمجھ کر دعا کرنا،

حضرت ابن رضی اللہ سے روایت ہے۔

بلعم بن باعورہ بنی اسرائیل کا ایک شخص تھا۔ کو تین مقبول دعائیں ملی تھیں۔ یعنی وہ دعا کرے تو وہ ضرور قبول ہوگی۔ اس کی بیوی نے کہا۔

"ان دعاؤں میں سے ایک دعا مجھے عطا کیجیے۔"

اس نے کہا۔ "ٹھیک ہے تجھے عطا کیا۔ مانگو کیا مانگتی ہو؟"

کہنے لگی۔ "دعا کیجیے کہ میں تمام بنی اسرائیل میں خوب صورت ترین عورت بن جاؤں۔"

اس نے دعا کی۔ دعا قبول ہوئی اور اللہ تعالیٰ نے اسے خوبصورت ترین عورت بنا دیا۔

خوبصورتی عطا ہوئی تو اس کی عادات بگڑ گئیں۔ وہ غیر مردوں کی طرف مائل ہونے لگی تو اس شخص نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ وہ اس کو کتیا بنا دے۔

دعا قبول ہوئی اور وہ کتیا بن گئی۔ اس طرح دو دعائیں ضائع ہو گئیں۔

اس کے بعد اس عورت کے بچے آئے اور اپنے والد سے کہنے لگے۔

"یہ ہمارے لیے بڑے عار کی بات ہے کہ ہماری ماں کتیا بن جائے۔ لوگ ہمیں طعنے دیں گے اور کتیا کی اولاد کہہ کر پکاریں گے۔" لہٰذا آپ اللہ تعالیٰ سے دعا کیجیے کہ اللہ تعالیٰ ہماری ماں کو اس کی اصل صورت میں لائے۔"

اس نے دعا کی۔ وہ اپنی سابقہ پہلی والی صورت میں آگئی اور اس طرح وہ تینوں دعائیں ضائع ہو گئیں۔

بہترین دعا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے خیر، بھلائی اور دنیا اور آخرت میں عافیت کی دعا مانگی جائے۔

پیٹ بھر کر کھانا،

بعض سلف صالحین نے فرمایا۔ بنی اسرائیل میں کچھ ایسے نوجوان تھے جو صرف اللہ کی عبادت و ریاضت کیا کرتے تھے۔ جب ان پر کھانا لگایا جاتا ایک شخص ان کے سامنے کھڑا ہو کر کہتا۔

"تم لوگ زیادہ کھانا مت کھانا ورنہ تم پانی زیادہ پیو گے، پھر تم زیادہ سوؤ گے اور پھر بہت گھاٹا اٹھاؤ گے۔"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب کرام اکثر بھوکے رہتے تھے۔

اگرچہ یہ بھوک کھانا میسر نہ ہونے کی بنا پر تھی، لیکن اللہ تعالیٰ اپنے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے وہی حالت پسند اور اختیار فرماتے گا جو سب سے اعلا اور افضل حالت ہوگی۔ اسی وجہ سے حضرت ابن عمرؓ کھانے پر قدرت ہونے کے باوجود بھوک میں آپ کی مشابہت اختیار کرتے تھے۔ اور یہی معمول ان کے والد کا بھی تھا۔

صحیحین میں۔ حضرت عائشہؓ سے روایت ہے۔

آل محمدؐ کو مدینہ منورہ آنے کے بعد تین دن تک متواتر جو کی روٹی پیٹ بھر کر کھانے کو نصیب نہیں ہوئی۔

یہاں تک کہ آپؐ کا انتقال فرما گئے۔

حضرت ابراہیم بن ادھمؒ نے فرمایا جسے اپنے پیٹ کی بھوک پر قابو حاصل ہو گیا، اسے اپنے دین پر قابو حاصل ہو گیا اور جس نے اپنی بھوک پر غلبہ پا لیا اُسے اخلاق عالی حاصل ہو گئے۔ بھوکے آدمی سے اللہ کی معصیت دُور رہتی ہے اور شکم سیر سے قریب رہتی ہے۔

(تزکیۃ النفوس۔ تالیف علامہ ابن رجب حنبلی)

انسان کی تکمیل،

حضرت بابا فریدالدینؒ کہتے ہیں۔ انسان کی تکمیل تین چیزوں سے ہوتی ہے۔

خوف، امید، محبت۔

افضالہ کرامت۔ شاہ گھوڑا

تکبر،

حضرت شاہ ولی کے والد حضرت شاہ عبدالرحیم جو بہت اونچے درجے کے ولی اللہ تھے۔ آپ ایک جگہ پر کھیت کے درمیان پگڈنڈی پر چلے جا رہے تھے۔ اسی پگڈنڈی پر سامنے سے ایک کتا آگیا۔ وہ پگڈنڈی اتنی پتلی تھی کہ ایک وقت میں ایک ہی شخص گزر سکتا تھا۔ آپ اس انتظار میں تھے کہ یہ کتا نیچے اترے اور راستہ دے تو میں جاؤں۔ اور کتا اس انتظار میں تھا کہ یہ اتر جائیں تو میں آگے بڑھوں۔ اب یہ دونوں کش مکش میں ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ ان بزرگ نے دل ہی دل میں اس کتے سے مخاطب ہو کر کہا۔

تو تو ایک کتا ہے۔ تو حلال و حرام اور پاکی و ناپاکی کا مکلف نہیں ہے۔ اگر تو نیچے اتر جائے گا تو تیرا کوئی نقصان نہیں ہوگا۔ لیکن اگر میں نیچے اتر جاؤں گا تو کپڑے خراب ہو جائیں گے۔ بدن ناپاک ہو جائے گا۔ غسل کرنا پڑے گا۔ لیکن پھر کچھ دیر سوچنے کے بعد ان کے دل میں یہ بات آئی کہ مجھے اتر جانا چاہیے اور یہ سوچ کر نیچے کیچڑ میں اتر گئے اور کتا گزر گیا۔ آپ دوبارہ پگڈنڈی پر آگئے اور پیچھے مڑ کر دیکھا تو وہ کھڑا ہوا آپ کو دیکھ رہا تھا۔ شاہ صاحب سوچنے لگے یہ کیوں کھڑا ہے؛ اور کیا دیکھ رہا ہے؛ اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ بات آپ کے دل میں ڈالی کہ یہ کتا آپ سے کہہ رہا ہے۔

اے شاہ عبدالرحیم! نیچے اترنے سے — تم بڑی معیبت سے بچ گئے۔ اس وقت تو تمہارے کپڑے اور بدن ناپاک ہو گئے ہیں — تین مرتبہ دھو لو گے تو پاک ہو جائیں گے لیکن اگر تم اس خیال کی وجہ سے نہ اترتے کہ میں انسان ہوں اور یہ کتا ہے تو اس وقت تمہارا دل تکبر کی وجہ سے نجس ہو جاتا۔ پھر سات سمندروں سے بھی نجاست دور نہیں کی جا سکتی تھی — یہ تکبر ایسی خوفناک بیماری ہے۔

مسرت الطاف احمد۔ کراچی

چند باتیں زندگی کی،

- سب سے بڑی خواہش ہر انسان کو خوش کرنے کی ہے اور متاثر کرنے کی اور اس کی سزا یہ ہے کہ انسان نہ متاثر ہوں گے نہ خوش۔
- ہم جو کچھ دیکھتے ہیں اسے سچ سمجھ لیتے ہیں۔ دوربین اور خرد بین نے یہ ثابت کر دیا کہ ہم جو کچھ دیکھتے ہیں وہ ویسے سچ نہیں ہوتا۔ ہم ساکن ہیں لیکن متحرک، ہماری عمر بڑھ رہی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہماری عمر کم ہو رہی ہے۔
- جب انسان کے دل میں روشنی نہ ہو تو وہ چراغوں کے میلے میں کیا حاصل کرے گا۔

(واصف علی واصف)

حافظ سمیرا۔ 157- این بی

سکون کی تلاش،

سکون کے دروازے پر بھکاری کی طرح کبھی نہ جانا بادشاہ کی طرح جانا۔ جھومتے جھامتے، دیتے بکھیرتے۔ کیا تم کو معلوم نہیں کہ بھکاریوں پر ہر دروازہ بند ہو جاتا ہے اور بھکاری کون ہوتا ہے۔ وہ جو مانگے، صدا دے، جو تقاضا کرے اور شہنشاہ کون ہوتا ہے۔ جو عطا کرے، لٹاتا جائے۔ بس جس راہ سے بھی گزرو، بادشاہوں کی طرح گزرو، شہنشاہوں کی طرح گزرو۔ دیتے جاؤ۔

دیتے جاؤ۔ غرض وغایت کے بغیر۔ شرط وشرائط کے بغیر۔

(اشفاق احمد، زاویہ 3 ۔ محبت کی حقیقت سے)

حرا قریشی ۔ ملتان

غرور و تکبر،

حافظ بن المنذر اپنی کتاب العجائب الغریبۃ میں لکھتے ہیں۔

میں نے نجران کی مسجد میں ایک جوان کو دیکھا اور دیکھتا ہی رہا۔ اس کی خوبصورتی، درازئ قد اور مضبوطی سے متعجب سا ہو گیا۔

اس جوان نے کہا۔ "تم میری طرف اتنے غور سے کیوں دیکھ رہے ہو؟"

میں نے کہا۔ "آپ کے جمال و کمال پر متعجب ہو کر۔" وہ کہنے لگا۔ "تو ہی کیا۔ خود اللہ تعالیٰ کو بھی تعجب ہے۔"

یہ جملہ کہتے ہی وہ گھٹنے لگا اور پست قد ہونے لگا اور کم ہوتے ہوتے ایک بالشت تک پہنچ گیا۔ اس کے کسی رشتہ دار نے اس کو اپنی آستین میں ڈالا اور لے گیا۔

دشمن کی گواہی،

سب جانتے ہیں کہ ابوجہل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا سب سے بڑا دشمن تھا۔ وہ کفر پر ہی مارا گیا۔

ایک مرتبہ اس کے ایک دوست نے اس سے پوچھا۔

"دوست! یہاں میرے اور تمہارے سوا کوئی اور نہیں جو ہماری باتیں سن سکے۔ یہ بتاؤ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سچے ہیں یا جھوٹے؟"

"خدا کی قسم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سچے ہیں انہوں نے کبھی جھوٹ نہیں بولا۔"

اس اعتراف کے باوجود محض اپنے تکبر کی وجہ سے وہ مسلمان نہیں ہوا۔

روشن ستارے،

☆ زندگی کیا ہے؟ صرف وقت۔ پس اگر ہم اسے ضائع کرتے ہیں تو گویا زندگی برباد کرتے ہیں۔

(رابرٹ اسپنسر)

☆ میں اپنے حریفوں پر اکثر اس لیے غالب آتا ہوں کہ وہ دو چار منٹ کی کچھ حقیقت نہیں سمجھتے لیکن میں اس تھوڑے وقت کی قدر و قیمت اور اہمیت سے بخوبی واقف ہوں۔

(نپولین)

☆ عقل مند اور بے وقوف دونوں میں کچھ نہ کچھ عیب ہوتا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ عقل مند اپنے عیوب کو خود دیکھتا ہے اور دنیا نہیں دیکھتی اور بے وقوف اپنے عیوب کو خود نہیں دیکھتا دنیا دیکھتی ہے۔

(ڈاکٹر جارٹر)

☆ آزادی اس کا نام نہیں کہ اخلاق یا مذہب کی پابندی نہ کی جائے۔

(پوپ)

☆ خوردبین سے بھی وہ چیز نہیں دیکھی جا سکتی جو آنسوؤں سے عیاں ہو جاتی ہے۔

(بائرن)

موسیٰؑ،

موسیٰ قدیم مصری زبان کا لفظ ہے۔ جو دو کلمات (مو+شا) کا مرکب ہے۔ مو کا مطلب پانی ہے۔ جبکہ شا کا مطلب شجر یعنی درخت ہے۔ آپ کو موسیٰ اس لیے کہا گیا کیونکہ آپ کی والدہ محترمہ نے آپ کو فرعون کے خوف سے دریا پر واقع درختوں کے جھنڈ میں ڈال دیا تھا۔ اس طرح آپ صندوق میں بند فرعون کے محل میں پہنچے تو وہاں کے لوگوں نے آپ کو نکال لیا۔ اور آپ کو "موسیٰ" یعنی پانی سے نکالا ہوا" کہا جانے لگا۔

ندا۔ کراچی

ڈا صفیہ صابری

دھماکا

لیجیے جناب آخر پاکستانی شاہ رخ خان (بھئی ساحر لودھی) کو فلم مل ہی گئی۔ پرویز کلیم نے اپنی نئی فلم "موسم" میں ساحر لودھی کو ہیرو کا کردار دے دیا۔ ویسے اس کی زیادہ تر کاسٹ نئے چہروں پر مشتمل ہے۔ اس فلم کے ذریعے ساحر لودھی کے دیرینہ خواب کو تعبیر مل جائے گی۔ کیونکہ وہ اپنے آپ کو بڑے پردے پر اداکاری کرتے دیکھنا چاہتے تھے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ساحر لودھی اس فلم میں کیا دھماکا کرتے ہیں۔ (ساحر آج کل دھڑا دھڑ شاہ رخ کی فلمیں دیکھ رہے ہوں گے۔) حالانکہ ساحر ہمیشہ اس بات سے انکار کرتے رہے ہیں کہ وہ شاہ رخ سے متاثر ہیں۔ ویسے تو یہ فلم ابھی تک صرف کاغذوں پر ہے۔۔۔ (اگر بن گئی تو پھر پاکستان بھی ایک خان والا تو بن جائے گا۔)

صلاحیت

نشو کا دوسرا بچہ (بھئی پہلا بچہ صاحب) حمزہ پاشا بھی شوبز میں آ گیا۔ بطور گلوکار انہوں نے اپنی ویڈیو "ہنجو" لانچ کر دی۔ ویڈیو لانچنگ تقریب میں حمزہ پاشا نے کہا کہ وہ شوبز میں نہیں آنا چاہتے تھے۔ لیکن اپنی فیملی کی سپورٹ کی وجہ سے وہ اس فیلڈ میں آ گئے۔ (اب دیکھیں ان کا آنا کیسا رہے گا۔) تقریب میں سید نور، جرار رضوی، یوسف صلاح الدین بھی شریک تھے۔ سید نور نے فوراً "حمزہ پاشا کو اپنی نئی اردو فلم میں سائن کرنے کا وعدہ بھی کیا۔ (ہیروئن کیا ان کی بھی صائمہ آنٹی۔۔۔ بھئی حمزہ پاشا کی تو آنٹی ہی ہوئیں نا؟) فلمی گھرانے کا سپوت ہونے کی وجہ سے حمزہ پاشا کو پذیرائی

تو مل گئی' اب دیکھیں' وہ اپنی صلاحیتوں کو منوانے کے لیے کیا کرتے ہیں۔

سپنوں کا شہزادہ

اب کیا کہیں کہ میرا کوئی نہ کوئی ایسا بیان "داغ" دیتی ہیں کہ انہیں ان صفحات پر جگہ دینی ہی پڑتی ہے۔ اب دیکھیں نا' میرا کہتی ہیں کہ میری فلم "حسن آف پاکستان" فلم انڈسٹری کی رونقیں بحال کردیں گی۔ (اہم) فلم انڈسٹری کی رونقوں کی بحالی کے لیے نئی فلمیں ضروری ہیں۔ (یعنی اب تک جو فلمیں فلاپ ہوئی ہیں' وہ پرانی تھیں؟) اور میری نئی فلم نہ صرف کامیاب ہوگی' بلکہ اس سے فلم انڈسٹری کی ویرانیاں بھی ختم ہوجائیں گی۔ (اگر کامیاب نہ ہوئی تو پھر؟) اور پھر میرا بات کریں اور شادی کا ذکر نہ ہو' یہ کیسے ممکن ہے' تو انہوں نے کہا۔ "مجھے ابھی شادی کی جلدی نہیں ہے۔ (ہاں' ابھی عمر ہی کیا ہے۔) جب بھی مجھے میرے سپنوں کا شہزادہ ملے گا (شہزادہ؟ میرا! شہزادوں کا زمانہ گزر گیا۔) میں سب کو بتا کر شادی کروں گی۔" (تو اب تک کیا چھپ چھپا کے؟)

محنت

ابرار الحق اپنی محنت اور لگن کے باعث اس مقام پر پہنچے اور ابھی تک اپنے معیار کو قائم بھی رکھا ہوا ہے۔

ابرار کا کہنا ہے کہ "محبت اور جنون کے بغیر کامیابی ممکن نہیں' سیٹلائٹ کے اس دور نے گائیکی کو آسان تو کردیا ہے' مگر اس میں کامیابی کے لیے بہت محنت درکار ہوتی ہے۔ (جس کا ہمارے ہاں فقدان ہے) اور اب تو سب سے پہلے اچھا ویڈیو مارکیٹ میں لانا لازمی ہوگیا ہے۔ (اور اس میں ہیرو یا ہیروئن گلوکار خود ہوتا ہے' تاکہ اداکاری کا چانس بھی رہے۔) اس کے بعد ہی گلوکار کے مستقبل کا فیصلہ ہوتا ہے۔"

خراج تحسین

انور مقصود کا مشہور ترین ڈراما "ہاف پلیٹ" پچھلے دنوں اسٹیج پر پیش کیا گیا۔ اس سلسلے میں انور مقصود نے کہا کہ "میرا نیا اسٹیج پلے "ہاف پلیٹ" ٹی وی اور اسٹیج کے لیجنڈری فنکاروں معین اختر' سالدہ ریاست' لطیف کپاڈیا اور جمشید انصاری کے لیے خراج تحسین ہے۔ اس سے پہلے ہم نے سلیم ناصر کو "آنگن ٹیڑھا" کے ذریعے خراج تحسین پیش کیا تھا۔ اسے بھی پورے ملک میں پذیرائی ملی تھی۔ خاص کر کراچی' لاہور اور اسلام آباد میں اس کھیل کو دیکھنے والوں کی تعداد دیدنی تھی۔ انور مقصود کا کہنا تھا کہ "ہاف پلیٹ" کے فنکار نئے ہیں' لیکن انہوں نے اداکاری بہت جم کر کی' نوجوانوں کی اس ٹیم نے مجھے بہت متاثر کیا اور ان کے لیے ان کے اصرار پر ہی میں یہ ڈراما لکھ رہا ہوں۔" "آنگن ٹیڑھا" اور "ہاف پلیٹ" جیسے ڈرامے انور مقصود آج کے چینلز کو نظر کیوں نہیں آتے۔ مزاح کے نام پر پھکڑپن دھڑا دھڑ ہر چینل پر دکھایا جارہا ہے۔

کوشش

مشہور کامیڈین شکیل صدیقی (وہی جنہوں نے انڈیا جاکر اپنے ملک میں بھی شہرت حاصل کی ورنہ.....) نے کہا کہ ہمیں اعتراف کرلینا چاہیے کہ گزشتہ سال ہم نے تھیٹر کی بہتری کے لیے کچھ نہیں کیا اور نہ اس پر توجہ دی۔ (ٹی وی سے جو فرصت نہیں ملی۔) عوامی کمرشل تھیٹر کی حالت بدتر ہے۔ خاص طور پر ان فنکاروں کے لیے جنہوں نے اس تھیٹر سے عزت اور شہرت (اور کچھ نے تو دولت بھی۔) حاصل کی۔ انہوں نے مزید کہا کہ یہ درست نہیں ہے کہ تھیٹر آکر کوئی ڈراما نہیں دیکھنا چاہتا۔ اگر ایسی بات ہوتی تو آرٹس کونسل اور ناپا آڈیٹوریم میں پیش کیے جانے والے ڈرامے کبھی کامیاب نہ ہوتے۔ عوام اچھے اور معیاری ڈرامے دیکھنا چاہتے ہیں۔ (بھئی تو کوشش کریں نا آپ لوگ جو تھیٹر کے فنکار ہونے کے باوجود صرف ٹی وی کے ہو کر رہ گئے ہیں۔)

مقامی شکیرا

ماڈل اداکار میترا نے اب گلوکاری کی طرف بھی قدم رکھتے ہوئے ایک آڈیو البم مکمل کرلی اور اب وہ ان گانوں کی ویڈیوز تیار کروا رہی ہیں' ابھی صرف ایک گانے "جھوٹا" کی ویڈیو ریلیز ہے۔ وہ ایک ایسے دور میں بطور گلوکارہ متعارف ہورہی ہیں جبکہ وہ میزبانی کے فرائض بھی انجام دے رہی ہیں اور مارننگ شوز میں بطور مہمان بھی ان کی ڈیمانڈ خاصی بڑھ گئی ہے۔ وہ ایک پاکستانی فلم میں آئٹم سونگ بھی کرچکی ہیں۔ (بھئی انڈیا کی ایسے کاموں میں ہی تو کاپی کی جاتی ہے' یعنی آئٹم سونگ) تو ایسے میں گلوکارہ کے طور پر اس بولڈ ماڈل کی آمد کہیں جلتی پر تیل کا کام نہ کردے۔ کیونکہ کافی عرصہ سے پاکستان میں کوئی چھیل چھبیلی گلوکارہ نظر نہیں آئی۔ اگر میترا نے مقامی شکیرا کا روپ دھار لیا تو کوئی اسے سنے نہ سنے دیکھ دیکھ کر ہی مقبولیت کی سند بخش دے گا۔"

کچھ ادھر ادھر سے

☆ تحریک طالبان کب اور کیوں پیدا ہوئی؟ ڈرون حملے تو 2004ء میں شروع ہوگئے تھے۔ لیکن تحریک طالبان 2007ء میں اسلام آباد کی لال مسجد میں فوجی آپریشن کے بعد قائم ہوئی۔ طالبان میں شامل عسکریت پسند 2007ء سے پہلے امن پسند شہری تھے۔ انہوں نے لال مسجد آپریشن کے بعد ہتھیار اٹھائے۔

قلم کمان..... حامد میر

☆ اگر کراچی کی آبادی اس وقت ڈیڑھ کروڑ ہے تو اردو آبادی 33 فیصد اور اگر 2 کروڑ ہے تو اردو بولنے والوں کی آبادی 25 فیصد بنتی ہے۔ تو پھر سندھ کی شہری آبادی کی نمائندگی ایک سیاسی پارٹی کیسے کرسکتی ہے۔

(بیرسٹر ضمیر گھمرو..... روزنامہ کاوش)

امتہ الصبور

روکسے لانا (حورم سلطان)

شاہ سلیمان جسے اہل یورپ "سلیمان عالی شان" کہتے تھے۔ کیونکہ وہ انہیں عالی شان نظر آتا تھا۔ اس کے ہم وطن اسے "سلیمان قانونی" کہتے تھے اس نے 1766ء میں وفات پائی۔ اس کا قد بلند و بالا تھا۔ چہرہ لمبا تھا۔ گردن دراز اور رنگ زرد تھا۔ اس کی ناک لمبی اور خم دار تھی۔ اس کی سلطنت جو تین براعظموں پر پھیلی ہوئی تھی۔ اس کو اس طرح زوال آیا جیسے کسی تماشے پر دفعتا" پردہ گرے۔ اس کی سلطنت کے زوال کے جو اسباب بیان کیے گئے ان کا بنیادی سبب روکسے لانا تھی، جو بعد میں اس کی ملکہ بنی اس نے سلطان کا دل جیت کر پورے حرم پر قبضہ کیا۔ سلطان کے بڑے بیٹے کو جو اس کا ولی عہد بھی تھا۔ اسے قتل کرا دیا۔ اس کے بہنوئی ابراہیم پاشا کو جو وزیراعظم بھی تھا، ذہین اور بہادر تھا۔ اسے بھی قتل کرا کے اپنے داماد رستم آغا کو وزیراعظم بنوادیا۔ رستم آغا اور روکسے لانا کے لالچ اور ظلم نے ترکی کی اس عظیم الشان سلطنت کو زوال کے اس رستے پر گامزن کردیا جہاں سے واپسی کا کوئی راستہ نہ بچا تھا۔

روکسے لانا کون تھی۔

ایک تاتاری بردہ فروش سے خریدی ہوئی روسی کنیز، جس کے بال سنہری تھے۔ اس کو خرم کا لقب دیا گیا۔

پارچہ جات کی داروغہ نے اسے یہ لقب اس لیے دیا تھا کہ وہ بڑے مزے لے کر گایا کرتی تھی۔ وہ ہاتھ میں سارنگی لیتی۔ گاتی اور قالین پر اس کے پاؤں تھرکتے جاتے۔

وہ شمع کے پاس اپنے ہاتھ لے جاتی اور انہیں اس طرح نچاتی کہ دیواروں پر دیو رقص کرتے نظر آتے۔ بہت معمولی فیتے سے اپنے بال باندھتی کہ اس کے پاس موتیوں کی مالا نہیں تھی۔ وہ نیلے مخمل کی ٹوپی پہنتی تھی۔ اس لیے کہ اس کے پاس دوسری لڑکیوں کی طرح زریں اطلس کی ٹوپی نہ تھی۔ جب اس نے والدہ سلطان کے ملبوس میں بٹن ٹانکے تو یہ سن کر ہنس پڑی کہ یہ ہیرے کے بڑے بیش قیمت بٹن ہیں۔ کہنے لگی۔

"قیمتی زر و جواہر کے بڑے بھدے بٹن بنتے ہیں۔"

جب وہ اس طرح بے تکے پن سے ہنستی تو اس کی پیٹھ پر دوہتھڑ پڑتے۔ لیکن دوسری کنیزوں کی طرح وہ ہرگز نہ روتی۔ آنسو پونچھ کے وہ پھر اپنے کام میں لگ جاتی لیکن جس نے اسے سزا دی ہوتی اسے کبھی معاف نہ کرتی۔

جب سلطان کی والدہ حافظہ نے اس کے متعلق پوچھا تو پارچہ جات کی داروغہ نے عرض کی۔

"روسی لڑکی تیز اور ہوشیار ہے۔ لیکن ان جواہرات کی طرح سخت ہے جن کا وہ مذاق اڑاتی ہے۔"

حافظہ نے کہا۔ "ضرور یہی بات ہوگی، کیونکہ ایک اجنبی ملک سے آئی ہوئی لڑکی جو پہلے قیدی بنی، پھر کنیز بنی، اس کی طبیعت میں ضد اور ہٹ کا ہونا قدرتی ہے۔" ایک دن وہ گانا گا رہی تھی تو سلطان نے اس کا گانا سنا۔ اس نے خود شمال کی بعض بولیاں سیکھ لی تھیں۔ اس لیے وہ اس کے گیت کے الفاظ سنتا رہا اور پھر اس نے اس کا نام پوچھا۔

اس کے بعد وہ اکثر ٹھہر کے اس سے اس زبان میں باتیں کرنے لگتا۔ جس میں وہ گانے گاتی تھی۔ جب وہ اس بولی کے بولنے میں غلطیاں کرتا تو یہ لڑکی کھلکھلا کے ہنس پڑتی، لیکن سلیمان کو اس کے ہنسنے پر غصہ نہ آتا۔ اب وہ اس کی منظور نظر ہونے لگی تھی اور پارچہ جات کی داروغہ کی بھی اتنی مجال نہ تھی کہ اسے سزا دے سکے۔

حرم کے آئین کے مطابق جس نوجوان لڑکی پر سلطان کی نظر التفات پڑتی، اسے علیحدہ خواب گاہ دی جاتی، اچھے کپڑے ملتے، اس کے نوکر الگ کردیے جاتے اور اس کے لیے موتیوں اور سونے کا مشاہرہ مقرر کردیا جاتا۔ وہ جب چاہتی غسالہ اور آرائش کرنے والی عورتوں کو طلب کرسکتی۔

خرم نے یہ سب کچھ کیا اور پارچہ جات کی داروغہ کا پاؤں اپنی جوتی سے کچل دیا۔ جواب اسے کوئی سزا نہ دے سکتی تھی۔ والدہ سلطان حافظہ نے البتہ اسے طلب کرکے سخت سست کہا۔ سلطان کی والدہ کے سامنے خرم ہاتھ باندھے مؤدب کھڑی رہی۔ عرصے سے سلطان نے گل بہار کے سوا اپنے حرم کی کسی عورت کی طرف نظر بھر کے نہیں دیکھا تھا۔ گل بہار ہی ملکہ یا سلطان کی خاص منظور نظر رہی تھی۔ لیکن خرم نے اپنے چلبلے پن اور اپنی اجنبی بولی سے اس کا دل موہ لیا۔ دفعتا" ایک روز مغرب کی نماز کے بعد اس کے پاس سے گزرتے ہوئے سلطان نے اس کے کاندھے پر اپنا رومال ڈال دیا۔ یہ اس بات کی نشانی تھی کہ سلطان اسے اپنے حرم خاص میں داخل کرنے والا ہے۔

حرم کے آئین کے مطابق یہ فرض گل بہار کا تھا کہ وہ اس سلاف نسل کی لڑکی کو سلطان کے ساتھ شب زفاف گزارنے کے لیے تیار کرے۔ لیکن گل بہار اس لڑکی کو پسند نہیں کرتی تھی اور کسی ایسی لڑکی کی روادار نہ تھی جو پہلے عیسائی رہی ہو۔ اس روسی لڑکی کی جلد گل بہار کی طرح ملائم نہیں تھی نہ اس کے سنہرے بال گل بہار کے بالوں کی طرح نرم تھے۔ اس میں شک نہیں کہ خرم خالص ریشم بھی اس سج دھج سے نہیں پہن سکتی تھی۔ لیکن اس نے بڑی ہوشیاری سے کچھ زیور پہن لیے۔

ایک بوڑھی مراکشی عورت جو زچہ خانہ سے متعلق تھی۔ اس کام پر مامور ہوئی کہ خرم کو سلطان کے حضور میں حاضر ہونے کے آداب سکھائے۔ یہ کہ کیونکر اسے محافظوں کے پاس سے گزر کر سلطان کی خواب گاہ میں جانا چاہیے، کیونکر اسے سلطان کے پائنتی پہنچ کر لحاف کو چومنا چاہیے، کیونکر اسے اپنے تمام زیورات اتار کے سلطان کے پاس جانا چاہیے۔

منظور نظر "قدن" کی حیثیت سے خرم کو اب بڑا اختیار حاصل تھا۔ جب اس نے والدہ سلطان سے عرض کی کہ وہ حمل سے ہے تو اس کا اقتدار اور بڑھ گیا۔ مصیبت زدہ کنیزیں اس کی پناہ ڈھونڈتیں اور شکریے کے طور پر دوڑ دوڑ کر اس کی خدمت کرتیں۔ اس سے اونچا مرتبہ صرف والدہ سلطان اور گل بہار کا تھا، کیونکہ گل بہار کے بطن سے سلطان کا ایک فرزند تولد ہوچکا تھا۔

لیکن حرم والیوں کی آنکھیں ہر بات کو تاڑ جاتی تھیں۔ وہ دیکھتیں کہ سلطان اس سلاف لڑکی سے بہت التفات سے گفتگو کرتا ہے۔ جو پہلے قیدی اور کنیز رہ چکی ہے۔ گل بہار برائے نام پہلی "قدن" رہ گئی یہ خبر بہت جلد پھیل گئی۔ پہلی مرتبہ غیر ملکوں کے سفیر سلطان کی نئی بیوی کے متعلق افواہوں میں دلچسپی لینے لگے۔ گل بہار کا تو نام تک انہوں نے نہ سنا تھا۔ لیکن یہ لڑکی ایک اجنبی ملک کی رہنے والی تھی اور نئی منظور نظر تھی۔ جب انہیں پتا چلا کہ وہ روسی نسل سے ہے تو انہوں نے اس کو روسے لانی یا روکسے لانا کے نام سے یاد کرنا شروع کیا۔

☼ ☼ ☼

جس زمانے میں سلطان نے ابراہیم کی شادی اپنی

بہن سے کی' اسی زمانے میں اس کے اپنے حرم میں خرم کے بطن سے ایک شہزادہ تولد ہوا۔ سلیمان نے اپنے باپ کے نام پر اس لڑکے کا نام سلیم رکھا۔

ماں بننے کے بعد حرم میں خرم (روکسے لانا) کا اقتدار گیا۔ سلیمان زیادہ تر وقت اس کے ساتھ گزارتا تھا۔ کنیزیں یہ دیکھتی تھیں کہ وہ اپنی اس منظور نظر کو شاذونادر ہی کبھی کوئی تحفے دیتا زیادہ تر وہ اس کے پاس بیٹھ کر اہم امور کے متعلق اس طرح باتیں کرتا' گویا وہ عورت نہیں مرد تھی۔ چونکہ یہ روسی عورت دارلحرب کی رہنے والی تھی۔ اس لیے یہ شمال کے اجنبیوں کی مصیبتوں اور ان کی آرزوؤں اور امیدوں سے خوب آگاہ تھی۔

کنیزیں آپس میں کانا پھوسی کرتیں کہ اس نے سلطان پر جادو کردیا ہے۔ اپنے حرم کے اندر ہی سلطان سنہرے بالوں والی عیسائی عورت کا مرید بن کے رہ گیا ہے۔ اس محبت کے توڑ کا کوئی طریقہ ان کی سمجھ میں نہ آتا تھا۔

قانون نے یہ پابندی عائد کر رکھی تھی کہ کوئی ذمہ دار عہدہ دار اپنے کسی ماتحت عہدے پر اپنے عزیزوں کا تقرر نہ کرسکتا تھا۔ اس طرح ترکوں میں اقربا نوازی ناممکن تھی۔ خود سلطان اپنے کسی عزیز کو کسی خدمت پر مامور نہیں کرسکتا تھا۔ شاہی خاندان کی عورتوں' سلطان کی بہنوں اور بیٹیوں کی شادیاں قابل و فاضل امراء سے ہوتیں' جنہیں ان شہزادیوں کے سوا دوسری شادی کرنے کی اجازت نہ ہوتی' ان شادیوں کی اولاد نرینہ کو نظم و نسق میں عہدے مل سکتے تھے یا فوجی خدمتوں پر ان کا تقرر ہوسکتا تھا۔ لیکن وہ تخت شاہی سے محروم قرار دیے جاتے تھے' تاکہ کبھی تخت کی وراثت کے لیے جھگڑا نہ ہوسکے۔ اس قانون پر جو کہیں ضبط تحریر میں نہ آیا تھا' بڑی سختی سے عمل ہوتا تھا۔

اس طرح مرتے دم کوئی سلطان پسماندوں کا بہت بڑا خاندان اپنے پیچھے نہ چھوڑتا۔ اس کا صرف ایک بیٹا زندہ ہوتا۔ سلطان محمد فاتح کے سخت قانون کے مطابق باقی ساری اولاد کا کام تمام کردیا جاتا۔

سلیمان نے اس قانون کو توڑنے کا عزم کرلیا تھا۔ اس نے گل بہار اور روکسے لانا کی اولاد نرینہ میں ایک کے علاوہ باقی اور سب کے قتل کرانے کا حکم نہیں دیا۔ لیکن وہ جانتا تھا کہ اگر وہ اپنی زندگی میں اس قانون میں باقاعدہ ترمیم نہ کرے تو یہ اس کے مرنے کے بعد باقی رہ جائے گا۔

اس عرصے میں اس کے حرم میں روکسے لانا کا اقتدار بڑھتا جارہا تھا۔

جیسے جیسے برس گزرتے جاتے' یہ اکیلی روسی لڑکی اس کے جذبات پر حاوی ہوتی جاتی۔ اس کے بطن سے دو بیٹے تولد ہوچکے تھے۔ جن کے نام اس نے اپنے باپ اور دادا کے نام پر سلیم اور بایزید رکھے تھے۔ اب وہ اکثر درمیانی دالان کے اس طرف اندرون حرم میں جایا کرتا تھا' تاکہ اس ذہین اور طباع روسی لڑکی کی باتوں سے محظوظ ہو' جسم سے زیادہ اس کے دماغ کو اس کی رفاقت کی ضرورت تھی۔

یہ لڑکی جسے اہل یورپ روکسے لانا کہتے تھے کوشش کرتی تھی کہ ہر بار وہ ایک نئے روپ میں سلطان کے سامنے آئے۔ کبھی چھوٹی سی زرکاری کی ٹوپی پہنتی' تو کبھی اپنے سنہری بالوں کو موتیوں کی لڑی میں باندھ لیتی۔ کبھی وہ ایک دبلے پتلے لڑکے کی طرح فوجی وردی پہن لیتی' تو کبھی رقاصہ کے روپ میں اپنے حسن کی بہار دکھاتی۔ اس کے برعکس سلطان کی پہلی محبوبہ گل بہار کا بس ایک ہی انداز تھا۔ وہ چاہے اپنی آنکھوں میں کتنا ہی سرمہ کیوں نہ جھونک لے' یا اپنی لمبی لمبی زلفوں میں شیشے کے رنگ برنگے پھول لگائے۔ اس کا انداز وہی رہتا۔

سلیمان اپنی ماں کی بے حد عزت اور قدرومنزلت کیا کرتا تھا۔ یہ سلاطین آل عثمان کا بڑا خاص طور طریق تھا۔ روکسے لانا نے کبھی یہ کوشش نہ کی کہ وہ ماں اور بیٹے کے درمیان حائل ہو' کیونکہ ماں کو دنیا کے معاملات سے زیادہ دلچسپی نہ تھی اور بیٹا بہت روشن دماغ تھا۔ روکسے لانا والدہ کی حکومت سے اپنے آپ کو الگ تھلگ رکھ کر سلطان کی فیاضی سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھاتی بھاری جیب خرچ وصول کرتی' حرم کی عورتیں اسے خاصگی خرم (منظور نظرم خرم) کہنے لگی تھیں۔

اب تک ترکی حرم کے مراتب کے لحاظ سے سلطان کی والدہ کی حیثیت مقدم تھی۔ پھر گل بہار کی بحیثیت قدن (ملکہ) کے تھی۔ وہ سلطان کے پہلے بیٹے اور ولی عہد مصطفیٰ کی ماں تھی۔ تیسرے درجے پر روکسے لانا تھی جو دوسری قدن تھی۔

اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ گل بہار اور اس روسی لڑکی کے درمیان ایک بڑا بے درد' لیکن خاموش معرکہ جاری رہتا۔ ایک آدھ مرتبہ انہوں نے ناخنوں اور دانتوں سے ایک دوسرے کو نوچا اور کاٹا بھی۔

وہ سلطان سے بار بار یہ کہتی تھی کہ مجھے اپنے دونوں بیٹوں کی جان کی طرف سے خطرہ معلوم ہوتا ہے' جو حوض کے کنارے والدہ سلطان کے صحن میں کھیلتے رہتے ہیں۔ گل بہار کا بیٹا جوان ہوچکا تھا اور اب وہ فوجی تربیت حاصل کرنے کے لیے حرم سے باہر بھیج دیا گیا تھا۔

جب مصطفیٰ فوجی تربیت کے لیے ایک صوبے کو بھیجا گیا تو گل بہار محل کو چھوڑ کر اپنے بیٹے کے ساتھ جانے کے لیے تیار ہوگئی۔ اسے یہ احساس ہوگیا تھا کہ سلیمان اب اس سے الگ ہوچکا ہے۔

روکسے لانا کے دونوں شرمیلے سے لڑکے سلیم اور بایزید زیادہ تر اپنے باپ کے ساتھ ساتھ رہا کرتے تھے رعایا انہیں دیکھ دیکھ کر خوش ہوتی تھی۔

آئین کے مطابق ختنے کی تقریب کے بعد پرانے محل کے حرم میں یہ دونوں لڑکے استادوں کے سپرد کیے جانے والے تھے۔ ابھی تک وہ والدہ سلطان کے صحن میں فوارے کے پاس کھیلتے پھرتے تھے۔ والدہ سلطان بیمار تھی اور لب مرگ' لیکن عورتوں کی دنیا پر اب بھی اس کی حکومت تھی۔ وہ اپنے مخمل کے بستر سے جس میں کمخواب کی جھالر لگی تھی' اٹھ نہ سکتی تھی' لیکن ہر روز صبح تڑکے وہ لڑکیوں کی دارغہ' حجروں کی داروغہ اور بڑی دائی کو ہدایات دیتی۔ روکسے لانا بالکل اس کی نظروں کے سامنے نہ آتی۔ لیکن اس روسی عورت کے دونوں بیٹوں کے متعلق اس نے رائے قائم کرلی تھی۔

"سلیم لیمو لگا کے چڑیاں پکڑتا ہے' بڑا گھنا ہے' مجھ سے باتیں چھپاتا ہے۔ چھوٹا سا ہے' لیکن موٹا تازہ ہے۔ خاموش ہے' لیکن بڑا ضدی ہے۔"

یہ دیکھ کر اب خود چند دن کی مہمان ہے۔ والدہ سلطان حافظہ نے ہمت کرکے سلیمان سے صاف صاف کہہ دیا۔ "سلیم چال ڈھال اور صورت شکل میں بالکل اپنی والدہ خاصگی خرم جیسا ہے۔ لیکن بایزید دل کا اچھا ہے اور ہوشیار بھی ہے۔ اس کی صورت اور طبیعت بالکل تمہارے جیسی ہے۔"

سلیمان کچھ کہے بغیر ادب سے اس کی باتیں سنتا رہا' کیونکہ جنت ماں کے قدموں کے تلے ہے۔

حافظہ اپنی بات پر اڑی رہی۔ "اے سلیمان تمہاری ماں جو کچھ تم سے صاف صاف کہہ رہی ہے' تم اس کا جواب نہیں دے رہے ہو۔ لیکن سنو میں تمہیں خبردار کیے دیتی ہوں' میرے الفاظ نہ بھولنا۔ بایزید پر اعتبار کرنا۔ سلیم سے مہربانی سے پیش آنا اور اس کا خیال رکھنا کہ اس کے دل میں تمہارا خوف نہ پیدا ہو۔ لیکن اس پر کبھی اعتبار نہ کرنا۔"

مصطفیٰ سب سے بڑا تھا۔ اسے والدہ سلطان سب سے زیادہ چاہتی تھی۔ لیکن چونکہ وہ حرم سے جاچکا تھا اور فوجی تربیت حاصل کررہا تھا۔ اس لیے اس کے متعلق اس نے کچھ نہیں کہا۔

حافظہ اور سلیمان دونوں جانتے تھے کہ گل بہار کے لڑکے مصطفیٰ کو عوام بہت پسند کرتے ہیں۔ مصطفیٰ کو مطالعہ کا شوق نہیں تھا۔ وہ اپنے بزرگوں سے گفتگو بہت شوق سے کیا کرتا تھا اور بہت آسانی سے ہر کسی کو اپنا دوست بنالیا کرتا تھا۔ اپنے باپ کی طرح تلوار

چلانے اور شہسواری اور پیراکی کا اسے خداداد ملکہ تھا۔ اکثر جب وہ اپنے خیمے کو لوٹتا تو اس کا سر لکڑی کے نیزوں سے زخمی ہوتا۔ یہ نیزہ بازی اور شہسواری محض کھیل کھیل میں ہوتی۔ وہ طویل قامت تھا اور ہمیشہ کسی نہ کسی کام میں مصروف رہتا۔ کبھی زخم کھانے میں دریغ نہ کرتا۔ منطق کے استاد مصطفیٰ کے متعلق یہ کہتے کہ اس میں استقلال، صبر اور نازک موقعوں پر جسارت سے سرداری کرنے کی صفتیں جو آل عثمان کی امتیازی خصوصیات ہیں، بدرجہ اتم موجود ہیں۔

روکسے لانا کا چھوٹا بیٹا جہانگیر سائے کی طرح قسطنطنیہ کے محل اور میگنیشیا میں مصطفیٰ کے دربار کے درمیان پھرتا رہتا۔ یہ وفاداری ایک طرح کا مریضانہ جذبہ تھی۔ سلیمان اپنے تمام لڑکوں میں مصطفیٰ کو سب سے زیادہ چاہتا تھا۔

اس کے بعد والدہ سلطان کا انتقال ہوگیا۔ تین دن تک سوگ منایا گیا۔ سلیمان نے سیاہ لباس پہنا۔ محل میں آرائش کے سارے سازوسامان کو دیوار کی طرف رخ کرکے رکھ دیا گیا۔ شہر کے گلی، کوچوں میں کہیں گانے بجانے کی آواز نہ سنائی دی۔

سلیمان کی عمر اب انتیس سال کی تھی۔ اس کی قوت اپنے پورے عروج پر تھی۔ وہ روکسے لانا کے عشق میں اتنا الجھا ہوا تھا کہ اس نے یہ بھی نہ دیکھا کہ اس کے حرم میں کیا، کیا تبدیلیاں ہوئیں۔ والدہ کی جانشینی گل بہار کا حق تھا، لیکن اس نے مصطفیٰ کے ساتھ میگنیشیا ہی میں رہنے کو ترجیح دی۔ اب سلیمان کے صرف دو رفیق باقی رہ گئے تھے۔ تیز و طرار ابراہیم پاشا اور حاضر دماغ روکسے لانا۔

ظاہری طور پر اس روسی عورت نے اس کی کوئی کوشش نہ کی کہ سلیمان پر اپنا اثر جمائے یا اس کی پہلی محبوبہ گل بہار کو جو فوقیت حاصل تھی، اس سے انکار کرے۔ بظاہر وہ تسلیم کرچکی تھی کہ مصطفیٰ ہی ولی عہد سلطنت ہے۔ وہ جانتی تھی کہ سلیمان کو متاثر کرنا آسان ہے۔ لیکن جہاں عدل و انصاف کا معاملہ ہو۔ وہ ٹس سے مس نہیں ہوسکتا۔

رفتہ رفتہ وہ اس کے حرم کی چار دیواری سے باہر نکلنے لگی، کبھی کبھی وہ اس کے گھوڑے کے پیچھے اپنی پالکی میں فوج کی پریڈ دیکھنے جاتی یا جمعہ کی نماز پڑھنے جاتی۔ کبھی کبھی وہ بھیس بدل کے دریا کی سیر میں اس کے ساتھ شریک ہوجاتی۔ سلیمان اپنی پیشانی کو عمامے سے چھپالیتا اور تیز کشتی پر اس کے ساتھ سوار ہوکر نکلتا۔

حرم میں بھی ایک تبدیلی پیدا ہوگئی۔ اگر شاذو نادر کسی نئی لڑکی پر سلطان کی نظر پڑ جاتی تو روکسے لانا کو غصہ آجاتا۔ وہ بڑی ہوشیاری سے ہر خوب صورت لڑکی کو اپنی کنیز بنالیتی، تاکہ سلطان صرف اس کی موجودگی میں اس کنیز سے مل سکے۔

ابھی تک اس چار دیواری کی دنیا پر حافظہ کی حکومت تھی۔ اب حرم کا کوئی پاسبان نہ تھا۔ روکسے لانا دوسری قدن سہی، لیکن جب سلیمان اس کی طرف داری میں کچھ کہتا، تب ہی اسے کوئی اقتدار حاصل ہوتا۔

چونکہ وہ اور دوسری بیویوں کو کبھی اپنے پاس نہ بلاتا۔ اس لیے وہ وظیفہ خواروں کی طرح سلطان کے دیے ہوئے قیمتی جوڑے پہنے اپنے اپنے حجروں میں پڑی رہتیں۔ چونکہ روکسے لانا ان کی دشمن تھی۔ اس لیے ان کا کوئی دوست نہیں تھا۔ بڑی آسانی سے بہلا

پھسلا کر یہ روسی عورت سلیمان کو اس پر تیار کرلیتی۔ کہ ان لڑکیوں کی شادیاں سپاہیوں یا محل کے محافظ دستوں کے حق دار فوجی افسروں سے کردی جائیں۔

جب یہ ہوچکا تو روکسے لانا نے سلیمان کو یاد دلایا کہ اس کی اپنی حیثیت دن بدن ناقابل برداشت ہوتی جارہی ہے۔ یہ دوسری عورتیں، بیویاں بن چکی ہیں۔ ان کی اپنی جائیداد اور اپنے حقوق ہیں۔ اور وہ جو ہر طرح سے سلطان کی بیوی کی طرح ہے۔ اپنی کنیزوں کی نظر میں بھی محض ایک کنیز ہے۔ یہ تو بے انصافی کی بات ہوئی نا؟

ہوشیار اہل وینس جو حرم میں روکسے لانا کے متعلق افواہوں کو بڑے غور سے سنتے تھے۔ یہ دیکھ رہے تھے کہ سلیمان پر اس کا اثر بڑھتا جارہا ہے۔

لیکن چونکہ سلطان کو اس سے اس قدر عشق تھا کہ کسی کو اس کے خلاف کچھ کہنے کی جسارت نہیں ہوتی۔

چھ پشتوں سے یہی رسم چلی آتی تھی کہ کسی عثمانی سلطان نے کسی کنیز کو باقاعدہ بیوی نہ بنایا تھا۔ لیکن روکسے لانا جانتی تھی کہ سلیمان اس رسم کو توڑنے میں پس و پیش نہ کرے گا۔ آخر اس نے ایسا ہی کیا۔

محل سرا میں خاموشی سے نکاح کی رسم پوری ہوئی۔ ایک قاضی کے سامنے سلطان نے روکسے لانا کا ہاتھ پکڑا جو نقاب پہنے تھی۔ یہ اقرار کیا۔

"میں اس عورت خرم کو آزاد کرتا ہوں اور اسے اپنے نکاح میں لاتا ہوں۔ یہ اپنی ساری ملکیت کی مالکہ ہوگی۔"

گل بہار موجود نہ تھی۔ وہ والدہ سلطان کی حیثیت کی حق دار رہی۔ لیکن روکسے لانا سلطان کی منکوحہ ملکہ بن بیٹھی۔ سلیمان کی فتوحات کا دائرہ بڑھ رہا تھا۔ یورپی سفیر اس کے حضور میں حاضر ہوتے تو واپس پہنچ کر یہی کہتے۔

"جس زمین پر ایک بار سلطان کے گھوڑے کی ٹاپ پڑ چکی ہے۔ وہ ہمیشہ کے لیے اس کی ہوچکی۔"

ایک مورخ نے اس کے متعلق لکھا ہے "طبعاً" وہ خاموش اور مغموم رہتا ہے۔ کام کاج سے زیادہ آرام کا جویا ہے۔ کیونکہ اس نے اپنی سلطنت کی حکومت اپنے وزیراعظم ابراہیم پاشا کے سپرد کر رکھی ہے۔ جس کے بغیر نہ وہ خود کوئی اہم فیصلہ کرسکتا ہے اور نہ اس کے امرائے دربار۔ ابراہیم جو چاہے سلیمان عالی شان سے پوچھے بغیر کر گزرتا ہے۔"

سلیمان خود اپنی طبیعت کے تلون سے خائف تھا۔ وہ نظمیں لکھتا تھا۔ اس نے اپنا تخلص طالب لکھا ہے۔

ایک غزل میں اس نے لکھا۔ "جس نے قلندری پسند کی، اسے محل سرا کی حاجت نہیں۔" ایک جگہ تو اس نے صاف صاف لکھا۔

"وہ چیز جو سلطنت کہلاتی ہے۔ عالم گیر جنگ اور مسلسل قتال کے سوا اور کچھ نہیں۔"

اسکندر چلپی کا مقدمہ

اسکندر چلپی ترک تھا، پرانی روایات کا پابند تھا اور ذہین طبع ابراہیم پاشا سے اس کی رقابت سالہا سال سے چلی آتی تھی۔ دونوں ایک دوسرے سے بڑھ کر خدم و حشم اور شان و شوکت دکھانے کی کوشش کرتے رہتے۔ بدقسمتی سے سلطان نے اسکندر چلپی کو ابراہیم کا نائب بنا کر اس مہم پر روانہ کیا تھا۔ ایک دن جب کہ اسکندر چلپی نے کوچ کے لیے خزانے کے صندوقوں پر مہر لگوائی تو ابراہیم کے محافظ دستے کے سپاہیوں نے اس کے ماتحتوں پر چوری کا الزام لگا کے ان کو گرفتار کرلیا۔

اس کا بدلہ لینے کے لیے چلپی نے ابراہیم کو تبریز پر حملہ کرنے اور نام و نمود حاصل کرنے کا سبز باغ دکھلایا۔ ابراہیم پاشا اس کے جال میں پھنس گیا اور یہ حماقت کر بیٹھا۔ فوج ایرانیوں کے مقابل کامیابی حاصل نہ کرسکی تو وزیراعظم ابراہیم پاشا نے اس کا الزام اسکندر چلپی پر لگا دیا اور اسے قتل کرادیا۔ اسکندر کو ابراہیم سے اس قدر نفرت تھی کہ اس نے مرنے سے پہلے بادشاہ کے نام خط لکھا جس میں تحریر تھا۔ وزیر ابراہیم پاشا غدار ہے۔

سلیمان نے طے کرلیا کہ قسطنطنیہ پہنچنے پر ابراہیم کا بھی وہی حشر ہوگا جو اسکندر چلپی کا ہوچکا ہے۔

ابراہیم اور اپنے ذاتی محافظ دستے کو ساتھ لے کر وہ سرعت سے قسطنطنیہ واپس پہنچ گیا۔

یہاں اب اس نے پابندی سے دیوان میں مقدمات کی سماعت شروع کی وہ ابراہیم کو اپنے ساتھ ساتھ رکھتا۔ اس زمانے میں اسے نیند بھی نہ آتی تھی۔ جب

مقدمہ کے تمام کاغذات مثل میں شامل ہو چکے تو ایک شام اس نے حکم دیا کہ اس کے اور ابراہیم دونوں کے لیے دیوان خاص میں کھانا چنا جائے۔ ابراہیم کی وزارت کے زمانے میں اکثر دونوں رات کا کھانا یہیں کھاتے تھے۔ اس رات کو بھی سلطان کے ساتھ ہم نوالہ و ہم پیالہ ہونے میں ابراہیم کو کوئی بات انوکھی نہ معلوم ہوئی۔

یہ دیکھ کر حسب معلوم سلطان کچھ سوچ رہا ہے اس نے لاپروائی سے کہا۔ "آپ نے ایرانیوں کی خوب گت بنائی ہے۔ وہ بہت دن تک اپنے زخم سینکتے رہیں گے۔"

سلیمان نے "ہاں" کہا۔ اور پھر وہ دفعتاً" کہنے لگا۔ "یہ جنگ عاقبت اندیشی کے خلاف تھی۔"

جب سلطان اپنی خواب گاہ میں جانے لگا تو اس نے ابراہیم کو دیوان خاص میں ٹھہرنے کا حکم دیا۔ حسب معمول ابراہیم کے لیے طاقچے سے نکال کے بستر بچھا دیا گیا۔

صبح کو طاقچے کی دیواروں پر خون کے دھبے تھے۔ دیوان خاص کے دروازے سے باہر وزیر اعظم ابراہیم کی لاش پڑی تھی جو سلیمان کا منظور نظر ہوا کرتا تھا۔ جو اس کی عزیز بہن کا شوہر تھا۔ جلاد نے کمان کی گرہ سے اس کا گلا گھونٹا تھا اور یہ زرہ ابھی تک اس کی گردن کے گرد تھی۔

ابراہیم کے متعلق مسلمان مورخوں نے لکھا ہے۔ "وہ حرص و آز کے خواب دیکھتے دیکھتے خود اپنے جال میں پھنس گیا۔"

اہل وینس نے اس کے متعلق لکھا۔ "وہ اپنے آقا سے زیادہ اپنے آپ کو محبوب رکھتا تھا۔"

سلطان ابراہیم پاشا کے بعد بہت خاموش رہنے لگا تھا۔

وہ اپنی حسین لڑکی مہرماہ کو بہت چاہتا تھا، لیکن اس کی لڑکی کو اس سے نفرت ہو گئی اور اس نے بہت عرصہ بعد جب اس کے مرنے کی خبر سنی تو بڑی سنسان خاموشی کے عالم میں۔

ابراہیم کے زمانے میں وہ کبھی کبھی شراب پی لیتا تھا، لیکن اب اس نے شراب بالکل ترک کر دی تھی۔ قریب قریب روز وہ اپنی کشتی پر سوار ہو کے ایشیا کے ساحل پر جاتا۔ سلطان کا دبدبہ اور عظمت اپنی معراج پر تھی۔ اہل وینس کی طرح آسٹریا بھی اسے سالانہ تیس ہزار بطور خراج ادا کرتا تھا۔

اسی عروج کے زمانے میں اس کی حرم سرا میں سازش شروع ہوئی۔

روکسے لانا!.... باقاعدہ طور پر اس کی بیوی بن چکی تھی اور ابراہیم کے زوال میں اس کی سازشوں کا بھی دخل تھا۔ یہ تیز و طرار یونانی وزیر تیسرا شخص تھا جو حرم میں اس کے اقتدار کل کے راستے میں حائل تھا۔ وہ ابراہیم کی خود پرستی سے خوب واقف تھی۔ سلطان کو ابراہیم سے بدظن کرنے میں اس کی کوششیں بھی شامل تھیں۔ ابراہیم کی موت کے بعد اپنے وزیروں اور مشیروں پر سلطان کی بے اعتباری بڑھتی گئی اور یہ بے اعتباری خرم کے بڑے کام آئی۔ اور کوئی عورت ایسی نہ تھی جو اس کی رقیب بنتی۔ لیکن سلطان اپنے فرائض سلطنت میں اتنا منہمک رہتا کہ اس کے لیے بہت کم وقت نکال سکتا۔ وہ خود پرانی حرم سرا میں بند رہتی اور سلطان نکڑ کے مرکز والی سرا میں کام کرتا، اور اکثر وہیں سو رہتا۔

جب روکسے لانا نے اس سے اس سرا میں رہنے کی منت کی تاکہ وہ اس کے قریب رہے تو سلطان نے انکار کر دیا۔ سلطان محمد فاتح کا فرمان تھا کہ کوئی عورت اس سرا میں رات نہ گزارے جہاں دیوان خاص سلطنت کے مقدمات کے فیصلے کیا کرتا تھا۔

قسطنطنیہ میں بڑے زور کی آگ لگی اور اس کی وجہ سے روکسے لانا عارضی طور پر مرکز والی سرا میں منتقل ہو گئی۔ یہ آگ ساحل کے کنارے کنارے پھیلتی ہوئی پرانے محلات تک پہنچ گئی۔ اس میں حرم سرا کا اندرونی حصہ اور عورتوں کے ملبوسات اور زیورات کے صندوق جل گئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سلطان کی منظور نظر بیوی کو فوراً" وہاں سے نکال لیا گیا اور سلطان نے اپنے حجروں کے پیچھے نئی سرا کے تیسرے صحن میں اس کے رہنے کے لیے کمرے عنایت فرمائے۔

سلطان کو بھی اس کی توقع نہ تھی کہ روکسے لانا اپنے ساتھ اتنا بڑا کارخانہ لے کر آئے گی، اس کے ساتھ کوئی سو کنیزیں، مغلانیاں، حبشی خواجہ سرا اور قاصد تھے۔ روکسے لانا کا کہنا تھا کہ اس خدم و حشم کے بغیر اس کا گزارہ نہیں ہو سکتا۔ سلیمان نے اس قافلے کو بھی سرا کے اندرونی صحن کے اطراف کے حجروں میں ٹھہرا دیا۔

اس طرح روکسے لانا نظم و نسق حکومت والی سرا میں سلطان کی واحد بیوی کی حیثیت سے رہنے لگی۔ اس طرح اس نے سلطان محمد فاتح کا بنایا ہوا قانون توڑ دیا۔ اس حصے میں روکسے لانا اسی طرح حکومت کرتی تھی جیسے والدہ سلطان پرانے محل سرا میں حکومت کرتی تھی۔ فرق اتنا تھا کہ بظاہر خرم کے والدہ سلطان بننے کے کوئی آثار نہ تھے۔

روکسے لانا کی اتنی مجال تو نہیں تھی کہ سلطان کے دیوان خاص تک پہنچ جائے مگر خواجہ سرا وغیرہ جو وہاں تک پہنچ سکتے تھے اسے بات بات کی خبر دیتے۔

بے چینی اور اضطراب کے عالم میں وہ اپنے جاسوسوں کے ایک ایک لفظ کو تولتی، اس کی بے چینی اور اضطراب کا باعث آل عثمان کا یہ دستور تھا کہ بادشاہ کے بھائیوں کو قتل کر دیا جاتا ہے۔ گل بہار تو مر چکی تھی لیکن اس کا بیٹا مصطفیٰ ولی عہد سلطنت تھا۔ اس کا امکان تھا کہ مصطفیٰ پرانے قانون پر عمل کرے، اپنے سوتیلے بھائیوں، خرم کے اپنے بیٹوں سلیم، بایزید اور جہانگیر کو قتل کرا دے۔

بڑی جرات اور اضطراب کے عالم میں یہ روسی عورت بار بار سلطان سلیمان سے اس خطرے کا ذکر کرتی۔ اور بار بار وہ اطمینان سے اسے یقین دلاتا وہ بار بار یہی دہراتا کہ مصطفیٰ ولی عہد ہے۔ اب برادر کشی کی یہ پرانی بربری رسم ختم ہو چکی ہے۔ مصطفیٰ بہت اچھی طبیعت کا لڑکا ہے۔ اس کے مزاج میں شک نہیں ہے۔ وہ ہرگز اپنے چھوٹے بھائیوں کی جان کا دشمن نہیں بنے گا۔

لیکن روکسے لانا کی نظر کسان لڑکیوں کی طرح صاف تھی وہ یقین نہ کرتی۔

سلیمان اس کے اس خوف کا ازالہ نہ کر سکتا تھا۔ اس کے مرنے کے لمحے بعد کیا پیش آئے گا اس کا کچھ انتظام کرنا اس کے بس سے باہر تھا۔

صرف روکسے لانا کی محبت ہی اسے نہیں ستا رہی تھی۔ وہ اپنے بچوں میں جہانگیر کو بہت چاہتا تھا جو مفلوج تھا اور اپنی لڑکی مہرماہ کو بہت چاہتا تھا جو بڑی خوش شکل بچی تھی۔ روکسے لانا اس کی اس چاہت سے فائدہ اٹھاتی تھی اور اصرار کرتی کہ مہرماہ کے شوہر رستم کو اور زیادہ اختیارات دے دیے جائیں۔ وہ سارے خاندان کی حفاظت کر سکے گا۔ اس کو وزیر بنا دینا چاہیے۔

مالیات کے کاروبار میں ابراہیم سے بھی زیادہ ہوشیار تھا۔ لیکن سلیمان کو اندازہ نہ تھا کہ وہ کتنا کنجوس ثابت ہو گا اور روکسے لانا اپنا کام نکلوانے کے لیے اسے کس طرح استعمال کرے گی۔

سلیمان نے رستم کو وزیر مقرر کیا۔ اس طرح اس نے سلطان فاتح کے ایک اور قانون کی خلاف ورزی کی کہ اس عہدے پر صرف قابلیت کی بنیاد پر تقرر ہونا چاہیے اور سلطان کے کسی عزیز کو اس کی قربت کا کوئی ممتاز منصب نہ ملنا چاہیے۔

شہزادہ مصطفیٰ کو سلطان سلیمان کے حکم کے بغیر قتل نہ کیا جا سکتا تھا اور سلیمان اپنے بیٹے کے قتل کا خواب بھی نہ دیکھ سکتا تھا۔ لیکن ایک معمولی سے موقع کی وجہ سے روکسے لانا کو موقع مل گیا۔ دور دراز سرحد پر مصطفیٰ اپنے سپاہیوں میں بڑا ہر دلعزیز ہوتا جا رہا تھا۔ روکسے لانا کے جاسوسوں نے اس کا تو ثبوت فراہم کر دیا، لیکن وہ اس کا کوئی ثبوت مہیا نہ کر سکتے تھے کہ مصطفیٰ اپنے باپ سے غداری کرنے والا ہے۔ وہ صرف خیمہ گاہ کی گپ شپ دہرا سکتے تھے۔

"نوجوان مصطفیٰ شہسواری کے لیے پیدا ہوا ہے' اب بھی وہ بادشاہ کے مقابل زیادہ تیزی سے کوچ کرکے' اپنا پرچم اڑاتا ہوا دارالحرب میں جہاد کرسکتا ہے۔ جب وہ انعام دیتا ہے تو مٹھیاں بھر بھر کے دیتا ہے... خدا اس کی عمر میں ترقی دے اور اسے ایک دن ہمارا بادشاہ بنائے۔"

اس قسم کی تھوڑی تھوڑی باتیں' بڑی احتیاط سے روکسے لانا نے سلطان کے کان تک پہنچائیں۔ اور اس طرح اس نے اپنی خباثت کے لیے راہ ہموار کی۔

اس تجویز کو کامیاب ہوتے کئی برس لگ گئے۔ روکسے لانا اپنے شوہر کی طبیعت کا ان تھک مطالعہ کرتی رہی۔ اس نے محسوس کیا کہ سلطان کی طبیعت کی گہرائی میں ظلم کا شائبہ تھا' اس کے ساتھ ہر اس شے پر بے اعتباری تھی جس کو وہ اچھی طرح سمجھ نہ سکتا تھا۔

سلطان کے خلاف سازش کرنا بہت خطرناک تھا۔ وہ یہی کرسکتی تھی کہ اس کے دل میں شکوک و شبہات پیدا کرتی جائے۔

روکسے لانا بار بار گل بہار کے فرزند کی ہمت مردانہ کا ذکر کرتی۔ وہ کہتی بہت جلد مصطفیٰ مشرق میں ایرانیوں کی شورش فرو کردے گا۔ اب سلیمان کو مشرق کا رخ کرنے کی ضرورت نہیں رہی۔

1553ء کے موسم گرما میں مشرقی سرحد پر بدقسمتی سے ایک ایسا واقعہ پیش آیا کہ سب اس طرف متوجہ ہوگئے۔ مشرق میں ایرانیوں نے پہاڑوں سے نکل کر ارض روم پر قبضہ کرلیا۔ سلیمان کی عمر اب ساٹھ سال کے قریب ہونے کو آئی تھی' اس نے بجائے خود مشرق کا رخ کرنے کے فوج کو رستم کی سپہ سالاری میں روانہ کیا۔

بہت جلد سرائے کو تشویش ناک خبریں وصول ہونے لگیں۔ فوج کے تجربہ کار سپاہی رستم کو اس لیے ستا رہے تھے کہ سلطان نے خود اس فوج کی قیادت نہیں کی تھی۔

سپاہیوں نے یہ مطالبہ شروع کیا کہ اگر سلطان اتنا ضعیف ہوگیا ہے کہ بہ نفس نفیس ان کی قیادت نہیں کرسکتا تو پھر شہزادہ مصطفیٰ کو ان کی سپہ سالاری کرنی چاہیے۔ ان کا کہنا تھا۔ یہ رستم عثمانی نسل کا نہیں۔ اگر ہم اس کو قتل کرڈالیں۔ اور سلیمان کو معزول کردیں تو ہمارا سردار مصطفیٰ بن جائے گا اور جنگ میں ہماری سپہ سالاری کرے گا۔"

رستم نے روکسے لانا کے کہنے پر یہ الزام لگایا کہ مصطفیٰ نے باغیوں کی ہمت افزائی کی ہے۔

رستم کی اطلاع پر اسے بھروسہ تھا' پہلے تو اس نے فوراً" کوچ کی تیاری کی۔

سلیمان کو غالباً" بغاوت کا اندیشہ نہ تھا۔ اسے یہ فیصلہ کرنا تھا کہ اس کے بیٹے نے کیا قصور کیا ہے؟ کس طرح اسے ملزم ٹھہرایا جاسکتا ہے؟ وہ خود کوئی فیصلہ نہ کرسکا اور ناموں کا اظہار کیے بغیر اس نے یہ مقدمہ قاضی القضاۃ کے سامنے ان الفاظ میں پیش کیا۔

"اس شہر میں ایک تاجر رہتا تھا' وہ خود تو سفر پر روانہ ہوا اور اپنا سارا مال اسباب اپنے ایک منظور نظر غلام کی تحویل میں چھوڑ گیا۔ اپنے مالک کے غیبت میں اس غلام نے مال اسباب کی چوری شروع کی اور اس کو قتل کرنے کے منصوبے باندھنے شروع کیے۔ ان حالات میں قانون کے بموجب غلام پر کیا سزا عائد ہوتی ہے۔"

یہ مسئلہ بلا کسی طرح کی اظہار رائے کے مفتی اعظم ابن سعود کے سامنے رکھا گیا۔ لیکن اس قاصد کے پیچھے پیچھے حرام سرا سے روکسے لانا کا بھیجا ہوا ایک اور قاصد بھی پہنچا جس نے مفتی اعظم کو یہ جتا دیا کہ اس مسئلے کا سلطان کی ذات سے تعلق ہے۔

مفتی اعظم نے کھرے پن سے جواب دیا۔

"میرے خیال میں اس غلام کی سزا یہ ہے کہ اسے طرح طرح کے عذاب دے کر قتل کردیا جائے۔"

یہ ساری کی ساری سازش روکسے لانا کی تھی۔ ابن سعود کا فتویٰ' رستم کا خفیہ خط سلیمان کے دربار خاص اور دیوان میں سرگوشیاں' یہ سب اسی عورت کی سازش تھی۔

سلیمان نے رستم کو سپہ سالاری سے سبکدوش کرکے واپس بلا بھیجا' شہر کی سرداری اس نے اپنے تیسرے بیٹے بایزید کے سپرد کی جو اس کا منظور نظر تھا۔ سلیمان نے مصطفیٰ کو حکم نامہ بھیجا کہ حاضر ہوکے بالمشافہ اپنی صفائی اور بریت کا ثبوت فراہم کرے۔

روکسے لانا کو یقین تھا کہ گل بہار کا بیٹا مصطفیٰ اتنا بے وقوف نہیں کہ اپنے باپ کے حکم کی تعمیل کرے لیکن مصطفیٰ اگر بھاگ نکلتا تو اس کے معنی یہ ہوتے کہ اس پر جو الزام لگایا جارہا ہے وہ صحیح ہے۔

جب روکسے لانا کو یہ اطلاع ملی کہ باوجود اس کے کہ مصطفیٰ کے رفیقوں نے اس کو سلطان کے پاس نہ جانے کا مشورہ دیا ہے۔ وہ سلطان کی خدمت میں حاضر ہونے کے لیے روانہ ہوچکا ہے تو اس عورت کو یقین نہ آیا۔

اس کے جاسوسوں نے کہا کہ مصطفیٰ نے چلتے چلتے یہ کہا۔

"اگر اس کی قسمت میں موت ہی لکھی ہے تو اس سے زیادہ اور کیا خوش قسمتی ہوگی کہ وہ اپنے باپ کے ہاتھوں قتل ہو۔"

مصطفیٰ بڑی شان سے اپنے راہوار پر سلطان کے خیمہ گاہ پہنچا۔ اس نے سلطان کے خیمے کے قریب ہی اپنا خیمہ نصب کرایا۔

وہ اپنے خیمے سے سلطان کے خیمے کی جانب صرف دو ساتھیوں کو ہمراہ لے کر روانہ ہوا۔ سلطان کے خیمے کے دروازے پر وہ لمحہ بھر کے لیے ٹھہر گیا کیونکہ سپاہی اس کے اطراف جمع ہوگئے تھے۔ وہ اپنے باپ سے ملنے کے لیے اکیلا آگے بڑھا۔ بارگاہ میں تین گونگے بہرے شخص اپنے ہاتھ میں کمان کی تانت لیے اس کا انتظار کررہے تھے۔

جاسوسوں کا یہ بیان تھا کہ سلیمان باریک چلمن کے پیچھے سے مصطفیٰ کے قتل کا منظر دیکھ رہا تھا۔

اس کے دونوں ساتھیوں کو خیمے کے دروازے پر قتل کردیا گیا مصطفیٰ کی لاش قالین پر لٹا دی گئی۔ اور فوج کے سپاہیوں کو اس کے قریب سے کوچ کرجانے کا حکم دیا گیا تاکہ وہ اس کی لاش دیکھ سکیں۔

اس کے بعد جو خبریں آئیں' ان کی طرف روکسے لانا نے کوئی توجہ نہیں کی' یہ کہ سپاہیوں نے کس شدومد سے شہزادہ مصطفیٰ کا ماتم کیا اور کسی کو سزا نہیں دی گئی۔ لیکن تمام روز سپاہیوں نے کھانا نہ کھایا۔ انہوں نے رستم کو قتل کردینے کا مطالبہ کیا جو حفاظت سے شہر کی جانب روانہ ہوچکا تھا۔

بروسہ کے قدیم شہر میں اس سے بدتر واقعات پیش آئے۔ وہاں مصطفیٰ کی بیوہ کو اندیشہ تھا کہ اس کے چار سالہ فرزند کی جان خطرے میں ہے' لیکن حرم سرا سے ایک خواجہ سرا یہ پیغام لے کر آیا کہ اسے حرم سرا میں طلب کیا گیا ہے۔ اس خواجہ سرا نے کسی نہ کسی طرح بچے کو ماں سے جدا کرکے قتل کردیا جب اہل بروسہ کو اس واقعے کی اطلاع ملی تو شہریوں نے دوڑ کر قاتل کا تعاقب کرنا چاہا لیکن وہ بچ کر نکل گیا۔

مصطفیٰ کا دامن ہر طرح کی غداری سے پاک تھا۔ ایسے نازک موقع پر اس نے بڑی عالی ہمتی سے کام لیا تھا' لیکن وہ اس سازش کا شکار ہوگیا جس کی ذمہ داری اس روسی عورت پر تھی۔

یہ بڑی آسان بات تھی کہ وہ اپنے بیٹوں کے راستے سے اپنے سوتیلے بیٹے کو ہٹادے لیکن اس کا انجام ایسا شدید ہوا کہ خود اسے اس کی کوئی توقع نہ تھی۔ اس واقعہ کا آل عثمان کے مستقبل پر بڑا فیصلہ کن اثر پڑا۔ سلیمان نے سلطنت کو جس راستہ پر لگایا تھا۔ اس پر آگے بڑھنے کے لیے اگر عثمانیوں کو مصطفیٰ جیسے راہبر مل جاتے تو یہ تصور کرنا مشکل ہے کہ ترکوں کا مستقبل کتنا شاندار ہوتا۔

پہلا نتیجہ یہ ہوا کہ شہر میں غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی۔ سلیمان کے خلاف نہیں کیونکہ ان کی رائے میں جس نوجوان کو اس نے اتنی بے دردی سے قتل کیا تھا۔ وہ اسی کا تو بیٹا تھا' بلکہ رستم اور روکسے لانا کے خلاف۔ چونکہ کھلم کھلا سلطان کی منکوحہ کا نام نہ لیا جاسکتا تھا' نہ کوئی اسے ہاتھ لگا سکتا تھا۔ اس لیے سارا غصہ وزیر اعظم کی طرف پلٹ گیا جو اس عورت کا داماد تھا۔ ایک شاعر یحییٰ نے نوجوان عثمانی شہزادے کے غم میں ایک

مرثیہ لکھا جو بہت جلد مقبول عام ہو گیا۔

رستم جانتا تھا کہ عوام میں اس کے خلاف کس قدر نفرت ہے۔ اس نے دیوان میں یحییٰ کو پکڑ بلایا اور پوچھا۔ "تم نے یہ جرات کیسے کی کہ میرے متعلق لکھا کہ "شیطان کی طرح میری رسی دراز ہے اور سلیمان کا تخت مصطفیٰ سے محروم ہو گیا۔"

حاضر دماغ شاعر نے جواب دیا۔

"سب کی طرح میں نے سلطان کے فیصلے کے آگے سر جھکا دیا۔ سب کی طرح اس کے انجام پر میں بھی روتا ہوں۔"

غصے کے عالم میں رستم نے یحییٰ کے قتل کا حکم دیا۔ لیکن سلیمان نے شاعر کو سزا دینے کی اجازت نہ دی۔ اس نے رستم کو وزارت عظمیٰ کے عہدے سے معزول کر دیا۔

اتنے میں جہانگیر کی وفات ہو گئی۔ یہ مفلوج اور بیمار لڑکا سلیمان کا سب سے چھوٹا بیٹا تھا۔ اور ہمیشہ سلیمان کے ساتھ رہتا۔ اس کو مصطفیٰ کی موت کا ایسا شدید صدمہ ہوا کہ وہ خود جانبر نہ ہو سکا۔ شاہی طبیب اس کی جان نہ بچا سکے۔

روکسے لانا کی چالاکی کسی طرح اب اس رقابت کو فروغ نہ کرپاتی تھی، جو اب اس کے اپنے دونوں بیٹوں کے درمیان سلگنے لگتی تھی۔ وہ خود سلیم کو زیادہ چاہتی تھی جسے اور کوئی پسند نہ کرتا تھا۔ سلیم کو اعصابی دورے پڑا کرتے تھے جن میں اس پر بڑی دہشت طاری ہو جاتی تھی اور وہ اپنے آپ کو سنبھالنے کے لیے شراب پینے لگا تھا، اور کنیزوں میں بہت وقت گزارتا تھا۔ اس کی ماں نے سلیمان کو یہ سمجھانا چاہا کہ سلیم کو اپنا ولی عہد بنائے لیکن اس نے یہ بات نہ مانی۔

سلیمان بایزید کو زیادہ پسند کرتا تھا۔ جس میں مصطفیٰ کی سی تمام صفات تھیں، جو بڑا حساس اور بڑا دور اندیش تھا۔

سلیمان روکسے لانا کے بیٹوں کو اچھی طرح قابو میں رکھ سکتا تھا لیکن اس کی راہ میں مصطفیٰ کی روح حائل تھی۔ اس روح نے ایک جعلی شخص کی صورت اختیار کی۔ اور مردہ شہزادے کا بھیس بدل کر وسط اناطولیہ کے قبیلوں کو بھڑکا کے درویشوں کی مدد سے اچھی خاصی جمعیت اکٹھی کر لی۔

یہ شخص مصطفیٰ سے اس قدر مشابہ تھا کہ وہ فوجی افسر جو مصطفیٰ کو اس کی زندگی میں اچھی طرح جانتے تھے قسمیں کھا کے کہتے تھے کہ یہ بالکل جیتا جاگتا مصطفیٰ ہے۔

بہت جلد اس جعلی مصطفیٰ کا بھرم کھل گیا اور یہ گرفتار ہو گیا لیکن اس نے جو فتنہ کھڑا کیا تھا اس کی لو سلیمان کے دونوں زندہ بیٹوں کی خیمہ گاہوں تک پہنچ گئی۔ یہ ایک ذرا سی چنگاری تھی جسے ڈرپوک سلیم نے ہوا دے کر بھڑکایا۔

اکیلے میں سلیمان کو اپنے بیٹے کا چہرہ نظر آتا۔ وہ کبھی اس کا ذکر نہ کرتا۔

اب وہ رات کو چراغ جلتا رہنے دیتا اور اس طرح چراغ کی روشنی وہ البانوی یحییٰ کا لکھا ہوا مرثیہ پڑھتا کیونکہ یحییٰ کو بھی مصطفیٰ سے محبت تھی۔

"جھوٹے سازشی نے کیا چھپی ہوئی نفرت دکھائی۔ جس کی وجہ سے ہمارے آنسو تھمنے نہیں پاتے۔ اور موت مصطفیٰ کے لیے کیا تحفہ لائی۔ اجنبیوں کی طرح وہ ایک منزل کی طرف چل پڑا۔"

اب سلیمان کی ٹانگوں میں گٹھیا کی تکلیف تھی، جب وہ تھک جاتا تو اس کی سانس رکنے لگتی جہاں کوئی ہنگامہ ہوتا اگر وہ خود موقع پر پہنچ کر تحقیقات نہ کرپاتا تو صحیح واقعات اس کے علم میں نہ آتے۔ اب وہ ساٹھ سال کا تھا، اور اس کے لیے زیادہ چلنا پھرنا آسان نہ تھا۔

حرم سرائے میں اس کی اپنی بیٹی مہرماہ اس کی خوشامد کرتی اور روکسے لانا اصرار کرتی کہ وزارت کے منصب پر رستم کو بحال کروایا جائے۔ رستم ہی اعتماد کے قابل ہے۔

ایک سال بعد سلطان نے ان کی بات مان لی۔ اور رستم کو بحال کر دیا گیا۔

وہ اب تک یہ نہیں دیکھ پایا تھا کہ اس کی اپنی حرم سرا میں روکسے لانا اور مہرماہ کی سازشوں کی وجہ سے نظم و نسق ــــ میں ایک بڑی مہلک کمزوری پیدا ہو گئی تھی۔ اگر پردہ نشین عورتیں دیوان پر حاوی ہو جائیں تو رفتہ رفتہ وہ سلطنت کے سارے امور پر چھا جائیں گی کیونکہ وہ خود تو نظر سے اوجھل رہتی ہیں، اور اندرونی بارگاہ سے باہر کوئی ان کی آواز تک نہیں سن سکتا۔

رستم ان بے شمار عثمانی وزیروں میں سے پہلا وزیر تھا جس کا تقرر حرم سرا نے کیا تھا۔

سلیمان کے گھرانے کو دیمک لگ چکی تھی لیکن اس کا مداوا اس کے سوا کوئی نہیں کرسکتا تھا۔ سلیمان بوڑھا ہوتا جا رہا تھا۔

روکسے لانا بیمار رہنے لگی تھی۔ اس کے ان دونوں بیٹوں کے درمیان جو زندہ بچے تھے۔ کھلم کھلا جنگ کے آثار تھے۔

روکسے لانا اب بھی اپنی سازشوں سے باز نہ آئی تھی وہ سلیمان کی منت کرتی تھی کہ ذہین اور قابل بایزید کے مقابلے میں کمزور سلیم کی حمایت کرے۔ لیکن سلیمان کا قطعی ارادہ یہی تھا کہ وہ بایزید کو اپنا ولی عہد بنائے گا اس کے سوا کوئی بھی ایسا نہ تھا کہ جو ترک قوم کی سرداری کی اہلیت رکھتا ہو۔

پھر اندرونی تخت گاہ کے قریب ہی اپنے حجرے میں روکسے لانا نے وفات پائی چونکہ وہ عورت تھی اس لیے اس کی موت کا زیادہ چرچا نہیں ہوا۔

سلیمان نے اپنا غم ظاہر نہیں ہونے دیا۔ اپنی زندگی کا آدھا حصہ اس نے اس عورت کے عشق میں گزارا تھا۔ اس کا اثر بہت زیادہ قبول کر لیا تھا۔ اور ایک سے زیادہ مرتبہ اس کے ہاتھوں دھوکا کھایا تھا۔

جامع سلیمانیہ کے عقب میں روکسے لانا کی قبر بنائی گئی۔ سلطان نے اس کے نام پر ایک چھوٹی سی مسجد اور مدرسہ کی تعمیر کا بھی حکم دیا۔

روکسے لانا کی بس اتنی ہی یادگار باقی رہ گئی۔ وہ جو اپنی زندگی میں اپنی نسوانی قوت ارادی کے زور سے سلیمان پر حاوی تھی اور جو چیز حاصل کر لیتی تھی اپنے چنگل سے نکلنے نہ دیتی تھی اس کی موت کے بعد سلیمان کبھی اس کا ذکر تک نہ کرتا تھا۔

(روکسے لانا کی موت کے بعد اس کے بیٹوں اور داماد رستم آغا نے کس طرح ترکی سلطنت کو زوال تک پہنچایا۔

آئندہ ماہ ان شاء اللہ)۔

(ہیرلڈ لیم کی کتاب "سلیمان عالی شان" سے ماخوذ)

سانحہ ارتحال

بہن قانتہ رابعہ کی والدہ محترمہ طویل علالت کے بعد دنیا سے رخصت ہو گئیں۔

انا للہ وانا الیہ راجعون

قانتہ رابعہ کی والدہ بہت صابر خاتون تھیں انہوں نے اپنی عمر کا ایک بڑا حصہ عبادت اور قرآن پاک کی درس و تدریس میں گزارا۔

اللہ تعالیٰ سے دعا گو ہیں۔ ان کی تمام نیکیوں کو قبول فرما کر اپنی جوار رحمت میں جگہ دے اور ان کے تمام متعلقین کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین

قارئین سے دعائے مغفرت کی درخواست ہے۔

موسم کے پکوان

خالدہ جیلانی

پائے

اجزا :

پائے	دو عدد
دہی	دو پیالی
پیاز	دو عدد
نمک، تیل	حسب ذائقہ و ضرورت

ترکیب :

پائے اچھی طرح دھو کر لہسن کے دس بارہ جوے کے ساتھ دگنے پانی میں چھ سات گھنٹے تک ابلنے کے لیے رکھ دیں۔ پھر گوشت اور چھوٹی ہڈیاں الگ کر لیں اور یخنی الگ برتن میں چھان کر رکھ لیں۔ الگ دیگچی میں پیاز براؤن کر کے پیس لیں اور دہی کے ساتھ گرائنڈ کر لیں۔ گرم تیل میں دہی ڈال کر بھونیں۔ پھر نمک، سرخ مرچ، ہلدی، پسا دھنیا اور گرم مسالا ڈال کر بھونیں۔ یخنی ڈال دیں۔ ایک جوش آجائے تو آنچ دھیمی کر کے پائے بھی ڈال دیں۔ تقریباً" بیس منٹ تک دم پر رکھیں پھر ہرا دھنیا، لیموں کا رس، باریک کٹی سبز مرچ اور ادرک چھڑک کر پیش کریں۔

فش کٹلٹس

اجزا :

مچھلی بغیر کانٹے کی	ایک کلو
ناریل پاؤڈر	آدھا کپ
پسی سفید و کالی مرچ	آدھا آدھا چائے کا چمچہ
لیموں کا رس	پانچ کھانے کے چمچے
پسی ادرک	ایک کھانے کا چمچہ
نمک، تیل	حسب ذائقہ و ضرورت

ترکیب :

مچھلی کے ٹکڑوں پر نمک اور لیموں کا رس لگا کر دس منٹ کے لیے رکھ دیں پھر اچھی طرح دھو کر چھلنی میں رکھ دیں تاکہ اضافی پانی خشک ہو جائے۔ ناریل پاؤڈر میں مرچیں، نمک، ہلدی، ادرک اور فش ساس ملا کر پیسٹ بنائیں۔ مچھلی کے ٹکڑے اس میں لپیٹ کر رکھ دیں۔ تین گھنٹے بعد گرم اور گہرے تیل میں تلیں اور ٹشو پیپر پر نکال لیں تاکہ اضافی چکنائی جذب ہو جائے۔ کیچپ کے ساتھ پیش کریں۔

فرائیڈ جھینگے

اجزا :

جھینگے	ایک کلو
انڈے	چار عدد
میدہ	ایک کپ
سرکہ	آدھا کپ
نمک، تیل	حسب ذائقہ و ضرورت

ترکیب :

انڈوں میں نمک، کالی مرچ، میدہ اور سرکہ ملا کر گاڑھا سا پیسٹ بنالیں۔ جھینگوں کو خوب اچھی طرح دھو کر اس آمیزے میں لپیٹ کر رکھ دیں۔ تین گھنٹے بعد گہرے تیل میں سنہری تل لیں اور کیچپ کے ساتھ نوش فرمائیں۔

کھوئے کی مٹھائی

اجزا :

کھویا	ایک کپ
میدہ	آدھا کپ
چینی	آدھا کپ
کریم	دو کھانے کے چمچے
بادام، پستے	حسب ضرورت
الائچی پاؤڈر	آدھا چائے کا چمچہ

ترکیب :

ساس پین میں کھویا بھون لیں۔ الگ سے بھونا ہوا میدہ بھی کھویا میں ملا دیں۔ پسی ہوئی چینی، الائچی پاؤڈر اور بادام، پستے باریک کاٹ کر مکس کریں اور گرم گرم آمیزے کی بالز بنالیں۔ درمیان کو انگوٹھے سے دبائیں۔ اس پر ایک ایک پستہ رکھیں۔ تھوڑی تھوڑی سی کریم لگا کر پیش کریں۔

انڈے کی ربڑی

اجزا :

دودھ	ایک لیٹر
چینی	تین چوتھائی کپ
انڈے کی سفیدی	تین عدد
ونیلا ایسنس	آدھا چائے کا چمچہ
کارن فلور	ایک کھانے کا چمچہ
الائچی	چار عدد
پستے بادام	حسب ضرورت

ترکیب :

دودھ میں الائچی ڈال کر ہلکی آنچ پر اتنا پکائیں کہ تین پاؤ رہ جائے۔ چینی ڈالیں۔ حل ہو جائے تو تھوڑے سے دودھ میں کارن فلور ملا کر شامل کر دیں۔ گاڑھا ہونے لگے تو سفیدی پھینٹ کر مکس کریں اور ساتھ ہی ونیلا ایسنس بھی ڈال دیں۔ ٹھنڈا کر کے پستے بادام کی ہوائیاں چھڑک دیں۔

(ثمرین اکرام..... میرپور خاص)

☆

سرورق کی شخصیت	
ماڈل	سونیا
میک اپ	روز بیوٹی پارلر
فوٹو گرافر	موسیٰ رضا

چہرے کا جو عضو سب سے پہلے جھریوں اور باریک لکیروں کا شکار ہوتا ہے وہ آنکھیں ہیں۔ بڑھتی عمر کے ساتھ آنکھیں کئی مسائل میں مبتلا ہو جاتی ہیں مثلاً" سیاہ حلقے' آنکھوں کے نیچے بیگز کا بننا' باریک لائنیں اور کروفیٹ (Crow feet) وغیرہ۔ آنکھوں کے آس پاس باریک لائنوں کے ہونے کی کئی وجوہات ہیں جن میں سے چند درج ذیل ہیں۔

نمی کی کمی بھی ایک مسئلہ ہے۔ پانی کی کمی سے جلد خشک ہو جاتی ہے اور اس کی قدرتی لچک جاتی رہتی ہے۔

آنکھوں کے گرد سیاہ حلقوں کی زیادہ تر وجہ بہت زیادہ تھکان یا مکمل نیند نہ لینا ہوتا ہے۔ اس لیے سب سے پہلے کوشش کریں کہ اپنی سات سے آٹھ گھنٹے کی نیند ضرور پوری کریں' جس سے نہ صرف آپ کا ذہن پر سکون رہے گا بلکہ آنکھوں کی تھکاوٹ بھی دور ہو جائے گی اور یہ تر و تازہ نظر آئیں گی۔

اگر سیاہ حلقوں کا سبب تیز دھوپ ہے تو گھر سے باہر نکلتے وقت چہرے اور خاص طور پر آنکھوں کے اردگرد سن اسکرین لگائیے۔ یہ آپ کے چہرے کی جلد اور آنکھوں کو سورج کی روشنی سے محفوظ رکھے گی۔

آنکھوں کے گرد سیاہ حلقوں کو دور کرنے کے لیے وٹامن K کی حامل کریم نہ صرف سیاہ حلقوں کو دور کر دیتی ہے بلکہ ان کے استعمال سے آنکھوں کی جلد کے نیچے موجود خلیات دھوپ میں زیادہ فعال بھی نہیں ہوتے' جس کی وجہ سے حلقے نہیں پڑتے۔

دیسی نسخے

آنکھوں کے حلقوں کے علاج میں بیوٹی کاسمیٹکس کے علاوہ دیسی نسخے بھی آپ کی خوب صورت آنکھوں کو بدنما ہونے سے بچانے میں اہم کردار ادا کر سکتے ہیں بلکہ یہ دیسی نسخے دیرپا بھی ثابت ہوتے ہیں۔ آنکھوں کے حلقوں سمیت بہت سے مسائل جلن' دکھن' درد اور سرخی کے لیے کھیرے کے قتلے آنکھوں پر رکھ کر ہلکی سی پٹی باندھ لیں یا پھر کھیرے کو پیس کر دو پوٹلیوں میں باندھ لیں اور ایک دو منٹ کے لیے انہیں فریج یا فریزر میں رکھ دیں اور پھر دونوں پوٹلیوں کو باری باری اپنی دونوں آنکھوں پر اچھی طرح جما کر رکھ لیں۔

کھیرے سے آنکھوں کو ٹھنڈک ملے گی اور اس سے نکلنے والا رس آنکھوں کی جلد کو سکون فراہم کرے گا۔ ہفتے میں دو تین بار یہ عمل کرنے سے بہت جلد سیاہ حلقے نہ صرف صاف ہونا شروع ہو جائیں گے بلکہ آنکھوں کی جملہ شکایت بھی دور ہو جائیں گی۔

اس کے علاوہ آلو' آڑو' کیلا' سیب وغیرہ کے گودے سے آنکھوں کے گرد مساج کرنے سے بھی حلقے دور کرنے میں مدد ملتی ہے۔

اس کے علاوہ سرسوں کے تیل کے مساج سے بھی آنکھوں کے حلقے دور ہو جاتے ہیں جبکہ انناس' نارنگی کے عرق ملنے سے بھی اس میں افاقہ ہوتا ہے۔